

عید مبارک

کھر کے ہر فرد کے لئے

پاکینہ

PDFBOOKSFREE.PK

اگست 2014

نورجیل

عنیزہ سید

رفعت سراج

کد لچپ ناطاق

ناہید سلطان اختر کی خصوصی تحریر

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں ستمبر 2014ء

سرگزشت

ماہنامہ

کا ایک حرکتہ الآرا
خاص نمبر

خطا نمبر

خطائے اول
انسانی تاریخ کی پہلی خطا، ایک سرسبز مملکت پر
خطائے سیاست
سیاست دانوں کی خطا میں جس نے نقشہ بدل دیا
ساتھ ہی خطائیں
ساتھ ہی وہ خطائیں جنہیں سچ سمجھا جاتا تھا
مختص خطا
پھر کیسے لڑی ہے لڑائی اور مسلمانوں کی اہم اہمیت پر پہلے نہیں
خطائے ہوا باز
یونان کے ساتھ پوری دنیا میں پھیل چلا دیے والی کٹھا

سرگزشت تمام خاص

شماروں سے اہم شمارہ

اس کی علامت

بہت سی خطا کی حیرت انگیز، دلچسپ اور دہلا دیے والی
کٹھنائیں۔ سچ بیانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں
نزدیکی بک اسٹال پر آج ہی اپنا شمارہ مختص کرالیں

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مدیرہ: انجم انصار

معاون: آمنہ حواد

افسانہ

اداریہ

47 77 سالہ سلطانہ اختر

15 مدیرہ

مجھے کچھ یاد ہے

87 حمیرا خان

121 ام شامہ

131 شیریں حیدر

157 شائستہ عزیز

167 ام مریم

187 نیروانی شفق

197 عقیلہ حق

207 عذرا فردوس

خصوصی مضامین

249 رضوانہ پرنس

259 عظمیٰ آفاق سعید

سلسلے وار ناول

18 رفعت عراج

92 عزیزہ سید

ناولٹ

54 نایاب جیلانی

138 سمیرا حمید

مکمل ناول

218 نگہت سیما

لمحنت

شاہ شہریار کا

ترک فتا

پہلی کتاب

اکٹھ کے بعد



مستقل مناصبات

296	پاکیزہ بہنیں	خوش فاقہ	16	ادارہ	دین کی باتیں
299	پاکیزہ بہنیں	سندھ	274	مدیرہ	بہنوں کی محفل
300	ادارہ	روحانی نشوونما	286	عظمیٰ آفاق سعید	پاکیزہ ڈیزائن
302		ہومیوپیتھک	290	انجم انصار	جلت رنگ
			294	صغریٰ زیدی	میرا گھر گنتا ہے

شعبہ فوری اشتہارات 0333-2256789 0333-2168391 گودھان مکان

اشتہارات 0332-4214400 سہیل پریس 0323-2895528 رائے سعید

مائل: رابعہ سیک اپ: روز بیونی پبلشرز فونو گراف: موسیٰ رضا

جلد 42، شماره 45، اگست 2014، مہمالات 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

E-mail: jobgroup@hotmail.com (021) 3580251 (021) 3580251 فون: 74200 • فیکس: 74200



کراچی

پاکیزہ

ماہنامہ

کی ایک اور قابل فخر و نواز
پیش کش پاکیزہ کی دیرینہ
ساختی اور مایہ ناز قلم کار

نگہت سیم

کے مشق قلم کا حسین شاہکار

اعتبارِ وفا

قسط وار کہانی کی صورت بہت
جار اپنے خوش ذوق قارئین کے لیے
ان صفحات کی زینت بنے جارہا ہے

ایک دلنشین اور پُر اثر کہانی آپ کے اعلیٰ ذوق کی نذر





مجھے کچھ کہنا ہے

دنیا میں ہر قوم کا ایک دن خوشی اور اظہارِ مسرت کا ہوتا ہے۔ ہر قوم اپنے خوشی کے دن اپنے
 مذہب و ملت کی تعطیلات کے مطابق مناتی ہے اور ہمارے مذہب اسلام نے بھی مسلم
 اُمہ کے لیے دو ایسے دن مقرر کیے ہیں جو خوشی اور مسرت والی سے حزن ہیں۔ وہ دن عید الفطر اور
 عید الاضحیٰ کے ہیں۔ عید الفطر اسلام کی عظمت و برکت کی علامت، مسلم اُمہ کے اتحاد و یکجہات کا
 مظہر اور ہماری عظیم روایات کا یومِ مسرت ہے۔ یہ دن اللہ تعالیٰ کا ہمارے جس میں اسلامی
 برادری کا ہر فرد خواہ وہ کسی بھی مکتبہ فکر یا مذہبی جماعت سے تعلق رکھتا ہو اپنی ذاتی زندگی کے اس عظیم
 آستان اور ایمان افروز اجتماعِ عید میں حصہ لے کر خوشی شامل ہوتا ہے اور اس بات کو ثابت کرتا ہے
 مسلمان مذہبی طور پر ایک ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ عید الفطر کا
 دن بڑا ہی چمکدار ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بہشت کو پیدا فرمایا۔ جبریل امین کو بیجا
 خداوندی ملے جانے کے لیے عید کا یہی منتخب کیا۔ فرعون کے جاہلوں نے عید کے دن نور
 ہدایت پایا اور اللہ نے انکس انکس سے نواز۔ یہ دن روزے داروں کے لیے بھی مسلسل تہجد سے
 آئیں آج کے ہائے کس دن ہم اس بات کا عید کریں کہ آج سے ہمارا بھی اقدامِ عمل ہو گا وہ
 اسلام کی سرچشمی، امت مسلمہ کی ہیبت و اور فلاح انسانیت کے لیے ہو گا۔ ہم معاشرے کے اندر
 پیدا شدہ ہر قسم کی برائیوں، نفرتوں، عداوتوں اور تفرقات کو ختم کریں گے اور باہمی صلہ اور
 رواداری کی فضا قائم کریں گے تاکہ ہمیں پھر پوری دنیا میں باعزت، باوقار اور قابلِ احترام قوم
 کے طور پر جانا جائے جیسا کہ ماضی میں ملتِ اسلامیہ کا طرہ امتیاز رہا ہے۔



علم... معبر رفتاری

ایک مرتبہ دس آدمیوں کے ایک گروہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ایک ہی سوال کیا مگر جواب جدا گانے چاہے آپ نے سوال ”علم بہتر ہے یا مال“ کے جوابات کچھ اس طرح فرمائے۔

4۔ علم..... اس لیے بہتر ہے کہ مال دیر تک رکھنے سے فرسودہ ہو جاتا ہے مگر علم کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔

5۔ علم..... اس لیے بہتر ہے کہ اس سے دل کو روشنی ملتی ہے اور مال سے دل تیرہ و تار ہو جاتا ہے۔

6۔ علم..... اس لیے بہتر ہے کہ کلمہ مال سے فرعون نے دعویٰ خدائی کیا مگر کلمہ جو علم سے رسول ﷺ نے مامونہ تک حق مہارنگ کیا۔

7۔ علم..... اس لیے بہتر ہے کہ مال کو ہر وقت چوری کا خطرہ ہے مگر علم کو نہیں

8۔ علم..... اس لیے بہتر ہے کہ صاحب مال کہیں بھٹل بھی کیلا تا ہے مگر صاحب علم کرم ہی کیلا تا ہے۔

9۔ علم..... اس لیے بہتر ہے کہ مال دوزر سے بے شمار دشمن پیدا کرتے ہیں مگر علم سے ہر دلی مزاجی حاصل ہوتی ہے۔

10۔ علم..... اس لیے بہتر ہے کہ ایم قیامت کو مال کا حساب ہوگا مگر علم کا کوئی حساب نہ ہوگا۔

علم محض ورائے کا منبع ہے۔

اس طرح حضرت امام جعفر صادقؑ کی زندگی کے چند سالوں میں دنیا آپ کے علوم سے معمور اور احادیث و آراء سے روشن و تابندہ ہو گئی۔ آپ کے گھر کو ایک بی حد روشنی سے تعبیر کیا گیا۔

استاد محمد صادق نکات جو جامع الازہر کا بہرہ کے تھیں الآداب کے استاد ہیں۔ کہتے ہیں کہ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت جعفر صادقؑ کا گھر ایک بہت بڑی کتب خانہ تھی۔ جو علماء و فلاسفہ اور اہل علم کے جہوم سے چمک رہا تھا۔ آپ ان کے سوالوں کے جواب دیتے، ان کے مذاہب و مذاہب و مذاہب کا گھر اور مقاصد کی طرف توجہ کئے بغیر ان کی مشکلات کو حل فرماتے تھے۔ آپ کے در سے کا معیار فیض علم یہ تھا کہ سلطان برہملا کی طرف اور مقام سے آکر آپ کے شیریں باطن علم سے سیراب ہوتے۔ آپ نے اپنے شاگرد جابر بن حیان میں استعداد و لیاقت دیکھی تو اسے مخصوص وقت دیا، جس میں اسے علم سکھایا اور مگر علوم تعلیم فرمائے۔ یہاں تک کہ جابر بن حیان نے امام کے مختلف دروس اور اجلاس سے کئی سو رساں تحریر کئے۔ امام نے اسے چھپنے والی سیاہی بنانے کا طریقہ سکھایا جس سے وہ قیمتی کتب کے خطوط پر چھپنے میں فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ انہیں تاریکی میں پڑھا جاسکتا۔

آپ مسلمانوں کے ساتھ کتاب و سنت سے اور فلسفوں کے ساتھ عقل و حکمت سے اور طبیب کے ساتھ طب کے ذریعے منہمک فرماتے۔

ایک دفعہ ایک ہندوستانی نے منصور کے پاس طب کی کتاب کی قرأت کی اس وقت حضرت امام جعفر صادقؑ بھی موجود تھے۔ آپ خاموشی سے سنتے رہے جب وہ فارغ ہوا تو اس نے عرض کیا۔ ”اے امیر المومنین! کیا آپ اس

میں سے کچھ چاہتے ہیں جو میرے پاس ہے۔"

آپؐ نے فرمایا: "نہیں! کیونکہ جو میرے پاس ہے وہ اس سے بہتر ہے جو میرے پاس ہے۔" پھر آپؐ نے فرمایا: "میں گرم کا سردے اور سرد کا گرم سے اور تر کا خشک سے اور خشک کا تر سے طمان کرتا ہوں اور ہر چیز کو میں خدا کی طرف پلاتا ہوں اور میں اس پر عمل کرتا ہوں جو کچھ رسول ﷺ نے فرمایا ہے اور یہ بات جان لے کہ معدہ بیمار میں کھنجر ہے اور احتیاطی بہت بڑی دوا ہے اور میں بدن کو جس چیز کا چاہتا ہوں عادی بناتا ہوں۔"

تب اس طبیب نے کہا: "کہ کیا طب میں اس کے علاوہ کچھ ہے؟"

آپؐ نے فرمایا کہ: "میں طب کو زیادہ جانتا ہوں یا تم.....؟" اس نے کہا کہ: "میں نہ زیادہ جانتا ہوں۔"

آپؐ نے فرمایا: "میں تجھ سے کچھ سوالات کرتا ہوں تو مجھے بتا....."

۱۔ آنسوؤں اور رطوبتوں کی جگہ سر میں کیوں ہے؟ اور سر پر بال کیوں ہیں.....؟

۲۔ پیشانی بالوں سے خالی کیوں ہے.....؟ نیز اس پر خط اوٹھان کیوں ہیں.....؟

۳۔ دونوں چٹکیں آنکھوں کے اوپر کیوں ہیں.....؟

۴۔ ناک دونوں آنکھوں کے درمیان کیوں ہے.....؟

۵۔ آنکھیں پادامی شکل کی کیوں ہیں.....؟

۶۔ ناک کا سوراخ نیچے کی طرف کیوں ہے.....؟

۷۔ منہ پر دو ہونٹ کیوں بنائے گئے ہیں.....؟

۸۔ سامنے کے دانت چوڑے اور داڑھی چوڑی کیوں ہے.....؟

۹۔ دونوں چٹیلیاں بالوں سے خالی کیوں ہیں.....؟

۱۰۔ مردوں کی داڑھی کیوں ہے.....؟

۱۱۔ عین اور بال میں جان کیوں نہیں.....؟

۱۲۔ دل منہ پر ہی شکل کا کیوں ہے.....؟

۱۳۔ ہاتھ پیروں کے دو ٹکڑے کیوں ہیں.....؟

۱۴۔ جگر کی شکل بھدب کیوں ہے.....؟

۱۵۔ گھٹنے آگے کو جھکے ہیں پیچھے کو کیوں نہیں جھکے.....؟

۱۶۔ دونوں پاؤں کے گھوٹے پیچھے سے خالی کیوں ہیں.....؟

طبیب نے یہ سب سنا کر کہا: "میں ان تمام باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔"

امامؑ نے فرمایا: "بعض اہل خدا تعالیٰ میں ان سب کا جواب جانتا

ہوں۔"

طبیب نے کہا تو پھر فرمائیں۔

امامؑ نے فرمایا کہ: "ہمارے

(ہمارے)

لو سے بچنے پاتے ہیں برگ و بار کے موسم
 باہر یوں لگا دینا شہر آسان کتنا ہے
 جنہوں نے دھوپ کی دشاہیاں جھیلیں تائیں گے
 جان پر سایہ دوار و در آسان کتنا ہے
 قلعہ خاک سے لے کر نمو پانی کے منظر تک
 ذرا دشاہ ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

امانت

قصہ

قطعہ 20

ہات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا
 کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے،
 تاروں کا نور..... چاند کی چاندنی امانت..... امانت کو خیانت سے
 بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے اسی اندھیروں میں
 امانت کی تابانہاں پھر سے روشنی کی کرنیں نکھرتے ہوئے
 چہار سو اجالا کر دیتی ہیں۔

امانت و خیانت کو واضح کرتی ایک پروردگار کی سورت قرآن





گزشتہ القسط کا خلاصہ

ڈاکٹر میر جان نثار دھرم پتہ تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور شیخیل راہب اور دو ماہ کے لیے ایک سخت گیر بہن نور بان تھیں۔ اسماعیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور مستحق خاص تھا۔ کا کاخ اپنے دارا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر میر جان کے پاس میں رہتی ہے۔ دو ماہ اور دو ماہ بیست فریڈر ہیں۔ انکی بی بی شاہ زمان خان، جاہلی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بی بی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریک کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے جو یہاں کوئی قابل قبول ہوتا ہے۔ رانی شاہ عالم کے گھر میں جاتی ہے۔ میر جان کو وہیں آتا ہے تو کچھ جان کو پتا چلتا کہ وہ حال کنفرانس میں کھینچیں ہیں۔ صابروہ ستارہ سے ملنے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ دو ماہ اور دو ماہ عالم کے گھر آ جاتی ہے۔ جاہلی ستارہ سے اپنے ساتھ چلے کو کہتا ہے تو وہ منع کر دیتی ہے۔ شاہ عالم اخبار میں مکی خبر میں یہاں کا نام پڑھ کر چمکتے ہیں۔ یہاں شاہ عالم کا قانون آنے پر انکی تفتا ہے کہ اس کی بہن کا مرزا ہو گیا ہے۔ وہ اب دو ماہ کو نہیں پڑھا سکتے گا۔ میر جان اپنے مرحوم باپ کو صدا میدہتی ہیں وہ گل جان سے کہتی ہیں کہ وہاں سے ملے بغیر مکی نہیں ملے تو اب کیسے چلے گئے۔ انکی بی بی وارث علی کو خبردار کرتا ہے۔ رانی کو یہاں کی بہن کے مرزا کی خبر ہوتی ہے تو وہ سوچتی ہے کہ شاید اب وہ اسے نہیں دیکھ پائے۔ شاہ عالم رانی کی بہت بددعا ہے شاہ عالم، یہاں کے گھر جاتے ہیں اسے کھل دیتے ہیں۔ شہینہ یہاں سے جاہلی کے بارے میں پوچھتی ہے تو یہاں کہتا ہے کہ وہ اب ان سے نہیں ملے گی۔ رانی کا کاخ اور دو ماہ کو یہاں کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہیں۔ وارث علی انکی بی بی شاہ زمان سے کہتا ہے کہ وہ جاہلی کے قبضے سے وہ قابل ٹھہرائے۔ ستارہ کی تدبیر ہو جاتی ہے۔ رانی شاہ عالم سے کہتی ہے کہ وہ کا کاخ کو تباہ کرے گا۔ یہاں انکی پڑھا نہ سکتی ہیں۔ شاہ عالم کہتا ہے کہ تو شاہ عالم کہتے ہیں کہ وہ یہاں کو کھانے کی کوئی چیز نہیں کے۔ دو ماہ کا کاخ کے ساتھ اپنے گھر جاتی ہے تو میر جان اسے نہیں بچھا سکتی۔ انکی بی بی جاہلی سے بات کرتا ہے کہ وہ قابل اسے کہتا ہے۔ وارث علی، یہاں سے قابل کی بات کرتا ہے کہ اگر وہ قابل اسے ملتی تو ان کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ یہاں قابل کے وارث علی شہینہ سے پوچھتا ہے تو وہ بھی یہ بیان ہو جاتی ہے۔ وارث شانتہ بیکھر کی اس بات سے بہت ڈر پڑتا ہوتا ہے کہ وہ شہینہ سے کوئی ملحقہ نہ کرے۔ وارث علی انکی بی بی سے کہتا ہے کہ وہ جاہلی کی بی بی کو کھالے گا۔ دو ماہ اسماعیل خان سے کہتی ہے کہ اس کے باپ کے بارے میں بتائے، اسماعیل خان اسے صرف اتنا بتاتا ہے کہ اس نے دو ماہ کے باپ کو کھینچا۔ شہینہ صابروہ کو ٹیڈی کی دوا دیتی ہے۔ دو وارث علی کا قانون سختی سے تو وارث علی، یہاں کو کھال دیتا ہے تو یہاں شہینہ کو شاہ عالم کے گھر لے جاتا ہے۔ وہ گاڑا ہے کہ کا کاخ کو لٹا دے گا۔ بتاتا ہے کہ شہینہ اس کی بہن سے دو ماہ سے پہلے رکنے کا وہ شاہ عالم سے بات کر لے گا۔ تو وہ اسے کہتی ہے کہ وہ شانتہ بیکھر کو کھائے کہ وہ شہینہ سے دو بی بی نہیں کر سکتی۔ کا کاخ صابروہ شہینہ کے آنے پر بہت حیران ہوتی ہیں۔ شاہ عالم کو کچھ پکا کاخازا یہاں کی بہن کے آنے کا بتاتی ہے۔ یہاں کو کچھ شاہ عالم کے گھر لے آتا ہے۔ یہاں شاہ عالم سے کہتا ہے کہ وہ انکی کرائے پر لے کر نہیں دے سکتا۔ انکی دھن میں جگہ پہنچے ضرور دے گا۔ یہاں شاہ زمان کے پاس وارث علی کے خلاف ایب آئی آر دوسرے کرائے جاتا ہے۔ وارث علی اگر شاہ زمان کو بتاتا ہے کہ وہ لوگ گھر چھوڑ کر نہیں چلے گئے ہیں۔ رانی اب فوراً سے خوش رہنا چاہیے۔ وارث علی کا حال کرنا چاہتی ہے کہ گل جان اسے اکیلے بھیجے پڑھ لیتی ہوتی ہے۔ جو عزتیں شاہ عالم کو کہتے ہیں کہ وہ کا کاخ کے لیے ان کی ہند کے مطابق رشتہ تلاش کر رہے ہیں۔ کا کاخ صابروہ کو دیا کی والدہ کی طبیعت کا بتاتی ہے تو وہ دو ماہ کی دلجوئی کرتی ہے۔ گل جان، اسماعیل خان کو بتاتی ہے کہ رانی باہر جانا چاہتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ جہاں جانا چاہتی ہے اسے جانے دے دے۔ وارث علی انکی بی بی کو بتاتا ہے کہ جاہلی کے گھر والے نہیں دوسرے ہو گئے ہیں اور اب انکی بی بی جان بنانے کے لیے جاہلی علی کی دوسری بی بی کو اپنے قابو میں کرتا ہے۔ یہاں رانی کو دیکھتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ جاہلی کے ساتھ لاک اپ میں سخت قید کی اور آگے تھے جو اس سے بہت حائر ہوئے تھے۔ دو ماہ شاہ عالم سے کہتی ہے کہ وہ گل جان کو کھانچے گا۔ میر جان کا مطالعہ کر گیا۔ کا کاخ صابروہ سے کہتی ہے کہ وہ یہاں سے کہے کہ وہ انکی پڑھا شروع کر دے۔ شانتہ بیکھر اسطرح یاد جاتی ہیں تو صوبہ نصرت جان کہ اسے اور قافلوہ شہینہ کے گھر آتے ہیں لیکن ان کا گھر بند تھا۔ شاہ عالم صابروہ یہاں سے کہتے ہیں کہ وہ ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں تو ضرور کریں گے۔ صابروہ کہتی ہے کہ وہ اپنی بی بی کو لے کر گاؤں چلی جائے گی۔ یہاں رات کو ان میں دو ماہ روئے تو کچھ کہ بیان ہو جاتا ہے۔ اپنی رات کو دو ماہ یہاں کو ان میں دیکھ کر رانی کو بے چینی لگ جاتی ہے۔ وارث علی، شاہ عالم کو جاہلی کا سر رکھتا ہے۔ یہاں جان نثار ملتی جاتا ہے تو اسے ہر چیز انکی محسوس ہوتی ہے۔

اب آگے پڑھیں

”ہمارے مذہب میں والدین کے حقوق کے بارے میں بہت واضح احکامات ہیں۔۔۔۔۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ ہر حال میں والدین کے حقوق ادا کرنا ہیں اور اس وقت تک ادا کرنے ہیں جس وقت تک وہ کفر کے راستے پر چلنے کے لیے مجبور نہ کریں۔۔۔۔۔ صرف اسی صورت میں والدین کی بات نہیں ماننی ہے لیکن۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ والدین کے حقوق ادا نہ کرنے کے معاملے کو مکمل بامفرمانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔“ شاہ صاحب اس وقت صابرہ سے ہم کلام تھے جو تھوڑی دیر قبل شاہ صاحب کو سلام کرنے حاضر ہوئی تھی۔ جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی اعلیٰ اور تفکر کے طور پر وہ دن میں ایک مرتبہ شاہ صاحب کو سلام کرنے ضرور آتی تھی۔

وہ بات جو شاہ صاحب کے ذہن میں ہر وقت رہتی تھی آج انہوں نے اس کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ چونکہ برہان نے اپنے طور سے ان سے مزید کسی قسم کی مدد نہیں چاہی تھی۔ لیکن وہ خطرہ تھے کہ برہان اپنے باپ کے بارے میں ان سے کوئی بات کرے۔ کوئی اخلاقی مدد مانگے یا اس معاملے میں اپنی ذمہ داری کا احساس کرتا ہوا دکھائی دے۔ کئی دن گزرنے کے بعد ایسا کچھ نہیں ہوا تو انہوں نے خود ہی سے بات شروع کی تھی۔ شاہ صاحب کی یہ بات سن کر صاحبہ کے چہرے پر کئی رنگ آن گزرتے گئے۔ اور ایک گہرے غم کا تاثر اس کے چہرے پر ظہور کیا۔ چند لمبے سانسوں کے بعد وہ بھری دھڑکن کے ساتھ بھری آواز میں گویا ہوئی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شاہ صاحب..... امیر اور برہان کے باپ کا رشتہ دنیاوی رشتہ ہے اور صرف ہم دونوں کی زندگی تک باقی ہے لیکن بچوں کا رشتہ..... میں اور آپ کا رشتہ قیامت تک کا رشتہ ہے۔ برہان بہت اچھا بچہ ہے، اس نے کبھی اونٹنی آواز میں میرے ساتھ بات تک نہیں کی..... لیکن شاید، لیکن کی منظومیت پر وہ بہت غمزہ ہے..... اور باپ کی طرف سے اس کا دل بھرتا ہے..... میں نے کبھی وہ اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس معاملے میں یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ کسی بات پر مجبور نہ کریں.....“ شاہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”وہ تو ٹھیک ہے، بچہ ہے۔ اس کا تاجہ کا ایک بلا کی طرح نازل ہوا ہے۔ سنہلے میں وقت تو گئے گا مگر مجھے اور آپ کو اس کی ہونانی عی کی نصرت کی بھی فکر کرنی ہے۔۔۔۔۔ جیسا کہ ہم انہی دنیا اور آخرت کی فکر کرتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ کے شوہر نے جو بچہ بھی کیا۔ وہ دنیا کے کٹھرے میں تو کھڑے ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ ایک دن آخرت کے کٹھرے میں بھی کھڑے ہوں گے اور صرف انہی سوالات کا جواب دیں گے جن کا معلق ان کے اپنے اعمال سے ہوگا۔۔۔۔۔ مجھے آپ کو، ہم سب کو صرف اور صرف اسے، اسے عمل کا جواب دینا ہے۔“

”میں بھی اسی طرح سوچتی ہوں شاہ صاحب..... لیکن اس کے باوجود کروٹ لیجئے عی و یکھئے اپنی ہستی کیا ہے اولاد سے محروم ہوگئی۔ اپنی اس بچی کا چہرہ ہر وقت میری نگاہ میں رہتا ہے۔ پھر بھی میں نے سوچا ان بچوں کے باپ کے ساتھ ایک محترم ازبائی..... اسی کی محنت کی کٹائی کھا کر آج تک زندہ ہیں اور اس کے ویسے سے ملنے والی عزت کی وجہ سے سر جھکا کر بیٹھی ہوئی تھی۔“ صاحبہ بدلت کھڑی تھیں۔

شاہ صاحب چند لمحے ٹھوکی، ٹھوکی گم گم کیفیت میں بیٹھے رہے پھر اس کی طرف دیکھے بغیر بولے کہ صابرہ کی بات نے انہیں از حد متاثر کیا تھا۔

”میں آپ کی ہر قسم کی اخلاقی اور مالی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں..... بس آپ برہان کو سمجھانے کی کوشش کیجیے۔ جہاں کو ہر حال اپنے باپ سے ملاقات کرنی چاہیے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے ناں کہ بعض اوقات انسان کوئی غلطی کرنے کے بعد بہت پچھتا تا ہے..... اور روبرو رکھنے سے تو یہ کراؤٹے استغفار کرتا ہے..... کیا خیر

لفطی کرنے والے کی لفظی سب معاف کر دی جائے اور ہم بندے اس لفظی کو بکڑے بچھے رہیں۔ جبکہ ہم میں سے کسی کو اس کا فائدہ نہیں..... ہو سکتا ہے جس کا نقصان ہوا تھا اسے کسی فائدے سے بدل دیا گیا ہو اور ہمارے فرشتوں کو خیر بھی نہ ہوئی ہو۔" شاہ عالم بہت غور و خوض کرتے ہوئے اس طرح سے بات کر رہے تھے کہ ان کے منہ سے نکلنے والا ایک ایک لفظ گنگنا جا سکتا تھا۔ شاہ صاحب کی یہ بات سن کر صابروہ اب ضبط نہ کر سکی..... چٹکیاں لے کر رونے لگی..... پھر رونے، دوڑتے ہوئی۔

"شاہ صاحب ہم تو اگر اس بات پر اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے کہ اس گھپ اندھیرے میں آپ جیسے اللہ کا خوف رکھنے والے بندے نے ہمارے سر پر ہاتھ رکھ دیا..... اگر آپ بھی دنیا داروں کی طرح اپنے دروازے ہم پر بند کر دیتے تو ہم بھلا کہاں جاتے؟" صابروہ کی یہ بات سن کر شاہ صاحب کے جسم پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ ایک دم ہاتھ اٹھا کر تڑپ کر پڑے۔

"نہیں..... نہیں، میں کسی قائل نہیں ہوں..... آپ میرے بارے میں اس طرح نہ سوچیں..... میں صرف اپنے گناہوں سے ڈرتا ہوں..... وہ گناہ جن کا مجھے ہر حال میں جواب دینا ہے اور صرف جواب دینا ہے اس عدالت میں جہاں صرف جواب طلب کیے جائیں گے جواب نہیں۔" صابروہ اب کچھ نہ بولی اسی طرح چٹکیاں لے کر روتی رہی۔ میں اسی لمحے گھر کے ایک ملازم نے شاہ صاحب کو آ کر اطلاع دی تھی۔

"صاحب کوئی مہمان آئے ہیں....." شاہ صاحب نے چونک کر ملازم کی شکل دیکھی۔

"مہمان.....! کیا نام بتاتے ہیں؟" شاہ صاحب اپنے ملازم سے سوال کر رہے تھے اور صابروہ اپنے بیٹے والے آنسو پونچھ رہی تھی..... لیکن اس کی سسکیں اب بھی غلا میں گھری ہوئی تھیں۔

"صاحب، وارث علی نام بتا رہے ہیں۔"

"وارث علی....." شاہ صاحب کے منہ سے نکلا..... صابروہ بدحواس ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور خوف زدہ انداز میں شاہ صاحب کی طرف دیکھ کر بولی۔

"شاہ صاحب.....! یہ..... وہی ہے جس کی وجہ سے ہم آج آپ کے گھر میں آکر بیٹھ گئے ہیں..... یہ یہاں بھی پہنچ گیا..... یہ کتنا بڑا شیطان ہے۔ اسے کیسے غرور لگتی کہ ہم یہاں ہیں۔ شاہ صاحب آپ اسے منع کر دیں..... اسے گھر میں نہ بلائیں، یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔" صابروہ اپنا رونا دھونا بھول کر بہت خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی۔ شاہ صاحب کے چہرے پر بھی ہلکرات کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ ملازم ابھی حکم کا منتظر کھڑا ہوا تھا۔

"آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کیجیے..... میں اس شخص سے بات کرتا ہوں..... بقول آپ کے یہ خطرناک آدمی ہے اگر اس سے بات نہ کی گئی تو پھر یہ دو بارہ بھی آئے گا..... پلیز آپ جا کر آرام کیجیے، میں اس سے بات کرتا ہوں اور ڈرنے بھگانے کی بالکل ضرورت نہیں..... جس اللہ نے آپ کو آج تک زندہ اور محفوظ رکھا، آگے بھی اسی کی ذمہ داری ہے، ہمیں اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے..... اور جو اللہ سے نہیں ڈرتا ہمیں اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" شاہ صاحب نے بہت وقار اور بے خوفی سے اس طرح بات کی مگر صابروہ کے دل کو بڑی تقویت پہنچی تھی۔ وہ چپ چاپ سر جھکا کر اس طرف نکل گئی جس طرف کاراٹ انگلیسی کو جاتا تھا۔

"اسے بھیج دو....." شاہ صاحب نے ملازم کی طرف دیکھا اور آہستگی سے بولے۔

ملازم واپس چلا گیا۔ شاہ صاحب اپنی جگہ بیٹھنے لگے۔ ان کے چہرے پر اسی طرح سے غمرات کا جال، بچھا ہوا تھا۔ دو، تین منٹ گزرے اور وارث علی اندر داخل ہوا۔

”السلام علیکم نانہ جان.....“ شاہ صاحب قدرے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ دوسرے پاؤں تک وارث علی کا جائزہ لے رہے تھے جو اس وقت بڑی تک سبک سے تیار تھا۔ اس کے چہرے پر کھلی خفا تھی اس کے دل کی کیفیت کو محسوس کر رہی تھی۔

”وہیکم السلام.....“ تحریف رکھیں۔“ شاہ صاحب باوقار انداز میں گویا ہوئے۔ وارث علی جھٹ ان کے سامنے رکھے ہوئے بھاری بھر کم صوفے پر گرنے کے سے انداز میں جھنسن گیا..... اس کے انداز میں عجیب سی بے تکلفی تھی جو شاہ صاحب کو بہت مل رہی تھی مگر اس وقت وہ علم و تدبیر کا بیکر نظر آرہے تھے۔

”نانہ جان.....“ میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے ملاقات میرے لیے بہت عزت کی بات ہے۔“ وارث علی نے اپنی دانست میں ادب و تہذیب کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی..... شاہ صاحب نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور پھر گویا ہوئے۔

”مجھے نانہ جان کہہ رہے ہیں..... کیا میں بوجھ سکتا ہوں کہ میں کس خالے دکن رشتے سے آپ کا نانہ جانتا ہوں؟“ شاہ صاحب نے اس انداز میں کہا کہ ان کے چہرے پر کسی قسم کی ناگواری کا تاثر اخذ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”جی..... آپ میری مرحوم بیوی کے نانہ جان ہیں تو کیا یہی بات ہے اس رشتے سے میرے بھی نانہ جان ہیں۔“
 ”مرحوم بیوی.....؟“ اب شاہ صاحب قدرے پھلنے لگے۔
 ”جی..... جی..... میں مرحوم ستارہ بیوی کی بات کر رہا ہوں۔“
 ”ستارہ بیوہ.....!“ شاہ صاحب پھر اپنے گرواٹ علی کی طرف دیکھنے لگے۔

”جی وہ..... کیا کہتے ہیں..... آپ برہان کے نانہ جان ہیں ناں..... تو ظاہر ہے ستارہ اور اس کی بہن کے بھی نانہ جان ہیں..... لیکن..... حیرت کی بات ہے کہ میری مرحوم بیوی نے آپ کا ذکر ہی نہیں کیا..... جب مجھے پتا چلا کہ میری مرحوم بیوی کے نانہ جان بالکل میرے قریب ہی رہتے ہیں..... تو مجھ سے رہا نہیں گیا..... میں فوراً آپ سے ملنے چلا آیا۔“

”بہت نوازش..... بڑی مہربانی کی آپ نے لیکن میں آپ کی اطلاع کے لیے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بلا ہر بخود یا وی رشتے بنائے جاتے ہیں اس طرح کا کوئی رشتہ میرا اور آپ کی مرحوم بیوی کا نہیں تھا۔“
 ”جی.....!“ وارث علی کو غماک سمجھ نہیں آئی، وہ آدھیں پھاڑ کر شاہ صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرا خیال ہے آپ کو میری بات سمجھ گئی چاہے کہ میں برہان کا نانہ نہیں ہوں البتہ..... ان کے خیر خواہوں میں سے ایک ہوں..... اب فرما میں..... آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ شاہ صاحب بہت خوش ہوئی نظر میں سے وارث علی کے چہرے سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔

”جی..... میں بس عرض کرنے لگا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ میری بات توجہ سے سنیں گا۔“
 وارث علی جو شاہ صاحب کی بات سن کر بری طرح پکڑا گیا تھا۔ ایک دم سبھل کر گویا ہوا۔
 ”جی فرمائیں، میں سن رہا ہوں۔“

”ای کی کیا کہہ رہی ہیں آپ، وارث علی، شاہ صاحب سے ملنے آیا ہے؟“ شینہ بری طرح بدحواس اور غورزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ صابرہ بری طرح لرزدہ بر اندام تھی۔ اس کی قوتِ گویائی سب کو ہلکی سی ہلکی سی شینہ کو صرف اتنا ہی بتا رہا تھا کہ وارث علی، شاہ صاحب کے پاس بیٹھا ہے۔ اس کے بعد خوف سے گویا ہلکی بندھ گئی تھی اور وہ بولنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔ شینہ اگرچہ خود بھی حالتِ خوف میں تھی لیکن اس نے لرزتی کانپتی ماں کو سہارا دے کر بٹھا دیا تھا۔

”وہ یہاں بھی پہنچ گیا شینہ۔۔۔ جس سے چھپ کر ہم یہاں آکر بیٹھے تھے۔۔۔“ صابرہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر ایک، ایک کر بول رہی تھی۔ ایک، ایک لفظ جیسے کسی گہری گھاٹی سے گزر کر باہر آ رہا تھا۔ شینہ کا دل سوکھے پتے کی طرح لرزدہ رہا تھا مگر اس پر رُخبری اٹھا دی۔ ایک تو یہ کہ خود کو سنبھال رہا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ ماں کو اب مزاحیہ حالت تک پہنچنے سے بچا تھا۔ وہ لرزیدہ ہاتھوں کے ساتھ بہ مشکل، لیکن تک گئی۔۔۔ گھاس میں باقی ڈالا اور اسی طرح لرزتی، کانپتی اس کے پاس آئی۔

”ای ایہ پانی پی لیں۔۔۔“ صابرہ انکار میں گردن ہلانے لگی۔ وہ بری طرح خوف زدہ تھی۔ اس کے اوسانِ جنور خطا تھے۔

”ای آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔ وہ شاہ صاحب ہیں نا، خود ان سے نصرت لیں گے۔ ہم کوئی گھر سے باہر روڈ پر تو نہیں بیٹھے ہوئے۔۔۔ وہ شاہ صاحب کی مرضی کے تحت ہیں۔ بات نہیں کر سکتا۔۔۔ پلیز آپ خود کو سنبھالیں۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہوگا، موت پریشان ہوں، شینہ، ماں کو سنبھالنے کے لیے ہرجمن کر رہی تھی۔ صابرہ نے گردن ہلاتے ہوئے گھاس لے لیا اور وہ چار گھونٹ لے کر حلق کو تر کیا۔ پھر گھاس واپس کرتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے بیٹا۔۔۔ ہم گھر میں بیٹھے ہیں۔ شاہ صاحب نے ہمارے سر پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ مگر میرا بچہ تو باہر جاتا ہے نا۔۔۔ یہ بہت خطرناک آدمی ہے، مجھے تو اپنے بچے کی فکر پڑ گئی ہے۔“ صابرہ کو اب مختلف قسم کے اندیشوں نے ستا کر شرور کر دیا تھا۔

”ای، شاہ صاحب اس سے بات کر رہے ہیں نا۔۔۔ بس وہ اس سے نصرت لیں گے، آپ خود کو سنبھالیں۔ خدا خواست آپ کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا ہوگا۔۔۔“ ماں کے پاس بیٹھ کر انہیں تسلی دیتے ہوئے اس کی آواز بھرانے لگی۔ صابرہ نے ایک ٹھہرنی پڑا لی اور بے اختیار ہی کیفیت میں اس کا ہاتھ چٹختی کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس نے شینہ کو زور سے، جھینچا ہوا تھا۔ شینہ کے وجود کی گرمی سے اسے جھپ سی اتھرت چٹکی تو اس کے اوسانِ بحال ہونے لگے۔

”ہاں بیٹا۔۔۔ شاہ صاحب تو بہانہ ہیں، مدد تو اللہ ہی کرتا ہے۔ سب بتاتا ہے، دعا کرو، اللہ ہم پر رحم کرے۔“ وہ شینہ کے سر پر ہاتھ بچھرتے ہوئے رقت بھری آواز میں کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

”دیکھیے میں آپ سے لمبی چوڑی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ یہ میرا گھر ہے، یہاں پر وہی آسکتا ہے جسے میں آنے کی اجازت دوں۔۔۔ آپ اس وقت یہاں پر بیٹھ کر مجھ سے بات کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے خود چاہا تھا کہ آپ سے بات کی جائے۔ اب کیونکہ میں آپ کی تمام بات سن چکا۔۔۔ اس لیے

صرف اتنا کہنا چاہوں گا..... کہ برائے مہربانی آپ دوبارہ زحمت مت کیجیے گا..... ٹھیک ہے آپ کا اس خاندان سے ایک رشتہ قائم ہوا تھا۔ مگر حرم کے بعد آپ کا اس خاندان سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ جب بیوی دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے اسی وقت بیوی کا شوہر سے یہ رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں دونوں کی زندگی تک ہی باقی رہتا ہے۔“

”لیکن..... نانا جان میں اس خاندان سے اپنا رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ اتنے بڑے وقت میں ان لوگوں کو دیکھا نہیں چھوڑ سکتا۔“ وارث علی نے اپنا اخلاقی جواز دے کر اور کمال ہوشیاری سے اپنی نگاہی کے تاثرات چھپاتے ہوئے بڑے فلوہ پانے لکھ میں کہا تھا۔

”لیکن جب وہ لوگ آپ سے کسی قسم کا تعلق قائم رکھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تو آپ کیوں اصرار کرتے ہیں اور پھر..... کچھ کچھ نہیں آتی آپ اس خاندان سے کس بنیاد پر تعلقات آگے بڑھانا چاہتے ہیں اگر آپ مجھے مطمئن کر سکتے ہیں تو میرے سوال کا جواب دیں..... ورنہ برائے مہربانی تشریف لے جائیں۔“ شاہ صاحب نے بے سروبی کو بھی مروت کے خوب صورت لہارے میں استغناء کیا تھا۔

”اس لیے نانا جان کہ یہ لوگ بہت اچھے ہیں، اتنے اچھے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں اور پھر آپ یہ دیکھیں کہ ان دونوں بچوں کا باپ نیکل جا چکا ہے۔ اس پر نکل کا تعلق اس وقت تک ہے بلکہ اس پر نکل کا مقدمہ سن چکا ہے اور وہ اپنے جرم کا اعتراف بھی کر چکا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اب عدالتی جانے کہ وہ باہر آتا ہے یا.....؟ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں.....؟“ وارث علی نے اپنی بات اصرار سے سمجھ کر شاہ صاحب سے سوال کیا۔

”بالکل، میں آپ کی بات سمجھ گیا مگر میرا خیال ہے اس خاندان کو آپ کی ہمدردی اور آپ کے اخلاقی تعادل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے تو آپ کی ضد اور اصرار بالکل بے جا اور بے گل ہیں۔ برائے مہربانی آپ اپنے کام سے کام لیں اور ان لوگوں کا بچہ چھوڑ دیجیے اور میں آپ سے ہمارے گھر کا کہہ دوں گا کہ آئندہ میرے گھر تشریف نہ لائیں۔“

وارث علی، شاہ صاحب کی بات سن کر قدرے سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی سوچ کسی نئے مکر کے لیے وقف تھی۔ شاہ صاحب کو اس کی سوچ میں کسی کا ایک، ایک بیل، بہت بڑا مکمل محسوس ہو رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے کندھوں پر پھاڑا تھا یا ہوا ہے۔ وہ بیوی پر باری اور نکل سے اس کے اٹھ جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ اور اس پر اپنے حریفانہ طالع خالق کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وارث علی، شاہ صاحب کی طرف سے مکمل خاموشی کا عندیہ پا کر طو باؤ کر پائی جبکہ سے کھڑا ہو گیا اور بی بی عاجزی سے گویا ہوا۔

”آپ جیسے کہتے ہیں..... آپ کی بات مان لیتا ہوں لیکن آپ یہ نہیں سمجھیں کہ میں اتنی آسانی سے ان لوگوں سے تعلق ختم کر لوں گا..... یہ میرے اپنے ہیں، ان لوگوں کا درد میرا اپنا درد ہے۔ میں تو ان لوگوں کی ہمدردی میں یہاں تک چلا آیا تھا..... اور میری یہ ہمدردی وقتی نہیں ہے۔ میں سچ کچھ اس مشکل وقت میں ان لوگوں کا ساتھ دینا چاہتا ہوں.....“ وارث علی اتنا کچھ کہہ بیٹھا..... مگر اب شاہ صاحب بالکل خاموش تھے..... اور ان کی خاموشی وارث علی کو کہہ رہی تھی کہ اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

وارث علی نے اپنی بات کا جواب نہ پا کر شاہ صاحب کی طرف دیکھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی، مجھے نہیں پتا تھا کہ ان لوگوں کو آپ جیسا سر پرست میرے اگر یہ لوگ مجھے پہلے بتا دیتے تو میں بہت پہلے آپ کو سلام کرنے حاضر ہو جاتا۔ ان لوگوں کے یہاں آنے سے پہلے..... اس

نے پھر کمر فریب سے لپٹے ہوئے الفاظ ادا کیے۔ مگر شاہ صاحب جنوز خاموش تھے۔ بہر حال انہوں نے وارث علی کا بڑا حابو ہاتھ قلم لیا۔ اور مصالحتی کے انداز سے اسے جتا دیا کہ یہ اس کا ان کے ساتھ آخری مصالحتی ہے۔

☆☆☆

برہان اب اٹھنسی جانے کے لیے وہی راست اختیار کرتا تھا جو صرف اٹھنسی کے لیے مخصوص تھا۔ اس لیے آج جب وہ شاہ صاحب کے گھر میں داخل ہوا تو شاہ صاحب سے اس کا آتنا سامنا نہیں ہوا۔ وہ غالباً اپنے کمرے میں تھے۔ مگر میں حمل خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

شام ڈھلے کا وقت تھا۔ برہان شل اعصاب کے ساتھ جب ماں کے سامنے آیا تو جیسے اس کے چہرے پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ الجھن بھری نظروں سے ماں کے چہرے سے کچھ اخذ کرنے لگا۔ مگر کچھ سمجھ نہ آئی۔ جبکہ صابرہ دم بخود کیفیت میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ای کیا بات ہے؟“ آپ اس طرح سے مجھے کیوں دیکھ رہی ہیں؟“ برہان کی آواز ماحول میں ابھری تو صابرہ جیسے ایک دم اپنے حواسوں میں آگئی اور بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے قلم لیا۔ پھر اس کا سر اپنے سامنے جھکا کر پیشانی چومتے ہوئے بولی۔

”یا اللہ، حیران کن، لاکھ شکر ہے۔ میرا بیٹا ساتھ خیریت کے واپس آ گیا۔“ ماں کی یہ بات سن کر برہان بری طرح چونک پڑا تھا۔ اور تشویش بھری نظروں سے ماں کی طرف دیکھتا تھا۔ صابرہ کے اس جھلنے میں ان گنت معنی پوشیدہ تھے۔ ایسے معنی جو دونوں میں دوسرا سمجھ نہ سکتے تھے۔ اندیشے ابھارتے تھے۔ خوف کے راستوں کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر بہن کو تلاش کیا مگر وہ اسے دکھائی نہیں دی۔

”کیا بات ہے امی! آپ اتنی پریشان کیوں ہیں۔ اور شینہ کہاں ہے؟“

”جینا۔۔۔ شینہ تو چھت پر ہوئی وہ بھی کچھ کمرے۔۔۔ دو چار کام کر کے ایک کونے میں بیٹھ جاتی ہے۔ انسان ہے، بعد کمرے میں دس گھنٹہ جاتا ہے۔ خورشی نکلی ہوں جینا چھت پر چلی جاؤ، کچھ دیر کھلی ہوا میں بیٹھو تو سکون ملے گا۔“

”اور آپ۔۔۔ آپ کیوں پریشان ہیں؟ کوئی خبر آئی ہے یا شاہ صاحب نے کچھ کہا ہے؟ کیونکہ ہمارے ملنے جلنے والوں میں سے کوئی یہاں نہیں آ سکتا۔ کسی کو بھی نہیں پتا کہ ہم لوگ یہاں ہیں۔“ برہان پر جھلٹ سی طاری ہو گئی۔ لہجہ لڑکھڑانے لگا کیونکہ اسے جلدی، جلدی بولنے کی عادت نہیں تھی۔ لیکن خیالات کی پلٹار نے جیسے اس کے حواسوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

”جینا۔۔۔ آرام سے بیٹھ جاتی ہوں میں تمہیں۔۔۔ پریشانی والی بات ہے بھی اور نہیں بھی۔۔۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“ برہان پھر ابھرا۔

”جینا۔۔۔ وارث علی آیا تھا۔“ صابرہ نے گویا ایک دھماکا کیا تھا۔ برہان نے پوری آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھا۔

”وارث علی آیا تھا؟ اندر آ گیا تھا وہ۔۔۔!“

”ہاں۔۔۔ ہاں جینا اندر آ گیا تھا۔ شاہ صاحب نے اندر بلوایا۔ وہ تو احق سے میں شاہ صاحب کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تو ان کے نوکر نے آکر بتایا۔ میری تو آنکھیں کانپ گئیں۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔۔۔“

شاہ صاحب سے بہت کہا کہ اسے اندر نہ بلائیں۔۔۔ مگر وہ کہنے لگا اگر میں نے اسے اندر نہ بلا یا تو وہ روز آئے گا۔۔۔ اس سے بات کرتا بہت ضروری ہے اور اس کے آنے کا مقصد جاننا بھی بہت ضروری ہے۔۔۔

”پھر۔۔۔؟“ برہان نے بے تابی سے پوچھا۔

”پھر۔۔۔ یہ کہ چنا میں تو اٹھ کر آگئی تھی۔۔۔ میں کیوں اس کے سامنے بیٹھتی، کیوں اس سے باتیں کرتی۔۔۔ اس سے کیا لینا دینا۔۔۔ شاہ صاحب سے جانے کیا بات ہوئی وہ تو تمہیں ہی بتائیں گے۔۔۔ میری تو ہمت ہی نہیں ہوئی پھر ان کے سامنے جانے کی۔۔۔ حالانکہ دل تو بہت چاہ رہا تھا کہ پوچھوں کیا کہہ کر گیا ہے؟ اور کیوں آیا تھا۔؟“ صابرہ کی بات سن کر اس نے ایک گہری سانس لی۔۔۔ جیسے اپنے اوسان سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہو پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گویا ہوا۔

”وہ تو میں شاہ صاحب سے پتا کر لوں گا اسی لیکن۔۔۔ وہ یہاں کیسے پہنچ گیا۔۔۔ اسے اس گھر کا پتا کس نے بتایا، میں نے تو کسی پر ڈوسی سے بھی بات نہیں کی تھی۔۔۔ اس لیے کہ کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔۔۔ یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے کہ وہ یہاں تک پہنچ گیا۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں چنا میں تو خود پریشان ہو رہی ہوں کہ آخرا سے کس نے ہمارے لڑکے کا بتا دیا۔۔۔“
”یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔۔۔ لگتا ہے کہ یہ بہت بڑا کوشش ہے اور اس طرح کے لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں مگر میں دیکھ لوں گا۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں چنا۔۔۔ زیادہ جوش میں مت آنا، میرے خطرناک لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے۔۔۔ اسے ہمیں کیا۔۔۔ میں نے تو پہلے ہی سوچ لیا ہے۔۔۔ کسی دن شہین گو نے کمر گاؤں چلی جاؤں گی۔۔۔ مگر تمہاری فکر تو ہے ناں مجھے۔۔۔“

”اسی میری فکر آپ چھوڑیں، میں اپنا خیال خور و کھسکا ہوں، کیا بگاڑ لے گا وہ میرا۔۔۔؟ کیا قتل کر دے گا؟ اب ایسا بھی نہیں ہے۔۔۔ وہ بہت لاپرواہی آدمی ہے اور جو آدمی لاپرواہی ہوتا ہے ناں۔۔۔ وہ بے سوچے، گجھے قتل و غارت گری کا پورا کرم نہیں کرتا۔۔۔ چونکہ اسے تو اپنی دولت انجوائے کرنا ہوتی ہے۔۔۔ وہ تو زندگی کے حیرے لونی چاہتا ہے۔۔۔ ایسی حرکت کیوں کرے گا کہ باقی کی عمر سلاخوں کے پیچھے گزر جائے۔۔۔ اس طرح کے لوگ بڑی ہوشیاری سے کام کرتے ہیں۔۔۔“

”جی تو میں کہہ رہی ہوں۔۔۔ کہ وہ بہت خطرناک ہے، بڑی ہوشیاری سے کچھ بھی کر سکتا ہے۔۔۔“
صابرہ سہجے، سہجے لہجے میں بڑی برہنگی کے ساتھ بولی تھی۔ گویا اس نے برہان کی بات پکڑ لی تھی۔

”اسی دیکھیں ڈار اور خوف حقیقت میں کچھ نہیں ہوتے، یہ انسان کے اپنے اندر ہوتے ہیں۔۔۔ جب کسی چیز سے بہت زیادہ ڈر لگے ناں تو اس چیز کا سامنا ضرور کرنا چاہیے۔۔۔ تاکہ خوف ختم ہو جائے۔۔۔ ورنہ یہ خوف انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔۔۔“

”میں پھر کہہ رہی ہوں برہان۔۔۔ بس تم شاہ صاحب سے کہو کہ اس کا بندوبست کریں۔۔۔ اسے بڑے آدمی ہیں۔۔۔ بڑے، بڑے لوگوں تک ان کی پہنچ ہوگی۔۔۔“
”اے یہ پہنچ پہنچ چھوڑیں اللہ سے مدد مانیں۔۔۔ انسان قتل دے سکتا ہے، ضمانت نہیں۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔۔۔ جہاں آج کل اس کا لٹکانا تھا۔

”دادا جان! کیا بات ہے آج آپ کمرے سے ہی نہیں نکل رہے۔ طبیعت ٹھیک ہے ناں آپ کی؟“
 کاناز بہت پریشانی کی کیفیت میں شاہ صاحب کی بیٹھائی پر ہاتھ رکھ کر پوچھ رہی تھی۔
 وہ پوتی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے۔ اس کے ہاتھوں کا لمس ان کی روح میں زندگی بن کر دوڑنے لگا تھا۔ انہوں نے کاناز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور تھیلی کی پشت پر بہت محبت بھرا ہوا سا لیا۔
 ”جینا..... ایندھ بڑھوں، کچی، کچی ایسے بھی ہوتا ہے۔ بندے کا خاموش رہنے کو دل چاہتا ہے۔ تنہائی اچھی لگتی ہے، سوچنا اچھا لگتا ہے۔“

”جی نہیں..... جی نہیں.....“ کاناز نے تیزی سے ان کی بات کاٹ دی۔ ”سوچنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ..... ذاکر اگلے کہتے ہیں ناں کہ آپ فضول سی بات نہیں سوچیں گے۔ سوچنے سے ڈپریشن پیدا ہوتا ہے اور ڈپریشن آپ کے لیے بہت خطرناک ہے۔ چلیں انھیں، آئیں میرے ساتھ لان میں۔ ہم وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“ اس نے شاہ عالم کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

”اچھا، اچھا بیٹا اگلا ہوں، اگلا ہوں، تم تھوڑی دیر یہاں میرے پاس تو بیٹھو اور یہ تو تھوڑا ہی تم آج کیا کرتی رہیں..... کاناز میں کوئی تیر مارا یا سارے تیر خلاص گئے..... میرا سب سے جونی ایسی سیدھی پڑھائی کر کے واپس آ گئیں؟“ شاہ صاحب نے زبردستی اپنے لہجے میں بیٹھشت پیدا کرنے کی کوشش کی اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔
 ”کاناز میں اب میرا دل ہی نہیں لگ رہا۔ آپ کو چاہئے کہ..... اور بگڑ ہو گئی ہے ایک دن چاتی ہے..... پھر دو دن چھٹی..... بس ایسی فضا کی وجہ سے کچھ کرنے کا دل ہی نہیں چاہتا۔“ کاناز منہ پٹھا کر بولی۔
 شاہ صاحب نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر کہا کہ سارا باؤڑ.....

”پھر وہی بات جینا، ہر انسان کی اپنی اپنی تھوڑی سی..... سوچ چاروں کی دویتی..... ساری زندگی کی نہیں ہے۔“
 ”دادا جان آپ کیوں بدعادی سے ہیں۔ اگر یہ فریضہ شپ شہری تو ہم دونوں میں سے کوئی بھی خوش نہیں رہ سکے گا..... اتنی بچی عادت پڑ چکی ہے نہیں ایک دوسرے کی.....“ وہ اپنے اسی لالہ بلی لہجے میں بولی جو اس کی ذات کا سب سے خاص حصہ بن کر رہ گیا تھا۔

”ارے نہیں، نہیں جینا..... خدا تعالیٰ اس میں کیوں بدعادی سے لگا، میں تو دن رات دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان چاروں، چاروں بچوں کو ہمیشہ ساتھ رکھے اور ان کی شادی کے بعد بھی ان کے گھر برابر ہونے چاہئیں۔ یعنی اللہ کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اللہ کی ذات سے ہمیشہ امید رکھنی چاہیے کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور سب کچھ کرنے کی طاقت بھی اسی کے پاس ہے۔“

”دادا جان، آپ یہ دعا کیوں نہیں کرتے کہ اگر شادی ہونا اتنی ہی ضروری ہے تو ہم دونوں کی شادی ایک ہی گھر میں ہو۔“ کاناز اب شرارت کے انداز میں شاہ عالم سے گویا ہوئی تھی اور مسکراہٹ دہا کر روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

دادا، پوتی کی اتنی دویتی تھی کہ اس نے بھی شاہ عالم کے سامنے اپنے ہونٹوں پر آئی ہوئی بات نہیں روکی تھی۔ اسے اپنے دادا سے کوئی خوف، کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی..... اور انہوں نے بھی کوئی روک ٹوک نہیں کی تھی اس لیے اسے بولتے ہوئے احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی ہے یا وہ کچھ بول گئی ہے جو اسے بولنا نہیں چاہیے تھا۔

”ایسا بھی ہو سکتا ہے، یعنی میں تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے سب کچھ ہونے کی امید رکھتا ہوں کیونکہ انسان تو

کچھ نہیں کرتا..... بس جو کچھ ہونا ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ تم میں سے جس کی شادی پہلے ہو جائے وہ اپنی کھلی کے لیے پہلے اپنے گھر میں رہنے تلاش کرے..... یہی شوہر کا کوئی کزن، بھائی جو ہو سکتا ہے اس کے ساتھ ہی رہتا ہو یا پھر قریب والے گھر میں بھانجے لے..... کہ شاید دوسرا کوئی دلچسپی ہو..... ایسا ہو سکتا ہے ناں..... شاہ صاحب، کانکار کے ساتھ گویا اپنے مستحق ذہن کو لاشعوری طور پر بھلانے کی کوشش کر رہے تھے..... کانکار نے اُن خیالات کا سلسلہ تو متقطع کر دیا تھا..... جن کی پورش نے شاہ صاحب کے اعصاب شکن کر دیے تھے۔ جب سے وارث علی گیا تھا تب سے ان کا ذہن صرف اور صرف اسی کی کھلی ہوئی باتوں کے گرد گھوم رہا تھا لیکن اب کانکار ان کا ذہن دوسرا دھڑکنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”اچھا نہیں چھوڑیں، یہ تو بہت لمبی پلاننگ ہے، ابھی تو ہم چھوٹے ہیں، بڑھ رہے ہیں.....“ کانکار نے شرمیلیں مسکراہٹ کے ساتھ دادا کی طرف دیکھا..... ان کا بازو پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی..... ”آئیں، آپ میرے ساتھ رو دیا کچھ بگائی ہوں۔“

”صرف رو دیا کو.....؟ ارے بھی رانی کو بھی کہہ دو۔“

”چھوڑیں رانی آپا کو..... وہ تو موڈی ہیں، بس آپ آ جائیں..... یہ کہہ کر اس نے جھک کر ان کے سلیپر زان کے پاؤں میں پہناتا شروع کر دیے..... انہیں اپنی جگہ کی یادداشت بھائی تھی۔ انہوں نے کمال شفقت سے اس کے بالوں پر ہوس دیا تھا۔

”اللہ میری بیٹی کو ہمیشہ ہنستا، مسکراتا رکھے..... آئیں.....“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کانکار ان کا بازو تھام کر باہر کی طرف قدم بڑھانے لگی۔



”جیسا ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ مذہب کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی..... ہر انسان اپنی، اپنی عقل سمجھ کے لحاظ سے مذہب کی تشریح کرتا پھرتا ہے۔ حالانکہ مذہب کا تو بہت سادہ سا فلسفہ ہے عباد اور جیسے دو۔ بڑی سبب ہی صواب حال ہوگی ہے۔ مذہب دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو ایک دو ظاہری احوال سمجھا کر خود کو مسلمان ثابت کرتا ہے۔ مثلاً دھتے اور عید کی نماز چڑھ لی، رمضان میں محروا بھاری کا اہتمام کر لیا..... دوسرا گروہ وہ ہے جو اپنی اپنی کامیابی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جہاں سائنس لینے کے عمل کو بھی شریعت کا پابند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شریعت بھی وہ جو انہوں نے سمجھی۔“ مسج کے بلکے نورانی اجالے میں شاہ صاحب سوچ سوچ کر بولتے ہوئے خود بھی بہت نورانی سے محسوس ہو رہے تھے۔

کچھ دیر قبل شاہ صاحب اور برہان دونوں فجر کی نماز ادا کر کے گھر لوٹے تھے۔ شاہ صاحب اپنے معمول کے مطابق اپنے بڑے سے سرسبز لان میں چھل تندی کرنے لگے تو برہان بھی ان کی مسج کی داک میں شریک ہو گیا..... دوسرا دھڑکنے دو چار بائیں کر کے شاہ صاحب جاہر علی پر آ گئے..... وہ برہان کو کچھ سمجھانا چاہتے تھے مگر اس سے پہلے برہان سے کچھ سنا چاہتے تھے۔

برہان نے بہت اختصار سے جاہر علی کی مذہبی اختیار پسنی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اب وہ اسی کو موضوع بنا کر آگے بڑھ رہے تھے۔

”قرآن کو صرف گھر میں روزی کی برکت اور محروے کی بخشش کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ قرآن اس لیے اتارا گیا ہے کہ اس کے مطلب پر تدبر، غور و فکر کیا جائے۔ قرآن تو خود کہتا ہے کہ سب سے اچھی راہ درمیان کی

راہ ہے۔ بہت کم نہ بہت زیادہ، موسمی کی نشانی یہ ہے کہ وہ طعنه ضبط کرتا ہے۔ اور مذہبی اعتنا پسند ہر وقت لڑنے، مرنے کو چاہور چتے ہیں۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، آج کل تو انسانوں کی برداشت ہی جواب دے گئی ہے لیکن جو سر کرتا ہے، برداشت کرتا ہے اسے بڑا اور ڈر ہو گیا ہے۔“ برہان کے لہجے میں لاشعوری طور پر مٹی اٹھائی۔

”کھینچے دیں۔۔۔۔۔ شیطان تو چاہتا ہی یہی ہے کہ برائی کا جواب برائی سے دیا جائے، مٹا موش دینے کو ناناو غیرت کا مسئلہ بنالیا جائے۔۔۔۔۔ چنانچہ میں نے حضرت کو کھینچ دینے کے لیے دماغ کو کھٹکا رکھنا چاہیے۔“ شاہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں برہان کو کھینچا۔۔۔۔۔ بات چنے کی تھی۔ برہان کے کھولنے کو میں برف کھلنے لگی۔

☆☆☆

”تم سب کچھ چھوڑو۔۔۔۔۔ فائل کی فکر کرو۔۔۔۔۔ ساری توجہ فائل پر آجھ کرنے پر لگاؤ۔۔۔۔۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں جاؤں اور جھان بین شروع کروں کہ شاہ عالم کون ہیں، دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے کیا کاروبار ہیں، ان کے کون، کون رشتے دار ہیں۔۔۔۔۔ وارث علی لگتا ہے کہ تمہارا ذہن ٹھیک ہے کام نہیں کر رہا۔۔۔۔۔ خود بھی الجھ رہے ہو اور خواہ تو اس میں مجھے بھی الجھا رہے ہو۔“ انیس بی، او ایس جی کے اگلے سیدھے پریشان کن خطبات سن کر چڑسا گیا تھا۔

”سری۔۔۔۔۔ مجھے ان لوگوں سے کیا لینا دینا۔۔۔۔۔ جاہل سلاطین کے پیچھے نہ ہوتا، آزار دہن تو بات دوسری تھی اب اس پر پریشر کیسے ڈالیں گے آپ۔ سارا جھگڑا اسی فائل میں کا تو ہے۔۔۔۔۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے جب تک اس پر پریشر نہیں ڈالا جائے گا اور وہ بھی ٹھیک خاک حتم کا پریشر۔۔۔۔۔ فائل ہمارے ہاتھ نہیں گھٹنے والی۔“ وارث علی اب مارے چند بات کے بھاگ اڑنے لگا تھا۔ ایک سانس میں بول چلا گیا۔

”جاہل جیسا آدمی۔۔۔۔۔ اب کیا پریشر میں نہیں آئے گا۔ سارے پریشر وہ تو زچکے ہیں۔۔۔۔۔ وہ انتہائی مجرم ہے، اپنے جرم کا اعتراف کر چکا ہے۔ اس کے سامنے چھائی کا پھندا اچھول رہا ہے۔ سرکاری وکیل اسے بچا نہیں سکے گا۔۔۔۔۔ اور جس بندے کے سامنے موت گھڑی تاجی رہی ہو وہ کس پریشر میں آئے گا۔ وہ اس پر اسی بندے کا پریشر اثر ڈال سکتا ہے جو بندہ اسے باہر لانے کی بات کرے بلکہ گارنٹی سے۔۔۔۔۔ مگر اس کے خاندان والے تو اسے ملے تک نہیں آئے۔۔۔۔۔ کون کرائے گا اس کی ضمانت اور جب ball ہی نہیں ہونے والی تو ظاہری بات ہے کہ جاہل کسی بھی وقت چھائی کے پھندے پر چڑھ جائے گا۔“

”سری جاہل سے فائل نکلوانی ہے، ایسی باتیں کر کے ڈراما نہیں۔۔۔۔۔ ہماری ساری زندگی کی بھاگ دوڑ اور محنت کا سوال ہے اگر یہ فائل ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تو سمجھیں کھوکھلی ہے ہمارے پاس۔ اگر فرمان علی کے وارث مقابلے پر آگئے ہوں تو کچھ نہیں ہم ناناوے پر ڈالے گئے۔۔۔۔۔ ساپ اور میزمری کا کھیل ہے یہ۔۔۔۔۔ وہ انیس بی کو بہت کچھ کھانا چاہ رہا تھا۔ جہاں غم و نا انصافی، جبر و استبداد کا راج ہو وہاں اندکوش اور دوسوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا، خاص طور پر جرائم پیشہ انسان کے دل میں دیگر نہ جسے صالح دل مٹا ہے اور تو شیطان خودی کے بل کر کر بار، بار خاک چاٹتا ہے اور ایسا مجرم جو تمام حدود بھٹکا چکا ہو چھوٹے، بڑے ہر جرم کا ڈاکٹر چمک چکا ہو۔۔۔۔۔ وہ تو سو فیصد عقل کا اندھا ہوتا ہے اس کی شامت اور اس کی بری موت جگمگ انہی اسے ان راستوں پر لے کر چلتی ہے جن راستوں پر چلنے کے بعد اسے اپنے ملے شدہ حقیقی انجام سے دو چار ہونا ہوتا ہے اور یہ راجیں ایسے مجرموں کے لیے

بڑی پُرکشش بنا دی جاتی ہیں۔ وہ سارے راستے چھوڑ کر انہی راستوں پر چل پڑتے ہیں جو دنیا..... زمانے کی لہجہ دینے والی آوازوں کے ساتھ ان لوگوں کے قدموں تلے گھسی ہوئی ہیں۔

”میں آج رات ایک بچے کے بعد جا رہی تھی۔ وہ طویل گاڑی پر پارک کو کھینچ کر رہا تھا کہ وہ فائل کا آٹا پتا بتا دے۔ ابھی اس کی ایک ہی شرٹناوی شدہ جینی موجود ہے۔ یہی وہ ٹرپ کا پتا ہے جو آخری پتا بھی ہے۔ اگر یہ پتا نہیں چلا تو کچھ کریمیں تو لگی ہمارے ہاتھ سے۔“ انہیں بی بی اب خود کلاہی میں جھکا ہو چکا تھا کیونکہ فائل کی جتنی اہمیت وارث علی کے لیے تھی اس سے بھی زیادہ اس کے اپنے لیے تھی۔ وہ تو ایک چمکا کھیل کر پولیس ڈیپارٹمنٹ سے کل از وقت راجا ٹرمنٹ لینے کے خواب دیکھ رہا تھا..... اسی فائل کے بل بوتے پر۔

☆☆☆

”آپ اتنی رات کو میں سے کیا باتیں کروں گی آپ خود سوچیں.....؟“ رومانا حیران، پریشان راہی کی شکل دیکھ رہی تھی آخر کار راہی نے اسے جالیا تھا۔ وہ شاید کھل جان کے پاس جانے کے لیے گھر سے باہر جا رہی تھی۔ راہی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھا اور دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے آئی اور اسے اپنے کمرے میں لے آئی..... چند لمحوں اور دھڑکے کی بات کرنے کے بعد اس نے اپنے مطلب کی بات شروع کر دی تھی۔

پہلا سوال یہی تھا کہ وہ کل رات برہان سے کیا باتیں کر رہی تھی۔ اس نے رومانا کی تنگ کسی قسم کا ٹیکہ ظاہر نہیں کیا تھا خود کو بہت مستحیال کہتا کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے سوال کو ایک عام سوال سمجھ کر اٹھ رہی تھی۔

”آپ میں وہاں اس کی جیسی تھی اور میں بھی تھا۔“ وہ دہری تھی۔ ”مجھے پتا نہیں..... سر نے اوپر سے دیکھ لیا..... میرے پاس آگے اور پچھلے گئے کہ میں کیوں رو رہی ہوں..... پتا رومانا بڑی مصیبت سے بول رہی تھی اور راہی کے غبارے سے جیسے ساری ہوا ہی نکل گئی تھی۔“

”آہ.....“ راہی کے منہ سے نکلا تھا۔ ”فکرت بھی کتنا بڑا عذاب ہے، کل رات سے اب تک میرے دماغ کی پٹریں مل نہیں، اتنی آنکھیں کھلتی ہیں نے ڈاکٹر صاحبہ کے تیر و شتر سہتے ہوئے بھی نہیں کی تھی۔“ وہ کچھ سوچتے سوچتے پھر بولی۔

”تم کیوں رو رہی تھیں.....؟“

”بس میرا دل چاہ رہا تھا..... رومانے جیسے چکر کھا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی منہ یہ دے دیا تھا کہ وہ اس ٹاپک پر بات نہیں کرنا چاہتی..... اسی لیے اٹھا جواب دے رہی ہے۔“

”روانے کا جب دل چاہتا ہے تو کوئی خاص وجہ ہوتی ہے، کوئی ایسی بات جو انسان کو اتنا بے بس کر دے جو وہ کسی سے کہہ نہ سکے تو آخری راستہ یہی رہ جاتا ہے کہ وہ رو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال دے..... کسی کو نہیں جانتیں مگر مجھے تو بتاؤ..... کیوں رو رہی تھیں؟“

رومانا اس کے سوال کے جواب میں خاموش رہی۔

”میں کیا پچھ رہی ہوں رومانہ، کیوں رو رہی تھیں تم.....؟“

رومانے خفا، خفا نظروں سے، لیکن کی طرف دیکھا اور بولی۔

”اگر آپ کو رونا نہیں آتا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسروں کو بھی نہیں آتا..... اور رونے کے لیے

کوئی بہت بڑی بات ہونا ضروری نہیں ہے۔ کبھی کبھی بہت چھوٹی سی بات پر بھی رونا آ جاتا ہے۔“ رومانے اپنی دانست میں بڑا عظیم فلسفہ بھاڑا۔

”چلو تو وہ چھوٹی بات ہی بتا دو۔۔۔۔۔“

”کیوں بتاؤں۔۔۔۔۔ اب اس میں رو بھکی، اب میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں ہے جو میں آپ کو بتاؤں۔۔۔۔۔“

”بھئی تمہارے سر نے بھی تو قسم سے بچ چھا ہو گا ناں کہ رونا کیا بات ہے، کیوں رو رہی ہو؟ تم نے انہیں کیا جواب دیا تھا۔“ زانیہ اب قدرے ہلکی ہلکی ہو کر بات کر رہی تھی۔۔۔۔۔ سر سے جیسے منوں، منوں بوجھ اتر گیا تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔“

”ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔۔۔ انہوں نے تم سے کچھ بچھا ہو اور تم نے جواب ہی نہیں دیا ہو۔۔۔۔۔ بتاؤ ناں؟

مجھے کیا جواب دیا تھا۔۔۔۔۔“

”بس یہ بتا دیا تھا ناں۔۔۔۔۔ کوئی جواب۔۔۔۔۔ اب آپ کو کیوں بتاؤں؟“ وہ پھر چڑ گئی۔

”مجھے دلچسپی ہے کہ روتے ہوئے تم نے جو کچھ جواب دیا ہو گا بڑا سچا ہو گا۔ سچی، سچی بتاؤ کیا جواب دیا

تھا۔“ زانیہ تو جیسے ہاتھ دھو کر پیچھے ہی چڑ گئی تھی۔

”کچھ نہیں کہا تھا میں نے سر سے، ہاں یہ کہا تھا کہ ہماری تو قسمت ہی خراب ہے۔ ہمیں تو رونا ہی ہے۔۔۔۔۔“

رومانے اتکا کہا اور پاؤں دھتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔ زانیہ کو تاس کا سخت جواب برا لگا اور نہ ہی پاؤں پختا۔۔۔۔۔ وہ تو جیسے تنگ جوتا اتار کر نہ سکون ہو گئی تھی۔



رات دو بجے کا عمل تھا۔ برہان خود کو سمجھا، سمجھا کر تھکی گئی، تھک کر لیٹا لیٹا، وہ انہیں سامنے رکھے یوں تک رہا تھا جیسے یہ سب فالتھیں، کتابیں، نوٹ بکس، بجلی بارود کچھ ہوا، آنکھوں میں عجیب سا خالی پن اس کی ذاتی کیفیت کا عکاس تھا۔ جیسے ہی کوئی کتاب کھول، کوئی خیال پھر بڑا آتا ہوا اس کے سر پر منڈلانے لگتا۔۔۔۔۔ کبھی قید خانے میں معتقل باپ کی طرف سوچ جاتی، کبھی وارث سنی کی آنی کی آمد کی طرف۔۔۔۔۔ کبھی شاہ صاحب کی مہربانوں کی طرف۔۔۔۔۔ کبھی اپنی زندگی کی مشکلات کی طرف اور اس کے بچ، بچ، دھندلا سا لپکا سا ایک مچھر کا ہے گا ہے جھک جاتا تھا۔ وہ مچھر جس میں رو رہی تھی۔ انتہائی رات کو لالہ میں تھا ابھی آنسو بہا رہی ہوئی۔۔۔۔۔

کئی بار رومانی کی طرف دھیان کیا تو ایک عجیب سا بھس بھسا ہوا ہو گیا۔ وہ لاشعوری طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور دیر سے ٹوچے سے چٹا ہوا کھڑکی تک آیا اور باہر جھانکنے لگا۔ یوں جیسے کسی نے اسے زبردستی پتھر کر اٹھا دیا تھا۔ تاکہ وہ رومانی کو ایک مرتبہ پھر رونا دوا دیکھ لے۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس کا وہم یقین میں ڈھلکا ہوا محسوس ہوا۔۔۔۔۔ آج بھی رومانی کی بیٹی پر بیٹھی تھی اور رو بھی رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ ایک نکتے کی سی کیفیت میں رومانی کو دیکھنے لگا۔ دل پر ایک بوجھ سا آچرا۔۔۔۔۔ کل کی بات اور تھی اور آج اس کے پاس اپنا سوال تو ہرانے کی بہت نہیں تھی۔ چائے کیوں اسے محسوس ہوا کہ رومانی کے آنسو اس کے دل پر لپک رہے ہیں۔ یہ مصعوم سی لڑکی پہلے ہی دن، بجلی ہی نظر میں اس کے لیے بہت اہم ہو چکی تھی۔ اس کے اندر کسی نفسیاتی خیال کا عمل دخل نہیں تھا۔۔۔۔۔ بس صرف ایک احساس تھا۔ یہ لڑکی بہت مصعوم ہے۔۔۔۔۔ اتنی سادہ اور مصعوم سی لڑکی کا آج کے زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لڑکیاں باہر چارے نہ گھومیں، پھرریں لیکن گھروں میں وہ سب ذرا منع ہوتے ہیں کہ وہ گھریں، بیٹھے بھی ساری دنیا سے باخبر ہو سکتی ہیں۔ زندگی کے مختلف رویوں اور راستوں کو سمجھ بھی سکتی ہیں اور پہچان بھی سکتی ہیں۔

لیکن یہ تو عجیب سی لڑکی تھی۔ اس کے اندر ایک نیا پن تھا جو اس کو دوسری تمام لڑکیوں سے منفرد کرتا تھا۔ کا کا کا

کے اندر اصرار تھا، بے ساختگی تھی اور قدرے ہوشیاری بھی..... جس کو وہ بھکاری کہتا تھا اور وہ بھی نہایت رومانا کے مقابلے میں..... اس کا بی چاہا آج پھر وہ رومانا کے پاس جائے اور اسے بھانے کے اس طرح راقوں کو اکٹھے بیٹھ کر نہیں روکا کرتے۔ کوئی بہت بڑی مشکل ہو تو اللہ کے سامنے سجدے میں گر جاتے ہیں اور پھر بے یقین سے دعا کرتے ہیں..... اس سے بھی انسان کو بہت سکون ملتا ہے، دل کو تسلی ہوتی ہے..... لیکن یہ سب اتنی رات کو چاہا کرو اس سے کیوں کہے..... اچھا نہیں لگتا..... یہ..... شاہ صاحب کا گھر ہے۔ قدم قدم پر احتیاط ضروری ہے۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ ماہر، ہارائے دوپٹے کے آئینے سے بچتے ہوئے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اس کے کمرے میں کیونکہ روشنی بالکل تھی صرف ایک ٹیبل لمپ کے سیور کی روشنی..... وہ ٹیبل لمپ جو شاہ صاحب نے کمال صبرانی سے رکھوا دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہاں ایک اسٹوڈنٹ ہے، پڑھنے، لکھنے والا انوجوان ہے، یقیناً ٹیبل لمپ اس کی ضرورت ہے۔ اتنی باریکیوں کا خیال وہ رکھتے ہیں جو بڑی باریکیوں کے ساتھ تھاہی میں اللہ کو سوچتے ہیں..... جوں، جوں اللہ کی طرف خیال مرکوز ہوتا جاتا ہے..... سوچ اسی طرح ٹھیس اور باریک جگہ مناسب ترین لفظ تو یہ ہے کہ لطیف ہوتی جاتی ہے۔ اور جب خیال خلافت کی انتہا کو چھونے لگتا ہے تو انسان شرف کی منزلوں کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ شرف انسانیت یہی ہے کہ انسان دوسرے انسان کو اپنی جگہ پر رکھ کر محسوس کرے۔

شاہ صاحب نے صرف ٹیبل لمپ ہی نہیں رکھوا دیا بلکہ ٹیبل کے بال پر ایکٹ، پرنسز، مادر، لیٹر بیڈ یہ ساری چیزیں بھی انہوں نے اس کی اسٹڈی ٹیبل پر رکھوا دی تھیں۔ اور وہ بھی اس کے اس گھر میں آنے کے اگلے ہی دن..... اس نے آگے بڑھ کر ٹیبل لمپ میں دفن کر دیا..... اب وہ اندھیرے میں کھڑا ہوا رومانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی لمحے دروازے پر بھی کی دھک ہوئی۔ وہ اپنے خیال سے چونک پڑا۔
”اے.....“ اس کی سوچ میں ایک لمحہ سا رہا کہ کون سا بھائی..... آگے بڑھ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے شبیہ کھڑی تھی۔

”اوہ تم.....! ابھی تک سوئی نہیں تھی.....“ غصہ یہ ہے۔ اس گھر میں تو ہمیں بہت آرام ہے..... پھر نیند کیوں نہیں آتی؟“ یہ وہاں کیونکہ رومانا کے تصور کی گہرائیوں میں اترا ہوا تھا اس لیے واپس آنے میں تھوڑا سا وقت تو لگنا تھا۔

”بس بھائی ویسے ہی نیند نہیں آ رہی تھی..... تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا، دروازے کے نیچے سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں نے سوچا آپ پڑھ رہے ہیں، اس لیے ڈسٹرب نہیں کیا لیکن جیسے ہی لائٹ بند ہوئی تو میں نے دروازہ کھولا۔“

”اوہ..... تو تم باہر بیٹھ کر میرے کمرے میں چلے بیٹھنے والی روشنیوں کا نظارہ کر رہی تھیں۔“ یہاں نے صرف اور صرف اس کے ذہن کو چکا چوکا کرنے کی غرض سے قدرے لٹکائی کا مظاہرہ کیا۔ جو حواس کے بعد سے لے کر اب تک پہلے سے ساختہ لگتا تھا..... ورنہ اس کے ہونٹ تو جیسے مسکراتے ہی بھول گئے تھے۔ جن دشتوں کو وہ میں اتار رہے ہیں ان کی خاطر بہت کچھ اچھا نہانے میں بھی کر جاتے ہیں۔

”ہاں بس وہ ایسے ہی کوشش کر رہا تھا کہ تھوڑی سی پڑھائی کر لوں مگر کتاب کھول ہوں تو کچھ سمجھ ہی نہیں آتا..... میرا خیال ہے کہ ابھی تھوڑا وقت لگے گا..... ابھی تک میرا ذہن اسٹڈی کی طرف نہیں جاتا۔“
”بھائی اپنا خیال کریں، آپ کا آخری سال ہے بلکہ چند مہینے ہیں، اچھے سالوں کی محنت ہے۔“

”ہاں..... یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے شینہ..... لیکن اسنے بڑے حادثے کے بعد انسان فوراً نہیں سمجھا۔ وقت گئے گا، آگے میری قسمت ہے..... کیونکہ انسان اپنے ذہن پر ایک حد تک ہی کنٹرول کر سکتا ہے اور بعض اوقات بالکل بھی نہیں۔ بڑی بے بسی کی کیفیت ہوتی ہے..... جاؤ تم جا کر سو جاؤ..... میں بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں۔ ارادہ تو کیا ہے کل پونے دو بجے چلا جاؤں۔“

”ہاں بھائی.....! دکھ تو ہمیشہ کے لیے ہے، یہ دکھ ہماری جان تو نہیں چھوڑیں گے ناں..... لیکن پھر بھی جب تک ہم زندہ ہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا.....“ بولتے، بولتے شینہ کی آواز نہ دے سکی۔

برہان نے بے اختیار اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا..... بے شمار انسان یک جہتکے میں بوڑھے ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کے خدو خال پر بڑھاپے کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا..... لیکن روح بوڑھی ہو جاتی ہے۔ دل بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ بڑھاپا آخر سے کیا..... تجربے کی انتہا اور حالات سے جنگ کر کے ٹھکے ہوئے شکست اعصاب..... بڑھاپے کی دونوں بڑی علامتیں ہیں وہ بڑی بھائی کے پاس آ کر بڑی کرگوشی سے بھل گیر ہو چکی تھیں۔ یوں جیسے برسوں کے چمڑے ہوئے دوست والہانہ ملتے ہیں.....

☆ ☆ ☆

ماحول میں بھیگروں کی آواز کا ارتعاش تھا۔ چار سو پھیلا ہوا سناٹا ان بھیگروں کی وقفے وقفے سے ابھرنے والی آوازوں سے لگاتی طور پر ٹوٹا تھا..... اور اس کے فوراً بعد یہاں سے لے کر وہاں تک رات اپنی چادر میں ہر ذی نفس کو لپیٹے چھپایاں دے رہی تھی۔

دل کے اندر کا ماحول بیرونی ماحول سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ ابنت باہر بے کراں تاریکی تھی۔ شاید اس میں کچھ عمل کوڑ شینہ تک کا بھی ہوگا..... لیکن جنھل کے برآمدے میں ایک بہت لمبا دروازہ کالپ روشتی پھیلائے کی ڈتے داری اور کر رہا تھا..... لاک اپ میں تمام قیدی نگرانی نیند کی آغوش میں گچھے چکے تھے۔ وہ فطری نیند جو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ پہرے دار بھی سوئے شخصیت جان کر ادھر ادھر چپ کر نیند کے حوزے نوٹنے میں مصروف تھے، اپنی دانست میں تو انہوں نے کسی اوت کا سپہ رانے کر خود کو چھپایا تھا لیکن ان کے حلقوں سے نکلنے والے خراٹے ان کی نشاندہی کے لیے کافی تھے۔

جاہر علی دو بار سے ٹپک لگائے گھٹنوں میں سر دے بیٹھا تھا۔ اسے اب نیند نہیں آتی تھی۔ بوٹی، بس تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگتی تھی اور خود بخود بغیر کسی آہٹ کے نیند ٹوٹ جاتی تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ لیٹا ہوا..... سونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جب کسی طور نیند نے آنکھوں کا رخ نہ کیا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے قیدی اس سے خاصے خاصے پرگمری نیند سونے ہوئے تھے اور وہ مختلف قسم کے خیالات میں جکڑا ہوا تھا۔

”بھائی کا بھندا تو سامنے بھول رہا ہے تو پھر میں کسی کے دباؤ کو کیوں قبول کروں..... آج مرا کل دوسرا دن..... پھر یہ سب اپنی من مانی کریں گے..... میری ایک آواز جو حق کے لیے شور مچاتی رہی ہے، وہ خاموش ہو جائے گی..... پھر شاید کوئی حق کی بات کرنے والا نظر نہیں آئے..... لوگ کیا سوچ کر مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں، ابلیس کیل کر رہے ہیں..... ان کا باپ بھی وہ فاکل مجھ سے نہیں نکلا سکتا۔ ایک دن یہ منہ کے کل کریں گے اور خاک ہو جائیں گے..... مگر ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ کوئی جاہر علی بھی تھا۔ جس نے ان کے سامنے سر نہیں جھکا یا۔ یہ سر تو بس اٹھ کے آگے جھکنے کے لیے بنا تھا۔ کسی انسان کے سامنے نہیں جھکے گا۔“

یہاں تک سوچتے سوچتے اس نے سراٹھایا اور گمری سانس لے کر صحت کی طرف بچھنے لگا..... ہونٹوں پر

ایک ذہر آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”کتوں کی طرح بوسو گھستے پھر رہے ہیں، اس فاکل کی اور میں یہاں قید خانے میں بیٹھا ہوا خوشیاں منا رہا ہوں، اپنے آپ کو شاپش دے رہا ہوں، یہی چوٹ دی ہے میں نے ان شیطانوں کو اپنی قبروں میں اتارنے تک یاد رکھیں گے کہ کوئی جاہل بھی تھا۔“

اسی وقت ماحول میں بھاری ہواؤں کی چاپ ابھری تھی۔ آہوں سے محسوس ہوتا تھا کہ یہ کسی عام سپاہی کی چال نہیں ہے۔ بلکہ کوئی شان والا افسر آرہا ہے اور پھر اس کی آنکھوں نے دیکھا..... ایس بی شاہ زمان خان..... یو پیغام میں پلیس ہوسٹر میں راج اور پھنسائے، ہاتھ میں چھڑی تھماتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ جاہل علی اسے دیکھ کر انھماں سارین گیا اور دوبارہ گھٹنوں میں سر دے دیا۔ ایس بی قریب آیا اس نے اپنے دونوں ہاتھ سلاخوں پر رکھ دیے۔

”جاگ رہے ہو جاہل علی سونے نہیں..... ہاں، سنے یاد آ رہے ہوں گے..... یاد ابھی اسی وقت یہ دروازہ کھل سکتا ہے۔ تم دوبارہ علی خضاد میں پر پھیلا کر آؤ گے جو..... یہ خضد نہیں ہے، ذہنی نہیں ہے، پاگل بن رہے پھری جان.....“ ایس بی بہت دم آواز میں جاہل علی سے مخاطب تھا جو ہر گھٹنوں میں سر دے بیٹھا تھا۔ ایس بی اتنا کچھ کہہ گیا..... مگر جاہل علی کے وجود میں ذرا بھی متغیر نہیں ہوئی۔

”پھری آواز آ رہی ہے ناں جاہل علی..... ہاں کیوں خضد کہہ رہے ہو..... تم نے تو مرنے کی ضمان لی ہے..... مگر اپنے بچوں کو تو خیال کرو..... خاص طور پر بی بی کا..... اب تمہارے ہاتھ میں بے فاکل نہیں دو گے تو بی بی دیتا پڑے گی..... میرا مطلب یہ ہے کہ وارث علی اسے لے جائے گا..... پہلے نکاح کیا تھا اب شاید یہ بخت بھی نہ کرے.....“ اب جاہل علی کے وجود میں ذرا جھٹک ہوئی پھر اس نے آہستہ آہستہ اٹھایا اور ایس بی کی طرف دیکھا مگر اپنی جگہ سے اٹھ کر نہ اٹھا نہیں ہوا۔

”وہ جاہل علی کی بی بی ہے ایس بی..... عزت کی خاطر جان دے ڈوے کی مکر وارث علی جیسے شیطان کو اپنے اوپر اختیار نہیں دے گی..... جاؤ جا کر سو پاؤ، حرام کی دولت سے جی بھر کر مزے اڑاؤ، میرے پاس آ کر اپنا وقت ضائع کرتے ہو اس کے علاوہ کچھ نہیں.....“

”مجھے تو یہ..... تم لگ رہا ہے جاہل علی، گناہ ہے فاکل کے مالک نے تمہیں پچاس کروڑ کی کوٹھی انعام میں دی ہے.....“ ایس بی کی بات سن کر اب جاہل علی چٹکا تھا۔

”پچاس کروڑ.....“ اس نے تو چٹک میں بھی کبھی پچاس ہزار نہیں رکھے..... یہ لاکھوں کی بھی نہیں کروڑوں کی بات کر رہا ہے..... پہلے تو وہ بکھا بکھا پھر بڑی طرز پر مسکراہٹ کے ساتھ کہہ دیا۔

”ایسا کرو ایس بی، وہ پچاس کروڑ کی کوٹھی تم لے لو۔ لینڈ مانیا، قبضہ کرو پ کا سر فو تمہارے ساتھ ہے ناں، جنہیں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوگا۔“

”تمہارے پتی، سچے اس کوٹھی میں تو رہ رہے ہیں، یقیناً اب تم پیسے کا تماشاً ضرور دکھاؤ گے کیونکہ میرے تو تمہارے پاس کلک سے آ رہا ہے..... میرا خیال ہے وہ جی سے آ رہا ہے جس کے لیے تم ہم سے گمراہ رہے ہو۔“

”تم لوگ اُسے موت کے گھاٹ اتار چکے ہو..... ہو سکتا ہے کہ اس کی بھگتی ہوئی روح تمہارے پاس آتی ہو۔“ جاہل علی وہیں سے بیٹھے، بیٹھے بولا..... فاصلے پر لیٹے ہوئے دونوں قیدی جو سر سے لے کر پاؤں تک چادر اوڑھے ہوئے تھے اپنی اپنی جگہ پر کسے ان قیدیوں کی موجودگی کی پروا ایس بی کوٹھی نہ جاہل علی کو.....

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ اسے ہم نے مروا دیا ہے۔" ایس بی اب قدرے شکرا انداز میں گویا ہوا تھا۔

"ثبوت ہے میرے پاس۔۔۔۔۔ ہر چیز کا ثبوت ہے، میرے پاس جہاں وہ فائل موجود ہے اس کے ساتھ سارے ثبوت موجود ہیں۔ میں تو بھائی کی چڑھنے جا رہا ہوں مگر تم اور تمہارے ساتھی بہت جلد مجھ سے ملنے میرے پاس آ جائیں گے۔" جاہلی کے لہجے میں بڑی مغربی اور ادا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یقین کی بجلیاں کود رہی تھیں۔۔۔۔۔ یہ سن کر ایس بی۔ چند لمحوں کے لیے تو کچھ چکر اکر رہ گیا۔ پھر اسے غور ہی کچھ خیال آ گیا۔

"مجھے تم نہیں ڈرا سکتے کیونکہ اس مردار سے میں میٹروں نہیں چڑھوں کیل دور تھا۔ بتا رہا ہوں مقتول سے میٹروں نہیں چڑھوں کیل دور تھا میں اس وقت، میرے پاس پورے پتے ہوئی ٹرک مجھے ہے کہنا بتاتی ہے۔"

"لیکن کون کونے والے کے ساتھ جو تہہ دار تعلق جاتا ہے، اس کا ایک بہت بڑا ثبوت اس فائل کے ساتھ موجود ہے۔۔۔۔۔ لیڈ مافیا کے چوہے اس وقت تک شیر ہیں جب تک تمہارا ہاتھ ان کے سر پر ہے۔ جس دن یہ بچنے، اس دن تم بھی گھو گئے۔۔۔۔۔ وقت کا انتظار کرو۔۔۔۔۔ اور اب میرے پاس مت آنا۔۔۔۔۔" جاہلی یہ کہہ کر اب اپنی جگہ سے اٹھا اور اس طرف جا کر فریض پر چٹ لیٹ گیا جس طرف بھٹا روشنی بہت کم تھی۔ اس نے ایس بی کو اس وقت گھما کر دکھایا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے ایس بی کے بھاری ہاتھوں کی چاب تکی گئی جو وہاں جا رہا تھا لیکن یوں کی آواز سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ آتے وقت چال گلی جو چھوڑا جاتے وقت وہ بات نہیں ہے۔

☆☆☆

"ثناء صاحب کہتے ہیں مجھے ابا جان سے ضرور ملنا چاہیے۔۔۔۔۔ میرا فریض ہے۔۔۔۔۔ وہ صرف باپ نہیں ہیں، قافلہ بھی تو ہیں۔۔۔۔۔" بھائی جان جاگ رہا تھا۔

رات گئے جاگنا اب تو اس کی عادت بن گئی تھی۔۔۔۔۔ دن بھر کے واقعات گزر رہا تھا وقت، آنے والے دن۔۔۔۔۔ کس طرف سوچ نہیں جاتی تھی۔ اسے صرف اور صرف شین کی فکر تھی۔

کلاس ٹیوٹر اسے بہت پڑا تھا اور اس پر ایک بھٹے تھے۔ خواہ مخواہ اس سے مرعوب رہتے تھے کہ وہ پولیس افسر کا بیٹا ہے۔ وہ کچھ کچھ تو نہیں تھا اس دل ہی دل میں ہنسے۔ حالانکہ کبھی، کبھی دل چاہتا تھا کہ کہہ دے۔ "ابا جان بس کاغذات پر ہمارے ابا جان ہیں۔۔۔۔۔ حصار تو گھر بھی پولیس ڈپارٹمنٹ ہے۔ یہ دین ڈھب کی تیسری presentation ہے ہاتھ تو اس کے بھی ستر گونڈا زیادہ بیا کرتا ہے۔ محبت، نرمی، حسن سلوک تو ڈھب کی بنیاد ہے۔ اسے یاد آیا انٹر میں اس کے اسلامیات کے پچھرا سر منور فاروقی جب احادیث پڑھا رہے تھے تو وہ کوئی حدیث پڑھتے ہوئے اس صحن میں کچھ اور احادیث بھی مضبوط حوالے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔

"تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے۔۔۔۔۔ اور میں تم میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ سب سے اچھا ہوں۔۔۔۔۔ (حدیث)" اس روز اس کا بھی چاہتا تھا کہ گھر جا کر ابا جان کو بھی یہ حدیث سنانے۔ مگر گھر میں کھتے ہی وہ لعن طعن اور من گرج سنائی دی کہ اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اس نے کچھ سنانے کا یہ دکر ام بنا دیا تھا۔ قصہ تو شیطان کا سب سے موثر ہتھیار ہے اور سب سے زیادہ اسی ہتھیار کا استعمال ہے۔ جس شخص میں جتنا زیادہ ٹکڑا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اتنی ہی قصص اس کی ناک پر دھرا رہتا ہے۔ ٹکڑا کو جنت کی خوشبو بھی نہیں پہنچے گی۔

دن جانے کب، کب کی چڑھی اور سنی ہوئی باتیں ذہن میں گردش کرنے لگیں۔

"میں کیوں جاؤں ان سے ملنے؟۔۔۔۔۔ ستارہ ہر وقت مجھ سے پوچھتی ہے، بھائی میرا کیا قصور تھا۔۔۔۔۔؟ کیا

میں نے اللہ کی بنائی ہوئی حدود و پاباں کی قسمیں؟ کیا میں نے ایسا جرم کیا تھا جس پر شرعی تاحی حد جاری کرتا ہے؟" "نہ ہاں کے دل پر بکھو کے گئے تھے۔"

"جاؤں گا ایک دن۔۔۔ مگر ابھی نہیں۔۔۔ ایک خاص وقت کا انتظار کروں گا۔"

☆☆☆

رانی گھر سے اپنی ساری فونو ز اٹھلائی تھی۔ چند شاعر ارحم کے کلوز اپ اس نے منتخب کرنے تھے۔

بچپن سے لے کر اب تک یہ فونو اپنے اندر اپنی کشش رکھتے تھے کہ وہ ہر طرف سے بے خبر ہو کر کھڑی تھی۔ بار بار دیکھ رہی تھی۔ کئی بار اٹھ کر آجینے کے سامنے بھی جا کھڑی ہوئی، کبھی ہاتھ میں بکڑی فونو دیکھی، کبھی خود کو۔۔۔

"مجھے پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت نظر آتا ہے، کوئی دیکھے تو بس دیکھا رہ جائے۔۔۔ جب پہلی بار اس کے سامنے آؤں گی تو بے نی ہنگ بچپن جا رہی کی ساڑی باندھ کر آؤں گی۔۔۔ کھانی رنگ صیت کا رنگ ہے ناں اس لیے۔۔۔ وہ مجھے ایک بار دیکھے گا اور گھائی ہو کر رہے گا۔"

رانی کے اندر یقین نقش چٹان بنا کر ابھر رہا تھا۔۔۔ ایک اور دست خود اعتمادی جو ہر ڈوبنے والے جہاز کے چٹان میں جہاز ڈوبنے سے پہلے تک بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ رانی نے اپنی خوب صورت تصویر کو خود بھی چمکایا۔

☆☆☆

یوں بھی ہوتا ہے کہ کبھی، کبھی انسان اپنے دکھ کو دنیا کا سب سے بڑا دکھ سمجھ کر ساری دنیا سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ اور۔۔۔ اس کی سوچ ہر وقت اپنی ذات کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ خود تری میں جھٹکا ہو جاتا ہے اسے اپنے علاوہ ساری دنیا ہستی، نہ جتنی کائنات نظر آتی ہے۔

بلکہ کبھی، کبھی تو ہر شخص خود پر ہتھ دھکا دیتا ہے۔ کبھی جان نے بھی برسوں سے صرف اپنی ذات کے کنوئیں میں پھر گرنے کے علاوہ کوئی کام نہ کیا تھا۔ لیکن جب رانی نے کبھی جان کو برہان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں بتایا تو چھوٹے کبھی جان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے جیسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا۔۔۔ "کوئی باپ اپنی اولاد کو بھائی ہوش و حواس موت کے گھاٹ بھی اتار سکتا ہے؟ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس کی رنگ ور پٹے میں انکار یوں کر دوڑنے لگا۔

"ضرور کوئی اور بات ہوگی۔ لیکن رانی اصرار کر رہی تھی کہ کبھی بات ہے۔ کیونکہ شاہ عالم اس کے ساتھ غلط بیانی کیوں کریں گے۔ اور کسی کے بارے میں اندازوں پر قائم رائے کا اظہار اس کے سامنے کیوں کریں گے۔"

اس کے سامنے اصل خان تھا۔۔۔ جس کا ماضی داغ و داغ تھا۔۔۔ مگر اس کے باوجود اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق جتنی قربانی دے سکتا تھا اس نے اس میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ آج بھی وہ صرف اس لیے اذیت بھری زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔۔۔ چونکہ وہ اپنی اولاد کو اپنے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ ہر مل اپنی بیٹیوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔ وہ اصل خان جو بے حس کے چھاؤں کو مجبور کر کے۔۔۔ حیر کے چرچور راستوں پر کچھ سطر تھا۔ کبھی جان تھی وہ اپنی جگہ کم صم بنی تھی۔ ایک خیال آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ وہ اس ہولناک دل ہلا دینے والی حقیقت کو غم نہیں کر پار ہی تھی۔ بالآخر اس کے لبوں کو جھٹک ہوئی۔

"ہو سکتا ہے۔۔۔ لڑکی نے ناں، باپ کی گپ اچھالی ہو۔۔۔ ہو سکتا ہے۔۔۔؟" لیکن رانی نے کبھی جان کے اس خیال کی کبھی تردید کی تھی۔ کیونکہ اسے تھا کہ شاہ صاحب سے معلوم ہوئے تھے اور وہ شاہ صاحب کی

ایک، ایک بات ہر اسی طرح یقین رکھتی تھی۔ جیسے کہ اسے اس بات پر یقین تھا کہ وہ پیدا ہوئی ہے۔
 رانی تو خوش چھوڑ کر لڑکھارہ نہ ہو گئی تھی۔ شاہ صاحب نے اسے..... روانہ کرنے کے لیے پوری صلاحیتیں
 سارا اثر و سوغ استعمال کیا تھا۔ کیونکہ وہ فوراً سے خوشتر رانی کو اس اذیت ناک احساس سے چھٹکارا دلانا چاہتے
 تھے جو ان کے خیال میں ہر مریضہ آئندہ کھینچنے کے بعد رانی کی روح میں نئے سرے سے تازہ ہو جاتا تھا۔
 رانی کے جانے کے بعد وہ اپنے تجسس کے ہاتھوں بھجور ہو کر اپنے ہاتھوں سے عظیم تیار کر کے پڑھتوں کو
 بد یہ کرنے کے بھانے صابروہ سے ملنے آئی تھی..... صابروہ نے گل جان کو اپنی مخصوص نرا اخلاقی مسکراہٹ کے
 ساتھ خوش آمدید کہا۔ اس کی نظر میں گل جان کی اہمیت بھی اتنی ہی تھی..... جتنی کہ شاہ صاحب کی اور اس کی
 وچہروا تھی جسے برہان پڑھا تھا اور رونا جو شاہ عالم کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی جسے وہ بہت پیار دیتے تھے
 اور اسے اپنے ہی خاندان کا حصہ سمجھتے تھے۔

گل جان خاصا دیر اجڑا دھڑکی ہاتھیں کرتی رہی مگر جو کھوج کے دل میں آئی تھی..... وہ دل میں ہی
 رہی..... بس اس کا حوصلہ ہی نہ ہوا کہ صابروہ کے ذاتی معاملات پر محنت نہ بھجورے..... وہ انتظار کرتی رہی کہ
 شاید صابروہ کے منہ سے خود ہی کچھ نکل جائے اور اسے اپنے دل میں پیچھے ہوئے سہولیات زبان تک لانے کا
 راستہ مل جائے..... مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ صابروہ بس رونا کی تعریف کرتی اور اس کی ماں کے بارے میں اظہار
 افسوس کرتی رہی کیونکہ کا کاخ، رونا کی ماں کے بارے میں اسے بڑی حسرتیں ملتی تھیں۔ مگر اس کے دل
 کو یہ طمینان تھا کہ روم بدیم پیدا ہو گئی ہے، مل چھیننے کا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا رہے گا اور اسے صابروہ سے کسی نہ کسی
 وقت کچھ سننے کو مل ہی جائے گا..... وہ تو بس یہ چاہتا تھا جتنی بھی کہ آٹھایا ہوا کیا تھا کہ باپ نے اپنی اولاد کی جان
 لے لی..... اس کے نزدیک یہ ایک ناقابل یقین چال تھی مگر چالی خور تھی..... لیکن اس کی تجربہ کار آنکھوں نے
 صابروہ کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے دل میں پیچھے ہوئے استغناء دکھ دیکھ لیے تھے..... اور اس بات پر اسے
 پورا یقین تھا کہ وہ چار طاقتوں میں صابروہ خود ہی اس سے غالب دل کہہ دے گی۔

دکھ سے بھر ا دل تو چمکتا چمکتا ہوتا ہے۔ سب چمکتا چمکتا..... دکھوں نے اس گھر کے کینٹھوں کی اگرچہ
 ساری شادابی چوس لی تھی..... مگر آج اس کے قدردانوں میں غلطی اور غائب نہیں تھی اسے تو کسی کے بہت بڑے
 دکھ نے شرمندہ سا کر دیا تھا..... اور وہ سوچ رہی تھی کہ اچھا اس دنیا میں تو اس سے بھی بڑے دکھ موجود ہیں۔

☆☆☆

”ڈاکٹر ذاب لوہن ہارٹ سرجری کی ہاتھیں کھل کر کرنے لگے ہیں..... اب آپ ہی کہیں..... خان صاحب
 ایک پچھ سال کے بوڑھے پر یہ جو اٹھایا جائز ہے؟“ شاہ عالم حلقہ انداز میں ہر سڑخیل خان سے کہہ رہے تھے۔
 اس وقت دونوں لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شام ڈھلنے کا خوب صورت منظر بس بکھیر بعد اختتام پڑ رہا تھا۔
 ”کیسی باتیں کرتے ہیں شاہ صاحب..... امید ہے دنیا قائم ہے..... عموماً یہ تو اسی عمر میں آتی ہے۔
 ساری مشینری ہی دھڑکنا لگا دکھنا کر رہی ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں آپ بہت باہمت ہیں، دو وال بند ہیں
 مگر فکر ہی نہیں.....“ ہر سڑخیل خان نے شاہ عالم کو گویا داد دی۔

”آہستہ ہو لیو، وہ میری طوطی زبان لے.....“ شاہ صاحب نے مسکرا کر ٹوکا۔

”آپ کی جان تو بس یوں سمجھیں اس طوطی ہی میں اٹکی ہوئی ہے۔ ہر سون ہی ایک صاحب سے بات
 ہوئی بہت اچھا رشتہ بنا رہے ہیں۔ میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔ مجھے آپ کی فکرات کا بخوبی اندازہ ہے.....

”میں کوشش میں لگا رہتا ہوں۔“

”جی اک اللہ۔۔۔ بہت اعلیٰ درجہ پر آپ ہے۔“ شاہ عالم نے ساختہ گویا ہوئے۔

”دو بھائی بیوہ ماں کے ساتھ رہتے ہیں۔ چھوٹا اچھی ذہن نشین ہے۔ بڑے کے لیے کھد رہے تھے۔ حال ہی میں اس نے اپنا چھوٹا سا بیزنس اسٹارٹ کیا ہے۔ عمر تقریباً اٹھاسی سال لگاتار ہے۔ MS اور MBA کیے ہوئے ہے۔ سہلے میڈ ہے۔“ سر سخرنجیل خان لڑکے کی خوشیاں گنوا رہے تھے۔ اس دوران برہان گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ اس کی نظر ان دونوں پر پڑی تو سلام کیے بغیر آگے بڑھنا معیوب لگا..... سوالن کی طرف چلا آیا۔ ”السلام علیکم۔“ اس نے قائل اور کتا میں ٹھیل پر دکھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ سر سخرنجیل خان بہت دلچسپی سے برہان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”آپ کی تعریف.....؟ یہی بار و بار کہتا ہوں۔“

”تعریف بھی کرتے ہیں اور تحائف بھی کراتے ہیں، ہوں سمجھیں ہمارا ہی یہ ہے۔“

"نچھویراں....." شاہ صاحب نے ساتھ رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ لوگ ہاتھ کیجئے۔ میں ذرا فریق ہو جاؤں۔ مغرب کی نماز کا وقت بھی ہونے والا ہے۔“

”اوہ ہاں..... بالکل..... مجھے ہمیں تو خیال ہی نہیں تھا کہ آپ کے نکلے آپ لوٹے ہیں۔ تھک گئے ہوں گے۔ چائیں بیٹا آپ اپنا کام کیجیے۔ مجھے میں تو روزگار بنا کر دینا بندہ ہوں..... سب کو اپنی طرح فارغ رکھ لیتا ہوں۔“ انہی بات پر شاہ صاحب غور ہی سمجھانے لگے۔

”بہت سارے کام کرنے کے بعد ہی چار ٹائرڈ ہوئے ہیں۔ آپ جتنا کام تو شاید ہم کر بھی نہیں سکتے۔“ برہان نے اپنے مخصوص نرم و مٹو لب لہجے میں مسکرا کر کہا پھر ہاتھ پیشانی تک لے جا کر گویا سلامِ رخصت عرض کیا اور ٹیبل سے اُٹھ کر بائیں دروازے کا اٹھا کر اندر کی طرف بڑھا گیا۔

...مکتفی حیرت کی بات ہے۔ آپ کا اچا بچہ ہے۔ کاناڑکا بھائی بھی نہیں ہے۔ پھر آپ نے اس پر توجہ خصوصی نہیں فرمائی؟“ سر سزیمیل خان نے جاتے ہوئے بد زبان ہلکے بخیر و نظر دوڑاتے ہوئے شاہ صاحب سے کہا۔

”اپنی طرف سے تو کوشش کرتے ہیں..... جہاں تک ضمیر کی آواز سنائی دیتی ہے، کان دھرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔“ شاہ صاحب یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

”آپ شاید میری بات کا مطلب نہیں سمجھے۔۔۔۔۔ آپ کا کار کے لیے فکر مند رہے ہیں۔۔۔۔۔ مگر میں انکا ہمارے موجود ہے۔ حقیقتاً آپ کا قریبی ارشہ دار ہے۔ وہی تو آپ اسے اپنا ہی کہتے ہیں۔“

”اوہ.....“ شاہ صاحب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا..... پھر نظریں جھکا کر جواب کے لیے الفاظ موزوں کرنے لگے۔

”میں تو حیران ہوں آپ نے کبھی اس بچے کا ذکر بھی نہیں کیا..... ایک زمانہ ہو گیا۔ مجھے اس گھر میں آتے ہوئے“..... یہ سزاوہ اہل مائتد و فخر آ رہے تھے۔

”آہ.....“ شہزادہ صاحب نے ایک آہروں کی۔

”اس بچے کو ہمارا بچہ بنے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا.....“ شاہ صاحب کے لہجے میں ذہن نشین تھی۔
ہر سڑک پر جیل خانہ کی طرف دیکھتے تھے۔

”نمبر بان ایک کمر خرم، با حوصلہ، با کردار نوجوان ہے، عام فوجیوں کی طرح من موئی، اہل اہلی نہیں..... مگر اس وقت سخت آزمائش سے گزر رہا ہے۔ قدرت اس کے سبب و ضبط کا امتحان لے رہی ہے۔“ شاہ صاحب نے توقف کیا۔
”ہم آپ کو سب کچھ بتاتے دیتے ہیں۔ ہم اور آپ کوئی دو تھوڑا سی ہیں۔“ جیل خانہ کی ساتتیس چوکس ہو گئیں، شاہ صاحب کے انداز غیر معمولی تھے۔

☆☆☆

راہی نے ڈاکٹر مہر جان کے دنیا سے بے خبر ہونے کے بعد پہلی فرصت میں ایک بہت قیمتی لیپ ٹاپ خرید لیا تھا..... پاکستان سے جانے سے پہلے وہ چٹنی دیر جاگتی تھی اپنے لیپ ٹاپ میں مصروف دکھائی دیتی تھی اور اس نے جانے سے پہلے گل جان کو بتا دیا تھا کہ اس نے اپنے بہت سارے دوست بنا لیے ہیں، اب وہ USA میں تنہا نہیں ہوگی..... وہ اس کی فکر نہ کریں..... اس کے فون مسلسل آ رہے تھے۔ وہ وہاں پہنچی کر بہت خوش تھی۔ کھلی فضا میں کھل کر سانس لے رہی تھی۔ اب وہ چٹنی بھی تھی اور اس کی فزنی تحفیں بھی ہوتی تھیں من کر گل جان کے دل کو ایک گونہ سکون ملتا تھا..... مگر وہ تو جیسے مگن، مگن کر دھن کاٹ رہی تھی۔ دیہات کی پروردہ گل جان جو اکثر سے آگے نہیں چڑھ سکتی تھی..... اور جس ماحول میں اس نے آنکھ کھولی تھی اور بہت وقت گزرا تھا اس کے حساب سے راہی کا آتی دور چلے جاتا ایک بہت بڑا واقعہ تھا..... راہی رات کو اپنے بڑے فیصلی فون کرتی..... طالع کے تمام مرحلوں سے اسے باخبر رکھ رہی تھی۔ گل جان کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کو فون کرنا بھی نہیں بھولتی تھی۔ اس لیے کہ وہ ساری دنیا میں صرف شاہ صاحب کی اہلیانِ ہند تھی جنہوں نے اسے جینے کا حوصلہ بھی دیا تھا اور زندگی کا سب سے حسین رخ بھی دکھایا تھا اور وہ حسین رخ ہے ابھی امیدوں کے ساتھ سج، دوپہر، شام کرنا..... باپ بھی اور ناکامی کے احساس سے اپنے اور اس بچہ کو دکھانا..... ہر برسرِ طے پر اس کی فون بھی چلتی تھی جو وہ کتنا دکھائی دیتی تھی اور پھر وہ فون نہ کتنا سب کو دکھائی تھی۔

سب کچھ بہت اچھا ہو رہا تھا لیکن

صاحبہ، برہان اور شبنم اب تک مجھے دم سادھے زندگی گز رہی ہے تھے..... جاہلی کو چھانسی کی سزا سنائی جا چکی تھی..... وارث علی فرار ہو کر گھس چلا کر گھس چکا تھا..... شاہ صاحب کے گھر وہ نکی مرتبہ آیا لیکن شاہ صاحب نے گھر میں آنے کی اجازت نہ دی تو وہ فون پر دھمکیوں پر اتر آیا تھا۔ وہ اپنا کھیل کھیلنے میں اتنا مصروف ہو گیا کہ باقی ہر طرف سے اس کی توجہ ہٹ گئی اور اسی دوران اس کے اپنے بندے نے اس کی جبری کردی اور وارث علی کو راتوں رات ملک چھوڑنا پڑا۔

لیکن شاہ عالم اور برہان کو اس بات کی ابھی خبر نہیں تھی کہ وارث علی ملک چھوڑ گیا ہے مگر چاس بات پر حیرت ضرور تھی کہ آخر اس کی دھمکی آج فون کاٹ کر کا سلسلہ ایک دم کیوں رک گیا تھا۔

☆☆☆

جاہلی کو چھانسی کی سزا اگرچہ سنائی جا چکی تھی مگر ابھی وہ چھانسی کی سزا سے پہلے کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ سزا پر عمل درآمد ہونے میں بھی ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ کچھ نئی سیاسی حالات کی وجہ سے بھی عدالتی کارروائی منظر ہوئی رہی تھی۔

زندگی اب ڈھلان پر بہتے پانی کی طرح رواں ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی کہ شاہ صاحب اپنے

دیرینہ عارضہ قلب کی وجہ سے اسپتال میں ایڈمٹ ہو گئے اور کاناز تو گویا اپنا آپ بھول بیٹھی..... اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ آٹھ پہر ایک ٹانگ سے دادا کے سر ہائے کھڑی رہے۔

اس وقت بھی وہ گھر سے بنا کر لایا ہوا سوپ بنیں چلا کر فارغ ہوئی تھی۔ ہر ستر جمیل خان بھی زیادہ سے زیادہ وقت شاہ صاحب کے ساتھ گزار رہے تھے۔ وہ بھی وی آئی پی روم میں موجود تھے۔

شاہ صاحب کافی دیر سے گہری سوچی میں تھے۔ اور ان کی خاموشی کے باعث کاناز اور ہر ستر جمیل خان بھی عالم سکوت میں تھے۔ شاہ صاحب کی خاموشی معمول کی خاموشی نہیں تھی۔ یہ خاموشی بہت خاص تھی مگر آنکھ منظر تھا کہ وہ داخلی طور پر کمرے میں موجود نہیں ہیں۔ بالآخر ان کی خاموشی ٹوٹی۔

”خان صاحب آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔۔۔ برہان بہت اچھا بچہ ہے۔۔۔۔۔ ٹیک ماں کا بیٹا ہے۔۔۔۔۔ دیکھی ہے۔ مظلوم ہے۔ لیکن بہت ذہین دار ہے۔ میری وارفت بھی سنہال سکتا ہے اور کاناز کو بھی۔ اللہ کا احسان ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہے۔“ کاناز آنکھیں میاڑے شاہ صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اس کی حالت کے پیش نظر ہر ستر جمیل خان نے اس کے سر پر جوی شفاقت سے ہاتھ رکھا اور بولے۔

”بیٹا۔۔۔۔۔ اپنے دادا جان کی بات بہت توجہ سے سنو۔۔۔۔۔“

”بیٹا تمہارا دادا بوڑھا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ اب تمہاری ذمہ داری ہے۔۔۔۔۔ لاکھ پارٹر کو سنہالنی چاہیے۔۔۔۔۔ اس دل پر بالکل بھروسہ نہیں رہا مجھے۔“ شاہ صاحب جگمگاتے ہوئے اس کی بات سن کر اڑن کرنے لگے۔

کاناز تو گویا سانس روک کر ان کی بات سن رہی تھی۔

”خان صاحب آپ اسے سمجھا نہیں بھی اور سنہالیں بھی۔۔۔۔۔ میں نے اپنی لائی کے لیے ہیرا چننا ہے۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ اچھی طرح میری امانت کو کوئی نہیں سنہال سکتا۔ بخیل مذموم ہے۔ لاپٹی محروم ہے۔ موت معلوم ہے۔“ شاہ صاحب کسی خیال کے تحت ذہن پر لب مسکرائے۔

”میں نے کسی ریکس والہ کی گفت نہیں کی۔۔۔۔۔ مالک کا دیا ہے حساب ہے۔ مجھے ایک پا کر دار، ہا حیمیر، یا ادب داماد چاہیے۔۔۔۔۔ اور میری بھی چاہتی ہے اس کا دادا ہمیشہ سے اس کے لیے بہترین کا انتخاب کرتا ہے۔“

کاناز دم معرضہ تھی۔ اپنی نرس بھی، خواب دیکھنے والی مرز نجیر کر چکی تھی مگر ابھی خواب کی دنیا میں قدم نہیں چنے تھے۔

ستر و سال کی کاناز۔۔۔۔۔ لمبے میں ستر برس کی ہو گئی۔۔۔۔۔ دادا اسپتال میں داخل تھا۔۔۔۔۔ موت کی ہاتھیں کر رہا تھا۔۔۔۔۔ ہدائی کے احساس کی شدت اتنی بھی کدول نہیں لگا۔

اس نے آگے بڑھ کر دادا جان کے سینے پر سر رکھ دیا۔ سینے میں آنسو گھٹ رہے تھے۔ مگر مارے خوف کے آنسو بہانے سے گرج کر رہی تھی کہ اس کے پیارے دادا جان کو اس کے آنسو پر پٹان نہ کر دیں۔

”دادا جان ایسی باتیں نہ کریں۔۔۔۔۔ وہ بہ مشکل حلق میں چڑتے پھندوں کے درمیان بولی تھی۔“

”بیٹا۔۔۔۔۔ اب ایسی ہی باتیں کرنے کا وقت ہے۔ ہو سکتا ہے میں ابھی تیس سال حریہ زندہ رہوں۔ ہو سکتا ہے میں لمبی بھی نہیں۔ یہی زندگی ہے بیٹا۔“ وہ اسے تسلی دینے کے سے اعزاز میں بولے۔

”میں نے کبھی مال بیع کرنے کے لیے اپنے آپ کو بلکان نہیں کیا۔ میں تو ایک سیدہ حاسادہ و بدور کریت تھا۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ تو میرے بیٹوں نے بنایا تھا۔ میں تو ان کی امانت کی دیکھ بھال کرتا رہا۔۔۔۔۔ اور کرد رہا ہوں۔“ وہ آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔

”الحمد للہ اب ایک صحیح امانت وار مل گیا۔“ آخری جھوٹا کردار صاحب نے آنکھیں بند کر لیں۔
مگر میں یہ بات ہوتی تو کا کا زانے کیا کچھ کہ جاتی..... مگر اسپتال کے کپڑوں میں لمبے شاہ صاحب اسے
بہت مختصر کر رہے تھے اسپتال کے نام سے ہی اندیشوں کے لافانی سلسلے شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ تو اس وقت حواس
بانتہ تھی..... لوہاں خطا تھے..... اسپتال ڈاکٹر سر جری موت کی باتیں..... اور فیصلے..... وہ بالکل کم عمر تھی۔

☆☆☆

”ای یہ میرے لیے اتنا آسان نہیں ہے..... جتنی آسانی سے آپ نے کہہ دیا.....“ برہان کا کھٹکائی دیر
بعد نوتا تھا۔ رات کے ڈھائی بجے کا مل تھا۔ صابرہ اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ وہ جاگ رہا تھا اور کب سے سوتا
میں پڑا ہوا ایک اسائنمنٹ مکمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

صابرہ نے آکر پہلے دیر کو اُٹھ کر عام سی باتیں کیں پھر بڑی ہمت کر کے شاہ صاحب کی خواہش اس تک
پہنچا دی..... شاہ صاحب نے خاص طور پر صابرہ کو اسپتال بلوایا تھا۔ وہ خود بھی جانا چاہ رہی تھی لیکن یہ کچھ نہیں
آ رہی تھی کہ وہ وہاں کس کے ساتھ جانے کیونکہ برہان یونہی رہی گیا ہوا تھا۔ کا کا زانے مستحق دادا کے پاس ہی
تھی۔ شاہ صاحب نے گاڑی بھیج کر صابرہ کو اپنے پاس بلوایا تھا۔ وہ کبھی کبھی اسپتال میں داخل ہونے کی وجہ
سے شاہ صاحب پریشان ہیں۔ ظاہر ہے پولی کے پارے میں سوچتے رہتے ہوں گے۔

لیکن ان کے پاس کافی کراس کے سارے اندازے غلط ہو گئے۔ شاہ صاحب نے خیر خیریت معلوم کرنے کے
بعد جو کچھ اس سے کہا اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ اسے نہ بے یقینی کی غیباں کی بھونٹے..... کتنی دیر تک اسے
اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا..... لیکن شاہ صاحب نے جس انداز میں اس سے بات کی وہ ان کے سامنے اپنی طرف
سے کوئی بات نہ کر سکی۔ مگر اہم اور احساسی کشتی کی وجہ سے اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا تھا۔

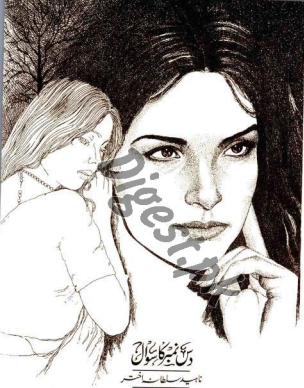
”آپ..... آپ اس قابل ہیں کہ ہم آپ کی خاطر اپنی جان بھی دیں تو کم ہے..... آپ کا یہ احسان کیا کم
ہے کہ میری بیٹی کو آپ کے گھر میں عزت سے سنبھالنے کی جگہ مل گئی ہے..... میرا اور برہان کا تو کچھ
نہیں تھا..... ہم ماں، بیٹا تو کھیں بھی مگر کب کھاتے تھے لیکن اصل مسئلہ تو شہینہ کا تھا..... آپ نے میرے پیچھے میں
ایسا سکون اتارا ہے کہ آپ بات بھی کریں تو میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔“ لیکن برہان یہ ساری تفصیلات
سن کر بری طرح الجھ گیا تھا۔ اس نے تو پہلے مرحلے میں ہی صاف انکار کر دیا تھا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ای.....! آپ شاہ صاحب کو اطمینان دلاد دیجیے کہ ہم کا کا زانے کا ہر طرح سے خیال
رکھیں گے اور شاہ صاحب کے اٹلیٹس کا ہی کوئی رشتہ تلاش کر کے اس کی شادی کر دیں گے۔“

”میں یہ بات نہیں کہہ سکتی برہان..... میں انہیں ایسے خواب نہیں دکھا سکتی جن کا پورا کرنا میرے اپنے
اختیار کی بات نہیں ہے۔“

”لیکن ای آپ اکیلی نہیں ہیں، میں آپ کے ساتھ ہوں..... آپ خود ہی سوچیں میں..... میں اسے
بڑے احسان کا جو جو نہیں اٹھا سکتا.....“ برہان اسی طرح الجھی، الجھی کیفیت میں کہہ رہا تھا۔

”اللہ نے ہم پر دم کر دیا ہے برہان، اس لیے وہ کہتا ہے..... بھی میری رحمت سے ماہوس نہیں ہو۔“
صابرہ نے یہ کہہ کر برہان کو اپنے سینے سے لگالیا..... گویا صابرہ نے تجربے کا کھل اس کے ہونٹوں پر ڈال کر
دلائل کا راستہ بند کر دیا ہو..... دونوں ماں، بیٹے کے درمیان خاموشی چلنے شروع کر کے ساتھ رہنا تھا۔



دنیا کی نئی کہانیاں

نہایت سلطان اختر

میری دایکسی پردہاں ایک سریشہ منیل کے چاکھنی شلوار
 نمیل میں لمبوں اکڑوں چیمبی اپنے دونوں بازو گھٹنوں
 کے گرد باندھے خاکس نظرہوں سے چہارہ اور دیکھے رہی
 تھی۔ اس کا سر نیچا تھا شائے اور مٹی سے بے نیاز اپنی

دارو میں داخل ہوتے ہی میری نظر دروازے
 کے عین مقابل اس بیڈ پر چڑی جھنگ دس ساڑھے دس
 بچے کے لگ بھگ کا فریشہ جماداری بھابی کو
 سوپ کر میرے گھر جاتے وقت تک خالی تھا مگر سپر گھر

تک کوئی آ جا رہا تھا۔ بھائی کو دوش روم جانے کی حاجت ہوئی، میں نے سہارا دینا چاہا مگر انہوں نے حسب عادت مردانگی کا مظاہرہ کیا۔ میں نے وارڈ بوائے سے آہستہ سے درخواست کی کہ بھائی کو دوش روم سے لے جائیں تو وہ انہیں سہارا دے دے۔

کوئی دس بجے لگ بھگ ڈیوٹی نرس نے بھائی کے ہیڈ کے ارد گرد سنے پردوں سے اندر جھانکا اور انہیں سوتا دیکھ کر مجھ سے آہستگی سے بولی۔
"کیا آج بھی رات بھر جاگیں گی؟"

"نیت تو ہے۔" میں نے دلی دلی آواز میں کہا۔
"سوئی کیوں نہیں..... اب تو آپ کے مریض کی حالت اچھا نہیں ہے۔" وہ مسکرا دی۔

"اسٹانچن چھوٹا ہو یا بڑا..... ہمیشہ میری نیند اڑا دیتا ہے اور یہ بہت ہی کم سن اسٹانچن ہے میرے لیے۔"
"مریضوں کو تو ہم ٹریکولائزرز کے کمرے لاتے ہیں مگر اکثر بیمار وارڈوں ٹریکولائزرز کے بغیر ہی مریضوں سے زیادہ گہری نیند سوتے ہیں۔"

"خدا کی دین ہے۔"
نرس مسکرا دی اور پلٹ گئی۔

سازھے گیارہ بجے کے لگ بھگ وارڈ کے سٹائے میں کسی مریض کے کمرے کی دھجکی دھجکی دروازہ آہستہ آہستہ شروع ہوئی، کچھ آوازیں ہی سنائی دیں۔ شاید کمرے والے مریض کو نرس یا ڈیوٹی ڈاکٹر نے آ کر دیکھا ہو پھر یہ آواز ختم ہو گئی۔ مگر کمرے کی آواز مسلسل آتی ہی ایک وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دروازے پر ایک جھلک آتی چلی گئی پھر کمرے کے ساتھ مسلسل ایک لفظ کی تکرار بھی سنائی دینے لگی۔
"گولی..... گولی..... گولی....." آواز سنوائی تھی۔

میں بہت دیر سٹی رہی پھر اٹھنے پر مجبور ہو گئی۔ آواز کے تعاقب میں اسی ہیڈنگ جا پہنچی جہاں شام کو میں نے وارڈ میں آنے والی اس نوجوان مریض کو اکڑوں پیٹنے انتہائی سراسیمہ نگاہوں سے چہارہ اور

کے بعد دوسرے کی بڑھ چڑھ کر خدمات..... پہلی رات ایک بیمار وارڈ بھائی کے سر ہانے اور تین وارڈ کے باہر موجود ہے۔

دوسرا دن تھا۔ طبیعت کافی سنبھل چکی تھی۔ میں گھر ہو کر اسپتال واپس پہنچی تو وارڈ میں داخل ہوتے ہی میری نظر اس دو شیرازہ پر پڑی جو بیڈ پر اکڑوں اور چوکی پر بیٹھی غزال آنکھوں سے چہارہ اور تک رہی تھی۔ اسے اپنی نظر سے دیکھ کر میں بھائی کے سر ہانے جا کر بیٹھی تو مجھے برسوں پہلے والدہ مرحومہ کی علامات کے دوران اسپتال میں لائی جانے والی وہ نوجوان لڑکی یاد آ گئی جسے سینے میں شدید درد کی شکایت کے ساتھ اس کے گھر والے انتہائی پریشانی میں اسپتال لے کر آئے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی اور گھر والوں نے اس کا رشتہ نہیں اور کر دیا تھا۔ لڑکی نے خود پر حملہ قلب طاری کرنے کی کوشش کی تھی مگر ڈاکٹر نے اس کی اس کوشش کو باختم کر دیا اور خواب آور انسپکشن لگا کر اسے اسپتال سے رخصت کیا۔ میرے ذہن نے اس امر کا قلب کے وارڈ میں پہنچی اس چوکی دو شیرازہ کے واسطے برسوں پہانے اس واقعے سے علامت کی کوشش کی۔

شام گہری ہو گئی۔ بقیہ جلی اچھی، ٹائٹ کا اسٹاف ڈیوٹی پر آ چکا تھا۔ مریضوں کو کھانا دے دیا گیا۔ سینئر ڈاکٹر نے وارڈ کا راول لیا۔ مریضوں کو دیکھا۔ جو شیرازہ ڈیوٹی ڈاکٹر کو مریضوں کی بابت ضروری ہدایات دیں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد مریضوں کے ہیڈز کے ارد گرد پردے تھک گئے اور بیمار وارڈوں نے ہیڈز کے ساتھ بڑی چھوٹی، چوٹی، چوٹی پر اپنے بستر بھانا شروع کر دیے۔ وارڈ ختم حیرت کی میں ڈوب گیا اور سناٹا چھا گیا۔ گزشتہ دوراتوں کی طرح میں نے وارڈ کے ایک گوشے میں مصفا کی نماز ادا کی اور بھائی کے ہیڈ کے نزدیک چوٹی پیچھے پر آ بیٹھی۔ گزشتہ دوراتوں کی طرح نیند کے دور، دور

کر مجھوڑا۔ نرس نے کچھ کہا۔ وہ اور اس کے ساتھ سوئے باقی دونوں نوجوان بھی ایک تخت اٹھ بیٹھے۔ نرس وارڈ کے انتہائی مغربی کونے میں واقع اس کمرے کی طرف لپکی جہاں سے میں نے گزشتہ دو دنوں میں جو نیئر ڈاکٹر ڈکڑا جاتے اور کھانے کے اوقات میں اسپتال کے اہلکاروں کو کھانا اُتار دے جاتے دیکھا تھا۔ نرس کمرے میں لگی اور ذرا سی دیر میں دونوں نوجوان ڈاکٹر خواہیدہ آنکھوں کے ساتھ کمرے سے نکل آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں طبیجر اسکوپ بھی تھا۔ سب کے سب آگے پیچھے بیڈ نمبر بارہ کی طرف لپکے۔ میں تجھ کے لیے وضو کیے دم بخود مریض کے سر پر ہاتھ مارنے لگی۔ مانیٹر کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں زحمتی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بیڈ کے مین اوپر چھت لگی سرکاری لائٹ روشن ہو چکی تھی۔

تختی ڈاکٹر کے اس پار بیڈ نمبر بارہ کے گرد اس وقت وارڈ کا قیام مکمل موجود تھا۔ دونوں ڈاکٹر اس پر بیٹھ گئے ہوئے تھے۔ اچھے اچھا کمرے سے جیسے اس وقت اس بیڈ پر موجود مریض ان کے لیے کائنات کی اہم ترین چیز تھی۔ کچھ دیر بعد دونوں سیدھے کمرے ہو گئے اور انہوں نے سینئر نرس سے کچھ کہا۔ سینئر نرس اُٹھی اور اس کے ساتھ، ساتھ اس کی جو نیئر بھی..... ایک الماری کھول کر انہوں نے اس میں سے دو سفید چادریں نکالیں اور تیزی سے بیڈ نمبر بارہ کی طرف بڑھیں۔ تکلیف کی شدت سے انہوں نے ہوا جسم سیدھا کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ رات بھر ایسے میں گزارنے والی مریض اب لمبے سکون ہو چکی تھی۔ مگر وہ جسم کو ایک سفید چادر میں لپیٹ دیا گیا۔ مریض کی چادر وارصدہ کی کیفیت میں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

”کوئی اور تمہارے ساتھ ہے؟“ میں نے سینئر نرس کو تیار دار دھرت سے پوچھتے سنا۔

دھرت جس کی آنکھوں میں اب وہی وحشت اتاری ہوئی تھی جو میں نے مریض کی آنکھوں میں

نرس کی بات مسمول تھی۔ دل کو لگی۔

”آپ دیکھ تو لیں.....“

نرس بادل ناخواسہ شیشے کے کمرے سے نکلی۔ بیڈ نمبر بارہ تک لگی۔ مریض سے کہا۔ ”بی بی ایٹ جاؤ۔ سوئے کی کوشش کرو۔“ مریض کچھ اس طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر جیسے اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی ہو۔ گتھی رہی۔ ”گوئی..... گوئی.....“

”سو جاؤ.....“ نرس نے پھر کہا۔ ”دوسرے مریض تمہاری آواز سے ڈر رہے ہیں۔“ مریض کی آنکھوں میں ان کی وحشت تھی۔

نرس دوبارہ اسی شیشے کے کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے سوچا سینئر نرس کو جھکواؤں مگر یہ خیال مانع رہا کہ کہیں وہ خند میں غلج پڑنے پر تھکا نہ ہو۔ ایک نظر مریض کو دیکھتی میں اپنی جگہ پر واپس جانے کو چلی۔

”گوئی..... گوئی.....“ دروں ڈوئی صدا نے میرا تھاقب کیا۔ میں اپنی جگہ پر واپس آئی تھی۔ مریض کے راتے اور گاہے گاہے لگتی

گوئی..... کی صدا کافی دیر اسی طرح جاری رہی..... پھر یہ صدا بتدریج دھیمی پڑنے لگی۔ ”گوئی..... گوئی.....“ کی گردانے لگی۔ ”گوئی..... گوئی.....“ کی گردانے لگی۔ میں نے اسے مریض کو آرام آجائے پر مائل کیا..... اور کرسی کی پشت سے سرٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ خند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گھڑی میں وقت دیکھا۔ پونے چار کا مکمل تھا۔ فجر کی اذان ہونے میں کوئی سو گھنٹا باقی تھا۔ اسپتال کی راتیں کتنی طویل ہوتی ہیں اور دل جھکھانے والی بھی..... میں تجھ کے نواخل ادا کرنے کی فرض سے وضو کرنے والی روم میں چلی گئی۔ وضو کر کے نکلی تو میں نے ڈیوٹی پر موجود سینئر نرس کو تیزی سے اس طرف جاتے دیکھا۔ جہاں تین وارڈ بوائز کو میں تین راتوں سے ہر رات پہلو پہلو سے دیکھتی تھی۔ نرس نے ایک وارڈ بوائز پر کئی چادر کا کونا جھک

دیکھی تھی اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”جدا“..... تیار دار عورت وحشت اور صدمے کی کیفیت میں باہر گئی۔

نرس، زندہ کی ایک حد پار کر جانے والی مردہ عورت کو ڈھانکا ہوا بٹھنے لگی۔ مجھے ہاندا دل ڈھونڈنا ہوا لگ رہا تھا۔

تیار دار عورت ایک نو جوان مرد کے ساتھ لوٹ آئی۔ مرد نے ایک بچہ گود میں اٹھا رکھا تھا جس کا سر

اس کے شانے پر تھا۔ بچہ غنیمت تھا۔ مرد نے بیڈ کے نزدیک پہنچ کر پھٹی، پھٹی آنکھوں سے بیڈ پر چڑی

مردہ عورت کو دیکھا..... اور اپنی ایک آنکھ ہاتھ کے انگوٹھے سے دوسری ایک انگلی سے دہالی۔ پھر چشم

زدن میں اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا اور بولا۔
”ایمبولینس مل جائے گی۔“ اس کی آواز مجھے

دنیا کے دوسرے کنارے سے آتی تھی۔
ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک دارو

پوائے سے کچھ کیا جو میں سن نہ سکی۔ غالباً اس نے دارو پوائے کو اس شخص کے مہرا چا جانے اور ایمبولینس

کا بندوبست کرنے کی ہدایت کی تھی۔ مذکورہ شخص نے بچہ اپنی گود سے تیار دار عورت کے سپرد کر دیا۔

”یہ آپ کی کون تھی؟“ دونوں میرے نزدیک سے گزرے تو میں نے اس شخص سے پوچھا۔

”بیوی اُس نے بیڈ پر چڑے مردہ جسم کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ پھر اس

نے میرے پوچھے پتا خود ہی تیار دار عورت کے شانے سے لگے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

بتایا۔ ”وہ میرا بیٹا ہے۔“
”کتنے بچے ہیں تمہارے؟“

”ایک.....!“ اس شخص کی آنکھوں میں ہے تھا شائستگی امتز آئی۔ مجھ کو لیے لیے ڈگ بھرتا دارو

پوائے کے مہرا دارو سے باہر نکل گیا۔
دارو میں سناٹا تھا۔ ایک کونکا سر لیٹھوں کے سوا

سب سوراہے تھے اور اسی طرح سر لیٹھوں کے تیار دار

بھی..... اور جو جاگ رہے تھے وہ دم بخود یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ مرنے والی کو ڈھانکا ہاتھ کر

اسے سرتا پتا چادر سے ڈھانپ دینے کے بعد دونوں نرسیں اور ڈیوٹی ڈاکٹر دھشتے کے کمرے میں

جائیں۔ سینئر نرس کے چہرے پر اپنے فرض سے غفلت اور خیالات کا احساس تھا۔ جو سینئر نرس اسے کن

ابھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ ڈیوٹی ڈاکٹر میں سے ایک جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہوئی تھمرتا ہوا تھا جبکہ دوسرا

اپنی ہائیں کھینچی کر کے مجھے پر لپک کر اپنی پھٹی کے بالے میں غلوڑی دبا کر سر جھکانے یوں بیٹھ گیا تھا

جیسے گہرے دکھ میں ہو..... مرنے والی کا بچہ حال و مستحق نہیں کیا ہر شخص سے بے نیاز اپنی تانی کے سینے سے

لگا اس کے کمرے پر سر رکھنے سوراہا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے صبر اول کتنے لگا۔ اسے خبری نہیں تھی کہ وہ کس

قدر اور کس سنگ کے کھنڈر ہو چکا تھا۔ موت کا بے رحم ہاتھ اس کے سر سے وہ مہربان ہاتھ سمجھ لے گیا تھا

جس نے اسے زمانے کے گرم دوسرے اور لوگوں کی دست برد سے محفوظ و مامون رکھا تھا۔

”اس معصوم کو کون بتائے گا کہ اس کی ماں نے اپنی زندگی کی آخری رات کتنی تکلیف اور اذیت میں

گزاری تھی۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔
”گولی..... گولی.....“ کی کرپ آہ صدا

میری سماعت میں ابھر رہی تھی ڈوب رہی تھی۔ رات بھر لمبی تان کر سونے والے دارو پوائے

سربہوڑے بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں پر فرض سے غفلت کا احساس اور شرمساری تھی۔

سمجھوں سے اذانِ فکری کی صدا نہیں بلند ہونے لگی تھیں۔ میں بھائی کے بیڈ کی جانب پھٹی۔ مصطفیٰ اٹھایا اور

دارو کے اس مخصوص گوشے میں قیام و بقا کے لیے جا کھڑی ہوئی جہاں میں گزشتہ دو دن نماز ادا کرتی رہی تھی۔

نماز کے دوران مجھے دارو میں لوگوں کی آمد و رفت اور کچھ لچلچل کا احساس ہوتا رہا تھا۔ نماز کی

اگر اسے زندگی بھانے والی کسی دوا کی ضرورت تھی اور اسپتال ایسی دوا کی فراہمی سے قاصر تھا مجھے بھاگ کر باہر سے دوا خرید لانی چاہی تھی۔ مرنے والی کی جگہ میرا اپنا کوئی پیارا ہوتا تو کیا میں یہ سب کچھ نہ کرتی۔ کیا رات بھر اسے اس اذیت میں مبتلا رہنے دیتی۔

میرا سارا وجود لرز رہا تھا۔ جائے نماز پر بیٹھی میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے رو رہی تھی۔ عرقِ عداست دس رہا تھا۔

”دس نمبر کا سوال..... دس نمبر کا سوال.....“ میرا ضمیر مجھے کچھ کے دے رہا تھا۔ دس نمبر کا سوال تھا جو گزری رات کے صبر سے سانسے دکھا تھا۔ میں نے غامی پر چہرے کو ٹونڈا دیا تھا۔ صبر میرا عقیدہ بن گیا تھا۔ میں کھل رہی تھی۔

بھئی! آسمانوں سے میں نے ششے کے کمرے کی طرف دیکھ..... نہیں..... ڈاکٹر سب جہرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے اور وارڈ کے ایک گوشے میں تینوں وارڈ بوائے دو بارہ اپنی، اپنی جگہوں پر لیٹ چکے تھے۔ شاید اس لیے کہ ابھی کی باہر تیر کی تھی..... ان کی نیند شاید بھری نہیں تھی۔

انہیں تو شاید ہر روز دس نمبر کا سوال ملتا ہوگا..... مجھے تو زندگی میں پہلی بار دس نمبر کا سوال ملا تھا۔ مجھے ان پر رشک اور اپنی بے بضاعتی پر افسوس محسوس ہونے لگا۔ مرنے والی کی تو ہر حال آتی تھی مگر اس کی دواہی کے سفر میں قدرے آسانی فراہم کر کے اپنی، اپنی جگہ ہم سب ناکامی کے اس حلال سے تو بچ سکتے تھے جو اس وقت ان سب کے چہروں ہی کو دھواں، دھواں نہیں کیے ہوئے تھا بلکہ میرے اپنے دل کو بھی نارسائی اور ناکامی کے احساس سے دوچار کیے دے رہا تھا۔

دس نمبر کا سوال تھا اور مجھ سمیت تمام امیدوار ہی اس امتحان میں لگے ہو گئے تھے۔

اور انجی کے بعد رب کریم کے حضور دستِ دعا اٹھانے سے قبل میری نظر بیڈ نمبر بارہ کی طرف اٹھی۔ بیڈ خالی تھا..... مجھے گزشتہ شام اسی بیڈ پر اس کے اکڑوں بیڈ کر ہر اسان نظروں سے چھار اور بجنے کا منظر یاد آ گیا..... تو موت اس کے تعاقب میں تھی۔

دفعتاً اک احساسِ جرم نے مجھے آدھو جا۔ دو دن قبل بھائی کو ایک ہونے پر میں کس بری طرح بولائی، بولائی بھری تھی۔ ابھر بھی میں موجود ڈیوٹی ڈاکٹر کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر میں نے گڑ گڑاتے ہوئے کہا تھا۔

”پلیز! پلیز ڈاکٹر..... پہلے میرے چھت کو دیکھ لیں۔“ مجھے روتے گڑ گڑاتے دیکھ کر ڈیوٹی ڈاکٹر فوراً ہی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شعبہ امراضِ قلب سے سینئر ڈاکٹر کو کال دینے پر میں کس وحشت کے عالم میں کال درجن..... کرتے جانے والے ابھار کے ساتھ اس سے بھی ایک قدم آگے دوڑتی چلی گئی تھی۔ سربراہ شعبہ امراض کے ساتھی ڈاکٹر میرے گڑ گڑانے اور رونے پر پھرے ساتھ ساتھ ابھر بھی میں چلتا آئے تھے۔ بھائی کو آٹا ٹاٹا وارڈ میں شفٹ کیا گیا تھا۔ خون کو پتلا کرنے والا انجکشن لگایا گیا تھا۔ بس کا تھوڑا بہم نے دس منٹ کے اندر، اندر کیسٹ سے خرید کر اسپتال کو فراہم بھی کر دیا تھا۔ سب کچھ کس قدر جلت اور میکانیکی انداز میں ہوا تھا۔ اور اسی وارڈ میں ایک مصوم بچے کی نو جوان ماں رات بھر ”گولی..... گولی.....“ کی دہائی دیتی مر گئی تھی۔

مجھے یوں لگا جیسے وارڈ کا مملہ ہی نہیں میں بھی اپنے فرض سے غفلت کا فکار ہوئی تھی۔ مانیٹر کی ریڈنگز اب نارمل دیکھ کر مجھے سینکڑوں کو بچھو ڈر دگانا چاہیے تھا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر ذی کو خوابِ غفلت سے نہیں جگانا چاہیے تھا بلکہ مریض کی بگڑی حالت کے پیشِ نظر سینئر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے زمین آسمان ایک کر دینا چاہیے تھا اور

ناولٹ

تَرْکِ مَقَامِ

نایاب جیلانی

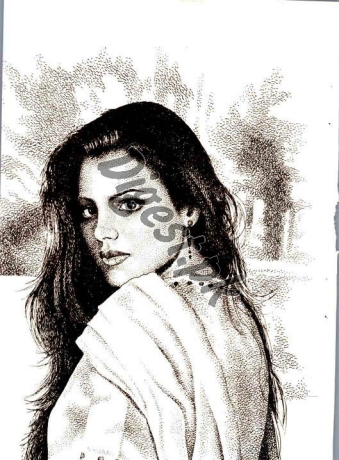


ساتواں حصہ



آفاق کا گھنٹاؤں کا چہرہ بیسی کو دکھائے گی؟ کیا بیسی کو یہ
انکشاف ملے گا کہ اسے کون سے گاؤں؟ وہ کس قدر لذت محسوس
کرے گا۔ اسے کتنا دکھ ہوگا؟ مگر مالا اسے آفاق کا
کریم روپ ہر صورت دکھانا چاہتی تھی، چاہے کچھ بھی

”پیارے مالا! گنتا ہے، رات کو سٹیوں کے
ساتھ لمبی ملاقات ہوئی ہے۔“ وہ جو مسلسل ان آوازوں
کے بارے میں سوچتے ہوئے سخت لاپرواہی میں مبتلا تھی،
بیسی کی شورش آواز سن کر بالکل ڈھسے گئی تھی۔ کیا وہ کبھی



تکلیف فوراً بتا دیتی اگر آفاق سامنے نہ بیٹھا ہوتا.....
وہ محض آفاق کے منظر سے ہٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ
جوں ہی اٹھ کر وہاں سے جاتا، بالا یعنی کو اس کی
حقیقت فوراً کھول کر بتا دیتی۔ چاہے سڑک کی کچھ بھی
ٹھٹکتے..... اسے پکا یقین تھا، اس ٹھٹکے پر کسی آسیب کا
سایہ نہیں..... یہ آفاق اور سوزن کی کوئی جلی بھلت تھی۔
یقیناً سوزن، ہمیشہ سے کوئی پرانا بدل لے رہی تھی.....
اور بالا کو خوفزدہ کر کے اسے تیز کر رہی تھی مگر آفاق
کیوں اس گھٹاؤ نے تعمیل میں شامل تھا؟ اپنے منہ اور
دوست کے ساتھ کھلا دھوکا کر رہا تھا۔

"بالا! کیا ہو گیا ہے تمہیں بار؟" اسے پھر کسی
سوچ میں گم رہ کر اب کبھی کبھی کچھ ٹھٹک رہا تھا۔ بالا
گویا ایک دم چار بن گئی تھی۔

اس نے کہا، میں اتنی سیر نہیں کیوں ہو رہی
ہوں؟ اب کچھ بھی نہیں، وہم ہے جس تمہارا۔" اس
نے جیسے بھی بالا کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا تب بالا کچھ
سنا کر میں چلی گئی تھی۔

"سیرا وہم نہیں، حقیقت ہے یہ سب....." وہ
آفاق کو چھٹی نظر سے دیکھ رہی تھی، ہمیشہ کی بغیر نری
سے بولا تھا۔

"ایک ہی بات کو بار بار سوچنے کی تو یہ حقیقت ہی
لگے گا۔ آئیں، آوازیں، دیکھو، بالا! ایک دم کو سر
پر سوار کرنے سے یوں ہی محسوس ہوتا ہے گویا سب
کچھ حقیقت میں ہو رہا ہے، کبھی تم نے خیال کیا،
اکہلے پھینے سے ہمارے کان خاموشی کے سناٹوں کو
محسوس کرتے ہیں، جیسے رنگ، رنگ کی آوازیں آنے
لگتی ہیں، اسی طرح آنکھوں کو تختی سے بند کر لینے کے
بعد اندھیرے میں آہستہ آہستہ کھسک اٹھتے ہیں،
ہماری تصوراتی دنیا کے کئی طرح کی تاریکی قسم کے منظر
اٹھتے ہیں۔ یہ ہمارا خیال ہوتا ہے۔ حقیقت سے
قطعاً دور....." ہمیشہ کی بہت غری سے اسے سمجھا رہا تھا۔
وہ بہت عجیب و غریب ہو گیا تھا۔ گویا پہلے والی مذاق کی کیفیت

ہو جاتا، چاہے ہمیشہ یقین کرتا یا نہ کرتا..... مگر وہ آفاق
اور سوزن کے ہاتھوں خود کو تیرے خوف میں نہیں بنے دے
سکتی تھی۔ اسے آفاق کے دھوکے نے اتنی نہیں نہیں
پہچانی تھی جس قدر سوزن کی غلیظ سوچ نے دکھ اور
افسوس میں جکڑا کیا تھا۔ ظاہر نہیں، ہمدرد، بچہ غلط اور
نیک بہت نظر آتی تھی مگر وہ پردہ سوزن کی کیا؟ بالا کچھ تو
جان چکی تھی اور کچھ جاننے کے قریب تھی۔ ایک بات تو
ملے تھی، بالا اب سوزن اور آفاق کے مہانے میں آنے
والی نہیں تھی۔

"وہیے بار! یہ خوب صورت رو میں اور پر یاں
بالا کو نظر آتی ہیں، ہمیں کیوں نہیں....." آفاق کی
شورخ ٹھٹکتا ہی آواز بالا کو بچہ افسوس سوچوں کے تصور
سے ٹھٹکتا ہی تھی، وہ کم مہم ہی آفاق کو دیکھنے لگی تھی۔ کیا
کوئی اتنا ڈرا سے باز ہو سکتا ہے؟

"سوچنے کی بات ہے، پر یاں ہمیں نظر کیوں
نہیں آتیں؟ ہماری غیر موجودگی ہی میں کیوں آتی
ہیں۔" ہمیشہ کی بھولیں کا منظر ہو کر آفاق سے بچہ ہوا
تھا۔ اس بات سے بچہ نیاز کے سامنے بیٹھا لگا کھٹکا
مکا اور ہوشیار ہے اور کس طرح آستین میں بند کر
ڈھنکے کے ارادے باندھے ہوئے ہے، یہ بات کو ایک
مرد پر سوزن اور آفاق کی باتیں زہر آلود کرنے لگی
تھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا بیٹھیں، دل دوپہل میں
آفاق کے چہرے پر سے غلبہ کھینچ دے۔ وہ کسی
غیر مری کی طرح بچہ نظر بنا کر ان الفاظ کو تر تیب دے
رہی تھی جو اسے کچھ دیر بعد ہی کسی کے گوش گزار کرنے
تھے۔ بالا کو اتنی سوچ بچار میں گم و کچھ کریمینی نے
ٹھٹکتا کر کر رہا تھا۔

"بالا! ڈیرا پھر تو نہیں کوئی سبکی دکھائی دے
رہی؟" ہمیشہ کی پہلے میں کچھ بھا کر اسے اپنی طرف
متوجہ کر رہا تھا۔ "کیا پھر کوئی پری نظر آتی؟ ہمیں وہ
عجیب اور تاریک اندام ہی؟" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ کچھ
کر رہا تھا جبکہ بالا بہت افسوس میں تھی۔ وہ اسے اپنی

”مجھے پریاں کچھ نہیں کہیں۔۔۔ بڑا پیارا آقا
ہو انہیں مجھ پر۔“ بیٹی باتر لگا۔

”ہوئی، دھیان سے یار.....! کھنکی چار، چار کے کھیل میں کھیں لے نہ اڑیں۔“ آفاق نے منہ جھکا کر کہا تھا..... دھرم لاواہل تھی۔

”اللہ نہ کرے۔۔۔“ اس نے جیسے ہوئے لیجے
میں فیسے سے کہا۔ اس کا درپہل خاصا چار چاند تھا۔ بھیجی
میںی اور آفاق دونوں چوک گئے تھے۔ آفاق
تھوڑا غصت زدہ رہ گیا تھا جبکہ میںی کو بات سنبھالنی
مشکل ہو گئی تھی۔

”آفاق مذاق کر رہا ہے ملا؟“ پھیلنے لگی

”ملاقات گئی سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔“ وہ
 روکے روکے لہجے میں یوں کہی جیسی جیسے وہ دونوں کچھ
 باتیں کر رہے تھے۔

یہودیوں کے حواج اور دماغ پر بھی تو اثر نہیں ہو گیا۔۔۔ عیسائی انتہائی خشک سارا کو یمن کی طرف جاتا، آخر کو بیابان رہا تھا۔ جبکہ آفاق کچھ خفت زدہ سا عیسائی کا کندھا جھپٹتا کر اپنے کمرے کی طرف ہلا گیا۔

”کیا بات ہے ملا۔۔۔۔۔؟“ بیٹی جو اپنے کمرے میں آ کر کسی کام میں مصروف تھا اب ملا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بڑی بے چارہ ہوتا تھا۔ وہ اس کی کافی باتری بچھ سکتا تھا۔ ان دنوں وہ نہ جانے کنہ ہوں میں نہ گئی تھی۔

”مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔“ بہت دیر کی کوشش کے بعد لانے والا آخر بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اسے آگاہ کر کہ تو تم کو لڑا کرتا ہے کاروبار کو بچا کر چلا جا رہا ہے۔

”کیا.....؟“ بیٹی بھی کچھ پریشان ہو گیا تھا۔
 ماما کے تاثرات ہی کچھ ایسے تھے اور جو کچھ ماما نے
 بتایا اسے سن کر تو بیٹی کا دل اور جوہل ہو گیا تھا۔ اس نے
 بے چینی کے ساتھ ماما کی طرف دیکھا تھا آیا وہ

فتم ہو چکی تھی۔ اسی طرح آفاق بھی تانیدی انداز میں سر ہلاتا گویا مینی سے متعلق تھا اور بالا کو دوسرا سر ادا کرنا کرنا دکھائی دے رہا تھا۔

”وہ بے مینگی اہل کچھ زیادہ دھمکی موری ہے، یہ سب ٹھیک نہیں، اسی طرح تو انسانی نفسیات بھی حائر ہوئی ہے۔“ وہ چالاک بڑی چھروں کے ساتھ مینگی سے مخاطب تھا جبکہ مینگی جھجھکی کے ساتھ اثبات میں سر ہل رہا تھا۔ اور اہل کادل چاہ رہا تھا کہ اتفاق کا کریمہ منہ لوٹ لے۔ اس نے ایسا متناقض زندگی میں سیکھ لی نہیں دیکھا تھا۔

”یہی تو اسے سمجھا رہا ہوں، جو یہ فعل کر رہی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا، کیا آفاق اقم نے کبھی محسوس کیا ہے؟“ بیٹی نے آفاق کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا، اس نے بے ساختہ نگلی میں سر ہلا دیا۔

”نہیں تو..... مجھے کبھی پرہیز نہیں آئیں..... حالانکہ مجھے پرہیز دیکھنے کا بہت شوق ہے۔“ آفاق نے بے جاہرہ ساتھ ہاتھ پکڑا تھا جیسے اس کی سب سے بڑی زندگی کی خواہش اس کی تک ادھوری تھی۔ مالا کو اس کی سکارتی پر ادھر بھی تھکے آگیا تھا مگر فی الحال وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی۔

”کاش پرہیز نہ کر کے بجائے مجھے نظر آتیں.....“ آفاق نے پھر معنی صحت کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ بھی نے اس کے کندھے پر دھب لگا دی۔

”مت اتنی آہیں بھرو..... یہ نہ ہو کہ آج رات تمہاری ہاری ہو۔“ بیسلی نے اسے دھمکایا اور وہ جھک جاتا۔

”نہیں یاد امت و راہ..... میرا دل پہلے ہی
کمزور ہے، ہریوں کی تاب نہیں لائے گا۔“ وہ منہ

”تم بھی زیادہ بہادر نہ بنو، کیا چاہتا آج تمہارے
مخالف کی باری ہو۔“ آفاق نے اسے حنا لیا۔

ہرموں۔۔۔ مجھے کچھ اور زبانیں سیکھنے کا بھی چرکا ہے۔ میں آج کل، عربی اور افریقی لنگوئج کورس کر رہا ہوں۔۔۔ میکس نے اطمینان سے کہا تھا۔
مالا اپنا سامنے لے کر وہ کئی گھنٹی اور میکس یوں دانست نکال رہا تھا جیسے مالا کو لاجواب کر کے لطف اعدوز ہو رہا ہو۔

”اور تم سون کوکب سے جانتے ہو۔۔۔؟“ مالا نے پھر سے ذرا چیختے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
”کافی عرصہ پہلے سے۔۔۔“ میکس نے۔۔۔
پروائی سے بتایا تھا پھر جیسے کچھ یاد آنے پر بولا۔

”تم نے میری ترچہ ڈے پائی پر ضرور آنا ہے۔۔۔ اور میرا کوکو کہنے کی ضرورت نہیں۔“ اب وہ ہمیشہ کی طرح سادگی سے بتا رہا تھا بلکہ یاد دل رہا تھا کہ مالا کبھی بھول نہ جائے۔۔۔ میرا نے پرجوش انداز میں حاشی بھری تھی جبکہ مالا کچھابھتی ہوئی لپٹ آئی۔

جب وہ گھر آئی تو نینے نے بتایا کہ چاچو کے کچھ مہمان آئے ہیں، مالا نے جی سمجھا تھا کہ مہمان وہ چار تو ضرور ہوں گے مگر ذرا تنگ روم میں بٹھائے کے بعد اسے پتا چلا کہ مہمان صرف ایک ہی ہے اور

وہ بھی میسنی کا انتہائی پاپنہیدہ۔۔۔ مالا کو مہمان کی خصوصیات کے بارے میں علم نہیں تھا۔ وہ کون تھا۔۔۔؟ اور اسے عرصے میں پہلے کیوں نہیں آیا؟ مالا کو ان باتوں کی طرف دھیان دینے کی بھلا ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے معمول کے مطابق ذرا تنگ روم میں چائے کے لوازمات جیسے اور پھر خود تھناؤ ٹھہرا دیا کرنے لگی تھی۔ آخری سلام پیکھنے کے بعد اس نے کوئی ناگواری آوازیں ابھرتی سنی تھیں جیسے کوئی فیسے میں تیز تیز بول رہا تھا۔ مالا نے جاننا لپٹ کر شہادت پر دنگی پھر سلیپر بکن کر جلدی سے باہر آئی۔
نینی بکن میں مصروف تھی اور اس شور سے قطعاً بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھی گویا جو کچھ ہو رہا تھا اس کی بار سے ہوتا رہتا۔ مالا تقریباً بھاتختے ہوئے لاؤنج میں

بٹھتی تو وہاں میسنی اور چاچو دونوں کو دیکھ کر ایک دم رک سی گئی۔ لاؤنج کے ایک صوفے پر سر جھکائے آفاق بھی بیٹھا تھا جبکہ میسنی بہت فیسے کے عالم میں زہر لب کچھ یو یو رہا تھا۔ اس کی یو یو اہٹ مالا کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔

”پروفیسر کیوں آیا تھا یہاں۔۔۔؟ آپ نے اسے دیکھ دے کر کیوں نہیں نکالا۔۔۔؟“ میسنی کی زہر میں بھی آواز سن کر مالا لٹک گئی تھی۔

”تو کیا وہ آدنی پروفیسر بشر تھا۔۔۔؟“ مالا گویا سر تپا حیران رہ گئی تھی۔ پروفیسر بشر کو دیکھنے کی سعادت سے محروم رہنے کا بھی اسے حق تھا۔ وہ ذرا آگے بڑھ کر کمرے کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔ اس نے کان اندر کی آواز پر لگا دیے تھے۔ چاچو بھی آواز میں گویا سنا کر جھپٹ کر رہے تھے۔

”بھائی! وہی کا لٹا تھا۔۔۔ پھر گھر سے کیسے نکال دیتا۔۔۔؟“ میری احوال پر سی کے لیے آیا تھا۔“ چاچو کی آواز بہت ہلکی تھی جیسے انہیں بھی پروفیسر کا آنا پسند نہیں آیا تھا مگر وہ مہمان کا لحاظ کر کے خاموش ہو گئے تھے۔

”شیطان کی اولاد ہے۔۔۔ ایک دم غیبت انسان۔۔۔ پھر کسی سازش کے تحت آیا ہوگا۔۔۔ آئندہ مجھے پتا چلا کہ وہ میرے گھر آیا ہے تو پھر اس کے حق میں بالکل اچھا نہیں ہوگا۔“ میسنی نے گویا وار تنگ دی گئی پھر لیے، بے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ چاچو بے چارے سنجیدہ سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ بس لاؤنج میں آفاق رہ گیا تھا۔ جس نے مالا کی موجودگی محسوس کر لی تھی پھر اسے باہر کی طرف جانا دیکھ کر خود بھی چیخے آگیا تھا۔ مالا تالاب کی طرف جاری تھی، پھر تالاب کے اونچے ٹکڑے پر چڑھ کر سر جھکائے کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ آفاق بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آگیا تھا پھر جس طرح مالا قدموں کی آہٹ پر حواس باختہ ہو

”کچھ نہیں، بہت کچھ.....“ مالا رو ٹوک لب۔
 لہجے میں بولی تھی حب آفاق شوخ سا ہو گیا۔
 ”پر یاں نظر آئیں تو بات بھی ہے۔“ وہ
 مسکراتے ہوئے سن باہیم کے بادلوں کو دیکھنے
 لگا..... گھرے ہوتے بادل..... جیسے برستے کو.....
 بہتاب ہوں..... مرقا بیوں کے غل محو رقص تھے،
 سفید رووہ جیسی گارگیں گارگیں تھیں۔

”پر یاں بھی دکھائی دے جائیں گی۔“ جنہیں فکر
 کس بات کی ہے؟“ مالا نے غلی سے پوچھا۔ آفاق
 کے آنجان پن پر اسے سخت تاؤ آ رہا تھا۔ جبکہ وہ اس کا
 صحیح طریق سمجھنے پر ابلی جون میں بولے جا رہا تھا۔

”میں ابلی سے تعلق ہوں، محبت کرتا ہوں اور
 غلطی سے بھی جہاز کی شادی کر رہا ہے، تم روجوں اور
 پچھلے کے پچھلے سے غلطو کچھ نظر بھی آئے۔“ جنہیں اپنی
 جہاز میں بہن بنایا تھا اور پہلی ہانچ سکی بہنوں سے زیادہ
 پر تو کوں دیا۔ پر تم تو سونپلی بہنوں سے بھی بڑھ کر
 بے مروت تھی ہو۔“ آفاق بے ساختہ ٹھوکر اٹھا۔
 دراصل مالا کے بدلے تلخ رخ روئے نے جیسی کے ساتھ،
 ساتھ آفاق کو بھی خاصا اپ سیت کر دکھا تھا۔ کہاں تو وہ
 اتنی دلچسپی لیا..... کرتی تھی۔ اس کی شادی اور محبت
 کی اسٹوری میں اور کہاں اتنی بیزار ہو چکی تھی کہ بات
 بھی کرتی تو سات چھرا اٹھا کر..... یہ صورت حال
 آفاق کے لیے بھی بہت پریشان کن تھی۔

”تمہاری بات سنے ہوگی.....؟“ مالا کو باجج
 بڑی۔ یعنی اس کی بے خبری میں ابلی کی ذات پر کیا
 نظم ہونے والا تھا۔ مالا کی تو گویا جان ہی نکل گئی تھی۔
 وہ تو کسی بھی صورت آفاق جیسے منافق کے ساتھ ابلی کو
 براہ دوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”نہیں..... ہونے کے قریب پہنچ گئی تھی مگر
 تمہاری وجہ سے سب پروگرام چو پٹ ہو گیا۔“
 آفاق کا منہ اتر گیا تھا۔ تاہم وہ اسی بات پر غور تھا

کر چوکی تھی۔ آفاق سے یہ منظر بھلائے نہیں بھولا
 تھا۔ وہ بہت خوف زدہ نظر آتی تھی..... یعنی اس کے
 چہرے پر جو سیلا تاثر ابھرا تھا وہ خوف کے علاوہ کچھ
 نہیں تھا۔ وہ سمجھتی تھی۔ یعنی آئیں اسے سہارہ
 تھیں۔ وہ اپنی طور پر فلت ہو رہی تھی۔ اس بات سے
 کوئی واقف نہیں تھا، وہ اپنے غل میں سمٹ رہی تھی
 اس بات سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ فی الوقت مالا،
 آفاق کو دیکھ کر کچھ سنبھلی تھی۔ یہ قدموں کی چاپ کسی
 غیر مرئی حلق کی نہیں تھی، ابھی اس کے چہرے پر
 سکون اتر آیا تھا مگر یہ سکون لمبا تھا۔ کچھ ہی دیر
 میں وہ فیسے کے ساتھ آفاق سے مخاطب تھی۔

”کیوں آئے ہو.....؟ کوئی کام تھا تو یہی سے
 کہتے.....؟“ مالا کے چہرے پر فیسے کی ٹھکنیں تھیں۔
 آفاق کچھ اپنا سامنے لے کر رہ گیا تھا۔ وہ وجہ جاننے
 سے قاصر تھا کہ مالا کی اسے دیکھ کر طبیعت کیوں بگڑ
 جاتی ہے اور مالا کو کچھ بھی کئی راتوں کی لذت پہنچنے
 نہیں بھولتی تھی پھر اس کی نکاری اور سونپن کے ساتھ
 اس گھر میں طاقت نے تو مالا کے حواس سنبھل
 کر دیے تھے پھر سونے پر سہاگہ جیسی اس کی بات
 سرے سے بات ہی نہیں تھا۔
 ”مالا! جنہیں کوئی دلچسپی ہے تو بتاتی کیوں
 نہیں.....؟ کیا حقیقت میں جنہیں کچھ سنائی یا دکھائی
 دیتا ہے؟“ وہ ٹھکر سا پوچھ رہا تھا۔ جب مالا نے سر
 جھٹک کر کہا۔

”ہاں..... نظر تو بہت کچھ آتا ہے.....“ اس کا
 انداز بڑا کامی غیر تھا۔
 ”کیا.....؟“ وہ کچھ بغیر بولا۔

”بہت جلد جان جاؤ گے.....“ مالا نے جیسے
 ہوئے لہجے میں کہا تھا اب آفاق ایک مرتبہ پھر کچھ
 بغیر کہہ رہا تھا۔

”کیا مجھے بھی کچھ نظر آئے گا.....؟“ اس نے
 مسکرا کر پوچھا۔

کہ مالا اس کے ساتھ بات تو کر رہی ہے۔ ورنہ اسے دن سے آفاق کو دیکھ کر راست بدل جاتی تھی۔ سیدھے منہ بات نہیں کر رہی تھی۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔

”بھری ہبہ ہے؟“ مالا چوکی۔
”تو اور کیا؟“ آفاق نے پھر سے پرسا منہ بنایا۔
”کیوں؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”کوئی۔۔۔ کیوں کا بھلا کیا سوال۔۔۔؟“ بیٹی کو ڈاکٹرز کے پاس پتھر لگانے سے فرصت ملے تب تان۔۔۔ آفاق پھولے منہ سے گویا ہوا۔ دوسرے جھکائے گھاس نوج رہا تھا جبکہ چہرے پر مصنوعی ہنسی تھی۔

”تمہارے گھر والے مان گئے۔۔۔؟“ مالا تنہیر رہ گئی۔ تو گویا اس کی بے خبری میں اتنا بڑا نقصان ہونے والا تھا۔ صد شکر کہ اس کی بیماری میں معاملہ اتنا اس پر نہیں تھا۔

”بیٹی نے بات کی تھی،“ مانتے کیوں نہیں۔۔۔ وہ اتر آیا۔ ”اب تم دونوں کو بھاڑ میں جھونک کر چھوٹی

سے ٹھیک ہو جاؤ۔۔۔ پھر چھوٹی سی کھانے کی تقریب رکھیں گے۔“ آفاق لہوں میں پر جوش چڑھا تھا۔ جبکہ اس کی کھلیات بچے بغیر اپنا اٹکا پر دم سے تار با تھا جبکہ مالا کچھ دیر کے لیے تو گم سم ہو کر رہ گئی تھی۔ تو گویا اپنی کواؤ بننے سے وہ ہرگز بچا نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنی کو بھلا بھاتی بھی کیسے؟ اس کی ممی تو گویا سب تیار یاں مکمل کر چکی تھیں۔۔۔۔۔ بیٹی اور آفاق کے جاتے ہی وہ اپنی کے گھر آگئی۔ ہیٹ کی طرح اپنی کی ممی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ وہ ایک بااخلاق، مہمان نواز خاتون تھیں اور مالا کو تو خصوصی اہمیت دیتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد خستی مسکراتی اپنی بھی آگئی تھی۔ اس کے انتہائی خیس نقوش میں سرخیاں اتر آئی تھیں۔ چٹکیلی آنکھیں اور مسکراتے ہوئے لب تار ہے تھے

کہ وہ اپنی شاہی کے قریب آنے پر بہت خوش تھی۔ مالا سے اس کی خوشی میں بدھڑکی گوارا نہ ہو سکی تھی مگر وہ اتنی پیاری لڑکی کو بے خبری کے عالم میں پر باد ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بہت دیر اور دھڑکھڑکی باتوں کے بعد مالا کو بالآخر بولنے کے لیے کچھ الفاظ مل ہی گئے تھے پھر اس نے سمجھتے ہوئے گھٹکھٹکا آغا کر لیا تھا۔

”تمہیں آفاق سے بہت محبت ہے انی۔۔۔؟“ مالا نے ذرا الجھ کر پوچھا تھا۔ حالانکہ یہ سوال پوچھنے کی ضرورت تو ہرگز نہیں تھی۔ اپنی کی خوشی اس کے اندر کا حال بتا رہی تھی پھر اس کی ہر بات آفاق سے شروع ہو کر آفاق پر ختم ہوتی تھی۔ مالا کا سوال سن کر وہ اس وقت بھی چوکی تھیں مگر جلد بہت جوش کے عالم میں تار پڑ گئی۔

”جی۔۔۔ بہت محبت کرتی ہوں، آفاق ہے۔۔۔۔۔ جی تو محبت بھلا۔۔۔۔۔ اس نے چٹکتی آنکھوں سے بتایا۔ وہ اپنی خوشی اور پر جوش تھی کہ مالا کا ارادہ ڈالو اور۔۔۔ ڈول سا ہو گیا۔

”کسی کے اچھا ہونے کی کب کوئی دلیل ہوتی ہے؟“ مالا نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

”یار! کسی کی اچھائی کو دیکھنے کے لیے دلیل نہیں دھوڑتے بلکہ اس کی شخصیت کی اچھائیاں دیکھتے ہیں اور آفاق بہت اچھا ہے۔“ اپنی نے گویا اسے سمجھانے کے ساتھ ساتھ آفاق کی تعریف کرتا بھی ضروری سمجھا تھا۔

”اور اچھائی کو تاپنے والا کوئی چنانہ ہوتا ہے؟“ مالا نے الجھ کر ممی پوچھا تھا۔ اپنی اس کی بات پر کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

”سینڈ ٹینن مالا۔۔۔! اچھائی کو تاپنے والا کوئی چنانہ نہیں ہوتا۔ بس دیکھنے والی آنکھ ہوتی ہے جو اچھائی اور برائی کو کھوج سکتی ہے۔“ اپنی نے کچھ دیر بعد بہت نرمی سے گویا اسے سمجھا یا تھا جبکہ مالا کچھ اور الجھ گئی تھی۔

نے کچھ عجیب کی بھرے لہجے میں جتایا تھا۔ "تم وہ بات کرو جو کہنا چاہتی ہو۔" وہ عجیبہ لگی جبکہ مال نے بھی چپ رہتا سب نہیں سمجھا۔

"بیاری اتنی اتم مجھے بہت عزیز ہو..... میں چاہتی ہوں تمہارا بھائی واپس آجائے، آفاق کے حوالے سے کچھ اور چھان بین کرو، عمر بھر کے فیصلے اتنی جلدت میں نہیں کرنے چاہئیں۔" مال نے اسے رومان سے سمجھایا تھا اب اتنی گویا اس کے خدشات سمجھ گئی تھی۔

"مجھے تمہارا فکر بہت اچھا لگا..... میرے دل میں تمہاری محبت اور بھی بڑھ گئی ہے۔" اتنی نے سچے دل سے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"مگر یاد! میرے بھائی کے آنے میں بہت وقت ہے، پھر بھائی اور گی دونوں کا مشترکہ فیصلہ ہے، آفاق نے بھائی سے بات کر لی ہے۔ اسے بھی آفاق بہت اچھا لگا ہے کیونکہ بیٹی کی گارنٹی بھی موجود ہے۔" وہ مسکرا کر گویا اسے تسلی دے رہی تھی۔

"اتنی..... کیا خبر، وہ بیٹھنی کا لالچ بھی رکھتا ہو۔" مال نے کچھ اور وسوسوں کا اظہار کیا تھا جس پر اتنی کچھ اور بھی مسکرائی تھی بلکہ قہقہہ لگا کر ہنس چکی تھی۔ اس کے قہقہے نے مال کو کچھ اور ہونٹ کر دیا تھا۔ وہ اس کے قہقہے کو سمجھ نہ پائی تھی۔

"اگر ایسی بات ہے تو کچھ غلط نہیں..... اسے بیٹھنی مل جائے گی مگر اتنی آسانی سے نہیں۔" اتنی ابھی تک ہنس رہی تھی پھر اسے مزید بتانے لگی۔

"یارا میری نانی بھی میرے پاپا کو بیٹھنی ملنے پر خدشات کا شکار تھیں۔ وہ پاپا کے چہرے نہیں بننے دے دی تھیں۔ انہیں خدشہ تھا سچے رشتے کے بعد پاپا بھی کو اور نہیں چھوڑ جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ پاپا ہمیشہ ہمارے رہے، نانی کے خدشے بے بنیاد تھے۔ سو آفاق بھی مجھے کبھی دھوکا نہیں دے گا۔" وہ اتنی مطمئن تھی کہ مال کو اس کے اطمینان پر رشک آیا تھا۔

"ضروری تو نہیں ہر اچھا دکھائی دینے والا بندہ قلمبوس ہو..... کیا خبر، وہ ڈراما کرتا ہو یا اچھائی کے لباس کو پہن کر بیس بدل کے کسی کو اپنے سازشی چال میں پھنسانا چاہتا ہو۔" مال کی گہری کاٹ داری بات نے اتنی کو کچھ چونکا دیا تھا۔ تاہم وہ کندھے سے جھٹک کر بے پردائی سے بولی تھی۔

"دلوں کے عہد تو بس اللہ ہی جانتا ہے۔" وہ شاید مزید بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر مال کا دل ابھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ بات کو کسی نہ کسی طریقے پر پھرا کر آفاق تک لانا چاہتی تھی مگر ہمت یوں نہیں ہو رہی تھی کہ اسے اتنی کی غشی کو ختم کر دینے کی تکلیف بھی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اتنی کا دل نوٹے یا وہ پریشان ہو۔

"وہیے بھی کر کی چھائی جانتے کے لیے دل کا مطمئن ہونا بھی ضروری ہے جیسا کہ میں نے خود آفاق کو پر دیا تھا اور یہ اس کی اچھائی تھی جو اتنی تک اس نے کسی کو بتایا نہیں..... اتنی کو بھی نہیں..... تمہاری بیٹی سے تو وہ سب کچھ سیکھ رہا ہے پھر یہ بھی تو دیکھو، وہ کتنا ہی مطمئن ہے، اس کی موجودگی میں کوئی مطمئن چھوڑے اور وہ اسے مل نہ کرے یہ ممکن نہیں..... میرا بھائی یہاں نہیں اور سمجھو، اس نے بہت سے ہمارے بوجھ باریکے ہیں۔" اتنی نے نہایت عقیدت کے ساتھ آفاق کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔ ویسے بھی مال کو لگ رہا تھا کہ اتنی کی آنکھوں پر آفاق کی محبت اور اچھائیوں کی پٹی بندھ چکی ہے۔ وہ اس کی بات سمجھ نہیں سکتی تھی۔

"ضروری تو نہیں ہر بلند نظر آنے والا بندہ حقیقت میں بھی بلند ہو..... ہر چٹکتی چیز سونا بھی تو نہیں ہوتی۔" مال دے لنگھوں میں باؤا خدہ ہی گئی تھی۔

"شاید تم بھی ٹھیک کہتی ہو، پر آفاق نے کوئی دکھاوا نہیں کیا۔" اتنی سنجیدگی سے بولی تھی۔ شاید وہ مال کی بات کے اندر کی گہرائی میں اتر گئی تھی پھر اس

اس نے دل ہی دل میں اس کا اعتماد قائم رہنے اور خوشیاں برقرار رہنے کی دعا کی تھی۔

”اللہ کرے، آفاق بہت اچھا رہے تمہارے ساتھ۔“ مالا نے سچے دل سے دعا دی اور جانے کی اجازت چاہی۔

وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو میٹی مسکراتا ہوا اسے سامنے سے آتا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ میں لڑے پکڑ رکھی تھی۔ شاید وہ بکن سے نکل کر باہر آ رہا تھا۔ فرے میں بیک، چائے اور ٹفلس تھے۔ مالا نے فوراً آگے بڑھ کر نوے پکڑ لی تھی۔

”گھر میں کوئی آیا ہے؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔ وہ میٹی کے پیچھے سنگ روم کی طرف جا رہی تھی۔ میٹی نے اشارت میں سر ہلایا۔

”سوزی آئی ہے۔“ میٹی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ وہ اور سوزن جانے کس موضوع پر بات کر رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

تاہم مالا نے نوٹ کیا تھا، سوزی کچھ ابھی، ابھی ہی بیٹھی ہے، مالا کو دیکھ کر اگرچہ اس نے جوش اور نصرت کا مظاہرہ کیا تھا مگر وہ کچھ ابھی، ابھی ہی بیک میں تھی جبکہ مالا کے تو اندر باہر آگے بڑھ کر بیٹھی تھی۔

جیسے اس رات کا ایک، ایک تکان دہا رہا اس کی نگاہ میں جم گیا تھا۔ سوزی اور آفاق کی آوازیں کیمیوں کی طرح جھجھکتی رہی تھیں۔ مالا کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔

”دھوکے باز، منافق لڑکی۔“ اس نے زہر بول بڑا کر کہا۔ وہ دونوں بھرے باتوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ جبکہ مالا اس پر غصت بھیج کر جانے کے نہانے دیں مٹانے پر تل گئی تھی۔ اب وہ بڑے غور سے سوزن کے سرخ زائمرے گالوں کو دیکھ رہی تھی۔

چکنا سا کھنک کی ٹکی جیسا پیچہ..... سر کو سنوڑ سے اب بھی ڈھکا ہوا تھا، پیچھے کی طرف جیسے رومال کو گرہ لگا رکھی تھی۔ اس کی سوتی روک کی فرل فرش کو چھوتی

تھی۔ مالا بتا دیکھے بھی جانتی تھی اس نے گھر پر آرام وہ ٹیبل پہنی ہوئی، وہ قدرے مضطرب تھی اور میٹی سے گفتگو کے دوران کبھی، کبھی مالا پر بھی نگاہ ڈال لیتی تھی۔ جانے وہ دونوں کس ٹاپک پر بات کر رہے تھے۔ مالا چونکی تو تب جب میٹی نے ایک ایسا موضوع چھیڑا جس کی مالا کو توقع تھی اور نہ سوزن کو..... وہ دونوں کچھ حیرت انگیز میٹی کو سن رہی تھیں۔

”بھری سا لنگرہ والی شام تھو تم نے مجھے دینا تھا یا مالا کو.....؟“ تھی تبھی ہو تم..... اگر ایک بیٹھ یا شرٹ مجھے بھیج دیتا تو میری دیوی کے سامنے کچھ عزت بن جاتی۔ کیا سوچتی ہوگی مالا! ان لوگوں میں کنزرفرینڈ شپ تو ہے ہی نہیں۔“ میٹی نے جس قدر سادگی سے اسے سچے میں لکھو کیا تھا سوزی کے جواب کے لیے تھی اور مالا کو ہی قدر سن کر کے دکھا دیا۔

”تھو.....؟“ کون سا تھو.....؟ میں تو آج تک طرہ مند ہوں۔ مالا کو کوئی تھو نہیں دے سکی۔“ سوزن نے سر جھکا کر جیسے اعتراف برم کیا تھا۔ مالا کی سانس ٹٹک ملنے میں ٹٹک گئی..... سوزی کیا کہہ رہی تھی۔

سوزی..... کتنی جھوٹی تھی۔ کتنی منافق تھی؟ اس نے خود کون پر مالا کو بتایا تھا کہ اس نے اسے تھو بھیجا ہے پھر اب میٹی کے سامنے کیوں کر رہی تھی؟ سوزی یہ سب کیا کر رہی تھی؟ مالا کے ساتھ کون سا کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنا بڑا جھوٹ وہ بھی ایک

دوسرے کے سامنے جھوٹ کر..... کتنی شدید غلط جانی؟ تھو بھیج کر کمر جانا کوئی معمولی بات تھی۔ مالا کو لگا وہ دھڑام، دھڑام تھو و برباد ہو جائے گی۔ وہ فنا ہو جائے گی۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں سوزن کو دیکھا تھا۔ وہ اب بھی انکار دیتی تھی اور میٹی جیسے سنبھل کر بچ چور رہا تھا۔

”گھر مالا کو تھو کس نے بھیجا؟“ میٹی کے ماتھے پر ٹھکنیں تھیں اور لہجہ اتنا سخت اور گھر درا تھا کہ مالا کا اندر تک مل گیا۔

تھا؟ اسے یقین تھا مالا جھوٹ نہیں بول رہی۔۔۔۔۔ اور اسے یہ بھی یقین تھا سوزی غلط بیانی نہیں کرتی۔ پھر مالا کے منہ پر کیوں کھرتی؟ پھر جانے اصل "ج" کیا تھا؟ بیسی کا سر تو پکڑنے لگا۔

ابو حلا غرت آج غلط دوسے سوزی کو گھوڑ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اس کے سرخ پچنے ابھرے گاں نوچ دے۔ اس کا دل چاہا وہ سوزی کی آنکھوں کو بھی پھوڑ دے۔۔۔۔۔ بلکہ کوئی ایسا بھالا اس کے اندر اتارے کہ سوزی کو اس بھیا یک جھوٹ بولنے کی حرا ل جائے۔ اس نے بیسی کی آنکھوں میں بے یقینی اسڑی دیکھی تھی وہ بھلا چپ رہ سکتی تھی۔

"تمنی سکاروڑی ہو تم۔۔۔۔۔ ایک دم شاطر اور چارہ۔۔۔۔۔ بیسی کی نظر سے مجھے گرانے کے لیے تمنی غناؤ کی غرمت کی ہے تم نے۔۔۔۔۔ آئی بیٹ ہو۔۔۔۔۔"

دل چاہتا ہے تمہارے منہ پر تجواب پھینک دوں۔۔۔۔۔ تم نے خود فون پر مجھے بتایا، میں نے تمہارا شکریہ ادا کیا تھا تب تم نے انکار کیوں نہ کیا۔۔۔۔۔؟ تم نے آج انکار کر دیا۔ تم آج بیسی کے سامنے کھرتی ہو تاکہ بیسی کا اعتبار مجھ پر قائم نہ رہ سکے، بیسی مجھ سے غرت کرنے لگے۔ بیسی کہے کہ میں ایک جھوٹی لڑکی ہوں۔۔۔۔۔ یہ مجھ پر بھی اعتبار نہ کرے اور میں بیسی کے دل اور نگاہ سے اتر جاؤں۔ "مالا غنیانی انداز میں چیخنے لگی تھی۔ اس کے آنسو بھل، بھل گر رہے تھے اور وہ اپنے ہاتھوں کو کولتی حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

"میں ایسا کیوں چاہوں گی، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" سوزن اور بیسی دونوں گھبرا گئے تھے۔ بیسی، مالا کے لیے پانی لینے مکان کی طرف بھاگا تھا جبکہ مالا مسلسل چیخنے جاری تھی۔

"تم ایسا ہی چاہو گی۔۔۔۔۔ میرے خلاف سازشیں کرتی ہو تم احتجاجی شخصیت ہو، یہ میں ہی تھی جو تمہیں جان نہیں سکی۔ تمہارا کر یہ روپ دیکھ نہیں پائی۔" مالا پچتے ہوئے زبردست جھوڑی تھی جبکہ سوزن

"یہ تو تم مالا سے بچو، پر یقین مانو۔۔۔۔۔ میں نے مالا کو کچھ بھی نہیں سمجھا۔" وہ سادگی بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی جبکہ مالا کو وہ کوئی چالاک لومڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا، وہ اٹھ کر سوزن کا منہ نوچ لے۔ مگر اس کی ہمت جیسے پگڑ کر رہ گئی تھی۔ اس نے پھٹی، پھٹی آنکھوں سے بیسی کو دیکھا تھا۔ وہ مالا کو دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کے کچھ بولنے کا منتظر تھا۔

"بولو مالا۔۔۔۔۔" اتم نے تو کہا تھا سوزی سے فون پر بات ہو گئی تھو سوزن نے ہی سمجھا تھا۔ پھر یہ کیوں غلط بات کر رہی ہے۔ "بیسی کے لہجے میں غری تھی۔ وہ بڑے مان بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ جیسے ابھی مالا تردید کر دے گی۔ جیسے ابھی مالا سوزن کو جھوٹ ثابت کر دے گی مگر مالا کچھ بھی نہیں کر سکی۔۔۔۔۔ اسے لگا، وہ گہری آنکھیں جو اس کی تاک میں گئی رہتی تھیں اسے کہہ لہو بیسی کی نظر سے گر رہی تھیں۔ وہ گرتی جا رہی تھی۔ گرتی جا رہی تھی۔ وہ کھائی میں گرتی جا رہی تھی۔

"بولتی کیوں نہیں ہو مالا؟" بیسی اٹھ کر اس کے برابر آ بیٹھا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی مذاق میں کبھی بات اتنی سنجیدہ صورت اختیار کر جائے گی۔ وہ تو سوزن کو بھڑکایا تھا کہ کبھی اسے بیسی کو برتنہ دے دس کرے گی تو ملتی نہیں ہوتی۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ گیا۔ وہ بے نام تھو جو اس وقت بھی اس کے ذہن کو الجھا گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر سوالیہ نشان بن کر چلیوں کے سامنے ناچنے لگا تھا۔ مالا نے بتایا تھا وہ بے نام تھو سوزن کی طرف سے آیا ہے۔ اس کی سوزن سے فون پر بات ہو گئی تھی۔ سوزی نے شکریہ بھی وصول کر لیا اور اب وہ بیسی کے مقابل بیٹھ کر صاف، صاف کھڑی تھی۔ بیسی کو ہنسنے آتا تو وہ اور کیا کرتا۔۔۔۔۔ وہ اٹھا کر بریل سلپٹ لے آیا تھا۔ جو تو زبردست دیا گیا تھا۔ بھلا مالا نے سوزن کا تھو کو روپ میں کیوں پچھا؟ اس نے تب نہیں سوچا تھا۔ وہ اب سوچ رہا تھا۔ آخر یہ تھو آیا کہاں سے

کاسر سچ چہرہ آگ کے مانند بنے لگا تھا۔ مالا کے الفاظ نے اسے ہلکا کر رکھا تھا۔

"مالا..... تم پاگل ہو چکی ہو۔" سوزن نے جلی سے کہا۔ "بہت جذباتی ہو..... ایک دم احمق اور بدصبر....." بیٹی کو آتا دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی مگر اس کے چہرے کی تپش ختم نہیں ہوئی۔

"ہاں، تم تو چاہتی ہو، میں پاگل ہو جاؤں، پہلے مجھے تختہ بچھتی ہو..... پھر مکر جانی ہوتا کہ میرے شوہر کو بدگمان کر سکوں۔" مالا پتنگھلاڑی تھی۔ وہ حرا جانا کی نہیں تھی۔ اسے حالات نے غیوط الحواس کر دیا تھا۔ بیٹی نے آگے بڑھ کر اسے زبردستی پانی پلا دیا تھا پھر سوزن کی طرف مڑ کر پی سے بولا۔

"پلیز سوزن! تم یہاں سے چلی جاؤ..... تمہاری وجہ سے مالا کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔" بیٹی کے انتہائی توجیز آئینہ الفاظ نے سوزن کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر سے نکل جانے کو کہہ رہا تھا۔ دوسرے معنوں میں وارننگ دے رہا تھا کہ اس کی وجہ سے مالا کی طبیعت بگڑی ہے اور سوزن دوبارہ یہاں نہ آئے۔ اس ذلت بھرے احساس نے اس کی آنکھوں کو کم کر دیا تھا مگر وہ پھر بھی ہانسنے کو تیار نہیں تھی کہ اس نے مالا کو تھوڑا بچھا ہے۔ وہ جائے، وہاں تے بھی اپنی صفائی میں کچھ بول گئی تھی جسے بیٹی نے سنا ہی نہیں۔ وہ تو مالا کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اسے پتکا رہا تھا۔ نرمی اور پیار سے سمجھا رہا تھا۔

"میں تم سے بھی بدگمان نہیں ہو سکتا۔ تمہارا جو مقام میرے دل میں ہے اسے کوئی بھی بدگمانی ختم نہیں کر سکتی اور نہ مٹا سکتی ہے۔ سوزن مکرانی ہے تو سو دفعہ مکر جائے۔ مجھے یقین ہے مالا جھوٹ نہیں بولتی۔" بیٹی کے نرم چہرہ جیسے الفاظ جاتی ہوئی سوزن کی سماعتوں میں بھی اتر گئے تھے۔ اس کے دل میں نیرے کی اتنی جا بھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ بیٹی کے الفاظ سوزن کے منہ پر طمانچہ

تھے۔ کبھی وہ کہتا تھا کہ سوزن جھوٹ نہیں بولتی، آج وہ کہہ رہا تھا کہ مالا جھوٹ نہیں بولتی۔ وقت انسان کو کیسے دور ہے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ حالانکہ بیٹی اپنے ایمان اور یقین سے کہہ سکتا تھا مالا اور سوزن دونوں جھوٹ نہیں بولتیں..... مگر وہ ایسا کہہ دیتا تو کیا حرج تھا؟ مگر وہ ایسا نہیں بولا تو گویا اس کا یقین مالا پہ بھاری تھا۔ سوزن کا چلڑا ہکا ہو گیا..... مالا اس کی بیوی تھی جبکہ سوزن صرف ایک کزن..... رشتوں میں فرق بہت تھا، اعتبار اور اعتماد کی نوعیت بھی یکساں اور تھی۔ اس نے غرض پر گھر سے برصیلت کو دیکھا..... پھر جھک کر اسے اٹھایا۔ اس برصیلت کی وجہ سے کتنے دنوں کا تھکانا ہوا تھا۔ یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہاں، سوزن کا اعتبار مالا سے اٹھ گیا تھا اور مالا کا اعتبار سوزن سے اٹھ گیا تھا۔ ایک قرآن کی قسم کھاتی تھی..... ایک مقدس انجیل کی قسم کھاتی تھی۔ ان دونوں سے بھی زیادہ بیٹی مشکل میں گرفتار تھا۔ پہلا وہ ان دونوں میں سے کسی کا یقین کرتا.....؟ وہ دونوں ہی اپنی، اپنی جگہ درست تھیں شاید..... جانے کد کیا تھا؟ جانے کد کیوں تھا؟ اور کیسے ہو رہا تھا؟ بیٹی نے مالا کے لبوں سے پانی کا گھاس بٹایا تو اس کی سماعتوں میں سوزن کی آواز اترتی۔ وہ سینے پر صلیب کا نشان لگاتی بھرائی آنکھوں سے پلٹ کر ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے یہ منظر.... بے انتہا اذیت ناک تھا۔

"مقدس انجیل کی قسم! یہ بڑی خسارہ اٹھانے والی ہے، اسے انسانوں کی پہچان ہی نہیں۔" سوزن کی درد ناک آواز لاؤنج میں گونجی رہ گئی تھی جبکہ وہ اپنی روک کو بیروں میں روکتی اگلے سیدھے قدم اٹھاتی تھی اس مگر میں دوبارہ نہ آنے کے لیے چلی گئی تھی جبکہ لاؤنج اور سٹنک روم کے سناٹوں کو محسوس کرتے یہ دو لوگ ایک دوسرے کو بے ساختہ پکارا تھے تھے۔

اور اعتبار ہی تو تھا جو وہ پھر سے بولنے کے قابل ہو چکی تھی۔ ورنہ جو کچھ سوزن نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ نہ بھلا یا جانے والا تھا اور نہ نظر انداز کیے جانے والا تھا۔ وہ جو کچھ رہی تھی سوزن کے انکار اور نکر جانے کے بعد بیٹنی اس سے بدگمان ہو جانے کا ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے گفت والے قصے پر بیٹنی ڈال دی اور مالا کو تختی سے تاکید کی کہ کندہ اس کھلیا تجھے کا ذکر نہیں ہوگا۔ مالا کے دل میں بیٹنی کی محبت پہلے سے چوکی ہو چکی تھی کبھی، کبھی اسے خود پر تاز ہونے لگتا تھا۔ وہ تو بہت حقیر سی لڑکی تھی اللہ نے اسے اتنا نواز دیا تھا جس کی نہ کوئی حد تھی اور نہ کوئی شمار تھا۔ سوزن تو یہی سوچتی ہوئی وہ بیٹنی کو مالا سے بدگمان کر دے گی۔ آخر اس کی بات کا مطلب تو یہی تھا۔ بیٹنی، مالا سے تنفر ہو جانے کا خطرہ باہر جیسے الٹ ہی گیا تھا۔ بیٹنی نے مالا سے بدگمان ہونا تھا نہ ہوا۔ حالانکہ اس کے بعد کئی مرتبہ بے نام پارسل موصول ہوئے۔ چونکہ بیٹنی کی غیر موجودگی میں آتے تھے سو مالا انہیں بنا دیکھے کوڑے والے ڈرام میں الٹ آتی تھی پھر بہت سارے دن دے قدموں گزر گئے۔ بیٹنی اسے اور چاہو کو شہر سے باہر کھانے لے گیا تھا۔ آفاق کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا مگر اس نے معذرت کر لی تھی۔

زندگی جیسے پھر سے معمول پر آ گئی۔ یوں لگا وہ دو آنکھوں والا آسیب اس کا چچا چھوڑ گیا ہے۔ شاید اس نے مالا کی ذات سے سمجھتا کر لیا تھا۔ مالا کے لیے یہ احساس ہی فرحت بخش اور اطمینان دلانے والا تھا۔ مگر یوں تھا کہ مالا بے چاری کے سکون و یقین اور اطمینان کے دن تھوڑے ہی تھے۔ پھر ایسا روح چلا دینے والا واقعہ ہوا جس نے پہلی مرتبہ بیٹنی اور چاہو کو چھوڑ ڈالا تھا۔ وہ دن بڑا سست روی سے طلوع ہوا تھا۔ بیٹنی اور آفاق دونوں دفتر چلے گئے تھے اور آج کے دن چاہو لازمی چابی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور پھول چڑھانے جاتے تھے۔ یہ ان کے معمول میں

”مالا.....!“ اس نے مالا کا کمال بے ساختہ

منہ بولا۔

”بیٹنی.....!“ مالا نے گھبرا کر بیٹنی کا اپنے کمال پر رکھا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر کے لیے کیم سمہ رہ گئے تھے۔ جیسے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ چند لمحوں میں بھلا ہوا کیا تھا؟ بیٹنی کو لگا جیسے یہ کوئی ڈرامے کا سین تھا جو فائنٹ منظر بدل گیا۔ دوہل میں کیا سے کیا ہو گیا؟ سوزن کے چلے جانے کے بعد بیٹنی کو احساس ہوا تھا کہ اس نے سوزن کو گھر سے نکال کر اچھا نہیں کیا..... قصے، جذباتیت اور جلد بازی میں اس نے سوزن کی بہت توہین کر دی تھی۔ بیٹنی نے گروہی کی محبت کا خیال رکھا اور نہ تانتے کے بہار کو نظر میں رکھا..... پھر وہ اس کے گھر مہمان آئی تھی۔ مہمانوں کو یوں بے عزت کر کے گھر سے نکالنا بیٹنی کے گھرانے کی روایت تو نہیں تھی۔ اسے سوزن کے ساتھ انتہائی معیوب سلوک کرنے پر اور بات گھر سے نکال دینے کی وجہ سے خود پر غصہ ہوا تھا۔ غصہ حرام ہوتا ہے۔ اسے ان لمحات میں غصے کے نقصانات کا ادراک ہوا تھا۔ مگر وہ سوچ ہی کیا کرتا؟ پویشن ہی ایسی تھی۔ مالا کی اذیت نے بیٹنی کی کندہ بد بھلا دی تھی۔ کبھی وہ سوزن پر الٹ پڑا تھا۔ اسے سوزن کے ساتھ اتنا تلخ رویہ نہیں دکھتا چاہیے تھا۔ بیٹنی نے سوچا تھا، معمولی سے گفت کا تو معاملہ تھا۔ بات رفع دفع ہو جاتی تو بھتر تھا۔ اسے بات بدعانی نہیں چاہیے تھی۔ مگر بات پھر بھی بڑھ چکی تھی۔ ادھر مالا ابھی تک اس کیفیت سے باہر نہیں آ رہی تھی۔ اسے سوزن پر شدید غصہ تھا۔ وہ اب بھی سکریاں بھرتی کھنٹی، مٹی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”یہ کون سی چادر گھری ہے علی بیٹنی! یہاں اتنی مہو جاس کیوں ہوئی ہیں؟ میری سادہ سی زندگی میں اتنی الجھنیں کہاں سے آ گئی ہیں۔“ وہ آنسو پونچھتی کر رہی تھی۔ یہ علی بیٹنی کی ذات کا مان، جھنڈا، محبت

شامل تھا۔ ہر پندرہ دن بعد وہ دل کے امینان کی خاطر چاہی سے ملنے جاتے۔ اس دن نئی اور ملاکمر میں اٹلی تھیں۔ مالا نے بڑا حریف تیار کر رکھا تھا مگر کچ سے کچھ دیر پہلے بیٹی نے کہا وہ کسی ضروری میٹنگ کی وجہ سے نہیں آسکے گا۔ جب مالا اپنے وقت کے مطابق نماز ادا کرنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ سلام پھیر رہی تھی جب اس نے مڑ کر دیکھا۔ ہاں اس نے مڑ کر فیر ادا کیا دیکھ لیا تھا اور یوں لمحوں میں اسے لگا جیسے اس کے وجود سے دھیرے دھیرے نہیں ایک ہی جھٹکے ساتھ جان نکل گئی ہے۔ اس کے پیچھے ایک عورت کھڑی تھی۔ سر سے لے کر ہر وہ تک سلید لباس پہنے ہوئے۔ اس کا چہرہ انتہائی سفید اور پھلنے خانے سے نشتر اہوا تھا۔ اس عورت کی آنکھیں جھلی تھیں۔ وہ خوب صورت عورت تھی مگر اس کی اصل رنگت سلید خانے میں گم ہو چکی تھی۔

ایک تباہ کمرے میں اکیلا وجود کسی اور کا گمان نہ کرتے ہوئے اپنے دھیان میں گمن ہو اور اسے اچانک کوئی وجود نظر آجائے۔ پھر کسی کی جاننے کہا حالت ہوتی ہوگی تاہم مالا جو پیسے مرنے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اسے لگا، آنکھیں تو ملنے چاہتے تھے مگر اصل بڑی کی اور یہ ناگہان تو کبھی پہننے کے قابل نہیں ہو سکیں گی۔ اس نے اتنا ہی ایک منظر زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ معاذ واہ وہ دھیرے سے نکلا تھا اور مالا کی جیسے جان میں جان آگئی۔ اندر داخل ہونے والی نئی گئی جو کسی اور کے وجود سے قطعاً بے نیاز مالا سے مخاطب تھی۔ "برتن میز پر لگاؤ ہے ہیں۔" نئی نے بغیر چونکے یا فٹکے آرام سے کہا تھا۔ کیا اسے مالا کے قریب کھڑی وہ عورت نظر نہیں آتی تھی؟ مالا کا ضمیر تباہ دل پھر سے دھک دھک کرنے لگا تھا۔

"نئی اکمرے میں کوئی اور بھی ہے۔" مالا نے کزور آواز میں زہر لب بڑ بڑا کر پوچھا تھا۔ جب نئی کی آنکھیں پھٹ چیں۔ اس نے ڈیلے پھاڑ پھاڑ کر پورے

کمرے پر لگاؤ ڈالی تھی۔ اسے مالا کے قریب وہ جوان عورت کھڑی نظر نہیں آتی تھی۔ مالا کے ہجڑوں سے زمین دھیرے دھیرے سر کے نیچے گئی تھی۔ پھر اس نے نئی کو کچھ بولنے کا حافہ دہلا کے اس کو معطل کر دی تھی۔

"کہاں ہے۔؟ کون ہے۔؟؟ مادام! آپ تو بہک گئیں۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔" نئی نے ہکلاتے ہکلاتے بہ مشکل اپنی بات حمل کی تھی۔ اس کا پورا وجود قرقرار ہا تھا اور وہ چہرہ خوف کے مارے بازے کی زردی جیسا ہو چکا تھا۔

"تمہیں یہ عورت نظر نہیں آئی۔؟" مالا نے اپنے قریب کھڑی عورت کی طرف اشارہ کیا تھا جب نئی بچ مار کر مالا کے قریب آگئی۔

"مجھ کوئی عورت نظر نہیں آ رہی۔ یہاں ہم دو ہیں۔" نئی نے اس کا زور دھک کر پکڑی آواز میں کہا۔ "اتر دو گئیں میں ہیں۔" مالا کی کھلی بندھ گئی۔

خوف نے اسے لرز لرزا کر بے حال کر دیا تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ جیسے مرنے کے قریب پہنچ چکی تھی۔

"تم اوجر دیکھو۔۔۔" مالا نے نئی کا چہرہ اس عورت کی طرف موڑا تھا۔ وہ عورت جو ساٹ چہرہ لیے ہاتھ باندھے سر جھکا کے کھڑی تھی۔ اس کا انداز اتنا عجیب تھا۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی کچھ کہہ بھی نہیں رہی تھی اور نہ وہ غائب ہو رہی تھی۔ جبکہ مالا کے علاوہ وہ کسی اور کو نظر بھی نہیں آ رہی تھی۔ سب سے تکلیف دہ مقام بھی یہی تھا۔

"یہاں کچھ بھی نہیں۔" نئی منہ مانی۔ "تم اتر دو گی۔"

"میں بھوت نہیں بول رہی۔" نئی کی آواز کھینچا رہی تھی۔ حلق فلک ہو رہا تھا۔ وہ کمرے سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر کیسے مالا کو اکیلا چھوڑ دیتی۔

"تو میں بھوت بولتی ہوں۔" مالا نے خراب کر کہا۔ "الٹی یہ کیسی سزا ہے۔" وہ بھل بھل روئے گئی

آنکھیں پھاڑے اسے پکار رہی تھی۔ مگر جنگلی پھولوں کی بازنگ جانے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اندھیرا نما جھنڈا اونچے اونچے درخت لٹا ہوا ہے جن پر قسم قسم کے پھول لگے ہوئے تھے۔ نئی بھی جب تک کالا کے پیچھے گرتی پڑتی آگئی تھی۔ اب اسے بازو کو گھورتے دیکھ کر زبردستی اندر لے آئی۔

”سایوں کا پیچھا نہیں کرتے۔“ مالا نے نئی کو کہتے سنا تھا۔ پھر جیسے اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا اثر آیا۔ وہ پکار کر فریادیں کر رہی تھی۔ جب اسے نئی نے سہارا دے کر قہقہہ لپٹا تھا تاہم اس کا ذہن ایک دم تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

وہ ہرے آٹھ تھکنے بے ہوش رہی تھی۔ اس بے ہوشی نے اگر اسے شدید اور بھیاں تک خوف کی سوجھ بھجھ دی تھی تو اس بے ہوشی کے ساتھ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ جب وہ بے ہوش ہوئی تب چاچا بھی گھر لوٹ آئے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ ایسویٹس منگوانی اور مالا کو اس میں ڈال کر اسپتال لے گئے تھے۔ جب تک بیٹی بھی وہاں پہنچی گیا تھا۔ پھر فوراً طبی امداد ملنے کے باعث اسے ہوش تو آ گیا تھا تاہم ڈاکٹر نے بتایا وہ کسی شدید قسم کے خوف اور ڈر کے زیر اثر ہے۔ اسی بے ہوشی میں ڈاکٹر نے بتایا کہ مالا ماں بھی بننے والی ہے۔

جہاں بہ خوش خبری چاچا اور بیٹی کے لیے انتہائی بد قسمت تھی وہیں مالا کی حالت نے انہیں تشویش کا شکار کر دیا تھا۔ نئی نے من و مہن پورا دیا تھا کہ سنایا تھا۔ مالا نے ہوش میں آ کر وہی باتیں وہی کہیں۔ مالا نے روتے روتے بتایا۔

”وہ عورت چاہتی ہے، میں اس گھر میں نہ رہوں۔۔۔۔۔ وہ مجھے نظر آتی ہے نئی کو نہیں۔ آخر میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“ مالا کی ذہنی حالت قابل تشویش تھی۔ اس کی کنڈلیں ایسی نہیں تھکی کہ۔۔۔ وہ کوئی صدمہ برداشت کر سکے۔ چاچا اور بیٹی سخت پریشان

تھی۔ مگر سامنے کھڑی چاندی کے جیسے میں دھلی عورت نس سے مس نہیں ہوئی۔ خبر نہ ہو چکی، نہ کبھی۔ اسی طرح بت کی طرح کھڑی رہی تھی۔

”تم۔۔۔ تم کون ہو۔۔۔؟“ مالا نے بڑی ہمت کے ساتھ اس عورت کو مخاطب کیا تھا جو صرف اسے نظر آ رہی تھی نئی کو ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ مالا بھلا کیا کرتی۔۔۔۔۔؟ خوف و صدمہ، دکھ اور جانے کون، کون سا احساس اس میں مغلل کر رہا تھا۔

”بلوئی کیوں نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کیوں بھگ کرتی ہو؟ میرا گناہ کیا ہے؟“ مالا تڑپ تڑپ کر بولی تھی پھر جیسے پتھر کے بت میں جان پڑ گئی تھی۔ اس چاندی کے جیسے نے کہا۔

”یہ ہماری جگہ ہے۔۔۔۔۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔“ آواز کی گونج مالا کے کانوں میں اتر گئی تھی۔ مگر نئی گونگوں، سہروں کی طرح بس مگر مگر دیکھتی رہی۔ مالا نے نئی کو جھوڑ دیا تھا۔

”کیا تمہیں کوئی آواز سنائی دی؟“ مالا نے بڑی آس سے پوچھا تھا مگر نئی نے لمبی نئی سر ہلا دیا۔ ”مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔“ نئی خوف کے مارے لرزتی آواز میں بولی تھی۔ پھر جیسے، مالا نے تھک کر نئی کو بتایا تھا۔

”یہ عورت مجھ سے کہہ رہی ہے میں اس گھر سے چلی جاؤں۔“ مالا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور نئی کے ذہن پر سے باہر آ کر رہے تھے۔ شاید جھمپتی عورت کو مالا کا بولنا اور رونا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ کسی روایت کی طرح پہنچی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ جبکہ مالا کو ایک دم ہوش سا آ گیا تھا۔ وہ بھی ایک کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ حالانکہ نئی اسے روکنا چاہتی تھی مگر مالا سر پر چڑھ کر بھاگ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ وہ عورت تالاب تک جاتی دکھائی دی پھر وہ جنگلی پھولوں کی اوٹ میں گم ہو گئی تھی۔ مالا

تھے۔ پاکستان میں ہوتے تو ان باتوں پر اس کے لوگوں سے مشورہ کرتے۔ مگر یہاں تو ایسا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ آجیب و غیرہ پاکستان میں تو تھے ہی، کہا جڑنی جیسے ملک میں بھی تھے؟

یہی نے آفاق کو پوری بات بتادی تھی۔ وہ اس سے مشورہ طلب کر رہا تھا۔ آفاق خود ساری باتیں سن کر بتانے میں رہ گیا تھا۔ خصوصاً وہ عورت جو ہاتھ کو ٹھکراتی تھی۔ اس کے بارے میں سن کر وہ بچے کی شکرت جو چکا تھا اور سنجیدگی سے اس کا عمل دہرائے کی کوشش میں بیٹنی کی ہر ممکن کوشش کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ ان کے گھر والوں سے سب کچھ چھپا لیا گیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو بے یقینان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بھی جتنے نہیں سکتے تھے۔

پھر بہت سارے دن سکون سے گزر گئے۔ بلکہ دو تین مہینے گزر گئے تھے۔ ان کی شادی کو کتنی کے چاہنا ساڑھے چار ہوا ہو گئے تھے۔ آنا خوب صورت وقت آئی جلدی گزر گیا تھا۔ غلابہ تو بچ کوئی انہماک نہ کرتی رہی تھی۔ اب یحییٰ نے بالا کو اکیلا نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ رات کو اگر اسے چاہا تو کسی تو پانی پینے اسے اکیلے نہیں بھجھتا تھا۔ اگر اس میں جانا اس کا بہت ضروری ہوتا تھا۔ ورنہ آفاق کو بھیج دیتا مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکا تھا۔ ایک صبح آفاق اور یحییٰ دونوں کو ایک ساتھ اس میں جانا پڑ گیا۔ نئی انہی آئی نہیں تھی بلکہ چار سو رہے تھے۔ دن کا وقت تھا۔ بالا نے یحییٰ کو تسلی دے کر دفتر بھیج دیا تھا۔ حالانکہ یحییٰ کا جانا بہت ضروری ہوتا وہیں وہ جاتا تھا اور آفاق کو گھر چھوڑ دیتا۔ تاہم آج وہ دونوں چلے گئے تھے اور صرف آدھے گھنٹے کے لیے گئے تھے۔ بالا چار سو سوتا دیکھ کر گارڈن میں آگئی تھی۔ یہاں تالاب کے پاس بیٹھنا اسے بہت پسند تھا۔ اسے لگتا تھا یہ تالاب سیف الملک جمیل ہے۔ جس پر ہر رات یہاں اتنی تھیں۔

حالانکہ یہ تالاب ایسا تھا کہ دن کے وقت بھی یہاں پر پاں چلتی پھرتی نظر آ سکتی تھیں۔ دیکھا جائے تو تصوراتی خاکوں میں پر یوں کا ذکر، ان سے ملاقات اور ان کے حسن کی ہمہ ساری کی ایک ایک کہانی بھری ہوتی ہے۔ پر یوں کو دیکھنے کا شوق اور ان کے حسن سے متاثر ہونا ایک الگ چیز اور بات ہوتی ہے۔ پر یوں کو اپنے مقابل دیکھنا بہت صحت والا کام ہے۔ قوم ہنسنے کی سببیں عورتیں، جن میں سے ایک پر وادی کو ہستان کا شیرازہ سیف الملوک بھی عاشق ہو گیا تھا۔ محروہ پر ی شیرازے سے ملنے پھیل برآتی تھی۔ شیرازہ، ہری کے حلق میں تپا ہو گیا تھا۔ قصوں اور کہانیوں میں یہ سب کچھ بہت دلچسپ لگتا ہے۔ اور اگر حقیقت میں کوئی پر ی حواس معطل کرنے سا حیرت انگیز تو بھی کیا حال ہوتا ہے؟ شاید ویسا ہی ہو گا یا حال بدتر ہو گا۔

ہاں کے ڈیڈی کی ذاتی لائبریری میں قوم بھجی کی
عسکری و جمیل پری دلیج الجہال کے صحن پر عاشق
ہونے والے شہزادہ سیف الملوک کی سوانح عمری
اپنی اصلی حالت میں محفوظ پڑی تھی جسے لکھنے والے
حضرت میاں محمد صاحب نے کسی بھی مہارت سے
ہٹ کر اصل کہانی کی صورت میں لکھا تھا۔ کتاب سفر
الحق معروف بہ سیف الملوک اصل کتاب جو
1898 میں حضرت منصفؒ نے اپنی زیر نگرانی طبع
فرمائی تھی۔ مالا نے سیف الملوک پوری پڑھ رکھی
تھی۔ اسے پنجابی کے شعر اسے سمجھ نہ آتے تھے مگر
شوق ایسا جنونی تھا کہ اس نے ڈیڈی سے پوچھا، بچہ
کمر پوری کتاب پڑھ لی تھی۔ بھلا کیا ہی عشق کیا تھا
سیف الملوک نے پری دلیج الجہال سے اور کیسے
دلیج الجہال مرمتی تھی شہزادہ سیف الملوک پر.....
اسے تو اپنی محبت اور عشق کے سامنے کسی اور کی محبت
وریا میں سے چلو بھر پانی کے برابر لگتی تھی۔ جو عشق
اسے علی بیسنی کے وجود سے تھا وہاں عشق تو کسی نے نہ

کھوٹی ہوئی تھی۔ اسے لگا، وہ سمندر پار کسی انجینی
ملک کی سرزمین پر نہیں بلکہ اپنے ڈیڑی ٹی لاجپری
میں بیٹھی سفرِ اقصیٰ یعنی قلعہ سیف الملوک و بدیع
الجہاں چھ رہی تھی۔ اسے پری کی ناز بھری آواز
لاکھوں میل کی دوری کے باوجود سنائی دے رہی تھی۔
جیسے وہ سیف الملوک کو سمجھا رہی تھی۔ اور ابن آدم کو
بے وقار کہہ رہی تھی۔

بے وقافی کھم تہ ذرا، پر یاں لوک وقافی
بے قدر ماں دی الفت مندی، نیچاں دی آشنائی
ترجمہ (پری بتاتی ہے کہ بے وقافی تمہارا کام
اور انسانوں کا وصف ہے، جبکہ پر یاں فطرتاً وقار
ہوتی ہیں۔ وہ جس سے محبت کرتی ہیں عمر بھر اس کی
وقار دار رہتی ہیں اور پری کہتی ہے کہ بے قدروں یعنی
انسانوں کی الفت بری ہے اور بچے لوگوں کی آشنائی
اور دل ربانی بھی بری ہے۔

نیچاں دی آشنائی لوگوں فیض کسے نہیں پایا
نکرتے انکور چڑھایا، ہر کچھا ڈھمایا
ترجمہ (بچے لوگوں کی محبت سے کس نے فیض
اور شرم پایا ہے؟ نکرتے کانٹوں پر انکور چڑھانے سے
ہر دانے کو زخمی تو آتا ہے، ہر کچھا ڈھانے سے
بدمال نے یہ الفاظ اسے ہی سمجھائے ہوئے تھے۔ جسے
ایک پردہ ساس کی آنکھوں کے سامنے سے مٹا تھا۔
اس کے کانوں میں میاں صاحب کا یہ شعر پھر سے
اسرت دکانے لگا۔

"نکرتے انکور چڑھایا، ہر کچھا ڈھمایا۔" ملا کو لگا،
بیاز کی پر تنس کھٹنے لگی ہیں۔ ایک، ایک، پردہ بٹنے لگا
تھا۔ غلوں اور محبت کو بے قدروں پر مت لٹاؤ، نیکر پہ
انکور مت چڑھاؤ اور ملا نے بھلا کیا، کیا تھا؟ اور کیا کچھ
کرتی آئی تھی؟ بے قدروں پر اعتبار کرتی رہی اور
غلوں لٹاتی رہی۔ جیسے بھڑ زمین پر غلوں والفت کے
چچ چھٹکتی رہی۔ بھلا بھڑ زمینیں چھٹیں لگاتی ہیں؟ محبت
چھروں کے سینوں میں سے چھٹے نہیں نکلتی پر چھروں

کے نیچے دی منی سے ہی چھٹے پھوٹتے ہیں۔ بس ملا ہی
کچھ نہیں پاتی تھی۔ اسے لگا، بدیع الجہاں نے اسے ایک
راہ دکھائی ہے۔ بدیع الجہاں جیسے روشنی کا تار بنی کمزری
تھی۔ اسے دست تھاری تھی۔ اسے سمجھا رہی تھی۔

"نیچاں دی آشنائی ہوں، لفظ بے وقافی میں
پایا؟" لفظ لفظ میں جیسے ملا کے لیے کوئی رہبر کھڑا
نکار رہا تھا۔ بات مشکل نہیں تھی بس ملا سمجھ نہیں پاتی۔
اس نے آفاق اور سوزن پر اعتبار کر کے دھوکا کھایا
تھا۔ اس نے ان دونوں پر غلوں لٹا کر غلط کیا تھا۔ ملا
نے بے قدروں پر غلوں لٹا کر غلط کیا اور انہیں اعتبار کے
قابل سمجھا۔ وہ بچوں نہیں سمجھ سکتی کہ سون کی کزن،
بھینی کی نام نہاد شہینزادوں، ملا کے لیے کیوں غلوں
ہوئی؟ وہ بھی کس کیوں نہیں سمجھ سکتی، سون کے انسانی
ثبوت سے قطعاً کس کر کے آنے والا آفاق سون
کی ہی خرابی تھی ملا سے کس ہوگا؟ تو گویا ملا نے
حسبِ کھلیا تھا، وہ ایک جیٹک سازش کا شکار ہو رہی
تھی۔ اور اسے نفسیاتی حربوں سے ٹیڑھ اور نارنج کیا
جا رہا تھا۔ اور سب سے بڑی بات اس سازشی
منصوبے میں آفاق اور سوزن کا بھی پرچار رہا تھا۔

وہ ابھی آفاق اور سوزن کی منافقت کے بارے
میں کچھ اور بھی غموں کھتے نکلتی جب "اوں ہوں" کی
آواز نے ملا کو پھر سے چوہکا دیا تھا۔ جیسے "اوں ہوں"
میں کوئی تنبیہ تھی۔ ملا کو کسی بات سے منع کیا جا رہا
تھا بھلا کس سے؟ اس نے تالاب کے کنارے پر
رکھے گیلے میں سے کئی نکھر تو نکالے ہی تھے بلکہ اس
سے بھی پہلے پودے کی شاخوں پر لگی ساری لکڑی کو توڑ
کر تالاب میں پھینک دیا تھا اس نے پھولوں سے
لہے پودے کو قریب، قریب گھبرا کر دیا تھا۔ اب کہ
ملا کو کچھ غموں سا ہوا تھا۔ بھلا ایسی بھی کیا۔۔۔
بھری؟ وہ خود کو کھن کھن کرنے لگی تھی۔ جب "اوں
ہوں" کی آواز پھر سے سنائی دی۔ اب کہ ملا نے
بانیں جانب دیکھا تھا۔ پھولوں کا اونچا جھنڈ ایک

بہت میں جان پڑ گئی تھی۔ مالا کو گویا بہت ہی لطف آیا۔
 ”ہاں، ہاں۔ تم چاندی کا بت ہو۔
 ہمارے ہاں تمہارے جیسے بہت کو خرید کر حرا پر
 چن حاد اوہتے ہیں۔ آں۔۔۔۔۔ ہاں۔ میں یہ کیا بول
 گئی۔ تم تو بدلی افعال ہو۔۔۔۔۔“ مالا نے کمال عظمتی
 سے اسے ایک مرتبہ بھر ہوتی کر دیا تھا۔ بھلا پر یاں
 ہوتی بھی ہو جاتی ہیں؟ مالا کو پہلی مرتبہ تجربہ ہوا تھا سو
 کچھ حیرانی بھی گئی۔ مگر سامنے کھڑی عورت اس کے
 سارے شوق روشن کرنے کے موڈ میں تھی۔

”میں ملی بیسٹ کے نکاح میں ہوں۔ جس
 شب تمہارا اٹھ بیٹھی تھی اسے نکاح ہوا تھا اسی شب میں
 بھی خواب دیکھا کہ اس کے نکاح میں آگئی تھی۔ اس مگر میں
 حیران تھا۔“ افسانہ تو بے وفا ہوتے ہیں جبکہ ہم
 نہیں۔ مگر کبھی نہیں چھوڑتے۔“ وہ اپنے تئیں مالا
 کے خواہوں پر جم پھڑپھڑاتی تھی۔ کچھ ہل کے لیے مالا
 بھی پکرا کر رہ گئی تھی۔ اسے سنبھلنے میں بہت دقت لگا
 تھا۔ یہ انکشاف لمبے بھر کے لیے ہلا کر رکھ گیا تھا
 اسے۔۔۔۔۔ مگر وہ بھر بھی سنبھل ہی گئی تھی۔ اس نے
 سامنے کھڑی پری بیکر کو دیکھا تھا۔ انسانی ڈھانچے
 میں ڈھلا وجود۔۔۔۔۔ پھر سے پرانا قابل فہم تاثرات اور
 الفاظ ایسے تھے گویا مالا کی سستی مل کر رہ گئی تھی۔

”اوہ۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے، تم بیسٹ کے نکاح
 میں ہو۔۔۔۔۔ اور مجھے پریشان کرتی ہو، پھر میری ہجرت
 بیسٹ پریشان ہوتا ہے تم کیسی محبت کرتی ہو ملی بیسٹ
 سے؟ اس مگر میں رہنے والوں کو دک بچھاتی ہو، مگر وہ
 میں قسمیں کھاتے ہیں۔“ مالا نے پورے جوش اور
 فیس کے عالم میں جارحانہ تہور کے ساتھ ملتی میں دوبائی
 کلی سامنے کھڑی عورت کو ماری تھی۔ یہ حملہ بہت
 اچانک تھا۔ ہوتا تو یہ چاہے تھا، مالا پھر بھی مارتی تو وہ
 عورت شس سے مس نہ ہوتی بلکہ ہندو کی کوئی بھی
 اس پر اثر نہ کرتی مگر وہ تو معمولی سی کلی کا زور بھی سہ
 نہیں نکلی تھی حالانکہ کلی اس تک پہنچی بھی نہیں پائی تھی۔

جنگ جاتی حسین عورت سے لٹک رہا تھا۔ وہی جوان
 عورت جو مالا کو کمرے میں ملی تھی۔ چمکتا ہوا سفید
 چہرہ۔۔۔۔۔ سانچے میں ڈھلا بدن۔۔۔۔۔ نہ نقوش مشرقی
 تھے نہ مغربی۔ کمال کا نقیص نقوش سے ترشا چہرہ تھا۔
 مالا کو پہلی مرتبہ ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس
 نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں خوف کبھی نہیں تھا۔ مالا
 کچھ تحیر رہ گئی تھی۔ مگر فی الحال حیران ہونے کا بھی
 اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ اپنے قدموں پر اٹھ
 کھڑی ہوئی۔ جھولی میں گری ساری پیچاں تالاب
 میں گر پڑی تھیں۔ مالا نے جبکہ کر ایک کلی کو مٹھی
 میں دالیا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔
 ”پری بدلی افعال۔“ مالا نے زیر لب بڑبڑا
 کر کہا تھا۔ ”مجھے تم سے ملاقات کا بہت شوق تھا۔
 میں ایک عرصے سے تمہارے حرم میں گرفتار تھی۔ مجھے
 یقین تھا اتم میرے تصور سے بھی بڑھ کر حسین
 ہوگی۔“ مالا نے دو قدم غیر محسوس طے کرتے کرتے آگے
 بڑھائے تھے۔ سامنے کھڑی چاندی میں ڈھلی عورت
 شا کڑو رہی تھی۔ اس کے تاثرات بہت کمزور تھے۔
 مالا خود بھی تحیر رہ گئی۔ ”تو کیا پر یاں بھی حیران ہوتی
 ہیں؟“ وہ گویا خود سے پوچھ رہی تھی۔ جبکہ دوسری
 طرف حیرت کا انداز اور شمار ہی نہیں نکلتا تھا۔

مالا ابھی نہیں تھی، ڈوری نہیں تھی۔۔۔۔۔ اس کے دل
 میں کہیں خوف کا نشان تک باقی نہیں تھا۔ خوف اس
 کے دل سے بے وقافی کر گیا تھا مگر مالا اس بے وقافی
 پر بہت خوش اور مطمئن تھی۔

”آج تم خاموش کیوں ہو؟ لولتی کیوں
 نہیں؟ مجھے تمہارے بولنے کا شدت سے انتظار
 ہے۔“ مالا جیسے اس کی خاموشی سے بھی لطف اندوز
 ہو رہی تھی۔ آج مالا کی ترکیب ہی کچھ اور سی۔ اس کے
 سامنے بدلی افعال جو کھڑی تھی۔ اس کا تصور دانی بیکر،
 سیف الملوک کی محبوبہ۔۔۔۔۔

”تم جانتی ہو، میں کون ہوں؟“ چاندی کے

ہوا میں معلق رہ کر بالا خرو زمین پس ہو گئی تھی۔ جبکہ سامنے کھڑی چاندی کی عورت نے بے ساختہ بیچ ماری تھی۔ پھر وہ اگلے قدموں بھاگ گئی۔ مالا کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جوتا اٹھا کر چاندی میں دھلی اس عورت کا پیچھا کرے مگر وہ گلاب کے پھنڈ میں غائب ہو گئی تھی۔ اور مالا... ایک گہری سانس لی۔ پتلیوں کے ٹکڑے پر بیٹھ گئی۔ اس کے سر پر سے خوف کا بھانک بھوت اتر گیا تھا۔ قوم جن کی ایک عورت ملی تھی اسے نکاح کا اعتراف کر کے بھاگ گئی تھی۔ مالا نے اسے بھاگ ڈالا تھا۔ ماری پہ خاکی جیسے سہقت لے گیا۔ اس نے ڈر کو ڈر کے ساتھ کٹ ڈالا تھا۔ اس ٹکڑے کو بدلی لیلال پر نوٹ کے پیارا کیا تھا۔

جیسے کوئی جمیل سیف الملوک پر سر جھکا کے خنڈی قلعی چاندی میں ٹکٹا رہا تھا۔ "بھلا یہاں کس کے ہاتھ آتی ہیں؟ پر یوں کو تو چھوٹا بھی ممکن نہیں۔" پھر یہ کسی پر ہی گئی جو قلی کا دار سے نہ پانی اور انسانی لمس کی قربت سے بھاگ گئی۔ مالا تو انہی میں سے قریب آ رہی تھی۔ وہ اسے قلی مار کر چھوٹا چاندی کی اور شاید وہ عورت اس کا ارادہ بھابھ لیتی تھی بھاگ نکلی۔ اگر مالا اسے چھو لیتی تو اسے نوٹ پاتا۔ شاید آج فیصلے کا... آگئی اور اوراک کا دل نہیں تھا۔ مالا پھر کی ایسی ہی ملاقات کا انتظار کرنے لگی تھی۔

علی بیٹی نے دو دن پہلے ہی مالا کو ہی تو سمجھا یا تھا۔ "یہ ڈر اور خوف کچھ نہیں ہوتا۔ انسانی ذہن کے دوسرے ہیں سارے، کچھ بھی خود پر سوار کرو، چاہے خوشی، چاہے غم یا خوف... جو سوچو گے اسی کے ذریعہ اثر ہو گے، دیکھو، کنویں میں جھانکے بغیر اس کی گہرائی کا پتا نہیں چلتا۔ آگ کو چھوئے بغیر اس کی تپش کا احساس ہو جاتا ہے مگر نزدیک جاؤ کچھ چیزیں سمجھانی پڑتی ہیں اور کچھ بغیر سمجھائے اوراک تک پہنچ جاتی ہیں۔ تم خوف کو آگ کی تپش مت سمجھو بلکہ کنویں کی طرح سمجھو... جب تک خوف کی گہرائی میں نہیں

اتر و گئی، جب تک خوف کو ہاتھ سے محسوس نہیں کرو گئی، وہ کبھی تم سے دور نہیں جائے گا۔" یہ بیٹی کے قول تھے پھر بھلا مالا ان پر ایمان کیسے نہ لاتی۔ اس نے خوف کو جسم شکل میں دیکھ کر اسے چھوٹا چاہا تھا اور خوف، مالا کے خوف سے بھاگ گیا تھا۔ مالا کا دل چاہ رہا تھا جو آسمانوں پر سر جھایاں اتر رہی ہیں اور جو کچھ نہیں قطاروں میں تیر رہی ہیں تم انہیں آج تو وہ ان کے ہمراہ قلعہ کر لے، آج مالا کی فتح کا... پُرسرت دن تھا۔ آج مالا کی ان دیکھے اور آنکھوں دیکھے خوف سے آقا لوی کا دن تھا۔

ﷲ ﷻ

اگلے بہت سارے دن جیسے امن اور شانتی کی پھوار بنے کر آئے تھے۔ زندگی کی بگڑتی ترتیب میں سنوارا اور کھرا رہ گیا تھا۔ بگڑتی چیزیں جیسے اپنے اصل سے تھک کر رہی ہیں۔ مگر مالا اتنا ضرور جانتی تھی کہ یہ سکون ہی عارضی ہے۔ ابھی اس کی آزمائش ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی کچھ اور امتحان باقی تھے۔

اس دن شام سے کچھ پہلے ہیرا کی کال آگئی تھی۔ وہ اسے میکس کی برتھ ڈے پارٹی کا تارہی تھی بلکہ یاد دہانی کر داری تھی۔

"سات بجے تک پہنچ جانا... میں بھی سات بجے تک آؤں گی۔" ہیرا عموماً ہر قسم کے قطعین انجوائے کرتی تھی۔ سو اس وقت بھی بہت ایکساٹڈ تھی۔ مالا کا پہلے تو ارادہ ہوا تو اس ڈول ہو گیا تھا۔ پھر ہیرا کے اصرار پر اس نے حالی بھرنی تھی۔ پھر جب بیٹی سے مالا نے پوچھا تو اس نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔ مگر ساتھ تاکید بھی کی تھی۔

"اگر آفاق فارغ ہے تو اسے ساتھ لے جاؤ۔" جانے اس کے شوہر کو فیصلہ آفاق پر کیسا اذیتناک تھا؟ مالا کو آفاق ذہر لگتا تھا۔ دل تو چاہتا تھا اسے اٹھ کر باہر بیٹھک دے مگر بیٹی کی وجہ سے مجبور تھی۔ مالا نے آفاق سے مارے پتہ صحتی پوچھا تھا

تالاب کے کنارے بھر کوئی پری
 بہو اڑے بیٹھی تھی۔ وہ جو روشنی کا بیٹا تھی اور مالا
 کو صاف راہ دکھا رہی تھی، اسے سمجھا رہی تھی کہ کچھ
 لوگ تلاش میں بھی رہیں تب بھی لپے ہی ہوتے ہیں۔
 اور بچوں کی پاری، دلدار سے اعتبار ہی لیتے ہیں۔
 بے یقینی، دکھ اور مصداقت ملتے ہیں، اسے لگا، بدلتی
 لہجہ اس کے قریب آگئی ہے۔ وہ جمیل سیف
 اہللوک کے خطے پانڈوں میں اتر کر اسے بتا رہی تھی
 کہ دکھ اور اچانک صدمے سے منہ ملتے کیسے ہیں؟ وہ
 اسے مضبوط رہنے اور حوصلہ پکڑنے کی ہمت دلا رہی
 تھی۔ وہ بدلتی لہجہ ای تو تھی جو ایک مرتبہ پھر روشنی کا
 بیٹا بنی کھڑی تھی۔ اسے بتا رہی تھی کہ انسان کا بھروسہ
 جب ٹوٹتا ہے جب اللہ پر اس کا بھروسہ ہلکا ہوتا
 ہے۔ زاہد اور متقی بنی مشقت کے نہیں بن
 جاتے۔ دو گاہوں اور صحراؤں میں گرنا پڑتا ہے۔ کسی
 نے مالا کے کانوں میں امرت قطرہ قطرہ ڈکا دیا
 تھا۔ اس کی تمام آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئی تھیں۔
 نکلتوں کی شکل میں دھجی دھجی گھبرا اوجھرنے
 دھیرے چھٹ رہا تھا جیسے اندھیرا کم پڑ رہا تھا۔ جیسے
 غبار کے چھکے کوئی غماسا بھٹوٹنا رہا تھا۔ وہ بہت دور
 لاکھوں میل کی دوری پر جمیل سیف اہللوک کے بے
 کناروں پر شیریں قلعے فضاؤں میں بکھرتے سنائی
 دے رہے تھے۔ کوئی بہت سوز و گداز سے اللہ کی
 "سم" پڑھنے میں دوبا بھلائے ممکن تھا۔ وہ بھلا کون
 تھا؟ سیف اہللوک یا بدلتی لہجہ؟ اللہ کی بادشاہی
 ہمیشہ کی ہے مایا کا راج ہے، اسی کی حکومت ہے مایا
 کے ملک ہیں اور اسی یعنی اللہ کے در پہ بھی سلاہی
 دیتے ہیں۔ بھی جھٹکتے ہیں۔ آدم جنم اور فرشتے ہر دم،
 ہر جان اللہ کی بندگی میں مصروف اور اسی کے سامنے
 سر بسجود ہیں۔ سیاہ دگی جیسا اندھیرا کچھ اور چھٹ گیا
 تھا۔ غبار پہلے سے ہلکا تھا۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں
 کھول گئی تھی، اسے اندھیرے میں کچھ، کچھ روشنی نظر

آ رہی تھی، یہ روشنی بھٹوٹی تھی یا بھر.....؟

وہ ہی ہے جو غرور اور تکبر کرنے والوں کے
 غرور کو توڑ ڈالتا ہے۔ غریب، بے کس، مسکین اور
 مظلوم کا ساتھی بددگار ہے، دکھ قاف تک روزی
 پہنچانے والا چہ نہ پرند تک رزق دینے والا وہی اللہ تو
 ہے۔ پردے جیسے ایک، ایک کر کے کھٹک رہے
 تھے۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھا تو اس کا پکڑا دماغ
 ٹھہر گیا۔ اسے گز رہے ہوئے کچھ پل یاد آئے تھے،
 اسے کوئی بات یاد آئی تھی۔

"تم حق پر مہرے بھائی کی زندگی سے
 جانے والی ہو، بہت جلد ہی میری نصیبیں طلاق دے
 دے گا شش غرور، تکبر سے بھری یہ آواز کس کی تھی؟ مالا
 عالم بالا میں کھڑی تھی اس آواز کو پہچان سکتی تھی۔ اس
 کا دل ایک مرتبہ پھر لہجہ بھان ہو گیا تھا۔ اس کی
 آنکھوں میں غم بھر کے تھے مگر پھر جیسے کوئی سکون کا
 آسمان اسے دھو دھو کر پڑھ کر پھر کھٹکے لگا تھا۔ جیسے کسی
 نے مالا کو اپنے محفوظ حصار میں مقید کر لیا تھا۔ اس کے
 اندر باہر خط و کتابت اترے گی تھی۔

اس نے یقین کو اپنے اندر مضبوط کیا تو اللہ نے
 اس کے قدم زمین پر مضبوطی سے جما دیے تھے۔ وہ خلا
 سے باحفاظت زمین پر اتر آئی تھی۔ اس کے قدم زمین
 پر جم گئے تھے اور وہ کچھ لوگوں کی اوقات پہچان چکی تھی۔

"مارگٹ مشکل ضرور ہے پر ناممکن نہیں۔
 میں جانتی ہوں لوگوں کو ایک ہی جھٹکے کے ساتھ غم کر سکتی
 تھی۔ مگر ایسی غم کا حشرہ کیا تھا..... جس میں مقابل کو
 اس کی بے خبری میں مات دی جائے۔" کچھ عرصے
 بلکہ کچھ دن پہلے تو اس نے اپنے کمرے کی واحد گھاس
 و غزو کے دوسری طرف ایک عورت کے ذہر پلے
 الفاظ سنے تھے۔ وہ عورت سون اور علی بیٹی کی فرسٹ
 کزن سوزن تھی۔ مالا نے سوزن کی اصلیت پہچان
 لی تھی اور مالا نے آفاق کی حیثیت بھی سمجھ لی
 تھی، اب کوئی راز "راز" نہیں رہا تھا جیسے حقیقت

نظم

نصیب سے نصیب کو نصیب ہو
کہ پیار تیرا مجھے بھی نصیب ہو
جتنا قریب ہوں میں تیرے
اتنا تو بھی میرے قریب ہو
لگ جائے تجھے ایسا مرض پیار کہ
میرے سوا کوئی نہ طیب ہو
ٹلے مجھے ایسے پیار تیرا کہ
زمانے میں کوئی نہ رقیب ہو

شاعر: میر اختر

مرسلہ: مہوش آفتاب، ماسلام آباد

روشن ہو گئی تھی۔ جیسے مالا کے حقیقی دشمن مکمل کر اس کے سامنے آ گئے تھے۔ آگہل کا مذاق تکلیف دہ ضرور تھا، مالا غور کو خوش بخت سمجھتی تھی جسے دوست، اور دشمن کی پہچان پر وقت ہو چکی تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا وہ جلی بیٹی کو آفاق کے گھٹاؤ نے روپ اور سوزن کی کرپہ شکل کیسے دکھائے۔ اسے کوئی ٹھوس ثبوت کی اشد ضرورت تھی۔ کوئی ایسی شہادت، کوئی ایسی گواہی جو دلیل بن کر سامنے آتی۔ جو جلی بیٹی کو یقین کی پہلی سیڑھی سے آخری سیڑھی تک لے جاتی جب وہ سوزن اور آفاق کے اندر کی سیاسی کوکھج نکالے۔ وہ مالا کی بات کا اعتبار کر لیتا۔ یہ کام بہت مشکل تھا وہ سب سے برتر تدبیر کرنے والے اپنے رب پر بھروسہ کرتی تھی وہی اسے اس مشکل سے نکالنے والا تھا۔

پچھلی دیوار سے گر چپکائے جیسے وہ اپنے حواسوں میں آچکی تھی۔ پھر کھانا دماغ اب نہ سکون ہو چکا تھا پھر کچھ دیر بعد اسے تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے میکس کھلے دروازے سے لہا پھندا اندر آ گیا۔ وہ کارپے پر میں کھڑی تھی اور میکس اسے کچھ بات کے ساتھ گھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

”تم اندر کیوں نہیں نکلتی؟ یہاں کیوں کھڑی ہو؟“ میکس حیران ہوتا ترک کر کے شاہز سانسے میز پر رکھتا ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولنے کے لیے واپس آیا تھا۔ وہی دروازہ جس کے پیچھے بہت سے سیاہ دل والے چہرے موجود تھے۔ جو کچھ عرصے پہلے تک مالا کے لیے بہت محترم تھے۔ آج وہ اپنی غلامت کے باعث ہاتھوں میں گر چکے تھے۔ اس نے تختی سے جڑے بچھتی لے تھے۔ وہ میکس کو جنڈل گھماتا دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھل جاتا اور ان دو لوگوں کی غلط صورتیں مالا کے سامنے آ جاتیں۔ وہ قیامت تک ان دو لوگوں کی صورت کبھی نہ دیکھتی مگر جو اتنی مجبور تھیں۔ اسے بالآخر

سوزن اور آفاق کا سامنا تو کرنا تھا۔ سوزن جو انجینیئر مالا کی پہلی دوست تھی، جو اسے بہت قلمس مکتی تھی۔ پھر آفاق تھا، بیٹی کا مہراز اور اس کا عزیز دوست..... مالا کو حیرت ہوتی تھی، لوگ اسے چال باز کیوں اور کیسے ہوتے تھے؟ قلمس رشتے بناتے اور پھر توڑا لے، مالا کو آفاق نے بہن بنایا تھا اور بہنوں کے ساتھ بھلا کوئی ایسے کرتا ہے؟

وہ ایک مرتبہ پھر ان گھٹوں سے سنہرے جنڈل کو دیکھ رہی تھی۔ جو ٹھک کی آواز کے ساتھ کھل چکا تھا۔

”تم اندر کیوں نہیں نکلتی.....؟ ڈرائنگ روم میں مومن موجود تھی۔ تم اس گھر میں آنے والی پہلی مہمان نہیں ہو، مومن تم سے پہلے کی آئی ہوئی ہے۔ اور ہائی لوگ بھی آتے ہی ہوں گے۔“ میکس نے مسکرا کر جیسے وضاحت کی تھی۔ وہ اس کا مذاق بکھ گیا تھا۔ شاید وہ غلیظ میں اکیلے ہونے کے خیال سے ڈرائنگ روم میں نہیں گئی تھی۔ میکس اب دروازہ کھولے اسے اندر آنے کا کہہ رہا تھا۔ مالا کے ارادوں قدم آگے کی طرف بڑھے تھے۔ اور دوسرے

ہی لمبے جیسے اس کے قدم زمین نے پھر سے جکڑ لیے تھے۔ ڈراؤنگ روم کا منظر واضح تھا۔ وہاں مون کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ نہ سوزن اور نہ ہی آفاق..... پورا کمر اہماں، ہماں کر رہا تھا۔ باقوت اور پیرے سے سجا کر اذن سر پر کھائے سرخ ٹھٹھے سنگی بالوں کی اونچی سی پونی بنائے پلاشبہ وہ مون ہی تھی۔ سرخ سنگ کی جیروں تک چھوٹی روک چپنے، ناگہ پر ناگہ رکھے وہ بڑے غرے اور عطرائی کے ساتھ صوفے پر بیٹھی سامنے کسی ڈیکوریشن میں کود کچھ دی تھی۔ مالا کی موجودگی محسوس کر کے اسے ایک شرک شاک لگا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ صوفے سے اٹھ گئی تھی۔

”تم نے اسے بھی انوائٹ کر رکھا ہے؟“
مون نے غیظ کے عالم میں میکس سے پوچھا تھا۔ اس کے چہرے پر ناقابلِ غم تاثرات چھائے تھے۔ گویا اسے مالا کی موجودگی نے بہت شاک کھا تھا۔ وہ کم از کم... مالا کی یہاں توقع نہیں کر رہی تھی۔ اگرچہ اس کے انداز سے یہی ظاہر تھا تاہم مالا کو لگ رہا تھا وہ رونا کر رہی ہے۔ اسے پہلے سے خبر تھی کہ مالا بھی یہاں آئے گی۔ جبکہ میکس، مون کے الفاظ پر کچھ رونا رہ گیا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر ہفت کی چٹائی تھی۔

”اے مے میری اچھی جان کچھ بھلا ہے۔ یہ سیرا کی دوست ہے اور تمہاری بھائی..... اگر اسے انوائٹ کیا ہے تو تمہیں کیوں برا لگا؟“ میکس اپنی شرمندگی منارہا تھا۔ اور مالا کے سامنے مون کی اتنی عجیب بات کا اثر ذہن کر رہا تھا۔ جبکہ مالا تو ششدر سی مڈرائٹک دم میں صرف مون کھڑی تھی تو پھر سوزن اور آفاق کہاں تھے؟ اس نے پاگلوں کی طرح آنکھیں میاڑ، میاڑ کر پھا کر اچھاں مارا۔ اسے سوزن اور آفاق کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ جانے وہ ایمانیک کہاں چلے گئے تھے؟ مالا کو دیکھ کر کہاں چھپ گئے تھے؟ اس کی موجودگی محسوس کر کے کسی جگہ اور کہاں غائب ہوئے تھے؟ مالا کی آنکھیں صوفے کے پار پردوں کے پیچھے دروازے کے دائیں

بائیں دیکھ دیکھ کر جھٹکے لگی تھیں جبکہ مون اس کی کیفیات سے بے نیاز باقی فٹ پوائنٹ پر غنائی اسی غرور کے ساتھ واپس گھر چلی گئی تھی۔ جبکہ میکس جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ مالا چونک کر میکس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”آفاق اور سوزن کہاں ہیں؟“ اس نے کمرے میں میکس کے علاوہ کسی اور کو نہ پا کر شکر لکھ میں پوچھا تھا۔ وہ مون کے چلے جانے پر قطعاً غور نہیں کر سکی تھی۔ وہ تو صرف آفاق اور سوزن کی آوازوں میں الجھی تھی۔

”وہ دونوں تو نہیں آئے۔ سوزن نے معذرت کر لی تھی جبکہ آفاق.....“ میکس بولتے، بولتے ایک دم روک گیا تھا۔ جیسے ایمانیک اسے کچھ یاد آیا تھا۔ جیسے ایمانیک اسے کچھ خیال آیا تھا۔ پھر وہ سر جھٹک کر کچھ ہنسا ہنسا تھا جب کارپنڈر سے پیر اور ایک کچھ لپٹ کر آواز سنائی دی تھی تب وہ مسکراتا ہوا انھیں دیکھ کر بے باہر نکل گیا..... جبکہ جانتے جانتے اس نے مالا کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔

”سوزن اور آفاق کہاں چلے گئے؟ ابھی تو یہیں تھے اور میرے خلاف بول رہے تھے۔“ مالا کی خودکامی میکس کو ضرور غصہ دیتی جو اثر سیرا کی چٹکار اس کا وحیان نہ بنا دیتی۔ کچھ دیر میں میکس کے گھٹے گھٹے مہمان جمع ہو گئے تھے۔ پھر مکمل زعفران زار میں گئی تھی۔ میکس نے تالیوں کی گونج میں ایک کاٹا تھا، وہ بچوں کی طرح خوش نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے سب سے پہلے مالا کا شکریہ ادا کیا، سب سے گفت و مول کرتے ہوئے وہ خوش ہونے کے ساتھ، ساتھ کچھ افسردہ بھی تھا۔ اب بکر کے پوچھنے پر اس نے افسردگی سے کہا۔

”کیا تھا جو سوزن بھی سیرا دل رکھنے کو آجاتی مگر اسے دل رکھنا آتا ہی کہاں ہے؟“ میکس کا لہجہ نرم سا تھا۔ اس اور غرور سا عجیب سا آٹچ دیتا ہوا..... جبکہ مالا تو اس کے الفاظ پر گویا دم بخود ہو گئی تھی۔

”سوزن بھی آجاتی؟ سوزن آتی تو تھی..... یہ

”کیا ہوا ہے جنہیں۔۔۔؟“ نفرت اور قہر سے گویا کرنا لگی پہلے کی طرح باہل انداز میں بیان کیا قدر مشکل ترین اس وقت۔ مگر مالا نے یہ مرحلہ بالآخر طے کر لی لیا۔ وہ آفاق سے کلام کرنے پر خود کو تیار کر چکی تھی۔

”گلے میں بہت درد ہے، دوا بھی لے کر آیا ہوں مگر کچھ آفاق نہیں۔“ آفاق نے تکلیف دہ کراہتی آواز میں کہا تھا۔ یقیناً وہ ہمدردی کو نئے کے چکر میں تھا اور مالا اپنی رحم دلی کا مظاہرہ کرنے سے کھڑی رہی تھی۔

”تو صبر کرو، آرام آئی جائے گا۔“ اس نے جتنی چھپا کر کہا۔

”کب سے جی رہی تو کر رہا ہوں۔“ وہ بھرتے کہا۔
”تو اب میں کیا کروں۔۔۔؟“ مالا نے منہ نکالیا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے خوب کھری، کھری کھا کر ہاتھ سے بکڑ کر کمر سے نکال دے مگر اسے صبر کی طلب کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا تھا۔ یہ اس نے خود سے وعدہ کر رکھا تھا اور وہ عہد توڑنے والی بننا نہیں چاہتی تھی۔

”ایک کپ قہو بنا دو، مجھے لگتا ہے قہو سے آفاق پاؤں گا۔“ آفاق نے مسکین صورت بنا کر فوراً فرمائش جزوی تھی۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا وہ کھٹ سے اسے جواب دے دیتی مگر اس انزلی مردیت کا کیا کرتی؟ پھر وہ اپنی بد مزاجی سے آفاق کو چوکنا کرنا بھی نہیں چاہتی تھی، اس کا بدلہ وہ تیر کچھ کر یقیناً وہ یہ کھوج کر نکال ہو سکتا تھا اور مالا اسے نکال نہیں کرنا چاہتی تھی، وہ ایسی ہی کسی سازش پلاننگ میں آفاق اور سوزن کو روکتے ہاتھوں پکڑنا چاہتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب بیٹی بھی قریب ہوتا۔ اور اسے پوری امید تھی اللہ اسے بہت جلد ایسا ہی کوئی موقع فراہم کرنے والا تھا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی آفاق، مالا کے لیے کتنے بے ہودہ الفاظ بول رہا تھا، وہ اس کا دشمن تھا اور آستین میں بیٹھ کر بیٹی پر وار کرنے والا

میسکس کیا ہے خوف ہے؟ یا مجھے احمق سمجھتا ہے؟“ وہ انتہائی کٹی اور بدگمانی سے سوچ رہی تھی۔ اس نے سوزن اور آفاق کے ساتھ میسکس کو بھی اسی ٹھنڈی میں کھڑا کر دیا تھا۔ دھوکے بازوں اور فریبوں کی ٹھنڈی میں۔

☆☆☆

وہ ایک بھر پریشام گزار کر جب گھر واپس آئی تو آفاق کو لاناؤچ میں کراہتے ہوئے پایا تھا۔ وہ صوفے پر گھلا پکڑے لیٹا تھا۔ اور پائے والے کیے جا رہا تھا۔ مالا اسے دیکھ کر حیرت مچ گئی تھی۔ کیا آفاق چھلا دیا تھا؟ بل میں ادھر اور بل میں ادھر۔۔۔ مالا اس پر تین حرف بھیج کر آگے بڑھ رہی تھی جب آفاق نے کراہتے ہوئے اسے پکارا تھا۔

”کیسی بہن ہو، روتے بھائی کو نظر انداز کیے آگے بڑھ رہی ہو؟ رکتی کیوں نہیں؟ بندہ کسی کا احوال ہی پوچھ لیتا ہے۔“ وہ کبھی سے مل سوا ہوا کچھ بڑی دھکی نظر سے مالا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتے بڑھتے ایک دم رک گئی تھی۔ اسے آفاق کی ڈھمائی پر غصہ سا آ گیا تھا۔ کوئی اتنا ذہین بھی ہوتا ہے؟ کوئی اتنا بے شرم بھی ہوتا ہے؟ اس کا دل چاہتا تھا۔ وہ اگلے قدموں پیچھے ہٹے اور آفاق کے منہ پر تین چار طمانچے دے مارے۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ آفاق کا منہ توڑ کر اس کا کرپہ روپ، اندر کی سیاہی اور منافقت کا سارا کچا چھٹا نکھول دے۔ مگر اس کے منہ پہ آیا سارا تلخ کلام ایک ضبط اور صبر کے چیز رہے میں بہہ گیا تھا۔ اس نے انتظار کی طابوں کو کتنی سے پکڑ لیا۔ وہ تدبیر کرنے والے کی سب سے بہترین تدبیر کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے انتظار کرنا تھا۔ حقیقت کے کھلنے کا، سچائی کے ظاہر ہونے کا اور سوزن، سوزن، آفاق کی غلط پلاننگ کے کھلنے کا تو پھر وہ اتنا سارا انتظار کیوں نہ کر لیتی۔ جب تک ملی بیٹی سب کچھ خود بخود نہ جان لیتا۔۔۔۔۔ سو وہ اپنے اندر احمق قہر سے کی لہروں کو دوہاتے ہوئے واپس پلٹ آئی تھی۔

آفاق کچھ ہونے لگا۔

”تم کیا سمجھ رہی ہو، یہ میگزین میں لایا ہوں؟“ آفاق نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا تھا۔ تو وہ چپے سے گنگے کو تھوٹے ملی تو وہ بھی فارم میں آ گیا۔

”پھر کون لایا ہے؟ مہینی؟ میں یا چاہو؟“ مالا کے تہہ خضہ تک تھے۔ آفاق پھر سے کم گیا۔ ڈرامے باز صاف ایکٹنگ کرتا نظر آرہا تھا۔

”آئی سوئیر مالا.....! مجھے اتنے بے ہودہ رسالے طریقے نے کا کوئی شوق نہیں۔“ آفاق اب...

بڑی عاجزی سے کہہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد یہ بے مقصد بحث مہینی کی آمد کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ مہینی کے آتے ہی مالا کو میکس کی پارٹی میں سون، سوزن اور آفاق کی بکواس پھر سے یاد آگئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً آفاق کا کچا پٹا کھول کر رکھ دے مگر بعض قوی خواہشات جتنی بھی قوی ہوں ان کو پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ بھی بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک انتظار کی زنجیر میں بندھ گئی تھی۔ وہ کل اپنی وقت کچھ بھی بول کر مہینی کو بدگمان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنا اعتبار ہلکا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی مہینی خود سوزن، مون اور آفاق کی اسلٹ کو کھینچ لے لے، ان کی مکاری، عمارتی اور سازش کو سمجھ لے اور ایسا ناممکن تو ہو کر نہیں تھا۔

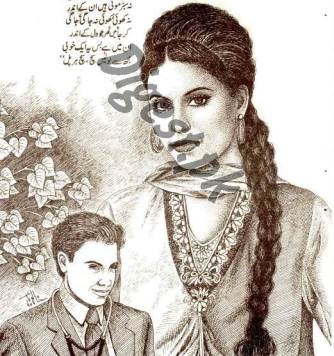
مہینی کے آتے ہی مالا کی معروضات بڑھ جاتی تھیں، اسے سونے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ ان دنوں مہینی رات کو کبھی گھر میں رہتا تھا سو وہ بے نام سا خوف اور جیب سی آئینیں سائی نہیں دیتی تھیں۔ کبھی، کبھی مالا کو لگتا تھا یہ اس کے اپنے ہی ذہن کے دوسرے ہیں، سو وہ سر جھٹک کر نظر انداز کر دیتی تھی ویسے بھی بڑے دنوں سے وہ سفید لباس میں اپنی عورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مالا کی ماری ہوئی گلی نے جیسے کوئی کا کام کیا تھا۔ وہ دوبارہ دکھائی ہی نہیں دی۔ حالانکہ مالا کو اس سے دوبارہ ملاقات کا خاصا اشتیاق تھا۔

چونکہ بہت دنوں سے کوئی جیب واقعہ رونما نہیں ہوا تھا سو چاہے سمیت کبھی دلی اطمینان محسوس کر رہے تھے۔ حالانکہ جانتے بھی تھے کہ یہ اطمینان بس عارضی ہے۔ تاہم کچھ دن تک سکون سے تو رہا جاسکتا تھا۔ اس دوران آفاق نہ جانے کہاں سے ایک بزرگ خاتون کو دریاخت کر لایا تھا۔ جنہوں نے پورے گھر کے کونے، کونے پر زعفران اور گلاب کے عرق میں بیکے تھوٹے والے پانی سے چھڑکا دیا تھا پھر بلند آواز میں قرآنی آیات کی تلاوت پورے تین دن تک کرتی رہی تھیں۔ جرنی میں ایسی عجیب بزرگ عورت کو دیکھنا بہت عجیب لگتا تھا۔ پھر مالا کو چاہا کہ یہ عورت فوراً ان کے ابو بکر کی والدہ ہیں جو ایران سے آئی تھیں اور ان کے پاس روحانی علم تھا۔ ہیرا کی ساسی سے مل کر مالا کے بہت سے دوسرے خود بخود ختم ہو گئے تھے۔ بالآخر صاحبہ نے تاپا تھا ان کے گھر پر کوئی بھی اسب نہیں ہے۔ مالا اپنے دل سے ہر دم نکال دے۔ انہوں نے مالا کو کھڑے سے ذکر الہی کے متعلق بدایات دی تھیں اور جاتے، جاتے انہوں نے انکشاف کیا تھا کہ مالا کی کسی بد نظری کے حصار میں ہے اور ستاروں کی محسوس کا اس پر اثر ہے۔ بالآخر صاحبہ ایک پٹنے کے لیے جرنی آئی تھیں۔ انہیں جلد واپس چلے جانا تھا۔ اور مالا چاہتی تھی کہ جانے سے پہلے وہ ان کی دعوت کرے۔ اس ضمن میں اس کا پروگرام بھی طے ہو چکا تھا جو جلد ہی ترتیب پایا اس روز کھانے کے دوران بھی مالا کی ڈسکس کرنا چاہتی تھی مگر آفاق اور مہینی نے ایک الگ موضوع پھیل کر رکھا تھا۔ وہ ٹوٹ تو کب سے کر رہی تھی کہ آفاق، مہینی کے کانوں میں کھسا ہوا ہے مگر اپنی سوچوں میں گم ہونے کی بیماری کے باعث وہ ان کی گفتگو سننے سے محروم رہ گئی تھی۔ اب جبکہ وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو چکی تھی تو وہ دونوں ہی منہ بند کیے کھانا کھانے میں مگن ہو چکے تھے۔ مہینی کے چہرے پر...

محبت سکرانی کا ہے

تسبیح احسان

”اس کی آنکھیں تھی سندھ
 دلوں میں بچے سندھ
 نہ تھی بھلیں ہی کہہ سکے ہیں
 نہ ہنس سکتی ہیں ان کے اندر
 نہ کھوئی کھوئی نہ جا گئی جاگی
 کہ جہاں لہر و طالع کے اندر
 ان میں ہے بس یہ ایک غولی
 جو سے تو جس کی جگہ ہر لہا“



لیوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے آنکھیں موندے
وہ بہت خوب صورت لب و لہجے میں بار بار ایک ہی
نظم پڑھائے جا رہا تھا۔

”اب بتا بھی دے کون ہے وہ؟“ شرنیل جو کافی
دیر سے سن رہا تھا آخر بچھے بغیر درہ سکا۔ شرنیل
کی آواز پر صارم نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔
”کیا بتاؤں؟“

”وہی جس کے لیے تم نے کئی دن سے یہ نظم
پڑھا پڑھا کر میرا دماغ خراب کر رکھا ہے۔“ شرنیل
نے کہا۔

”مجھے یہ نظم پسند ہے اسی لیے پڑھا ہوں۔“
صارم نے فوراً ہی انہی لہجہ اختیار کر لیا۔

”ابھی کچھ..... اب تم سے بھی پردہ شرافت سے
بتا دو ورنہ کچھ لوٹیں دادی اماں کو کہہ دوں گا کہ تم فائزہ کے
حشوق میں دغا دے ہو رہے ہو بھتر ہے جلد از جلد اسے
تہہ داری زندگی کا حصہ یعنی شریک حیات بنا دیا جائے۔“
”اوئے، اوئے رک تو کسی۔“ شرنیل چمپے کی

سے کہہ کر کمرے سے جانے لگا تو صارم کی جان پہ
نیت تھی۔ جانتا تھا کہ اگر ایک بار دادی اماں کے کان
میں یہ بات پڑ گئی تو پھر وہ لاکھوں پٹے لٹا دیں گے۔
فائزہ سے ہی کرتا پڑتی کیونکہ دادی اماں خود دل و
جان سے سبکی جانتی تھیں۔ وہ تو صارم نے جانے
کون، کون سی نصیحتیں اور محبت کے واسطے دے کر
انہیں ایسا کرنے سے روکا ہوا تھا ورنہ اب تک تو وہ دو
چار بچوں کا ابا حضور بھی بن چکا ہوتا۔ ایسا نہیں تھا کہ
فائزہ میں کوئی برائی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ان
دونوں کے حواج میں زمین، آسمان کا فرق تھا اور اسی
لیے صارم کو ہی انہیں فائزہ کو بھی اس رشتے پر شہید قسم
کے اعتراضات تھے۔

”بھل بتا پھر کون ہے وہ؟“ شرنیل اپنی بلیک
سلینگ کے کامیاب ہونے پر مسکراتا ہوا بچھے لگا۔
”یار میں اسے نہیں جانتا، میرا مطلب ہے اس

کا نام پتا نہیں معلوم۔“

”تو تجھے معلوم کیا ہے ذفر.....؟“

”بس اتنا جانتا ہے یار کہ اس کی آنکھیں بہت
خوب صورت ہیں اس کے چہرے پر جو مصوویت
ہے وہ میں نے پہلے نہیں دیکھی لیکن ایک بات مجھے
بالکل پسند نہیں، اس کی خوب صورت آنکھوں کی
اداسی مجھے بالکل پسند نہیں، جب میں نے اسے پہلی
بار دیکھا تب سے ہی میرا دل چاہا اس کی آنکھوں
سے وہ اداسی چرا لوں اور وہاں مسکراہٹ رکھ
دوں۔“ شرنیل خاموشی سے بیٹھا اسے سن رہا تھا آخر
صارم کو ہی آسمان ہوا۔

”تم خاموشی کیوں کہتے ہو کچھ کہنا۔“
”کیا یہاں بھئی تہہ داری رام کہانی ختم ہو تو میں
کچھ بولوں۔“ شرنیل نے پہلی بار اسے کسی
لڑکی کے ہاتھ میں اس طرح بات کرتے سنا تھا۔
”تو کیا نیاں ہے پھر بتا دیکھ؟“

”یعنی ان خوب صورت آنکھوں کی اداسی کا
راز، آخر میرے یار نے ان آنکھوں کو مسکراہٹ
دینے کا حقد جو کر لیا ہے۔“ شرنیل کے کہنے پر صارم
بے اختیار اس کے گلے لگ گیا۔

”یو آر مائی بیسٹ فرینڈ۔“
”آئی ڈو آئی ڈو مگر کاش میرا بھی کوئی بیسٹ
فرینڈ ہوتا۔“ شرنیل کے مصنوعی دکھ سے کہنے پر
صارم نے اس کی پشت پر ہنکا رسید کیا۔
”ماروا الا خالہم۔“ شرنیل نے وہابی دی۔
”اور ماروں گا اگر ایسی کبھی پھر کی تو۔“
صارم کی دھمکی سن کر شرنیل ہنس پڑا۔

☆☆☆

”اللہ مجھے معاف کرے، رمضان کے مہینے
میں ایسے، ایسے کام کرتا پھر رہا ہوں۔“
”کیسے کیسے کام؟“

معتقل توڑنے کے لیے عادیہ کا کاغذ حاصل کیا ہے اور یہ کہہ کر معتقل توڑ دی ہے کہ اسے عادیہ پر بھروسہ نہیں ہے، اس کا کسی اور کے ساتھ چکر ہے اور تم کچھ سکتے ہو کہ ایسے میں لڑکی کی لائف مشکل ہو جاتی ہے۔
”اؤ تو کا۔“

”شرم کرو یا درودے میں گالی دے رہا ہے۔“
”سوری میرے اللہ میاں.....“ صادم نے فٹ معافی مانگی۔
”ویسے بھی تجھے اس گدھے کا شکر گزار ہونا چاہیے اگر وہ معتقل نہ توڑتا تو تو ہمیشہ کے لیے غنڈی آہیں بھرتا رہ جاتا۔“
”ہاں یا یہ تو ہے۔“ شرجیل کے کہنے پر صادم کو خیال آیا۔

☆☆☆

”کون آیا تھا امی.....؟“ وہ اکیڈمی سے حمل ہاری موٹی توگلی میں ہی اس کی پڑوس فرخندہ نے اس سے پوچھا تھا کہ آج ان کے گھر کون لوگ آئے تھے مگر ظاہر ہے وہ غلط تھی۔

”کچھ لوگ آئے تھے جینا، اسنے مجھے لے کر تھارا رشتہ مانگنے..... بہت بڑے لوگ آئے تھے۔“ ان کی بات پر انہیں جھٹ سے دھچک چلی۔
اس نے ماں کی کچی ہوئی بات سن کر آیت پھر اپنے درود بخار پر ڈالی اور ماجھی سے گردن ہلا دی۔

”معتقل سے آگے ہوں گے امی۔“ بچھلے کچھ عرصے سے وہ بہت زیادہ حقیقت پسند ہو چکی تھی۔
”ارے نہیں جینا، ماں کے ساتھ بشری بی بی بھی تھیں اور انہوں نے تمہارا نام لے کر رشتے کے بارے میں بات کی تھی وہ تمہارے بارے میں سب جانتے ہیں۔“ انہوں نے غلطی کی ایک معزز خاتون کا حوالہ دیتے ہوئے اسے یقین دلانا چاہا۔
”میرے بارے میں سب جانتے ہوئے بھی وہ رشتہ لے کر آئے..... پاگل تھے کیا؟“

”ایسا کیوں سوچتی ہو عافی، خدا اسی طرح اپنے بندوں پر مہربان ہوا کرتا ہے۔“ عینی کے لہجے کی نفی اور ماجھی نے انہیں اداس کر دیا۔

”جو کچھ بھی ہو امی، آئندہ وہ لوگ آئیں تو انکار کر دیجیے گا، مجھے شادی نہیں کرنی مایک ہی تجربہ کافی ہے میرے لیے۔“ ان کے لہجے کی اداسی کو نظر انداز کرتی وہ عینی سے سختی اپنے کمرے میں جا گئی۔
انہوں نے بڑی بے چارگی سے کمرے میں جاتی عینی کو دیکھا جانتی تھیں کہ اس کی یہ نہ ہاں میں نہیں بلے گی جبکہ وہ خود تو سوچن ہی سوچوں میں عادیہ کو ایک بڑے چارے کے گھر میں چار کرنے والے لوگوں کے درمیان پہنچتے پھرتے بھی دیکھ چکی تھیں۔

☆☆☆

”نیکس! بھاری کوئی وجہ تو بتائی ہوگی انہوں نے؟“ صادم کو ایسے صاف جواب کی امید نہیں تھی۔
”نہیں تو ہے ان کی جینی نے رشتے سے انکار کر دیا ہے وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔“
”گھر کیوں.....؟“

”مجھے کیا پتا شاید تم پر پچھلے تجربے کی تکی سے نہیں نکلیں ابھی تک، کسی اور پر اعتبار نہیں کرنا چاہئیں۔“
”ہوں.....۔“

”دیکھو صادم تم ابھی طرح جانتے ہو کہ وہ لوگ ہمارے لحاظ سے..... میرا مطلب ہے کہ کلاس وافر س ہی بہت بڑی وجہ بن جایا کرتا ہے ایسے معاملات میں دیگر یہ ہم سب لوگوں کی تمہارے لیے محبت کی انتہا ہی ہے کہ تمہارے جذبات کے بارے میں جان کر اسے پتا دیکھے، پتا لے دی دل و جان سے قبول کر لیا رشتہ بھی لے گئے اب اگر وہ نہیں مانتی تو اس میں کوئی کیا کر سکتا ہے، بھول جاؤں کچھ اور مشکل ٹھیک کھائی، تمہیں اس طے اور موڈ میں دیکھ کے سارے پریشان ہو رہے ہیں۔“ صادم نے کچھ بھی کہے بغیر اثبات میں گہر دن ہلا دی، شرجیل اس کے

”آپ کو شاید عجیب لگے مگر یہ سچ ہے کہ آپ کی آنکھیں بہت بولتی ہیں اور ان کی ہر بات مجھے سمجھ آتی ہے اور ان بولتی آنکھوں میں حیرتی اداسی میرے دل کو بے چین کیے ہوئے ہے، میرا آپ سے کوئی رشتہ نہیں مگر میرے دل نے آپ سے کوئی رشتہ بنا لیا ہے، میں آپ کے ہونٹوں پر چمکی نمی اور آنکھوں میں مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں، شاید اسے ہی محبت کہتے ہیں۔“ وہ بولتے پر آیا تو بولتا چلا گیا اور اس کے لہجے کی سہائی عانیہ کے دل کو چھوئے گی۔

”میرا نامی جاننے کے بعد بھی آپ ایسا سوچتے ہیں؟“ وہ کلمہ اور سرد لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
”ہاں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم اتنی ہی پاکیزہ، سچائی، کوئی بھی ٹوٹی ہو سکتی ہے۔“ صادم کے یقین سے کہنے پر عانیہ نے کیوں عانیہ کی آنکھیں بھر گئیں، آنسو اس کی آنکھوں سے سونہی بین کر برس رہے تھے اور صادم خاموشی سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ جانتا تھا بارش کے بعد آسمان ٹھہر جایا کرتا ہے اور وہ نگارہ بہت دھڑپ ہوتا ہے۔

”تو میں اپنے گھر والوں کو دوبارہ کب سمجھوں؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا پوچھ رہا تھا۔ جہاں اس کے سوال پر دھنک اتر آئی تھی۔ صادم نے مسکراتے ہوئے اس حسین منہ کو اپنی یادوں کے ذخیرے میں محفوظ کر لیا۔ ”میری عانیہ کا خیال رکھنا۔“ جاتے جاتے وہ یاد دہانی کراتا نہیں بھولا تھا اور عانیہ مسکراتے ہوئے اپنے دل کی کایا پلٹ پر حیران ہو رہی تھی۔

”شاید سچے جذبوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ لمحوں میں تغیر کر لینے کے فن سے واقف ہوتے ہیں۔“ عانیہ کو کہیں پڑھایا یاد آیا اور وہ مسکراتے ہوئے اتحاد سے قدم اٹھائی نکلاں کی طرف بڑھ گئی۔

کندھے پر زری سے جھکی دیتا وہاں سے اٹھ گیا جاتا تھا کہ صادم کو اس وقت تنہائی کی بہت ضرورت ہے، اس طرح اسے خود کو بھانے میں مدد ملے گی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ شرنیل نے مزہ کرنا ایک نظر سر جھکا کر بیٹھے صادم پر ڈالتے ہوئے شاید خود کو تسلی دی۔ اور صادم کسی اور ہی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا وہ جنگ لڑے بغیر مارنے کو تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

”جی فرمائیں کس سے ملنا ہے آپ کو.....؟“
”آپ سے.....!“ ملازم کے کہنے پر کوئی اس سے ملے آیا ہے وہ اکٹھڑی کے آفس میں آئی تھی۔ اتفاق سے اس وقت کوئی ٹیگور ہاں نہیں تھا اس وقت بھی مصروف ہوا کرتے تھے۔ صونے پر ایک اجنبی شخص کو بیٹھا دیکھ کر اسے ملازم کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے لیکن اجنبی کے جواب نے اسے حیران کیا تھا۔
”بلیز تحریف رکھیں۔“ وہ جو اس کے سامنے پر احترام کھڑا ہو گیا تھا اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا اس کے سامنے والے صونے پر بیٹھا۔

”میرا نام صادم رحمان ہے، کھدوں پہلے ہی میرا ہاؤس چاب کمپلیٹ تھا ہے فی الحال قریب ہوں مگر جلدی ایک اچھی چاب تلاش کروں گا ورنہ تو ٹینک بنانے کا آپشن بھی ہے میرے پاس لیکن ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے، خبر یہ تھا میرا احترام، اب آپ یقیناً میری یہاں موجودگی کی وجہ جانتا چاہیں گی۔ توجہ ہیں آپ، کچھ دن پہلے میرے گھر والے ایک ریگورسٹ نے کہ آپ کے گھر آئے تھے لیکن آپ نے منع کر دیا تو مجھے ایسے میں آپ سے ملنے آنا پڑا، اتنی ایم سوری مگر اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں بچھا آیا۔“ اب عانیہ کو سمجھ آگئی تھی کہ وہ کون تھا لیکن اب بھی وہ حیران تھی کہ اس کے انکار کے بعد بھی وہ یہاں کیوں چلا آیا تھا اور یہی سوال اس کی آنکھوں میں دکھائی دیا تو اس کے پچھنے سے پہلے صادم بول پڑا۔

شہزاد شاہ

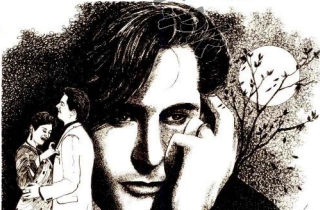
مستیزہ سند

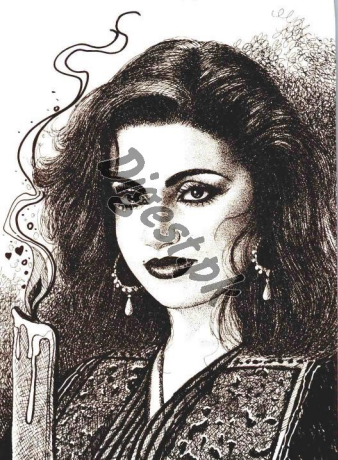
آخری قسط



زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے۔۔۔ خیر و شر، نیکی اور بدی،۔۔۔
زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت۔۔۔ ہر برائی پر حاوی ہو جاتی ہے اور اسی
طاقت کی بدولت صحرابی بھی ستاروں کا آئین بن جاتا ہے۔
ہماری ماہ نامہ مستطہ عزیز، سیدھے اس ناول میں صحرابی کی ریت میں کس طرح پہول آگئے
ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حسن و خوبی کے
تم سے تھے مجھے استعارے تھے





”اب کیا ہوا تورو؟“ نادر ان لوگوں کو وہیں کھڑا چھوڑ کر زوئی کی طرف آیا تو اس نے اپنے ٹنگ ہونٹوں پر زبان بکھیرتے ہوئے پوچھا۔ ”شہباز صاحب کا پتا چل گیا کیا انہیں؟“

”نہیں زوئی اس بار وہ صرف پتا چلانے نہیں آئے.....“ نادر تنہیدگی سے بولا۔ ”اس بار وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔“

زوئی کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔

”نہ صرف تمہیں بلکہ شہباز صاحب کو بھی۔“

”شہباز صاحب بے چارے کو بھی؟“ زوئی کو پہلے سے زیادہ یہ جملہ سن کر تکلیف ہوئی تھی۔

”ہاں..... تمہیں جلدی جانا ہوگا۔“ زوئی کو نادر کے لہجہ اور دیتے ہوئے حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی پریشانی کے آثار نہیں تھے، وہ مطمئن تھا اور ہر سکون بھی جیسے کسی ہلکے کھل جانے پر ہوا جاتا ہے۔

”اماں!“ زوئی نے عقب سے آتی قدموں کی آواز سن کر گردن موڑ کر دیکھا۔

”اب لینے کے لیے سر پر آن کھڑے ہوئے ہیں تو چاہتا ہو گا ہی۔“ اماں نے پہلی بار اس کی طرف داری کرنے کے بجائے نادر ہی کے سے لہجے میں کہا۔

”اوہ میرے اماں..... کوئی ساقھی بھی نہیں رہا.....“ زوئی نے آہستہ کی طرف دیکھا۔ ”میں نے تو نادر کو پا کر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔“ اس نے ایک بار پھر باری، باری نادر اور اماں کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے چہروں پر ایک ہی تحریر تھی۔ ”سوچ کیا رہی ہو، اب جانو..... ہمارے جان بچاؤ۔“ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد زوئی نے سر ہلایا اور تین قدموں سے چلتے ہوئے اندر چلی گئی۔

”نادر اور شہباز صاحب کو بازو کا سہارا دے کر اپنے لالہ کے ساتھ اسے دس منٹ لگے تھے۔“ چچیں..... اس نے ان تین اہلکاروں کے قریب جا کر کہا تھا اور پھر نادر کی طرف دیکھا۔

”میں تو ان سے پہلے ہی وعدہ کر چکا تھا زوئی، کچھ ثابت ہو گیا تو تمہیں لے جانے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ وہ بے نیازی سے منہ اٹھاتا ہوا بولا اور پھر باری، باری ان تینوں سے ہاتھ ملا کر انہیں رخصت کرنے لگا۔

ان کی جیب میں شہباز صاحب کو کھانا کھانے کے بعد خود سوار ہونے تک زوئی کے دل میں موجود نادر اور پاکستان سے محبت کے بت میں کمی درازیں آچکی تھیں۔

☆☆☆

”وہ کہتا ہے کہ وہ جہا تکیر سہگل کی لے پاؤں جی ہے، مجھے اس بات پر شک ہے۔ جہا تکیر سہگل کسی بچی کو کیوں اڑا پٹ کرے گا بھلا۔“ بھرنی نے محمود درانی سے کہا جو اخبار کے پیچھے چہرہ چھپائے بیٹھے تھے۔

”کوئی کام، کوئی بھی شخص کیوں کرتا ہے، میں اس کے بارے میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔“ محمود درانی نے ہنوز چہرہ اخبار کے پیچھے چھپائے ہوئے کہا۔

”مجھے پہلے اس بات کی تحقیق کرنا ہوگی، جہاں میں کرنی پڑے گی وہ بچی دراصل ہے کسی کی؟“ بھرنی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ کے لیے اتنا کافی نہیں کہ جہا تکیر سہگل اسے بچی کہتا ہے۔“ اب کے محمود درانی کو اخبار چہرے کے آگے سے ہٹانا پڑا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ یہ کافی نہیں ہے۔“ نہرین نے سر ہلا کر کہا اور اپنے فون پر کسی کا نمبر ملنے لگیں۔ محمود رانی اب پوری توجہ سے انہیں دیکھ اور سن رہے تھے۔
 ”ہاں رضا۔۔۔۔۔ انہوں نے اپنے ایک بچھے کا نام لیا۔“ کچھ اچھا لگا؟“
 ”اچھا۔۔۔۔۔ کیا بتایا اس نے۔“
 ”کیا۔۔۔۔۔؟“

”انوار ہو گئی تھی، اس کیلئے ٹراسنے آئے تھے۔“ ان کا لہجہ بدلنے لگا اور محمود رانی کا دل بیٹھنا شروع ہوا۔
 ”تو یہ سب ہوا کدھر، کہاں بات ہوئی رہی، ہمیں تو نہیں پتا، ہم نے تو یہ خبریں نہیں سنیں۔“ ان کی آواز میں تجزی آتے لگی۔

”ہائے میرے اٹھ ہفتہ کی رشتہ رہ چکی ہے۔“ ان کی آنکھیں پھٹیں۔
 ”مغزوہ کو وہ کہاں نگر لگی۔ یہ تو بھند ہے شادی کرے گا تو اسی سے کرے گا۔“ انہوں نے جین کرنے کے سے انداز میں کہا تھا۔

”ہائے نہیں۔۔۔۔۔ میں بھلا یہ ہونے دیتی ہوں، ان بڑے لوگوں کے اندر قاتل جانے کیسا گند بھرا ہوتا ہے۔
 تو یہ تو میرا حق تو معصوم ہے، بے چارے کو زمانے کے کیا مضید کی اپنی خبر کس، نہیں میں سمجھا لوں گی اسے تم فکر مت کرو۔“ انہوں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور فون بند کر کے غریب نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں دیکھا میں نے پتا لگا لیا۔

”تم مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو نندا؟“ اس کا ایک ایڈ پر جب فہد لاہور آیا اور میرال سے ملنے عارفہ کے گھر پہنچا تو اتنے وقت میں پہلی بار میرال کو ایک نارمل موڈ اور بہتر طبع میں پایا۔ وہ آہستہ آہستہ اس فرما سے باہر نکل رہی تھی جس نے اسے اپنے آن گشت کیوں میں دبوچ رکھا تھا۔

”اس لیے کہ تم مجھے اچھی لگی ہو اور میں تم سے خوش دیکھنا اور خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“ فہد نے مختصر جواب دیا۔
 ”اگر میں کیوں نہ تم سے کسی بے شادی کرنا چاہتے ہو کہ تم مجھے ہوا اس نارمل معاشرے میں مجھ ایسی ایب نارمل حالات کی فکر نہ کرے، شاید ہی کوئی شادی پر رضا مند ہو کیونکہ جو بھی سنے گا شکوک کا شکار ہو جائے گا اور ان حالات میں میرے بچپن کے دوست ہونے کے ناتے تمہیں ہی یہ قربانی دینی چاہیے تو یقیناً تم یہ بات نہیں مانو گے، ہے ناں۔۔۔۔۔؟“

فہد کے دل نے ایک دھڑکن چھوڑ دی، وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی ذہین بھی تھی۔ اور یہ بات وہ بہت پہلے سے جانتا تھا۔

”تم ایک سلیمہ بنی ہو فہد، تمہارا نام سے معاشرے میں، لوگ تم سے ایک ایب نارمل فیصلے کی توقع نہیں کرتے تمہارا بیچ تمہاری شخصیت سب اس ایک فیصلے کا شکار ہو سکتے ہیں۔“

”مجھے اس کی پروا انہیں میرال تم جانتی ہو کہ میں ہمیشہ سے ہی قرارے لیے اچھی لکھو رکھتا ہوں۔“
 ”اچھی لکھو رکھنا اور بات ہے۔ ایک سلیمہ بنی کسی سوشل کاڈ کے لیے چلائی جانے والی ہم کا حصہ بن کر اپنا اچھا مزہ بہتر تو کر سکتا ہے مگر اس ہم کے اندر جو بیاہوں کو اپنے چہرے پر چاہتا اس کے لیے مشکل کھڑی کر دیتا ہے۔“

فہد نے سراٹھا کر میرال کی طرف دیکھا، وہ مجسم شخص تھی، ایک ایسا صحن جس پر حزن اور طال نے شاید مستقل ڈھیرے جما لیے تھے۔

"تم سمجھتی ہو سلیپر بنی ہونا میرے لیے بہت اہم چیز ہے کیا؟" اس نے سوال کیا۔ "میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔"

"ایسا کہنا آسان ہے فہد..... اور کرنا۔" وہ رکی۔ "بہت طویل سفر ہے کر کے دکھانا اور جیسے تمہیں مجھ سے انسیت محسوس ہوتی ہے وہی مجھے بھی تم سے محسوس ہوتی ہے، میں تمہیں اس لیے کھنکھانے کا سا سفر نہیں بنا سکتی۔"

"گو یا تم مجھے رنجش کر رہی ہو؟" فہد نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا میری اوقات کسی کورجیکٹ یا قبول کرنے کی ہے؟" جواب میں میرال نے سوال کیا۔

"تمہاری اوقات....." فہد نے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا اب بھی تمہیں اس کے بارے میں کوئی شک ہے؟"

"نہیں کوئی شک نہیں ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں انسانوں کے لیے آزمائش بن کر نہیں بیٹھا چاہتی..... آزمائش کہنے کو صرف ایک لفظ ہے مگر اس میں سے گھوڑا پوری قیامت ہے تمہیں اعزاز نہیں۔"

"پھر اگر میں نہیں تو کون ہے جو آزمائش میں بڑے بغیر تمہیں پلانے کا؟" فہد نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے علم نہیں لیکن تمہیں ایک محروم دوں گی کہ اگر تمہارے اندر قربانی کا جذبہ ہے تو تم اس کو اپنالو، جو تمہیں چاہتی ہے کسی کے لیے تمہارا ساتھ اہم ہے۔"

فہد اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ایک تیزی سے اس لیے ہونے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی دائیں ٹانگ کا پتا کھٹا اس کے اندرونی اضطراب کو صاف ظاہر کر رہا تھا۔

"اپنا من چاہا یا لینے کی خوشی اپنی جگہ..... لیکن کسی کا من چاہا اسے دے دینے کی خوشی بھی محسوس کرنی چاہیے کبھی..... اس کا الگ ہی مزہ ہوتا ہے۔" میرال نے کہا۔

"تم چاہتی ہو وہ تم سے کچھ نہیں ہوتی ہے۔" فہد نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"یہ تو اس کی تم سے محبت کی واضح ترین علامت ہے۔" میرال نے فوری جواب دیا۔

"محبت.....؟" فہد کے لہجے میں استہزاء تھے۔ "وہ احساس کتری کا مظاہر ہے۔"

"اسے اس احساس کتری سے تم ہی نکال سکتے ہو، دوسروں کے لیے جینے میں بہت مزہ ہے فہد، تم ایک بار آزمائش کر دو دیکھو۔"

"میں اس suggestion پر احتجاج اس لیے نہیں کروں گا کہ یہ تم دے رہی ہو اور تم میرے لیے کتنی اہم ہو، اس کا اعزاز شاید تمہیں کبھی نہیں ہو سکے۔"

"اگر تم میری تجویز مان لو تو یقیناً مجھے اعزاز ہو جائے گا۔"

فہد نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا آئی فون نکال کر اس پر ایک نمبر لکھ دیا۔

"ویلو ویلو..... تمہیں ہوتی؟" اس کی آواز کمرے میں گونجی تھی۔

"سنو جی ٹامک میں اپنے آپ کو کتنی ربا ہوں، ناویہ آئی سے ملاقات ہو سکتی ہے ناں.....؟"

"نہیں، میں نے ٹیک ایو اس نہیں لینی، مجھے تمہیں پرہیز کرنا ہے آئی ناویہ کے سامنے۔"

میرال نور سے فہد کی بات سن رہی تھی اور اس آخری بات کے رد عمل کو منگلو میں شریک نہ ہوتے ہوئے بھی سمجھ سکتی تھی۔
 ”چپ کیوں ہو گئیں؟“ فہد کہہ رہا تھا۔
 ”you there?“ پھر اس نے سوال کیا تھا۔
 ”ہاں تو بس پھر میرا انتظار کرو آج میں پہنچوں گا، کل ہم لوگ حشد یانی چلیں گے۔ اوکے۔“ فہد کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

”پہلے تو تمہاری ساس کتنی تھی کس کی کوئی بیٹی نہیں ہے، اب اچانک یہ بیٹی کہاں سے نکل آئی؟“ پیش کی اماں نے دانیال کے گھر سے واپسی پر اس سے کہا تھا۔ دانیال، پیش کو میرال کے بارے میں بتا چکا تھا اور اماں کو میرال کی کہانی سنا کر طوفان کھڑا کرنے کے مترادف تھا۔
 ”انہوں نے آپ کو بتایا ہی ہوگا اماں؟“ پیش نے ڈانچہ دیا۔
 ”پتا نہیں کیا بتا رہی تھیں کہ چھڑی ہوئی بھانجی دو چارہ ملی ہے۔“ اماں نے کہا۔ ”مگر میرال نہیں مانتا اس لڑکی کا تو نامعرا (چہرہ سرہ) ہی ان لوگوں سے نہیں ملتا، وہ تو دور سے نہیں ملتی ہے کی۔“
 ”افوہ۔۔۔۔۔۔ اماں آپ بھی کیا بال کی کمال اتار رہے تھ جاتی ہیں۔“ سلیم جھنجھلا کر بولا۔ ”ہو سکتا ہے دانیال کا خالو شیرینی ہو چکے۔“

”لو۔۔۔۔۔۔“ اماں نے ایک اور ٹھٹھکا لئے ہوئے کہا۔ ”اگر ایسا ہے تو پھر تو بھی ان سبھلوں کا خاندان تو بھان متی کا کنبہ ہی ہے، کنکری کی اجنبی کنکری کا دروازہ۔“
 ”جو بھی ہے، آج تک کسی نے ان کے خاندان کی طرف اٹھلی تو اٹھائی نہیں، ایک آپ ہیں کہ جب موقع ملتا ہے ان میں کینز لٹکائے لٹکتی ہیں۔“ سلیم بھی زچ ہو کر بولا۔
 ”جہاں کینز لٹکے ہوں گے وہیں نظر بھی آئیں گے اور ٹکالے بھی جائیں گے۔“ اماں ہٹ دھرمی سے بولیں۔ ”تم لوگوں کو تو تھ جالنے کا ہے کا ہو کا لگا ہوا ہے، تمہارا بس چلے تو آج ہی بہن کی اٹھلی پکڑ کر اسے ان کے گھر چھوڑ آئے۔“

”وہ لوگ ہیں ہی اتنے اچھے۔۔۔۔۔۔ ہمیں تو ان میں اور خود میں کوئی فرق نہیں نظر آتا۔“ سلیم نے بے جا زاری سے کہا۔

”سب جانتے ہیں اچھے کیوں ہیں۔“ اماں کی زبان خاموش رہی نہیں سکتی تھی۔ ”لوکا ان کا فٹ بیج (نوٹ پموت) کرو بارہ جڑا ہے، اللہ جانے کون کون سی شقیں اس کے اندر ڈالی گئی ہوئی ہیں، ریڈ کی آنتیں اور پلاسٹک کا معدہ۔۔۔۔۔۔ انہوں نے تو اچھا ہوتا ہی ہے، انہیں پیش کے کنوں والی لڑکی اور کہاں ملتی تھی۔“
 ”افوہ اماں۔۔۔۔۔۔“ سلیم سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”ان کا بیٹا میرا ہے پیرا۔۔۔۔۔۔“ وہ جتانے کے سے انداز میں بولا۔ ”وہ چاہتے تو اوچھے سے اوچھے گھرانے میں اس کا رشتہ کر لیتے مگر آپ نے دیکھا نہیں تھی ما جڑی، تھی خدا خونی ہے ان میں، دولت، پیسے اور اسٹیلٹس کے فرق کو فرق سمجھتی ہی نہیں وہ لوگ، باب ہی تو خود چل کر رشتہ لے کر آئے تھے۔“

”یو اا احسان کیا تھا میں جو رشتہ لے کر آئے تھے، نہ آتے تو ہم نے ان کے گھر جا کر رشتہ دے نہیں آتا

تھا۔" اماں اب بھی پوری اکر دکھادی تھیں۔

"بس اماں بہت ہوگئی۔" ہانا خلیم تختی سے بولا۔ "وہ لوگ جیسے بھی ہیں اب ہمارے کزم (سجھی) ہیں، کوئی بات نہیں ہوگی اب ان کے سلسلے میں۔ رہی آپ کی برادری تو جا کر تیں کون ایسا ہے جو رشتے والی بات سن کر رٹک نہیں کر رہائیش کی قسمت پر۔" اب اماں کو بیٹے کے تہرہ لیک نہیں لگے اسی لیے سر جھٹک کر خاموش ہوگئی تھیں۔

"تختی عجیب سی بات ہے ناں۔۔۔" اس رات بتیش نے اپنے بستر پر بیٹھے کتاب میں دیکھی دانیال کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔ "نا میں اپنی بیٹیوں کے لیے شہزادوں کے خواب دیکھتی ہیں اور جب کوئی شہزادہ واقعی آن پہنچتا ہے تو اس میں کیزے ٹکا لے گئی ہیں۔"

"تمہاری اماں غلط نہیں ہیں۔" اگلی صبح کیفے میں بیٹھے دانیال نے اسے بتایا تھا۔ "وضعدار اور پرانے خیالات کے لوگوں کی طرح ان کا ری ایکشن فطری ہے۔ ہمارا معاشرہ ہر اگر تیش کے فخر سے گزرتا ہے، پرانے کو سننے میں تبدیل ہوتے نام تو گھٹے گا، یہ کیا کم قیمت ہے کہ انہوں نے، مارا رشتہ ہو جانے والا ہے۔"

"انہیں میرال والی بات پر بھی تشویش ہے۔" بتیش نے اسے بتایا۔
"فخر مت کرو، ہم جلد از جلد میرال کی شادی کسی بہت اچھی خلی میں کرنے کی فکر میں ہیں جب تک تم میرے گھر آؤ گی، میرال والا معاملہ ویسے ہی منت چکا ہوگا۔" دانیال نے اسے فکری سے کہا۔

"ویسے وہ حقیقت میں تختی خوب صورت ہے ناں۔۔۔" بتیش نے یاد دلایا۔ "ایسے لگتا ہے جسم حسن نہیں خواب دیکھ رہے ہوں۔"

"ہوں۔۔۔" دانیال نے کہا۔ "یہ ہی حسن تو اس کا دشمن بن گیا۔۔۔ اور دیکھ لو اسے کئی کن داستانوں سے گزرتا کہاں تک لے گیا۔"

"وہ جو فخر صاحب ہیں، کیا وہ نہیں کریں گے میرال سے شادی؟" بتیش نے تجسس کے مارے پوچھا۔
"میرا خیال ہے کہ نہیں۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ وہ کیوں۔۔۔۔۔ صبر مت خیال تھا کہ وہ اس کی محبت میں ہی یہ سب کرتا رہا۔" بتیش کا رد عمل فطری تھا۔

"ہم سب کا بھی یہی خیال تھا۔ مگر لگتا ہے اس کے سیاسی اور خاندانی حالات اسے اس شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔" دانیال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تو ان لوگوں کو کیا فرق پڑتا ہے، یہ تو غیہ شادیاں کرنے کے باہر ہوتے ہیں۔"

"میرال اس کے لیے شاید۔۔۔ one and only والا معاملہ ہے۔" دانیال نے کہا۔ "میرا مطلب ہے یہ میرا تجربہ ہے اس کے بارے میں۔" اس نے بتیش کو وضاحت دیتے ہوئے کہا۔ "اور جب کوئی کسی کی زندگی میں ایسا اچھا دوست ہوتا پھر وہ اس تک پہنچنے اور اسے جانے کے لیے چور راستے نہیں دھوڑتا۔۔۔۔۔"

میرزا خان نے می سے خود کہا ہے کہ کوئی اچھا لڑکا کچھ کر میرال کی شادی کروادیں۔
"ہائے۔۔۔۔۔" بتیش نے جھرمجری لیتے ہوئے کہا۔ "کتنا مشکل ہے ناں یہ کہنا۔"

"وہ بہت مختلف شخص ہے، اس کے مضبوط جسم کے اندر اس سے بھی زیادہ مضبوط دل و دماغ موجود ہے اور اس پر وہ پورا اختیار بھی رکھتا ہے۔" دانیال نے کہا۔ "میں نے اس سے ملاقات کے دوران اسے عمل آبرو

کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ وہ بہت سوں سے بہت مختلف ہے۔
 "اور ہم بچکے کی محنتوں سے اسے گالیاں دیتے چلے آ رہے تھے۔" نیش نے کہا۔
 "اور اس نے وہ گالیاں بھی پھول کچھ کر وصول کیں..... سوچ لو وہ میرا ل کے لیے کیا ہنہ بد رکھتا ہوگا۔"
 "ایسا ہنہ بد کرنا سہی کیے بغیر بہت قربان کر دی۔" نیش کے لہجے میں حقارت۔
 "میں فی الحال کچھ کہ نہیں سکتا۔ وہ بہت unpredictable انسان ہے، دیکھتے ہیں وہ آ کے کیا کرتا ہے۔" دانیال نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہلو گاڑ۔۔۔۔۔" سامنے سے آتی ٹھہرنے نے دانیال کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ "بلکہ مجھے کہنا چاہیے ہیلو برادر۔"
 "ہیلو ٹھہرن۔" دانیال نے چہرے پر اتر آئی تا گماری کو چھپاتے ہوئے کہا۔
 "سوفاسٹلی تم نے اس لڑکی سے رشتہ جوڑی لیا۔" ٹھہرن نے ایک حقارت بھری نظر نیش پر ڈالی۔ "تم جہاز سے کیا گرے تمہاری چوٹس اور سیکشن بھی آسمان سے زمین پر آ گئیں، مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"
 "کیوں ہمدردی ہے تمہیں؟" دانیال وہاں سے جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے دوبارہ نیش کے ساتھ والی کر سی پر بیٹھ گیا۔

"تمہاری چوٹس دیکھ کر۔" ایک مزید حقارت بھری نظر نیش پر ڈال کر وہ بولی۔ "ایک ایسی لڑکی جیسے ڈھنگ سے اردو بھی بولتی نہیں آتی، جو گنگنا سے ڈریں اپنی اپنی دہائی میں ہوتی ہے، جسے پھر اور آرٹ اور لٹریچر سے ذہنیاتی کا لگاؤ ہے اور جسے دنیا کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں، تم نے اس سے منگنی کر لی۔؟
 تمہاری قربان سوچ پر مجھے ہمدردی کیوں نہ ہو جسے، انظر حال ہم پرانے دوست ہیں۔"

"ٹھہرن، نیش میری طبیعت ہے اور اس کے بارے میں ایسے الفاظ دوبارہ استعمال... کرنے کی اجازت میں تمہیں نہیں دوں گا۔" دانیال نے اپنے اشتعال کو قابو کرتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا ہوا میں جہاز سے گرا، مرنے کے بعد مجھے زمین پر موجود ہر چیز پر بارہ واضح نظر آنے لگی، ورنہ اس سے پہلے میرا حال یہ تھا کہ بہت زمین پر تھا اور اڑا اڑا آسمانوں پر تھا، زمین کی مخلوق تھا نہ آسمانوں کی..... جب ہی تو کوؤں اور فسون میں فرق نہیں کر سکا کبھی۔"

"دہری..... sarcastic اینڈ دہری فنی۔" ٹھہرن طنز بولی۔ "آئی وٹ تمہیں کبھی اپنے فیصلے پر پچھتاؤ نہ پڑے۔"

"انشاء اللہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔" دانیال نے مضبوط لہجے میں کہا۔
 ٹھہرن ایک اور حقارت اور طنز بھری نظر نیش پر ڈال کر وہاں سے اٹھ گئی۔ دانیال نے اسے دور جاتے دیکھا اور پھر گردن موڑ کر اپنے ہیٹو میں بھیجی نیش کو جس کی آنکھوں میں آنسو بھر رہے تھے۔
 "ارے یہ کیا....." اس نے نیش کا سر زری سے اوجھایا۔

"اتنی اسلٹ..... اتنی humiliation نیش نے بدقت کہا۔" آپ کے ساتھ میں..... مجھے ہر دم اسی کا ڈر ہے گا۔"

"امحق ہو تم جو اس خوف میں جھکا ہو۔" دانیال نے نشوونہی اسے پکارتے ہوئے کہا۔
 "ارے میری جان..... میں جو تمہارے ساتھ ہوں ہر دم..... ہر لمحہ اور میرے گھر والے بھی..... پھر تمہیں ایسے روتوں کا غورف کیوں ہے۔" وہ اسے دلا سا دے رہا تھا..... لیکن نیش کے دل سے تذلیل کا

احساس نہیں جا رہا تھا۔

"میں نے تم سے ایک بار کہا تھا انسان کو اپنے بارے میں کا فیصلہ نہ ہونا چاہیے..... اگر وہ غلط نہیں ہے تو دنیا کے سارے لوگ جو مرضی سمجھتے رہیں وہ غلط نہیں ہو سکتا اور یہی کا فیصلہ دنیا کی زبانیں بند کر کے چھوڑے گا..... ابھی میں نے تمہیں صبر و استقامت کے بارے میں بتایا..... ہم تو ہم، اللہ جانے اس نے کہاں، کہاں سے کیا کچھ نہ سنا ہوگا، کیا کچھ نہ نہیں کیا ہوگا مگر تم نے اس کے احتیاط کا کیل نہیں چیک کیا شاید، پہلی گولیوں سے خود لڑکی کو نکال کر ہمارے پاس پہنچا گیا اور کسی کو کالوں کا ان خبر نہیں ہوئی، ردول ماؤز صرف ابھی دنیا میں ہی نہیں تلاش کرنے چاہیں، ردول ماؤز ہم سب کی خوشکاری ہوئی دنیا میں بھی مل جاتے ہیں..... اور یہ شرین....." اس نے آہستہ سے دیکھا ہر شرین کی قسمی۔

"pity on her"..... وہ صرف تم سے نہیں ہو رہی ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے وہ تم سے حد کر رہی ہے، دل میں تم پر رشک کر رہی ہوگی، اس سے ثابت ہوا کہ تم ہر چیز سے ہر بات سے above ہو۔" بینش نے بے نیچی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"بہن کرو اور اب جو میں کرنے والا ہوں اس میں مجھے پوری طرح سمجھوتہ کرنے کی تیاری کرو۔" پھر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیا کرتا ہے؟" بینش نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ محبت کا یہ اظہار تو مجھ سے میں بھی جان ڈال سکتا تھا اور اس نے تو ابھی بیٹا شروع کیا ہی تھا۔

"ایک تو اپنی آرٹ گیلری بناتی ہے، لی ایڈ ڈی ایچ کے ہر شخص کے نام سے اور جس میں تمہارے مٹی ایچرز اور کئی کرائی کے شاہکار خصوصیت کا وہجہ رکھتے ہوں گے..... اور دوسرا یہ کہ میں دوا دارہ سے ملائنگ کلب جوائن کرنے والا ہوں۔"

"نہیں..... یہ نہیں ہوگا۔" بینش نے گھبرا کر کہا۔ "اب ملائنگ کلب..... ہرگز نہیں جاؤ گے۔"

"میں ضرور جاؤں گا لیکن ایک سے عزم کے ساتھ، اسکاٹی از دی لٹ کے خمرے کے ساتھ، اب میں beyond the skies جانے کا دعویٰ نہیں کروں گا اور تم دیکھو گی کہ اس بار میں کیسا بیباک ملائنگ ہوں گا۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ بینش نے بھی مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

☆☆☆

"مجھے معلوم نہیں محترمہ آپ نے میرے بچے کو کیسے ورغلا لیا، ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے کی ضد کرنے لگا ہے وہ جس کا آگاہ چچا ہی ٹھیک نہیں تو پتہ چاہے آپ کو خدا کا خوف نہیں آیا، ایسے نامور خاندان کے بیٹے تھے ایسا افتور اور پھون کا کام کرتے ہوئے۔" عائیدہ کو یہ جملے سنتے ہوئے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا یہ جملے حذر کی محی بول رہی تھیں اور بولتے ہوئے کہیں سے بھی مہذب اور چڑھی گھسی خانوں نہیں لگ رہی تھیں۔

"کیا کی دیکھی آپ نے میرا لڑکا، جو ایسے کہہ رہی ہیں؟" عائیدہ چہری کو شش کے ساتھ ایسے نرم الفاظ بولنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔

"کی.....؟" وہ ہاتھ پھیلا کر بولیں۔ "کوئی ایک کی جوتو بولوں..... انوہ شدہ، کوٹھے والیوں کے پاس رہنے والی، منسٹر کی داشتہ، جسے ابھی طرح برت کے وہ آپ کے حوالے کر گیا اور اب آپ اس کے ذریعے شریف خاندانوں کے لڑکے پھنسا رہی ہیں، خدا کا خوف کریں..... سنا ہے بیڑی اللہ والی مٹی ہیں آپ ویسے تو،

اللہ رسولؐ کے نام کے پردے سے یہ حرکتیں تو بہت بڑی بی بی خدا کو کیا منہ دکھاؤ گی کل کو۔" عافیہ کا واسطہ ایک بد زبان اور مفروغ خاتون سے چڑا ہوا اور ان کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان خاتون کو کیسے چنڈل کریں۔

"بھو آپ تو کوئی اور بات کرنے کا کہہ کر لائی تھیں مجھے۔" خاتون کے ساتھ آنے والی لڑکی شرمندہ، حیران اور پریشان تھی، یہ لڑکی نہیں تھی جسے صبرین خاص طور سے اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔

"میں یہی کہنے اور ان محترمہ سے یہی پوچھنے آئی تھی۔" انہوں نے عافیہ سے اپنا ہاتھ چمڑاتے ہوئے کہا۔
 "دیکھیے محترمہ، میں آپ کے بیٹے کی نیک دلی، شرافت اور نیک فطرت کی وجہ سے آپ کی باتیں برداشت کر رہی ہوں۔" بالآخر عافیہ کے صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"ہماری شریف، باہم صمت، باکردار بیٹی پر یہ دہائیات الزام لگانے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ خدا سے مجھے مت ڈرامیں، خود اس کا خوف کریں کہ آپ کسی بات کے سیاق و سباق کو جانے مجھے بغیر ایک خاندانی، باعزت بیٹی پر شرمناک الزام لگا رہی ہیں، معافی مانگنی چاہیے آپ کو اللہ تعالیٰ سے، اس سے پہلے کہ آپ اس کے غضب کی چکڑ میں آ جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے بیٹے کو تو کسی نے یہ دشتہ جوڑنے پر مجبور کیا ہے نہ ہی اس کا باپ، وہ اپنی مرضی سے یہ دشتہ مانگے آیا تھا۔"

"اگر سے اتنی ہی شریف اور باہم صمت و باکردار ہے تو لڑکی تو آج اپنے بیٹے سے کیوں نہیں جوڑ لیتیں اس کا رشتہ، آپ کا بھی تو ایک چٹا کھوٹا رہا ہے ناں۔۔۔۔۔۔" صبرین نے چمک کر کہا، "مجھے لگتا ہے کہ آپ کا شوق چرایا ہے جس تو ہم اللہ اپنے گھر سے کیوں نہیں کر لیتیں۔" سبائے دوسروں کے گلے منہ سے لڑکی کو۔" عافیہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔

"نو بھکا کیسے سب سب سوچ گئے ہیں، اب جب اپنے بیٹے کی بات آئی ہے۔" عافیہ کو خاموش دیکھ کر صبرین نے عافیہ کو کہنی مارے ہوئے کہا، "عافیہ کی طرف سے یہی سے دیکھ رہی تھی۔" ڈراما باندھ کر دکھا میں گندگی کے اس طوق کو اپنے بیٹے کے کچھ میں بھر میں جانوں کی۔۔۔۔۔۔ دوسروں کے بیٹے چھانے تو بہت آسان ہوتے ہیں۔" صبرین نے بلی جارہی تھیں۔

"بھو آپ کو بتا رہا تھا کہ وہ بی بی امیں کی کیکلی کی۔۔۔۔۔۔" عافیہ نے کہنا چاہا۔
 "اگر سے چھوڑ دلی امیں اور ان کی کیکلی کو۔۔۔۔۔۔" صبرین طے سے فرمائیں۔ "ساری عمر کے لیے بھوت بن کر جیت گئی بی بی امیں کی روح میرے حیر ہو کر، ان کی مروت میں ایک دھمکیل سے شادی کرنے چلا تھا۔"

"پلیز آپ خاموش ہو جائیں۔" عافیہ سے میرال کے لیے بولا جانے والا یہ لفظ برداشت نہیں ہوا۔ "آپ کو اپنے بیٹے کی خواہش سے اتفاق نہیں ہے تو مت کیجیے یہ دشتہ گراب میں حیر آپ کو اس بیٹی پر کچڑ اچھالنے نہیں دوں گی۔"

"اے اپنی ہو جائیں۔۔۔۔۔۔ باعزت مقام دے دیں، کچڑ اچھالی خود ہی بند ہو جائے گی۔ آپ بیسوں کے پردے میں چھپ کر تو کوئلہ بھی ہیرا بن جاتا ہے، اچھی رچیں گی میری ماں کر، ورنہ ابھر اُدھر کے لڑکے چھانسنے کے چکر میں تو یہی ہی بے عزت ہوئی رہیں گی۔"

"آپ غلط نہ کریں، مجھے اس بیٹی کی خاطر ایسا کرنا چاہا تو میں یہ بھی کر گزروں گی۔" عافیہ نے غصہ سے ہونے لگے میں کہا۔ "اللہ مجھے اس کی عزت کی چادر کی حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

عافیہ کے جواب نے عافیہ کے ساتھ ساتھ صبرین کو بھی ششدر کر دیا تھا۔

سارا راستہ آنسو کی گرم سیال کی طرح زوئی کی آنکھوں سے بہتے رہے تھے۔ خود پر ہونے والی ناگہانی صورت حال کے غم سے زیادہ اسے نادر اور اس کی اماں کے روتے کی روکھائی اور بے اعتنائی نے حد درجہ دھکی کر دیا تھا۔ نادر کا رویہ اس کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ اس سے آگے کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔

دائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو پھٹتے ہوئے اس نے شہباز صاحب کی طرف دیکھا۔ جن کا چہرہ خوف سے سفید چمک رہا تھا۔ ان کے ہاتھ اور ہونٹ لرز رہے تھے، زوئی کو بے اختیار ان پر ترس آنے لگا۔

”باجا، یا صرف ایک جھوٹی سی ٹکلی، وہ بھی غلط فہمی کی ٹکلی کی اتنی بڑی سزا؟“ وہ کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکے ہلکے کہتا ہوئی۔

”لیس جی دفتر آگیا، آپ آجائیں نیچے۔“ ایک بڑی سی عمارت کے گیٹ کے اندر جیب داخل کرنے کے بعد روکتے ہوئے ڈرامائیجیور نے کہا اور زونی کے ساتھ والدہ اور وائیکول دیا گیا۔ زونی لرزاتی آنکھوں کے ساتھ پہلے خود جیب سے اتاری اور پھر شہباز صاحب کو سہارا دے کر اتارنے لگی۔

شہباز صاحب کے لیے وکیل جیمز لاواہ نے۔ ایک ایڈکار نے اپنے تجویز اور آواز سے کہا۔ دو منٹ کے بعد شہباز صاحب کے لیے وکیل جیمز لاواہی..... شہباز صاحب کی وکیل جیمز لاواہی ناخوشی سے کہنے لگی۔ ایک مختصر فاصلہ طے کرنے میں کافی وقت لیا۔ ان کے آگے چلے جہاں ایک دفتر تھا کمرے کے سامنے جا کر رک گیا اور دروازہ کھول کر اندر بھاگنے لگا۔

”صاحب اندر ہی بیٹھے ہیں، آپ آجائیں۔“ اس نے زوئی کو طلب کیا۔ زوئی اس کے پیچھے چلتی اندر داخل ہوئی۔ یہ ایک کشادہ اور خوب صورتی سے سجایا تھا۔

”سرا جانیخوڑکی اور چنگ سنگھ۔“ ابلکار نے اعلان کیا، میز پر سر جھکائے قلمی نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا اور جیسے تھکسا گھڑا ہو گیا۔ اس شخص کے بال حلیہ اور چہرے پر طولی تجربے کی کہانی لکھی تھی۔

”آج میں جاگیر نہیں، تو خوشی سے کھاتے ہوئے اپنے سامنے رکھے صوفوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔“ علامہ بہت اچھی اور خوبصورت نگاہوں سے نگاہ ڈال رہے تھے۔ پھر اس نے اعتراف کا چوکھٹا اٹھا کر کہی کہ:

روٹی کے لیے یہ دیتے اور ماحول بھی خیر متوقع تھا۔ وہ شہباز صاحب کی چیخ و پکار سننے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی رہنمائی کرنے والا ایک دوسرے سے باہر جا چکا تھا۔

”جی تو س زون کی حسین۔“ وہ شخص جو اس دفتر کا صاحب تھا زون کی طرف دیکھ کر یوں۔ ”اور ملک شہباز صاحب۔“ پھر اس نے شہباز صاحب کی طرف دیکھا۔

”کیسے ہیں آپ؟“
”جی ٹھیک.....“ زونہی نے شہناز صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم نے شہباز صاحب آپ کے گھر پر بندے بھجوائے، آپ سے ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی جس میں آپ کا کچھ اتنا چاہیں تھا۔“ اس شخص نے شہباز صاحب سے کہا۔

”اور میں نے توئی آپ کے تو خیر جڑیٹھ سے بات ہوگئی تھی۔“ اس نے زوئی کی سماعت پر مبادری کی۔
 ”اور پھر ہمارے خیر دالوں ہی کا کمال ہے کہ آپ کو میں نے زوئی کے گھر میں کوئیٹ کر لیا انہوں نے۔“ پھر

وہ شہباز صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔
 ”ہمیں یہاں کیوں لائے آپ؟“ نرونی کی ہار یک آواز گھرے میں بھیلی۔

Figure 1

”آپ دونوں کو سیٹوٹ کرنے کے لیے۔“ اس شخص نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ ابتداء کی فارم نقل کروانے کے لیے۔“ اس نے دو فارم ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگ اپنا، اپنا بائیں وایا خود درج کر لیں اس میں، مس زدنی۔“ اس نے زدنی کی طرف دیکھا۔ ”آپ کو بہت مبارک ہو، آپ کا نام اس سال سماجی بیہود کے لیے دی گئی خدمات کے سلسلے میں صدارتی تمغہ برائے صحت کارکردگی کے لیے فائصل ہو چکا ہے۔“ اس نے زدنی کی سماعت پر ایک مرتبہ بھر مہماری کرتے ہوئے کہا۔

”اور شہباز صاحب آپ کی دلیرانہ مدد جو آپ نے مس میرال صلاح الدین کو فراہم کی کے عوض آپ کو خصوصی انعام سے نوازا جا رہا ہے اور ان دونوں انعامات کی سفارشات وزارت اطلاعات و نشریات کی طرف سے کی گئی ہے۔ میں خود بھی۔“ وہ شخص کھڑے ہوتے ہوئے بولا اور ماتھے پر ایک مرتبہ بھر ہاتھ لے جا کر سیٹوٹ کے سے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ ”آپ دونوں کی اس نادر خدمت پر آپ کو سیٹوٹ کرتا ہوں۔“

اس دفتر کی مشرقی دیوار پر سجے پاکستان کے قومی پرچم اور بڑے مختصر فارم میں جڑے پاکستان کے نقشے پر زدنی کی نظر پڑی۔ وہ جغرافیائی حدود کی حقیقت کو نہ سامنے ہوئے اس ملک کی شہری بننے پر بخیر رہی تھی اور اس نے اس خواہش کے پورا ہونے کے بعد کتنی ہی بار سوچا تھا کہ اس نے ایسا کر کے اپنے سیدھے سادے راستے میں کیسے کاٹنے دیے تھے جو اس کے پر ملتے، پھٹتے، آبد ہونے لگے تھے۔ مگر یہ اس کی نیت، شرق، گلن، جو بندہ ریل محبت کی سچائی تھی جو اس روز ایک ایسے خلیے کی شکل میں اس کے سامنے آئی تھی جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے ڈبہ بانی نظر ان سے شہباز صاحب کی طرف دیکھا۔ جن کی اپنی آنکھوں سے اشک دوں تھے اور وہ اسی مشرقی دیوار کی طرف تہہ سوزے ماتھے پر ہاتھ رکھے پرچم کو سیٹوٹ کر رہے تھے۔

اس روز دگر واپسی پر زدنی کا دوبارہ نادر سے ایک بہت بڑا جھگڑا کرنے کا تھا۔ لیکن مگر وہ ابھی پر اس کے سامنے ایک انوکھا سی منظر موجود تھا۔ اس کی سماعت، سب ندریں، اندوئی ان کے بچے اور شہباز صاحب کی بیگم ان کے راستے میں پھول سجھیں۔ بیہودوں کے ہمارا اور بکھرے لیے اس کے اور شہباز صاحب کے منتظر تھے۔ مگر کابر کمراسا ہوا تھا اور بکھرے منتظران اور بک کے ان محنت ڈے رکھے تھے، وہ اپنے بھرپور انداز میں اپنی سسرال اور اپنے پاکستان میں قبول کر لی گئی تھی کہ اس کی پہلی تمام تکلیفیں اور آبلہ پائی اسے بھرتے گئی تھی۔

”تم بہت بے ایمان ہو نادر۔۔۔۔۔“ منٹائی کھاتے ہوئے اس نے باریک آواز میں چلاتے ہوئے کہا۔

”اور آپ بھی لماں۔“ بھر اس نے ساس کی طرف دیکھا۔

”میں تو سچ سے ہی پتا تھا، ہم نے سوچا تھیں وہ دیا جائے کیا بھلا نادر۔۔۔۔۔؟“ ماں نے نادر کی طرف دیکھا۔

”سر پرانہ۔۔۔۔۔ ہاں سر پرانہ۔۔۔۔۔“ نادر کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

”بس میں کچھ نہیں جانتی زدنی، مجھے تو تم چانتا سے اصلی چائینیز ڈیکوریشن چمولا کر دو گی جب اگلی بار وہاں جاؤ گی تو۔۔۔۔۔“ یہ نادر کی آپا تھیں جنہیں سب سے زیادہ اس سے اختلاف تھا۔ جاو کی چھڑی سی جلی تھی اور منظر بکسر بدل گیا تھا۔ اسی بچنے کے انتہام پر شہر کے ایک اچھے ٹیکسٹائل ہال میں زدنی اور نادر کے ویسے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں حمزہ محمود دانی نے بطور خاص شرکت کی تھی اور زدنی سے اس ساری تکلیف پر معذرت کرتے ہوئے جو اسے انجینئری کی تحقیقات کے دور ان اٹھانی پڑیں، خود اس کے سامنے کھڑے ہو کر اسے سیٹوٹ کیا تھا۔ یہ ایک ایسا سیٹوٹ تھا جس کا حمزہ نے نادر سے وعدہ کر رکھا تھا۔

”تم بھی تو ہند پنڈت سے سرشار ہو جاؤ دانپال..... پھر قربانی کی تو کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بے درپے مہی، میرال کے دھتے کے حلیے میں جس قسم کی انگلیں جھگی ہیں انہیں یہ فیصلہ اسی وجہ سے کرنا پڑا۔“ شادخانہ نے اپنے بند پر سیدھے لپٹے دانپال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”قربانی کی کوئی جگہ بھی تو ملتی ہو جس بھائی۔“ ”انیا مال ہے کسی سے بولا۔“ ”آپ خود جانتی ہیں کہ یہ کیسی بے گنجی بات ہے۔“

”دیکھا ہوں۔۔۔ جب بات خود پر آئے تو کیا لگتا ہے۔“ شاعرانہ نے اکسایا۔ ”ہم ادھر ادھر جہاں بھی میرال کی شادی کرنے کی کوشش کریں گے ہمیں کم و بیش ایسی ہی باتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک دم ہو جو سب جانتے ہو، سب سمجھتے ہو، یقین کرتے ہو اور مانتے بھی ہو۔“

”پلیز بھائی مجھ سے اتنی بڑی بات کی توقع نہیں کی جائے، آپ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی میرا کو اس ایجنٹ سے نہیں دیکھا اور پھر پرنسپل کے ہوتے ہوئے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”وہ محمود واناہل..... ہنیش اپنی اچھی لڑکی ہے، اس کے چہرے ایک ایسی جلیب جیٹ کر اڑا دے، اسے تو کوئی بھی اپنانے میں فخر محسوس کرے گا مگر میرا ل.....“ شائمانہ نے اپنی بات ادھر دیکھ کر چھوڑتے ہوئے واناہل کی طرف دیکھا جو اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی نظریں غلامی جیٹیں اور وہ کی گھری ہوئی جلیب میں ڈوبا ہوا تھا۔

”پہلو نے بہت بڑی زیادتی کی ہے، مجھ کو تو یہ بات منہ سے نکالنی چاہیے تھی۔۔۔۔۔ مجھے تو بہت پہلے سے اس ہنگامے کی توقع تھی۔“ تمہیں نے ناخوش گھر سے واپس پر سب قصہ مجھ کو گوش گزار کرتے ہوئے کہا تھا۔

”محمی نے بہت بڑی حماقت کی تھی۔ سب وہاں جا کہا۔۔۔۔۔“ جواب میں حمزہ کا رتو ٹھٹھل گیا کی توقع سے زیادہ شدید تھا۔ ”محمی نے لی ایماں کے حوالے کر کے بھی مجھے نہیں سکھایا تھا لیکن آج شاید انہوں نے ہمیشہ کے لیے مجھے سکھو دیا۔“ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔

”میں لی اماں کے ہاتھوں پلا بڑھا ہوں تمہیں۔“ پھر اس نے نگہیں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”لی اماں جو رتوں، روپ والوں، موضع داروں اور اپنی بات کا پاس کرنے والی نسل کی امین تھیں۔ لی اماں نے یہ سب خصوصیات ختم کی کے ساتھ میرے اندر بھی ڈال دیں جب ہی تو میں تم لوگوں کی اور میری کی اس دنیا میں مس فٹ ہوں، خدا کی قسم نگہیں میں اگر لی اماں کی بواچی سے کٹ صف کے بارے میں نہ جی جانتا ہوتا تو میرال کے لیے اپنا پوچھنا ضرور جھوٹا نکال بھی لاتا اسے کسی سجا کی ضرورت ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اس کے لیے مجھ سے بہتر کوئی اور سجا ہو سکتا ہے، میں تو خود اپنی ذات کی تمنا کی کا شکار ہوں اور اپنے ہی جیسی کسی شریک حیات کے ساتھ لی اماں کا گھر بسانا چاہتا ہوں مجھے ان خویوں اور خامیوں کے ساتھ جو مجھ میں ہیں کون قبول کرے گا بھلا؟“

تفہیم کے پاس حمزہ کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ تو اس کے پروہنڈل کے درجہ میں ہر ایک کی رائے سن کر حیران ہو رہی تھی اور تو اور روشن خیال اور تعلیم یافتہ اشعر میاں بھی حمزہ کی تجویز پر اعتراض کر رہے تھے۔

”حقیقت اسے جو بھی ہو، ہم شریف خاندان کے لوگ ہیں تقمیں، عزہ کو ہمیں ہادیٰ علی نظروں

میں شرمندہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔" اشعر کے کھٹ نے تلمیں کو حیران کر کے رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

"کچڑ میں کھلے پھول کو کچڑ میں ہی پڑے رہنے دینا چاہیے کیونکہ وہ کچڑ سے باہر نکل کر بھی اپنی اصلیت کے ساتھ ہی پہچانا جاتا ہے، شاید وہ کچڑ میں ہی بکلا اچھا لگتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے کچڑ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔" محبت دن پیچھے مہرزاو خان نے مہرال سے رابطہ کیا تھا اور اس کی کئی بات سنی تھی۔

"آپ عزت داروں کا معاشرہ مجھے قبول کرنے سے انکاری ہے کسی اور کی کیا کہیں خود آپ بھرے جھوم میں میری گواہی دینے کا دعویٰ کرنے کے باوجود مجھے قبول کرنے سے انکار کر چکے ہیں باقی کے لوگ تو تمام دنیا میں اور دنیا کو کیا پڑی اس گواہی پر آمنا و صدا کہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"تم بھلا نہ یاد رہو مجھ سے بدگمان ہوتی ہو مجھے استغایٰ زیادہ اطمینان قلب محسوس ہوتا ہے۔" مہرزاو خان نے دل میں سوچا تھا۔ "بہت بھتر ہے تم مجھے بہت برا جانو اور بروں کی زندگی میں اچھی چیزیں بھی نہیں، میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہاں خوب صورتی کے اندر بد صورتی ہستی ہے اور وہاں تم جیسے لوگ پہنچے ہیں شاید بد صورتی کے درمیان ہی جاتے ہیں، ہم انہوں کے اصول دور سے ہی سہا نے ملتے ہیں مہرال صلاح الدین ہیں اور تمہیں اس بد صورتی میں پسند کر جیتے ہی تمہارا گھانا کھنٹ دینے کا گناہ میں کیسے کر سکتا ہوں..... جبکہ میں نے تو خود تمہیں..... زندگاری بد صورتی سے نکال کر مہرال صلاح الدین بنا دیے کہ آپ نے جس کا گنا خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹنے رکھا..... میں واپس تمہیں جس کی خود غرضی کی، سیاہ کاری، جھوٹ، فریب، دہائی، انا، جھوٹی انا پرستی اور جالاندزم و

رواج کی دنیا میں لے جانے کا جرم نہیں کر سکتا۔ مجھے معاف کر دینا، مہرال میرے قدم میری حدود پر کھڑے ہیں، ان سے پار جانے کی کوشش کروں گا تو خود کو تباہ ہوئی جاؤں گا، تمہاری بربادی کا بھی باعث بن جاؤں گا۔" وہ کہہ رہا تھا اور اس کے الفاظ مہرال کے دل پہاڑوں کی طرح گرج رہے تھے۔

"مجھے قسم ہے اس عظیم جذبہ کی جو مجھ پر عینی نظر پڑتے ہی میرے دل میں جاگا تھا، جس کے اثر میں، میں آگے چلا، کہانیاں کہنے اور کہانیاں سننے کے سلسلے سے آگے ایک ہزار راقی کی قیمت ادا کرنے تک اور پھر اس سے بھی آگے اس کچڑ میں جہاں تم جیسا کنول ڈولا تھا، اس بد صورتی جس نے تم بھی خوب صورتی کو اپنے گلے میں بکڑ رکھا تھا ایک رسائی کے دوران کوئی گواہی نہیں آیا جب میرے دل نے تمہاری تمناؤں کی ہو، میرے خواہشوں سے اثر کر تم کہیں اور چلی گئی ہو۔ دنیا مجھے سیاست کرتے، انتخاب لاتے، تقریریں کرتے، چیتنے، جشن مناتے، وزارت کا حلف اٹھاتے، پیشہ ورانہ ذمے دار ہوں پوری کرتے ہر روز دیکھتی رہی مگر قسم ہے مجھے اپنے رب کی اس سب کے دوران بھی کوئی گواہی نہیں تھا جب تم میری سوچ پر حاوی نہ تھیں....." وہ کہہ رہا تھا۔

"میرا جذبہ کتنا عظیم تھا اس کی سب سے بڑی گواہ تم خود ہو مہرال..... وہ راتیں یاد کرو، جن میں تمہارے، میرے، تمہاری اور میرے اختیار کے سوا صرف خدا تھا۔" مہرال کا دل لرزنے لگا۔

"وہ دن یاد کرو جب اس مرنے والے اور اس کے بیٹے کی قید سے نکال کر میں تمہیں اپنے ریت پاؤں میں لے گیا، کتنے دن، جتنے، میں نے تمہارے وہاں گزرے، کیا مجھ ایسے شیر کے دانت تیز نہ تھے یا انکار مہر دار تھا؟"

میرال کا دل اپنے کئے لفظوں کے ایک ایک حرف پر جڑاؤ ہزار بار دعا مست کی گھبراہٹوں میں ڈوبنے لگا۔
 ”کیا تھا جو میں مسز جہانگیر اور ان کے دوستوں کی انہی کی آواز کو شروع میں ہی دبا دیتا، میرے پاس اختیار نہ تھا یا مجھے خود پر قابضی کچھ اچھی لگتی تھی؟“ حقیقتیں مزید عریاں ہو کر میرال کو اپنا آپ دکھانے لگیں۔
 ”اور پھر مجید خان تو میری کیا تھا، دو چار گولیوں کی زد میں تم بھی آ جاتیں، قصہ ہی ختم ہو جاتا، مسز جہانگیر اور ان کے دوستوں کے اٹھتے ہوئے تم مجھے عظیم ترین شخصیت گردانے لگتے، برقی گولیوں میں خود کو جھونک کر، پرنو کول اور پرنیشن کی پروا کیے بغیر جان پر کھینچتے ہوئے اپنا وعدہ ایلا کرنے کی مجھے کیا ضرورت تھی میرال اگر تمہارا میری نظر میں وہ مقام نہ ہوتا جو ہے۔“ میرال کو کیلی ہار اس کی آواز بھڑائی ہوئی محسوس ہوئی۔

”خدا گواہ یہ سب سچ ہے۔“ میرال نے بہ مشکل حلق میں ٹھٹھنے لفظ ادا کیے۔ لیکن اب جبکہ آگ کا دریا عبور ہو چکا، پھر مجھے کیوں زندگی کی تسکینی میں تھا چھوڑے جاتے ہیں۔“
 ”کیونکہ میں تمہیں اپنے ساتھ کی ہوں، میں کی موت مرتے نہیں دیکھ سکتا۔“ خدا اپنے ہاتھوں سے تمہیں زندگی کی ایسی بسائی تسکینی میں چھوڑ کر آیا ہوں۔“ وہاں آگ کے کوبہ بانیں کسے لے آؤں۔ میں بہت بہادر، بہت ذہین، کسی سے نہ ڈرنے والا، بھگتوں کا آگنی پست پر بیٹھ کر سینہ سر جھکوں کا قہار، پشت سے آئے دار کا فکار ہو چکا ہوں..... اور یہ وار میرے اس اپنے نے کیا ہے جسے بے گناہ قرار دینے کی مجھ میں ہمت ہی نہیں ہے۔ میں اس وار کے آگے نہپتا ہوں میرال۔ میرے ہاتھ اوپر کواٹھے ہوئے ہیں اور ہونٹ میل چکے ہیں، میرے ہتھیار میرے قدموں میں چڑے ہیں۔“
 میرال نے اس کی بات سنی اور جذبہ گریہ کھڑے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنی ساری بات کہہ چکا تھا۔ اب اس کے پاس اور نہ خود میرال کے پاس کچھ بچنے کو باقی تھا۔
 ”تم مجسم دعا ہو میرال صلاح الدین، میرے سے دعا کرنا میں اپنی کی ہوئی جو فصل کاٹ رہا ہوں، وہ کٹ جائے اور میرے ہاتھ ملنے نہ ہوں۔“ اس نے آخری بات کی بھی اور فون بند کر دیا تھا۔ میرال سب کچھ پا کر بھی اسے ہار چکی تھی۔

☆☆☆

”میرا نام محمود گردانی ہے، میں حمزہ کا والد ہوں اور آپ سے اپنی بیوی کے انتہائی غلط رویے کی معافی مانگنے آیا ہوں۔“ محمود گردانی نے باری، باری عافیہ اور جہانگیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”انہوں نے غلط رویہ ہی نہیں اپنا یا، بہت بڑی ذرا دانی کی۔“ عافیہ نے کہا۔
 ”وہ ناگوار ہو بڑی ہوئی ہے، میں تمہیں سکنا میں کتنا شرمندہ ہوں۔“ محمود گردانی سر جھکا کر بولے۔
 ”کہے ہوئے لفظ اور دیے ہوئے دھم وہاں نہیں ہو سکتے۔ لیکن پھر بھی آپ خود چل کر آئے ہیں اس لیے ہم اپنے دل سے بات نکال دیں گے۔“ جہانگیر نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”میں حمزہ کے والد کی حیثیت میں خود آپ سے میرال کے لیے حمزہ کا نام جو بڑ کرنا چاہتا ہوں۔“ محمود صاحب نے کہا۔

”اب شاید اس کی ضرورت نہیں رہی۔“ عافیہ نے کہا۔ ”آپ کی وائٹ کی توجہ دلانے پر ہی ہمیں خیال آ جا کہ دوسروں کی طرف دیکھنے کے بجائے ہم میرال کو اپنی ہی بہو کیوں نہیں بنا لیں کیونکہ ہم تو اس کی مصمت

اور کردار کے گواہ ہیں، اس کے لیے ہمیں اپنے سینے کا طے شدہ رشتہ ہی کیوں نہیں توڑنا پڑے ہم اس نیک کام کو اپنے گھر ہی سے کیوں نہ شروع کریں۔“

”نہیں میری بہن۔۔۔“ گھوڑورانی نے عافیہ کی بات سن کر حمزہ کے چہرے پر اندلی بے چینی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں اگرچہ ابھی تک اس ہنگام سے ملا نہیں ہوں مگر بغیر دیکھے، ملے اور جانے ہی اس کی پاکبازی اور مصمت و کردار کی گواہی دیتا ہوں اور یہ کوئی جذباتی گواہی نہیں ہوگی، یہ حالات و واقعات کے منطقی نتیجے کا نتیجہ ہوگا۔“ عافیہ نے کن گھبیلوں سے جہا تھیر سہگل کی طرف دیکھا۔

”ویسے عجیب سی بات یہ ہے کہ ہم سب اپنی، اپنی جگہ پر کوشش کر رہے ہیں، ہم نے میرال سے اس کی رائے نہیں لی، وانیال، حمزہ، لہدیان تینوں میں سے اسے اپنے لیے کون مناسب سا مکی محسوس ہوتا ہے۔“ جہا تھیر سہگل نے یک دم کہا۔ ان کی بات سن کر وانیال نے بے چینی سے اپنی نشست پر بیٹھے، بیٹھے پہلو بدلا تھا اور حمزہ اٹھ کر اندر چلا گیا تھا۔ اس کا رخ میرال کے کمرے کی طرف تھا۔ دروازے پر دستک دینے اور اندر داخل ہونے کی اجازت ماننے کے بعد وہ میرال کے سامنے تھا۔

”مجھے زیادہ مکی چوڑی ہاتھیں کرنی نہیں آتیں میرال، یہ بات تم بہت پہلے سے جانتی ہو۔“ اس نے اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے بغیر کوئی تہمید باعہ نہیں کیا۔

”ایک مہرے سے بی اماں اور خصوصاً یوای مکی مجھے خواب میں تمہاری کھوج میں لپکنے کی تلقین کر رہی ہیں، ساتھ کے ساتھ وہ مجھے یہ اشارہ بھی دیتی رہی ہیں کہ تم کسے سے مہرے چاؤ ڈالنا میرا فرض اور میری ذمہ داری ہے۔“ اس نے دک کر میرال کی طرف دیکھا اور وہی وجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔

”میں تمہارے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔۔۔ بچپن، ایک چوہے کی طرح میری یادوں میں زندہ ہے۔۔۔ مگر جب میں ایک مہرے سے بھلا ہوا تو اس شہر کو وہ کچھ مجھے تمہارا اور یوای کا خیال آیا اور عافیہ اسی روز سے میری ڈیوٹی لگ گئی کہ تمہیں تلاش کروں، تمہاری کھوج میں جہاں اتنے لوگ لپکنے وہاں ایک دیا تمہاری تلاش کا میں نے بھی جہاں لکھا تھا، بسا اٹھ کر کوشش کرتا رہا۔“

میرال کے چہرے پر مسکونیت کے آثار نظر آنے لگے۔

”اور اب جب تم اس زلفوں سے باہر نکل چکی ہو میرے سامنے موجود ہو، میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر تمہاری مصمت اور پاکبازی کی گواہی دیتا ہوں اور خود کو تمہارے ساتھ کے لیے سوالی کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ بی اماں اور یوای تو شاید ہم دونوں کا حلق بہت پہلے۔۔۔ ملے کر چکی تھیں، میں اس کٹ منٹ کو حقیقت جاننے کے لیے تم سے ریکوسٹ کرتا چاہتا ہوں، اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ ہم دونوں مل کر بی اماں اور یوای کی ریتوں، مردانوں اور اس دم توڑتی اقتدار کو دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں جن کو ہم نے بھلا رکھا ہے کیونکہ اس نسل کی وضع داری کے امین شاید صرف ہم دونوں ہی ہیں۔“

”کیا تم اس مچہ پگام زندگی سے دور مجھے پھر سے سادگی اور بے تکلفی کے اس دور میں واپس لے جا سکتے ہو جو بی اماں اور یوای کا دور تھا؟“ میرال نے اس کی لمبی بات سننے کے بعد صرف ایک سوال پوچھا۔ ”کسی ایسی جگہ جہاں میں اپنی ہی شناخت بنا سکوں جہاں میں یوای کی بیٹی اور بی اماں کی بہو کی حیثیت سے جانی جاؤں؟“

”بالکل لا۔“ حمزہ نے فوری جواب دیا۔ ”میرا تم سے وعدہ رہا۔۔۔ میں تمہیں ایسی ہی جگہ لے جا کر بساؤں گا۔“

”کیا تمہارے والدین مجھے قبول کر لیں گے؟“ میرال نے دوسرا سوال کیا۔

”بھرے والد باہر تمہارے سوالی بنے بیٹھے ہیں، عافیہ آفتی کے پاس۔“
 ”فحیک ہے، میں تمہارے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتی ہوں۔“ میرال نے ہاتھ بڑھایا، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے حذر نے دیکھا وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی بھاری غلافی آنکھوں میں حزن تھا۔ سلاسل تھا ہو گاوری تھی۔

”لو آج میں بھی تم سے دست بردار ہوئی میرزا اوخان۔“ اور میرال سوچ رہی تھی۔ ”ایک صرف تمہارے خیال سے نہایت پانے کے لیے اس شخص کی ایک فطرتی اور پُر غلوں محبت کے آگے سر سفر کر دینے میں مجھے کوئی حال نہیں ہونا چاہیے۔ مگر نہ جانے ایسا کیوں ہے کہ میرے اندر کچھ کتنا محسوس ہو رہا ہے اور میرے جسم میں کانٹے سے چبھنے لگے ہیں۔“

☆☆☆

”میرا بیٹا، شہید کا بیٹا، خالوں کے قبضے میں، حکومت بد کرے، ہم کارواں بنائیں گے، احتجاجی ریلی، غم، جلا، بجنی اتنے کم دنوں میں تم نے بہت کچھ کر ڈالا۔ مجھے توقع نہیں تھی سائیکس کہ تم اتنی باہمت ثابت ہوگی، جب آپ سائیکس بیکسپ۔“
 ”میں کانٹوں کے ہسٹر پر سوتی ہوں صاحب، میری آنکھوں کی فیکس لگ چکی ہیں، میرا بیٹا نہ جانے کس حال میں بیٹا ہوگا۔“

”تو ایسا کرو ناں بابا ایک چیز ہوتی ہے ٹریکولائزر، ایک بجیں ٹریکولائزر وہ لیتا شروع کر دو رات کو سونے سے پہلے، دو ماغ کو آپ کو آپ (اپنے آپ) سکون آتا حذر سے آپ نے گا۔“
 ”صاحب آپ باتوں میں اڑھا رہے ہیں مجھ کو۔“

”تو اور کیا کروں بابا..... دوسر جہاں تمہارا بیٹا ہے ناں، ٹھہرات کرنے کے لیے پہلے ڈالروں کی بورجوں کے منہ کھولنے پڑتے ہیں۔ ڈالریاٹ شروع کر دیتے ہیں۔ ڈالریاٹ بات آگے بڑھاتے ہیں..... لے آؤ اسٹے ڈالروں کو لو ان سے بات، جنہیں تو پڑا رہنے دے، اسے اس کا سر چنگ سیٹ میں بھڑی فہار چٹانوں میں پڑا آرام کرتا ہے، canned تو ڈکھاتا ہے اور اس کی شراب پیتا ہے، اسے وہاں دکھایا ہے جو روٹی ہو، اس وقت کو تائی جاؤ، احتجاج کرتی رہو گا بے بگا ہے یہی تمہارے لیے لائن آف ایکشن ہے، اگر ڈائیز انٹرفو جڑے نعم ہو گئے ہیں تو وہ اور بڑا الموالیت، بیسیوں نے دخی میں ایک نیا ڈیز انٹرفو ڈھونڈا ہے، فرانس سے آیا ہے، دنوں میں جھنڈے گاڑ دیے اس نے، کہو تو اس کا کاسٹیکٹ دے دوں؟“

”رہنے دیجئے..... بہت حسد اڑا چکے آپ ہماری بے بسی کا، وقت بدلنے کا وقت اب آیا ہی چاہتا ہے، اب آپ بھی ٹیلی ویسیوں کے اور جیل کی دھار بھی۔“

”بابا..... ہمیں ڈالنی ہوتی ہاں..... یاد رکھنا راوہا کے ناچنے کے لیے بھی ٹومین تیل چاہیے ہوتا ہے، کوئی ٹومین تیل لانے کا تو راوہا کو لچائے گا ناں..... اس لیے ہمیں تیل کی دھار کی کیا فکر بھلا؟“

”اللہ آپ سے پوچھے صاحب، میرا تو خاندان برادر ہو گیا آپ کی دوستی میں۔“
 ”میں تو پہلے ہی عرض کرتا تھا تم کوک ظہرے لالہ علم و دانش کی اولاد ہیں، فدوی اللہ والوں کی سر زمین کا خادم، دوستی کیسے ہوگی کچھ کچھ نہیں آیا۔“

”جھیک ہو صاحب! بندہ گڈ پائے فارگڈ۔“

”گڈ پائے بی بی جان..... گڈ پائے سب کچھ کی دھار دکھانے والی دکھانی تم نہ جانے کوھر سے آگئی تھیں
اولی علم و دانش کے خاندان میں۔“

☆☆☆

اس کے سامنے تین شاہیوں کے کارڈز رکھے تھے، سادے مگر بے حد خوب صورت کارڈ تین بارائیں
ایک ہی گھر سے نکلے والی تھیں اور تینوں کو ایک ہی جگہ جا کر تین دہلیزیاں کھلائی تھیں۔ ان تینوں بارائوں میں
وہ ابدا حرم مدعو تھا بلکہ شاید وہی آئی بی گیسٹ ہوتا اگر وہ ان میں شرکت کرتا..... مگر وہی آئی چیز کو مدعو کرنے
کے مجھڑے اور قہسے لیے ہوتے ہیں، یہ دو کول، خصوصی انتظامات، حفاظتی دستے اور نہ جانے کیا..... اپنے
میزبانوں کو اسی دھمت سے بھاننے کے لیے اس نے شرکت سے معذرت کر لی تھی۔ اس کی طرف سے تینوں
جوڑوں کے لیے تین تین بیچانات کے ساتھ قیمتی تحائف بھجوائے جاتے تھے۔ اس شام جب یہ تقریب منعقد
ہو رہی تھی تو وہ اسکا پ پر عافیہ جھاگھیر کے ساتھ راجیلے میں تھا۔ تینوں کاغذ سمجھ میں ہوئے تھے اور تینوں
بارائیں سادگی کے ساتھ کنفری کلب میں اتڑی تھیں۔ تینوں دھلیزیاں خوب صورت تھیں اور روایتی لباس میں
شاہکار لگ رہے تھے۔ وہ بہت دلچسپی کے ساتھ حرم سے کے بعد کی شادی کی تقریب دیکھ رہا تھا۔ تینوں دہلیزوں
نے روایتی گھونگٹ کا ڈھر رکھے تھے۔ تینوں کو وہ ساتھ بیٹھے دھلیزوں کے لیے بیچتی بار تھا۔ فہد صدیقی کی
دلہن دانیال جھاگھیر کی دلہن اور حمزہ محمود کی دلہن اس تیسری بیوی پر آئے تھیں نے راک مہری سانس پلٹے
ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ تینوں دھلیزوں کے چہرے غمی اور مسکند رہے تھے مگر لیے گھونگٹ کا ڈھر تھیں
دہلیزوں میں سے کون کتنی خوش تھی کون جانے..... اسے لگا وہ حرم کی دیکھ پائے گا..... اس نے اپنے ٹیپ کی
اسکرین آف کر دی اور لگاس دال کے پار اندر حرم سے میں پہنچی مصنوعی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

”میں کہتا تھا ناں کہ تہاری قسمت کا ستارہ بہت بلند ہو رہا ہے جو بات منہ سے نکلتی ہو پوری ہو جاتی
ہے، کیسے طے کرنے کے ساتھ تم نے کہا تھا۔ دیکھتے ہیں کون یہاں سے جا کر واپس آتا ہے اور کون تہاری کبھی بات
پوری ہوگی۔ مہارک ہو اس بار یہ بیویاں حسب عادت تم نے بولا اور اس کی فصل مجھے کافی پڑی۔ مگر تہاری عطا
کردہ یہ سوغات میرے سر آنکھوں پر، بس ایک خواہش دل میں جاگتی رہے گی کہ تم ہمیشہ خوش رہو اور میرے دل
کے نہاں خانوں میں بسکتی رہو۔“ اس نے حمزہ محمود کے پہلو میں بیٹھی دلہن کو قصور میں مخاطب کرتے ہوئے سوچا
اور کرے میں جتنی کام و دشیاں بھجوا دیں۔

☆☆☆

”لگ کر حمزہ منڈٹ جاتا تو میں تو کیا تھا کام سے۔“ دانیال نے ہنس کر کہا تھا۔

”میں تو مر ہی جاتی۔“ بیٹی کی آواز ابھری۔

”میں تہاری لائف ہوں جان من، تم کیسے مر سکتی تھیں.....“ دانیال کے لہجے میں شوشی ابھری تھی۔ وہ
دونوں ہنس رہے تھے۔

☆☆☆

”مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ تم نے میرال کو چھوڑ کر میرا انتخاب کر لیا۔“ علید نے کہا۔

”میرال کو میں نے بیکار کیا تھا حمزہ..... اسے صرف حلاش کر رہا تھا میں، وہ بھی انسانیت کے نام

ملک کی ایک جنگی مصمت کو بچانے کے لیے چھوٹی سی سٹی ان پریکٹسی بھاری بن کر گزرتی رہی تھی۔ تمام ہمسایہ حالات کا سامنا کر لینے کے بعد بھی زدوئی حسین کی پاکستان سے محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بڑو چار سرکاری تقریب کے اختتام پر ہنر ہلائی پرچم کے ہم رنگ سبز لباس اور سفید دوپٹے میں پلیس زدوئی حسین بی ڈوی کمرے کے سامنے اپنا مینل پینے کھڑی اپنی باریک آواز اور چٹنی لب و لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"مجھے پاکستانی قوم کی فرد ہوئے پر فخر ہے۔ پاک سرزمین شاد باد۔" اس کے ارد گرد کھڑے لوگ بھی ہاتھوں میں پکڑی چھوٹی، چھوٹی جھنڈیاں اٹھائے قومی ترانہ سارے تھے۔

☆☆☆

قیوم نے "steady green" سگنل دینے کے بعد پیچھے ہٹتے ہوئے اپنے سامنے موجود سیدنا جہاز کو ٹیکسی فارورڈ کا اشارہ دیا اور حریف پیچھے ہٹ گیا۔ جہاز نے اپنے پیلوں پر آگے آتے ہوئے انجن سے دھواں پھوڑا اور دھیرے دھیرے اوپر اٹھنے لگا۔ والٹن تھاٹنگ کلب، بور کے فوٹنگ انسٹرکٹر قیوم شہزاد کے لیے یہ فلائٹ، اس کی زندگی کا سب سے بڑا تجربہ تھی۔ چار سال قبل جو فلائٹ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے جہاز سمیت بلند یوں سے نیچے آگرا تھا۔ ایک ایسی فال جس نے جہاز کو آگ کے شعلوں میں لینے ہوئے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا، جہاز اڑانے والے کا جسم زمینوں سے چور تھا اور ریگ کوٹ میں جا چکا تھا اور جس کی جواں عمر کی کا سوچ کر اس کی روح فنا ہوتی تھی اور جسے اس حادثے کے بعد ایک لمبے عرصے تک وہ موت اور زندگی کے دوراں ہوں پر کھڑے اور بھٹکتے دیکھتا رہا تھا۔ آج وہی ہوا ہے۔ اس کی غمروں کے سامنے اپنے کامل اعضا اور مکمل حواس کے ساتھ اس کے "steady green" سگنل پر ہاتھ کے انگوٹھے کے اشارے سے اسے تھیز زکا اشارہ دیتے ہوئے آسمان کی بلند یوں پر پرواز کر رہا تھا۔ قیوم نے اپنی زندگی کے اس سب سے بڑے معجزے کا نظارہ کرتے ہوئے اپنی بھٹی آنکھوں کو ہاتھ کی انگلیوں سے خشک کرتے ہوئے لپٹے بائیں طرف کھڑے دانیال جہاگیر کی والدہ، والدہ اور بیوی کو دیکھا۔۔۔ ان سب کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں اور چہرے خوشی سے جھٹک رہے تھے۔

"وہ ایک مکمل فائٹر ہے۔" قیوم نے عافیہ جہاگیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اور مکمل فائٹر ہی عظیم ترین فلائٹر ہوتے ہیں۔"

"تم خوش قسمت ہو بیٹی جو تمہیں اس شخص کا ساتھ ملا جو اللہ کی قدرت کا چنا چھنا اور اس کی رحمتوں کا بیٹا جانتا سمجھتا ہے۔" پھر اس نے نیش دانیال کو مخاطب کیا تھا جس کا معصوم چہرہ ہلکے گلابی دوپٹے کے بالے میں اور بھی معصوم نظر آ رہا تھا۔

"ہم سب خوش قسمت ہیں سسر قیوم۔۔۔ جو ایک حادثے نے ہماری زندگیوں کے محور بدل ڈالے، ہمیں راہ ہدایت اور صراطِ مستقیم حاصل ہو گئی، اب یقیناً دانیال کی پرواز میں اور بھی مہارت اور خوب صورتی نظر آئے گی کیونکہ یہ ایک بچہ ہے اور پختہ ایمان والے کی فلائٹنگ ہے۔" عافیہ نے مسکرا کر کہا۔ آسمان کی بلند یوں پر دانیال کا جہاز یکساں اور متوازن پرواز کر رہا تھا۔ ایک دھماکے خیزے ناٹھکن کو ٹھکن میں بدل ڈالا تھا۔

☆☆☆

"میں نے تمہاری ماں کو جو حقیقت تھی سچ، سچ بتا دی تھی مگر زانو خاں۔۔۔" بھٹی آواز والے بزرگ اس روز بھی اس کے گھر میں اس کے سامنے بیٹھے تھے، کمرے میں موجود باقی نشستوں پر بھی وہی جانے بچانے

میں شہادت کے نعرے مارنے والوں کے لیے قربان کر جاؤں، مجھے اپنی زندگی کو جتنی کہ وہ ہے بہت سے اور کاموں کے لیے استعمال کرنا ہے۔ ایسے کام جو میرے ہی کرنے کے ہیں۔ آج میں آپ کو آپ کے قہقہے کی، آپ کی برادری کی اور آپ سب حضرات کی اپنی، اپنی دستار، عزت، غیرت اور سرداری واپس کرتا ہوں، جتنی وہ میرے پاس رہی، میرا خدا گواہ ہے میں نے اس سے غداری نہیں کی لیکن حریہ و فداکاری اب میرے لیے ممکن نہیں رہی لہذا اب یہ آپ کو سہارا کہ ہو۔ اس نے حتیٰ الجسہ میں آخری بات کی اور ان سب چھوڑ دی، ہر نظر ڈالی جن پر باقی تھی، ہر مسند کی تھی، پر بیٹھی تھی، چیمائی تھی، ٹکر تھی۔ ٹکر پیچ نہیں تھا، وارننگ بھی نہیں تھی اور دھمکی بھی نہیں تھی، مہر زادو خان نے بغیر اپنے مہرے، اداہر اداہر کہے انہیں سیدھی شاہ مات سے دوچار کر دیا تھا۔

☆☆☆

قوام نی وی نور جھٹلو راکہ بر پانک نوز چل رہی تھی۔ وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات سردار زادہ مہر زادو خان نے اپنی وزارت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف وزارت بلکہ قومی اسمبلی کی رکنیت اور پارٹی کی قیادی رکنیت سے بھی استعفیٰ دے دیا تھا۔ استعفیٰ کی وجہ ذاتی مسائل بتائی گئی تھی۔ چند منٹوں کے اندر سیکرٹری، نی وی کے نوز جھٹلو پر قوام مخصوص چہرے اپنے، اپنے، پانک سنبھالے اس بر پانک نوز پر تہرے اور بحث کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

☆☆☆

"His was an entry of a leading soldier and his is an exit of a high-headed conqueror"

اگلے روز ایک ایڈنگ نوز بچہ میں نامور صحافی، چل رہی تھیں کا منظر اس عنوان کے تحت شائع ہوا تھا۔ چل رہی تھیں جس نے چند ہفتے قبل ہی مہر زادو خان کی ترجمان کی حیثیت سے ذاتی اختلافات کی بنا پر استعفیٰ دیا تھا کا یہ منظر جاندار اور انتہائی منطقی تھا۔

☆☆☆

"میں جانتا تھا بابا..... تم اگلا دایاں قدم ایسا اٹھاؤ گے جس کی خبر تمہارے بائیں قدم کو بھی نہیں ہوگی مگر تم نے یہ قدم کچھ اچھا نہیں اٹھایا۔"

"آپ سب جانتے ہیں سر"

"ہاں بابا میں جانتا ہوں..... مگر یہ کوئی مردوں والی بات تو نہ ہوئی ناں....."

"میں نے پہلے روز کہا تھا سر، میں اپنی ہی کوشش کروں گا لیکن اگر نظام کو نہ بدل سکا تو نظام کا حصہ بننے کے بجائے نظام کو چھوڑ جاؤں گا۔"

"پہلے روز کی کبھی باتیں کوئی سمجھنے تو نہیں ہوتی ناں سائیں، کیوں اپنا نقصان کرتے ہو..... آگے لیا سیاسی کیریئر چاہے، جانتے ہو تم کئی بار گولی سے بچے ہو، اتنی بار گولی سے بچا جانے والے کو تو تے خیراں ہوتی ہیں سائیں۔"

"آپ میرے قہقہے، میری برادری اور خاندان کو جانتے ہیں سر، میں ان کے سردار انجیل کے لیے انہیں ایک اور شہید کا تقد نہیں پیش کرنے والا۔ اب انہیں اپنے ہتھیار خود اٹھا کر فرنت پر آنا ہوگا..... یا تو ختم ہو جائیں گے یا ہمیشہ کے لیے عین اس طرح میں آجائیں گے۔"

”تو بابا میرا کیا قصور ہے اس میں، تمہارے راستے صاف کرنے کو میں نے کون، کون سا کاٹا کیسے لگالا جانتے ہو ناں.....“

”جانتا ہوں سر..... اور اسی لیے آپ کو سٹیوٹ کرنے آیا ہوں۔ آپ بہت بڑی سپورٹرز ہے۔“

”یہ اچھی بات نہیں ہے سائیں، سپورٹروں کو یوں دعا دے جانا۔“

”میں یہ بھی جانتا ہوں اور مسدودت خواہ بھی ہوں لیکن ابھی اگر مجھے محسوس ہوا کہ تبدیلی کا محض غرہ نہیں لگ رہا تبدیلی واقعی نظر آنے لگی ہے تو ٹوٹ آؤں گا۔“

”یاد رہے تو بڑے کنواں والے بندے ہو، جو صلا مند چنگیز خان کے قلعہ retreat کیوں کر رہے ہو سائیں۔“

”یہ retreat نہیں ہے سر، قلم چالیں ایک individual کو بچانے کے لیے نہیں۔“

individual، سر وادعہ کر گیا تو وہ ابھی کا سفر آسان ہو جائے گا۔“

”صرف ایک لڑکی کی وجہ سے بساط الٹ کر جا رہے ہو سائیں، کم آن سائیں۔“

”صرف ایک لڑکی.....؟“ وہ ہنسا۔ ”وہ صرف ایک لڑکی نہیں سر، وہ پورا جہان ہے۔ جب ہی تو اللہ مجھے

ابھرا لایا، انگلش لڑایا، وزارت عطا فرمائی، وہ صرف ایک لڑکی ہوتی تو بساط قات کہاں ہاتھ لگتے۔“

”ایسی ہی ہوتی آتی ہے سائیں، انہی عجوبائیں تمام یہ دور کو چھو جہان ہی نظر آتی رہی ہیں، جب ہی

ہمیں دیکھو کہیں ایک جگہ دل نہیں لگایا۔ جو آئی اسے جا رہی ہے، صداقت کیا، کیا سہ گئے ہم۔“

”آپ کی تو بات ہی کیا ہے سر، آپ تو گرجت ہیں، میں نے آپ سے بہت سیکھا ہے سر..... خصوصاً بساط

پر بیٹھے بغیر چالیں چلنے دیکھنے کا فن سحر میں اس عجیبی ہاتھ کے حامل کہاں جو پڑے کے پیچھے سے آئے اور سب

شعرے میرے حق میں چل جائیں۔ اس عجیبی کچھنے کے لیے مجھے آپ کا سا سطرے کرنا ہوگا..... وہی سطرے

کرنے جا رہا ہوں۔“

”bon voyage، bon voyage“ سائیں، تم بہت کامیاب رہو گے، موقع پر آئے اور

موقع پر نکل لے۔ ”نے والا وقت تمہارا ہی ہوگا۔“

”مجھے میرے وقت کی بشارت ملت سائیں سر، میرے لیے اب سارے وقت ایک سے ہی ہوتے ہیں۔“

”.....“

”anyway“ فحیک یو فاروی سپورٹ یو آل ویز ایکسٹنڈ ڈوئی۔“

”تم ڈیجین تھے، سپورٹ تمہاری بنتی تھی، ورنہ کون محافظ اپنے ہی صاحب کو گولی مار دیتا ہے اور کون

..... hired حاصل خود کو hire کرنے والے کو اغوا کر کے لے جاتا ہے۔ سب co-incidence

کا نتیجہ ہے سائیں..... اللہ تمہاری حفاظت کرے۔“

”فحیک میر..... گاؤ نہیں یو۔“

”یاد رہے یہ ایک فارش الوداعی ملاقات ہے، اندر دکھاتے ہم ملتے رہیں گے۔“

”شیدو سر شیدو.....“

☆☆☆

تین سال بعد

لندن میں مقیم سادھو انشین اسٹریٹ کی استاد اور معروف پاکستانی صحافی کی کتاب ”Meharzad“

"khan a dynasty in himself" کے ایک معروف اور مہنگے پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوئی اور ایک ساتھ چورے یورپ اور امریکا کے بک اسٹائر کے فیصلوں کی زینت بنی..... فیضک مہر زاد خان کی بلیک اینڈ وائٹ پروفائل والے سردرق سے بھی اس کتاب میں ایک پاکستانی سیاست دان کی زندگی کو موضوع بنا کر پاکستان بالخصوص اور جنوبی ایشیا بالعموم کی سیاست کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی تھی اور مہر زاد خان کو ایک تاریخ ساز، دیوبالائی شخصیت کے طور پر سامنے لایا گیا تھا۔ اس کتاب نے اپنی اشاعت اور مارکیٹ میں آمد کے ساتھ ہی کتب بین حلقے میں جھلک چھایا تھا۔ چورے یورپ اور امریکا کے تمام بڑے اخبارات میں اس کتاب پر ریویو لکھے گئے اور چھ ماہ کے اندر، اندر ہی یہ کتاب booker's award کی ایک مضبوط امیدوار قرار دی جا چکی تھی۔

پاکستان میں البتہ اس کتاب کی خرید و فروخت پر کھل پابندی لگ چکی تھی کیونکہ پاکستان میں مہر زاد خان کی پارٹی کی مخالف جماعت اقتدار میں آچکی تھی۔ انٹرنیٹ پر دستیاب یہ کتاب آئندہ آنے والے سالوں میں انتخابات اور نئی قیادت کے سلسلے میں پاکستانیوں خصوصاً نوجوان پاکستانیوں کے ذہن میں کس انقلاب کا پیش خیمہ بننے والی تھی۔ یہ آنے والا وقت ہی بتائے والا تھا۔

☆☆☆

"ایک اجتماعی الپے سے مردانہ وار لڑنے والی پاکستانی قوم شاید ہی کسی اندازہ کر پائے کہ اس اجتماعی الپے کے اندر کتنے ہی انفرادی الپوں نے جنم لیا۔ سن دو چار سو پانچ سو، جس خوف ناک زلزلے نے پاکستان کے شمالی علاقوں کو اپنے اپنی بچوں میں آن دیو چاہا۔ وہ ایک قدرتی آفت قرار دی جا سکتی ہے بلکہ وہ بھی ہی ایک قدرتی آفت..... لیکن اس زلزلے کے اندر ختم ہونے والے چھوٹے، چھوٹے انفرادی الپوں کو برو کر پانے کا ذمہ دار کون ہے، کون ذمہ دار ہے اس بے کی موت کا جسے بھوک اور آفت کی دہشت کی ماری ماں نے خود اپنے ہاتھوں سے بھڑی سے نیچے پھینک دیا۔ کون ذمہ دار ہے ان لوگوں کی موت کا جو کسی امداد کا انتظار کرتے کرتے یہ قرار ہو کر خود ہی پتھر والے پتھر سے زندہ وطن اپنے چاروں کواٹھالنے چل پڑے اور خود بھی موت کا شکار ہو گئے۔ کون ذمہ دار ہے ان سکھوں یا مسیحیوں یا مسیحیت دہشیزاؤں کی عصمت دری کا جو امدادی کیہوں سے دہشتی حالت میں اٹھائی گئیں اور آج تک جن کی کسی کو خبر تک نہیں ملی۔ میں جانتی ہوں، میرا یہ جاگ، صرف چند سولہ گویں کی نظروں سے گزرے گا شاید اس سے بھی کہیں کم..... لیکن کیا ان چند سو میں سے کوئی ایک ہے جو مجھے بتائے کہ ان ہا مسیحیت دہا گرد دہشتی بچیوں کو امدادی کیہوں سے امداد اور طبی سہولتوں کے نام پر اٹھا کر کسی امراؤ بیگم، کسی زمر و خانم، کسی سلطانہ جان کے کوٹھے یا پھر کسی وزیر، مشیر، بڑے افسر، اعلیٰ عہدیدار کی بیچیں سجانے کو چھوڑ دینے والے ہاتھ کس کے ہیں، امدادی کاموں میں بے قاعدگیوں اور لوٹ مار کی حقیقتات کرنے والے کیا بھی اس امر کی تحقیق بھی کر پائیں گے کہ ان بے کس، مجبور، لاوارث بچیوں کی مصیبتوں کا قائل کون ہے، حکومت، معاشرہ، ناظمین قانون سازی یا پھر یہ سب مل کر ان کے مجرم ہیں؟

میں ایسی ہی کم کردہ راہ بچیوں میں سے ایک ہوں جس نے اس عظیم انسانی الپے میں دنیا میں باقی بچنے والا اپنا واحد رشتہ بھی کھو دیا اور قیامت کے منظر اچلی آنکھوں سے دیکھے..... امداد کے نام پر کپکپ سے اٹھائی گئی اور انسانی قماشوں کا حصہ بنی رہی..... میرے مہربان رب نے نہ جانے کس، کس کی دعا کے صلے ہر کام پر مجھے جہاں دولت سے بچاتے ہوئے ایک عظیم انسان کی آستین پکڑا کر آج کا دیباہ عبور کرایا اور اس سے آگے

بھی اپنی رمتوں کے صدقے ایک اور عظیم انسان کے گھر کی عزت بٹا دیا۔ آج میں اپنے جاس لٹا دینے کی حد تک محبت کرنے والے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ اپنی من چاہی زندگی گزار رہی ہوں..... لیکن زندگی کے ان خوب صورت و حسین رنگوں میں کھیلنے ہوئے جو آج مجھے میسر ہیں، کیا میں قدرت کی وہ قیامت خیز یاں اور انسان کی وہ شیطانی طاقت ٹھٹھا پاؤں کی جنہیں میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا اور ہار ہار دیکھا..... کیا میں اپنی زندگی کی کتاب سے بھی وہ باب نکال پاؤں گی جو تاریک ہے مگر سب سے طویل بھی ہے۔"

پاکستان کی بہادر خواتین میں سے ایک بچی کے نام سے... انٹرنیٹ فورم پر آنے والا یہ بلاگ میرا ذرا دلخیز تھا۔

"بہت اچھا ہوا یہ بلاگ میری نظر سے گزر گیا۔" اس رات اس نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ اس شخصیت کو کھنکھاتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے کسی بھی قسم کا رابطہ کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ عز و محمود بہت عظیم انسان کسی محروم فرشتہ پر گز نہیں اور اسے میرے اور تمہارے باہمی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔ میں تمہاری سچت لگا کر اس کی نظروں میں آتا اور تمہاری ہشتی، مسکرائی زندگی کو طوفانوں کی تندہ کردینے کا جرم کیسے کر سکتا ہوں لیکن تمہارا یہ بلاگ بڑھنے والوں کو تو کیا پیغام دے گا، میں نہیں جانتا مگر مجھے یہ پیغام دے گیا ہے کہ تم خوش ہو، مطمئن ہو، ہلکا ہو، لیکن شوہر کی محبت اور اولاد بھی نعمت سے نوازا رکھا ہے، بھلا تاؤ میرے جیسے انسان کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کا اہتمام اور کیا ہوگا۔"

پیشانی

وہ اپنے پسندیدہ ترین لیبارٹری ریفریج کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اپنی نسل کا یہ لیپ (lab dog) بچلے پانچ سالوں سے اس کے ساتھ تھا، جن دنوں وہ بہت مصروف رہا کرتا تھا اس وقت بھی وہ اس کے لیے وقت نکال لیا کرتا تھا اور اب تو ہر ایک اپنے پاس کے دن کا ایک حصہ ضرور اس کے ساتھ کھیلنے گزارتا تھا۔ دنیا کے بہترین کتوں کی نسل میں سے ایک ہے۔ یہ اپنی ذاتی وفاداری، دوستانہ فطرت، دوسروں کی راہنمائی کرنے کی صلاحیت اور محبت کے فطری جزو، جسم کے کھلے ہونے سے دنیا کے بہترین کتوں کی کسی بھی دوسری نسل سے اسے کہیں زیادہ پسند تھا۔ اس کے پیچھے سر پران کی نسل گرین گھاس پر لینا وہ لیپ کے خصوصی کرتبوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب اس کے قریب کسی کے قدم آ کر رکے تھے۔ اس نے بے غمی لینے، لینے ایک نظر ڈالا اپنے دائیں طرف ان ڈارک براؤن چمیلیے گورٹ شوہر پر ڈالی اور مسکرا کر سر اٹھاتے ہوئے لوہر دیکھنے لگا..... اس کی یہ خصوصی مہمان اس کے اس وقت کی چٹیلی اپنا تخت لے چکی تھی..... اور اس نے دیکھا اس کی مہمان کے عقب میں سوڈج کی تیز کر نہیں چمک رہی تھی۔

"کیا یہ ایک پرنٹنگ ویک اینڈ ہے؟" اس کی مہمان نے چاکلیٹ براؤن لیپ اسٹک سے بچے اپنے ہونٹ پھیلاتے ہوئے کہا۔ وہ آف وائٹ بلاؤز اور چاکلیٹ رنگ کے پھولوں سے بھئی..... اسکرٹ میں ملیں تھی۔ اس کے گلے میں چمکی موتیوں کی مالا نظر آ رہی تھی اور کانوں میں انجی موتیوں کے اسٹنڈر بچے تھے۔ اس نے بالوں کو ایک ڈھیلے جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا اور وہ بیٹھ سے زیادہ بچھوڑا اور دلکش نظر آ رہی تھی۔

"ہاں، ایک بہت پر سکون ویک اینڈ ہے۔" وہ گھاس پر سے اٹھتے ہوئے بولا اور اپنی کثیر رنگ پلو شرت کی پشت پر چمکے گھاس کے ٹکٹے بھاڑنے لگا۔

"کیا یہ ایک اچھی ریٹائرڈ لائف ہے؟" اس کی مہمان نے اس کے ہمراہ چلتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے بتایا یہ ایک بہت پر سکون زندگی ہے اور بڑا نرڈ اگرچہ نہیں۔ میں محنت کرتا ہوں اور اس محنت کی کمائی پر زندگی گزار رہا ہوں۔ یہ ایک اچھی زندگی ہے۔“

”دنیا بھر کی لڑتھک ہو خود کشیز میں جنوبی ایشیا کی سیاست پر بڑا جنگ بھگڑ رہا محنت ہے کیا؟“ وہ مسکرائی اور اس کے ساتھ چلتی وسیع بیک پارڈ میں چھت کی طرح نئی سرسبز و شاداب بیلوں کے سامنے تھکے رہی کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گئی۔

بیشل دیکھ اس روز خصوصی طور پر تاراجھ کیرو لینا کے علاقے ڈاریم میں واقع سردار مہر زادو خان کے اس جاپانی طرز تعمیر کے شاہکار قمارم ہاؤس میں اس سے ملنے آئی تھی۔ اس وسیع قمارم ہاؤس میں مہر زادو خان تیار چلتا تھا۔ چند ماہ قبل ہی یہاں اس کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ وہ ساڑھے تین سال پہلے اس کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔

”ہاں یہ محنت کی کمائی ہے۔“ وہ گاؤں کا چیز پر آرام سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اس میں کوئی دھوکا، ڈراما اور سیاست انوالو نہیں ہے۔“

”آپ پاکستان سے کیوں فرار ہوئے..... دھوکے، ڈرامے اور سیاست کی وجہ سے؟“ بیشل نے ترجیحی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں وہاں سے فرار ہوا نہ ہی میں نے خود ساختہ جلا وطنی اختیار کر رکھی ہے۔“ مہر زاد نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی عزم لے کر وہاں گیا تھا نہ ہی گرتی سرسبز کو جھکا دینے کا خیال میرے ساتھ تھا۔ مجھے حالات کی تمام تر غلطی خود بخود دیکھا کروا رہی تھی۔“ اس نے اپنے ذاتی ملازم کی پہنچائی جانے والی چائے کے لوازمات پر نظر ڈالتے ہوئے کہا..... ”جو ایک عرصہ پہلے ایک اچھی زندگی کے لیے کافی تھے۔“

”زندگی کی اکثر چیزیں اس کے ہماری اپنی نہیں ہوتیں.....“ بیشل نے کہا۔ ”کیسا ہی جانا اور اپنے باپ کی چھوڑی سرداری کو سنبھالنا میری چوائس نہیں تھی مگر اس وقت کے حالات کا تقاضا تھی۔ میرے علاقے کے لوگ خود کو بے آسرا اور ختم بھردہ تھے، ان کے سروں پر ہاتھ دیکھا میرا فرض تھا۔“

”کیا آپ وہ ایسا نہیں سمجھ رہے ہوں گے؟“ بیشل نے بشری لفظ ملن اٹھا کر اپنی پلیٹ میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اب.....؟“ وہ مسکرایا۔ ”میں نے اس مختصر عرصے میں وہاں چھوٹے بڑے سرداروں کی مشروم گردھ ہوتے دیکھی ہے، اب ہر چندہ گز کے فاصلے کے علاقے کا اپنا ایک سردار ہے، ہر سردار کے اپنے مفادات ہیں اور ان مفادات کے لیے وہ سب اپنی، اپنی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس علاقے کو شاید ایسے ہی ذہنی حقائق سوٹ کرتے ہیں۔“

”آپ کی پاکستان میں انٹری اور ایگزٹ...“ بیشل نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا دونوں ہی غیر متوقع نہیں رہے؟“

”زندگی کے اس اسٹیج پر جہاں ہم سب انسان اپنا اپنا حصہ پر قارم کر رہے ہیں، ہم سب میں سے ہر ایک کے لیے دوی چیزیں تو سب سے اہم ہیں، کون کیسے انٹری ہوا اور کون کیسے ایگزٹ کر گیا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”میں اقرار کرتی ہوں کہ زندگی کے اس اسٹیج پر آپ سے بہتر پر قارم ابھی تک میں نے کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔“ بیشل نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ”اور آج میری یہاں آمد کا ایک مقصد اپنی ان تمام ختمی اور خلیج باتوں پر معذرت کرنا بھی ہے جو اپنے استعفیٰ پیش کرنے کے دن میں نے آپ سے کہیں۔“

”اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔“ وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ ”اُس حادثے کے روز تمہارا بیٹا مرنے پر تیار تھا اور کالم اور گزشتہ سال شائع ہونے والی تمہاری کتاب تمہاری سوچ کی عکاس ہے اور یہ سب چیزیں مجھ تک پہنچ چکی ہیں۔۔۔۔۔ تمہیں یاد ہوگا میں نے کہا تھا کہ میں کو شش ضرور کروں گا، کامیاب نہ ہو سکا تو چھوڑ جاؤں گا۔“

”کیا اسی کو فراموش نہیں کیجئے؟“ بیٹل کے لہجے میں طرکی بھین اتری۔
 ”نہیں، یہ بڑا ہے۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس نظام سے بڑے رہتے ہوئے اور اس کو بدل ڈالنے کا ایک ٹھکانا اور انفرادی غرو کا تے ہوئے چاروں میں سے کسی ایک بھی سمت سے آتی ہوئی کوئی کا شکار ہو جانا مردانہ داری کہلاتی کیا۔۔۔۔۔؟“
 ”ضروری تو نہیں کیا ایسا ہی ہوتا۔“ بیٹل نے کہنا چاہا۔

”ضروری ہی تھا کہ ایسا ہوتا۔۔۔۔۔ سو فی صد امکان کی کیا تھا۔“ اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھتے ہوئے اپنی کمری کو پیچھے کی طرف جھٹک دیا۔ ”تم بتاؤ میں کس کے غروں کے لیے شہید ہو جانا، شہادت کا درجہ تو کیا ملتا کس، کس کے مفاد اس خود ساختہ شہادت سے نہڑا جاتے۔۔۔۔۔ میں کیوں اپنے ہاتھ کو ان کے دانت تیز کرنے کے لیے چھوڑ دیتا۔۔۔۔۔ میں کیوں بڑا راستہ نہ اپناتا۔۔۔۔۔ جتنا جس میں کوئی امید کی گنجائش نہیں مل سکتی ہے۔۔۔۔۔ میں نے اپنے ہتھیار پھینک دیے، اپنے قدموں میں رکھے ہیں، ہاتھ کی شکل میں کسی سخت جہیز کو دوبارہ اٹھایا جا سکتا ہے۔“
 ”میں جانتی ہوں آپ بارے نہیں، آپ نے بہت بڑا تجربہ کیا، پھر بھی کسی اس عرصے میں آپ نے لوگوں میں گھر بنائے ہیں، جس کا ثبوت آپ کے حلقوں اور حلقوں کے وہ بیان ہیں جو آپ کے اشتعالی پر سامنے آئے۔“

”میری وہی ایک انفرادی کو شش ایک روز اجتماع کی آواز بننے کی تم دیکھتا۔۔۔۔۔ اور اسی روز کے انتظار میں، میں یہاں رہتے ہوئے اپنی توانائیاں جمع کر رہا ہوں۔“ اس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔
 ”یہاں سکون ہے، میرے چہرے سے دیکھا، چاندور ہیں، درخت ہیں، پھل پھول ہیں، کتابیں ہیں، میں ہوں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔
 ”اور۔۔۔۔۔“ بیٹل نے اس کی طرف دیکھا۔

”اور میری سوچ کا لگا یا ہوا باغ ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”کسی کے بارے میں میری ہر سوچ میرے دل میں ایک پھول کھلا دیتی ہے اور اب تک یہ پھول ایک وسیع باغ میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ میں ان پھولوں کی چھاؤں میں خوش باش، سرور میں دن رات گزارتا ہوں۔“
 ”وہ۔۔۔۔۔ بیٹل کے لہجے میں ایک بار پھر ٹھہرا ہوا۔“ وہ جو صرف ایک نہیں تھی۔۔۔۔۔ وہ جو پورا جہان تھی۔
 آپ نے اسے بھی یاد کیا؟“

”تمہیں معلوم نہیں اسے جیت کر بھی تو میں نے بار بار ہی تھا۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بد صورتی میں چھپی جس خوب صورتی کو۔۔۔۔۔ کچھڑ میں کھیلے جس کنول کو میں وہاں سے نکال لانا چاہتا تھا۔ وہی بد صورتی اور کچھڑ میرا اپنا جہان تھی۔ وہ مجھے جہاں تک جانتی تھی اس سے آگے میں بہت کم روہ تھا، گندا اور بد صورت، وہاں تک اسے لے کر آتا تو وہ سامنے لیٹا پھول کر مر جاتی۔ اسی لیے میں نے اسے جیت کر بھی یاد نہ پتا بھرتا تھا۔“
 ”اور اس کے بعد آپ موت سے ڈرنے لگے؟“

"نہیں، اسی کے بعد تو مجھے زندگی سے چار ہونے لگا..... اس سے پہلے تو موت مجھے ایک کھیل لگا کرتی تھی..... اس کی یاد نے تو مجھے زندگی جینا سکھا دیا۔ میں خود کو کیوں اُن، ان نکتہ ریزوں میں شامل کر دیتا جن کی یاد میں تو اب کوئی ایک شے تک بھی نہیں جلتا..... میں اپنی جان کو کسی قسمی کام میں کیوں نہ مصروف کر دیتا..... ایک مقصد اور محور رکھتا تو کیا ہوا..... کئی اور مقصد تو ہرے ہو سکتے ہیں۔"

"یونہی رہ جائیں گے، مایکے اور مست.....؟"

"ہاں کیونکہ یہی میرا مقصد ہے۔" وہ ایک بار ہلکا سا مسکرایا۔

"میں نے وہی آپ کو ملنا سمجھا..... میرا خیال تھا آپ نظام کا حصہ بن چکے ہیں۔"

"نظام.....؟" وہ ہنس..... "نظام تو بس ایک نام ہے، ہم ہی تو ہیں جو نظام بناتے ہیں، ہم ہی تو ہیں جو نظام کو نرسورہ اور مکروہ شکلیں عطا کرتے ہیں۔ ہم خود ہی تو نظام ہیں..... ہم نہ بولے تو نظام کیا بدلے گا..... میں نے اس بھاری پتھر کو بدلتا اٹھایا، چوہا اور بھرا دایں رکھ دیا۔ میرے لیے زندگی میں کرنے کو شاید اور بہت سے کام تھے۔"

"کوئی بچھڑا، کوئی دکھ.....؟"

"نہیں، میں بہت مسرور ہوں، خوش ہوں، میں نے دعا کی تھی، اور یہی عمل کی اور اسے پورا کر پایا۔ اسی دعا کے ماحصل سے جب مجھے خوشی اور مسرت کی لہریں وصول ہوئی تھیں تو میرا جہان اور مٹی خوب صورت ہو جاتا ہے۔ میں خوش ہوں کہ میرے شہر پاراں کی فسیں ترو تاروں اور شاخیں کی سکن ہیں، کیا میرے بچنے کے لیے خوشی اور اطمینان کا اتنا احساس ہی کافی نہیں....." اس نے اپنی کئی طرف دیکھا اور مجھے کے اس ہزارویں حصے میں جمل کو سترہویں دور زندگی گزارتی میرا دل صاف..... میں نے جبر کر رکھا تھا۔

"آپ واقعی بہت unpredictable ہیں،" میں نے بے ساختہ کہا۔

"انسان کو ہونا بھی چاہیے..... جھم کار کو اپنے قاری سے کم از کم دو قدم آگے چلنا چاہیے..... جس کہانی کی ابتدا پڑھ کر قاری اس کا قیام لے لے وہ کا صواب کہانی نہیں ہوتی۔"

یہ وہ ڈراما تھا جسے میں نے آکر صبر زانو خان سے گفتگو کا اختتام ہوا۔

"an afternoon with brown beard and olive green eyed sardar from pakistan" میں نے اپنے نوٹ پیڑ پر اس گفتگو کا عنوان نام لکھا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میرزا کے سر پر چھت کی طرح تھی مارننگ گھوڑی کی تیل کے نیچے چھوٹی ایک شام کو چمک بڑا نے اپنی چوچ میں دیوبند دکھا تھا۔ اس شام کو چھوڑ کر کسی اور شام کو دیوبند کی چاہ میں چمک بڑا نے اپنی چوچ گھوٹی اور چھوٹی شام سے کتنی ہی شگرتی رنگ کے پھول کر کر نیچے میرزا خان پر پھر گئے۔

"کچھ لوگوں کو نیچر خود tribute پیش کرتی ہے شاید اسی طرح مجھے اس پھولوں نے گر کر میرزا خان کو پیش کیا۔ کیا کوئی بھی دوسرا tribute اس tribute کا متبادل کر سکتا ہے۔" میں نے سوچا اور مسکرا دی۔

"یہ ایک بہت اچھا اعتراض تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں..... ایسی ہی طرح۔" وہ بھی مسکرایا اور اپنی جگہ پر بیٹھے، بیٹھے، بیٹھے، بیٹھے اور خود سے دور جاتے دیکھنے لگا۔ حسین شام کے شگرتی سائے سارے میں پھیل رہے تھے۔

(ختم شد)



کرتار سنگ؟ آکاش

”اسلام علیکم..... نانا جان.....“ دین محمد
میں اتار کے درخت کے نیچے بیٹھے چڑیوں کو دانہ ڈال
رہے تھے کہ عبد اللہ اُن کے پاس رہ گئی کرسی پر آکر بیٹھ
گیا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا وہ آفس جانے سے
پہلے اور نماز پڑھنے کے بعد کا وقت اپنے نانا کے پاس
گزارتا تھا۔

”بیٹے رہو بیٹا.....“ انہوں نے پیار سے اس
کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

دین محمد پچاسی سال کے ہو چکے تھے مگر ابھی وقتوں کی خالص اور سادہ خوراک، نماز، روزے کی پابندی اور اخلاقی اقدار کی بلندی کی وجہ سے ان کی صحت قابلِ رشک تھی۔ عبداللہ ان کی انگوٹھی بنی ہانو کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس سے پہلے کہ عبداللہ ان سے باتیں شروع کرتا اس کے موہاٹل کی تختی بچنے لگی۔

”اے چھوڑ پار۔۔۔ کیا دوستی کا راگ الاپ رہے ہیں لوگ، یہ دوستی، یہ محبت اس وقت کہاں تھی جب جراثیم پر قبضہ کیا گیا اور آج اسے سال گزر جانے کے بعد بھی وہاں ظلم و ستم کا بازار گرم ہے۔ یہ جذبہ اس وقت کہاں ہوتے ہیں جب رزق کی تلاش میں پانی کی بے رحم موجوں پر سفر کرنے والے غریب ماہی گیروں کو پکڑ لیا جاتا ہے اور ساری عمر یا تو وہ قہر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں یا پھر مار دیے جاتے ہیں اور پھر ان کے بے جان جسوں کو اپنے وطن کی مٹی میں دو گز جگہ بھی نصیب نہیں ہوتی۔ دوستی کا راگ الاپنے والے انصاف پر کھڑے اور تعلیم یافتہ لوگ اس وقت کہاں تھے جب انیس سو سینتالیس میں صرف ایک ایک ریاست کے مقابلے پر بے گناہ مسلمانوں کی زندگی کی دھمکیوں کو انصاف و حاکمِ کانون میں بھیل دیا گیا، جب کئی مائیں، بیٹھیں فقط اپنی عزتوں کو بچانے کے لیے بچتوں سے کودیں اور غریبوں اور کنوؤں میں چھلائیں لگا کر ڈوب مریں۔ میں ایسے کئی وفد سے ملاقات نہیں کروں گا“ ہماری این جی او کے لیے اس سے زیادہ ضروری لاشو موجود ہیں۔ یہ سمجھ، ہندو بہت مطلب پرست قومیں ہیں، خود غرض، احسان فراموش اور کینڈوز۔“

عبداللہ غصے میں کسی سے فون پر باتیں کرنے میں لگا ہوا تھا اور دین محمد پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ عبداللہ نے حال ہی اپنی تعلیم مکمل کر کے ایک ملٹی پلٹس این جی او جوائن کی تھی۔ اس کا تعلق اس مہینہ

وطن گھرانے سے تھا، جن کے رگ و پے میں وطن عزیز کی سلاحتی کی دعا تیں اور تختیں دوڑ رہی تھیں۔ اس لیے پاکستان کے مفاد کے خلاف تھوڑی سی بات بھی قابلِ برداشت نہیں تھی۔ عبداللہ فون بند کر کے اٹھ کر جانے لگا تو دین محمد نے اسے آواز دے ڈالی۔

”بیٹا ایک بات کہوں۔۔۔ کسی انسان کو صرف اس کے مذہب اور قومیت کی بنیاد پر برا نہیں کہا جاسکتا، مانا تحریک آزادی کے وقت اور بعد میں بھی ہندوؤں اور مسکوں نے بہت ظلم ڈھائے، ساری عمر کی واقفیت کو ان سب نے راک ٹمے میں بھلا ڈالا مگر جس طرح باپوں، اٹھیاں ایک برابر نہیں ہوتیں بالکل اسی طرح سب برے نہیں ہوتے، سب ہی برے نہیں ہوتے جتنا۔“ وہ بات کرتے، کرتے جانے کہاں جا پہنچے تھے کہ ایک ہی بات کی گردان کر کے، محمد عبداللہ پر ہورہی تھی۔ اس لیے وہ کچھ دیر بعد کھٹکتے ہوئے انہیں خدا حافظ کر کے کھیت کے باہر نکل گیا۔

اندروں کے لیے میں کھڑی ہانو جانتی تھی کہ اب باجی نے بہت دنوں تک بے عمل رہنا تھا، اداوں کے لیے انہیں اپنے ساتھ بھائے لیے جائیں گے اور ان کے پورا، پورا سے تفکر اور دعاؤں کے سوتے پھونکنے رہیں گے۔

رات دین محمد سونے کے لیے لیٹے تو نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اکتوبر کا اداؤں کا ہوا میں بجلی، بجلی خنڈک اب محسوس کی جاسکتی تھی۔ رات نے تاروں بھر گھومت آسمان کے شانوں پر ڈال دیا تھا۔۔۔ دین محمد کچھ دیر تک نواڑ کی چار پائی پر کروٹیں بدلتے رہے اور پھر بے چین ہو کر اٹھ بیٹھے۔

چپ چاپ، سر جھوٹے کھڑا اتار کا درخت، پھر سے میں اوتھنی کھنی چڑیاں اور بہت سی یادوں نے ان کے گرد میلا سا لگا لیا تھا اور وہ ان کے درمیان سر جھکائے بیٹھے تھے۔ یادیں انہیں اپنے

گی کہانوں آپ تہوں تک تہوں کے مثال محمود

سرگزشت

ماہنامہ

نمبر اگست 2014ء

کی جھلکیاں

نشان ہمد

جرات و بہادری کے بیکر کے حالات زندگی

واخان خان

ایک بہادر قبیلے کی سرگزشت جو

وادیوں میں پھرا تارہتا ہے

مدرسہ پرست دوم

شوبز کی دنیا میں جاوہر دگانے

والی انسان دوست کا تذکرہ

امید پرست

اس مضمون کے حالات زندگی

جس نے لوگوں کو جینا سکھایا

آخری راستہ

ایک بے بس لڑکی کی داستان عشق

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یہی گزارش تحریر کرنے والی خولہ داستان "سراب"

قصی دنیا کی کنی کنی داستان "قصی اللہ"

اور بہت سے دیگر

واقعات سچے قصے آپ دیکھیں، سب دیکھیں

آج ہی خبریں کی ایک اسٹیل پلانٹ شاہد محسن کراچی

خاص شمارہ..... ہر شمارہ خاص شمارہ..... ہر شمارہ خاص شمارہ

سنگ، سنگ دور بہت دور لیے جاری تھیں اور وہ ان کا ہاتھ تھا سے پٹال کے گلی کوچوں کی جانب چل گئے۔ بہت سارے پتھر ایک، ایک کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ جن میں سب سے واضح پتھر بڑا، اسٹینڈ کا تھا۔

☆☆☆

دینو کو چوان کپ سے سواری کے انتظار میں کھڑا تھا مگر آج کوئی سواری اس کے ہاتھ کی طرف نہیں آ رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے استاد کی سکھائی ہوئی بات "حرکت میں برکت ہے....." پر عمل کرتے ہوئے جگہ تبدیل کرتا سامنے کی طرف سے دو گورے آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے مان سگھ چوک بک جانا تھا۔ اس نے کہا یہ طے کیا اور گھوڑے کی بائیں پیچھے کر اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ بے زبان جانور مالک کے اشارے پر غرائب، غرائب ونگی چال چلنے لگا۔ پکھری روڑ سے ہوتے ہوئے مان سگھ چوک پہنچ کر دینو نے سواری کو اتارا تو وہاں سے اسے پیالہ مار کریت تک کی سواری میں کی تو اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے بھوک لگی تھی۔ صبح سویرے وہ بغیر کچھ کھانے کے پٹال لے کر اسٹینڈ پر آ جاتا تھا کہ اسے اپنے استاد کی بات آج تک یاد تھی۔ وہ کہتے تھے۔ "پتر رزق کے پیچھے تڑکے" تڑکے جانے سے وہ زیادہ مٹا ہے۔"

دینو نے سواری اتار کر تارک درشت سے ہاتھ دھا اور گھوڑے کے آگے گھاس رکھ کر خود گریار سگھ چلوائی کی دکان کی طرف چل دیا کہ وہ روز یہاں سے ہی ناشتا کرتا تھا۔

"ست سری کال بھائی....." دینو کو دکان میں داخل ہوتے دیکھ کر کرتار نے غور لگایا۔

"نئے جلدی سے اپنے یار کے لیے ملائی والے دودھ میں جلیبیاں بھگو کر دے۔" زور دار

آواز میں ایک اور بڑک ماری گئی۔

”او تو کیوں غل کر رہا ہے۔ وا مگر وہی سوں
مرتے دم تک اپنی پاری بنی نوٹے گی اور پھر تیرے
پار کرتا رہے گی کہ پان کس دے بے کم آئے گی۔“
کرتار سنگھ نے جھپکی پان پر ہاتھ بچھرتے
ہوئے کہا وہ اسے ہر وقت اپنے ہی پاس رکھتا تھا۔
کبھی کسی کے ساتھ ڈالٹھانی ہوتے دیکھتا بیچ میں کود
پڑتا۔ اسی چکر میں وہ کئی بار پکھری کا چکر بھی لگا آیا
تھا۔ مگر وہ تھا ہی ایسا بے بکر، بے خوف اور دل والا۔

☆☆☆

دھوپ آگئی تھی میں دروازے کے پاس رکھی
ٹادی تک آئی تھی۔ شام ہونے والی تھی۔ بانو نے
سارے گھر میں پانی کا پھیر کا کر دیا تھا تو بے چین
اڑتی گرد کو ایک دم سے قرار آ گیا۔ گرد پانی کی گیلی
اور ٹھنڈی ہوا کو ڈھک کر تماشائی سے چھٹی تھی ان کا
گھر خانہ کے کارخانے کے اوپر تھا۔

بہار میں ایک کھڑکی بانو کی تنہائی کی واحد ساتھی
تھی، وہ یہاں سے متحرک اور ساکت ہر منظر کو اپنی
زندگی کا حصہ سمجھتی تھی۔ سامنے سے گزرتی چمک
چمک کرتی ریل اور پھر اس طرح اکیلے رہ جانے والی
پڑیاں، آتے جاتے لوگوں کے ٹکس سڑک پر سے
گزرتی گھوڑا گاڑیاں، ٹرام، موٹر بس، تھل گاڑیاں
اور سائیکل یہ سب اس کی نگاہیں لیا کرتی تھیں۔

سورج دھیرے دھیرے مغرب کی اور ڈوب
رہا تھا شام کا اجالا رات کی سیاہی میں ملنے والا تھا کہ
اس نے اٹھ کر دیا جلا دیا۔ اس کے کانوں
میں گھوڑے کے جھنڈانے کی مخصوص آواز سنائی دی تو
اس نے سکون کی سانس لی اور کھانا گرم کرنے چل
دی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی ابا گھوڑے کو پاس اسٹبل
میں جوت کر سیدھا لوہا پر ہی آئے گا۔

”بانو پتھر ڈرا پانی تو پلا دے آج تو بہت
سواری مل گئی تھی۔ حالات تو روز بروز بدلتے جا رہے
ہیں۔ لوگ جلدی، جلدی ہوا دھیرے دھیرے جاتے ہیں

وہ ایسا ہی تھا پاروں کا پار..... زرخیز دل.....
اور بھانے والا، دینو کو چران اور کرتار سنگھ حلوئی کا
بچپن کا ساتھ تھا۔ دونوں کی ماؤں کا میکا ایک ہی
پنڈ کا تھا اس لیے جب، جب وہاں جانا ہوتا تو وہ
دونوں مل کر مزے کرتے پنڈ کے ٹھوڑے میں
نہاتے، مٹائی والی برف کھاتے، درختوں سے لٹک
لٹک کر آم توڑتے۔

عملی زندگی میں آنے کے بعد بال بچوں والے
ہونے کے بعد۔ آج اپنے دو بچوں بعد بھی دونوں کی
گوڑی پاری ابھی تک قائم وہم تھی۔

ابھی دینو وہ گھلی گھاسی رہا تھا کہ کرتار اپنی
چھڑی اور کرپان سنبھال اس کے پاس آ بیٹھا۔ گھا۔
نہالال اس نے گھکے کے حوالے کر دیا تھا۔

”دینے پار تیرے سے ایک گھل پوچھتی تھی کل
کوئی بابو کسی پتے ہوئے ہاتھیں کر دیا تھا، میں اپنے پار
سے طوم کر دیا گا وہ سارا دن دوسرے گھر ٹھہرا
ہے۔“ کرتار سنگھ نے کرپان سناؤں میں رکھتے ہوئے
سوچوں کو تادیتے ہوئے بات شروع کی۔
”ہاں، ہاں پوچھتے تو بے خبر سے پار کی بڑی
گوڑی نظر ہے، باہر ہر چیز کی خبر لگتا ہے۔“ ”دودھ“
چلیی کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے دینو نے سوالیہ
نظروں سے کرتار سنگھ کو دیکھ کر کہا۔

”پار میں نے سنا ہے کہ الگ وطن بننے والا
ہے، سارے ہندو اور سکھ یہاں رہیں گے اور
سارے مسلمان نئے وطن چلے جائیں گے۔“
”ہاں کرتار، میں آج تجھ سے یہی بات
کرنے والا تھا۔ دوسرا دوسرے بڑی، بڑی خبریں
آ رہی ہیں، سب راک دوپے کی جان کے دشمن بن
گئے ہیں، میرا تو دل ہوتا ہے۔ کہیں دھپڑے ناں
پڑ جائے۔“ پوچھانی دینو کے چہرے پر واضح طور پر
دکھائی دے رہی تھی۔

دیر تک چار پائی پر کمرہ میں بدلتے رہے۔ جب کہیں جا کر خینک کی دیوی مہربان ہوئی اور انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆ ☆ ☆

صبح سویرے دیو نے تانگے میں گھوڑا جوتا اور رزق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ رینگ بھگڑ کے سامنے سے ایک بوڑھے نے ہاتھ دے کر تانگے کو روکا، دیو نے گھوڑے کی ہانگیں کھینچ کر گھوڑے کو رکنے کا اشارہ کیا۔

”بھیا ذرا آغوش چلو گے؟“ آواز میں آنسوؤں کی ٹہنی اور چہرے پر حد درجہ پریشانی رقم تھی۔

”جی، کی بھائی بھائی بھولے چتا ہوں مگر آپ بہت پریشان لگ رہے ہو، خیر تو ہے؟“ دیو نے ربا کو دیکھا۔ سوہنے والا اس قدر پریشان لگ رہا تھا کہ وہ بچہ بچہ تھا۔

”اس بھائی کیا بتاؤں جب سے جتار صاحب کی قیادت میں آزادی کی تحریک چلی ہے تب سے ہی یہ بات ہندوؤں کی نظر میں ٹھنک رہی تھی اور اب جب منزل قریب آئی ہے تو ان لوگوں نے ہر لحاظ والا طاق رکھتے ہوئے اپنی اصل شکل دکھانی شروع کر دی ہے۔ جو وہ ہر میں میری بہن راجنی تھی، اطلاع آئی ہے کل نکالوں نے مسلم اکثریت والے علاقوں میں آگ لگادی۔ کافی قتل و غارت گری کی، بہن جہنوی کے قہریدہ ہونے کی اطلاع ملی ہے مگر ایک بھائی بھی تھی اس کی کوئی خبر نہیں مل رہی اس کی تلاش میں جو وہ پور جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔

”میری انکونی بہن کی ایک ہی نینٹی بیٹی ہے، اسے صحیح سلامت لے آؤں تو اپنے گھرانے کے ساتھ اپنے وطن چلا جاؤں گا..... اللہ جانے بیٹی کس حال میں ہوگی۔“ رومال سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس شخص نے بات ختم کی تو آغوشیں آسمان۔

جانے کیا باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن مجھ ان پڑھ کو اتنا چاہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔“ دیو نے کندھے پر لٹکے رومال سے منہ پر مچھتے ہوئے کھانا گرم کرتی ہانہ کو آواز دے کر کھانا اور وہیں اس کے پاس بیڑی پر بیٹھ کر پانی پینے لگا۔

”قل تانگے میں اتنا ہل چھوڑنی سے کوئی باؤ آکر بیٹھا تھا بڑا بھلا ماں تھا۔ مجھے کہہ رہا تھا کہ ابھی اچھے وقتوں میں پاکستان ہجرت کر جاؤ۔ ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

”ابا ہم پاکستان ضرور جائیں گے۔“ باب کے آگے روٹی رکھتے ہوئے ہانہ نے خوش ہو کر کہا۔

”کچ ابا بڑا مزہ آئے گا، اپنا وطن، اپنے لوگ..... نہ کسی بچے کی چک، چک نہ کسی گورے کا مرب۔“

”ہاں جتر، دل تو میرا بھی کرتا ہے کہ اپنے وطن چل کر بے فکر ہو کر زندگی گزاریں۔ کتنے ورہوں سے جو تلخای کا ان دیکھا ملوث گئے میں ڈالا ہوا ہے۔“

اتار بھینگیں..... پھر سوچتا ہوں کہ ساری دنیا کی بھینیں جیتی، میرے ماں، بیٹے اور تیری ماں سب ہی مٹی بنیں۔ یہاں کام دھندا بڑا ہوا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر اپنا یاد کرتا رہا یہاں ہے سب بڑا ایک دم کیسے چھوڑا جائے گا۔“ وہ کچھ سوچ کر بھرتیلا۔

”خیر سب سوچنا خیر کرے گا۔“ چل روٹی کھاتے ہیں سویرے کی سویرے دھکی جائے گی۔ ابھی تو بہت تھک گیا ہوں تھوڑا آرام کروں پھر رتے اٹھتا ہے۔“ کھانا کھانے کے بعد ہانہ نے برتن سیٹے۔ دے کی لو بھائی اور کھڑی کھول دی۔ چاند بوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ مہن میں چھٹی چار پائیل پر پورے چاند کی میٹھی اور مدیم روشنی پڑ رہی تھی۔ ہوا بھی دھیمی، دھمی چل رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی چڑا سر اسرار خاموشی کا راج تھا۔ ویسی خاموشی جو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ دونوں باپ بیٹی سوچوں میں ڈوبے جانے لگی

دینو نے اسے دعا اور تسلی دی اور اس سے کرایہ بھی نہیں لیا کہ اس کا رخصتہ میں وہ بھی شریک ہو جائے گا۔
دینو نے گھوڑے کا رخ گھر کی طرف موڑ لیا۔
اب اس کا کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے آگے بار بار بانو کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

☆☆☆☆

اماں نے چھوٹی سی عمر میں دینو کی شادی کر دی تھی۔ اس کا اور آئندہ کا ساتھ بھی چھوٹا سا ہی ثابت ہوا اور جب بانو صرف چھ سال کی تھی وہ انہیں چھوڑ کر اپنے اہل قریہ گھر روانہ ہو گئی۔ اس دن کے بعد سے دینو نے بنی ماں کی بیٹی بانو کا بہت خیال رکھا۔ اسے بہت لالچ پیار سے پالا، پوسا بھی وہ جوان ہی تھا مگر اس نے دوسری شادی نہیں کی کہ آنے والی جانے اس کی بیٹی کے ساتھ کیسا سلوک کرے ابھی یہ بھی کی عمر صرف چند رو سال تھی مگر ابھی اٹھان اور صحت کی وجہ سے وہ سترہ، اٹھارہ برس کی لکھی تھی۔

بانو نے اماں کے اس صندوق میں سامان رکھنا شروع کیا جس میں انہوں نے اس کی شادی کی چیزیں رکھی تھیں۔ دادی کو وہ اماں ہی لکھی تھی جب وہ نو سال کی تھی تو دادی بھی انہ کو پیار ہی ہونے لگی تھی اسے یاد تھا کہ وہ اس صندوق کو بانو کا صندوق کہتی تھیں اس میں اس کی مرحومہ ماں کی چیزیں اور جو چند چیزیں دادی نے اس کے لیے لے کر رکھی تھیں، پڑی ہوئی تھیں۔ اب سویرے اسے چاری کا کہہ گیا تھا۔ بانو نے صندوق کا ڈھکن کھولا..... لہندی چمٹن کی لال قیس شلوار، سفید مٹھلون کا ایک دوپٹا جس پر چاروں طرف اس کی اماں کے ہاتھ سے کروٹیا ہوئی تھی۔ چاندی کی پانچ کلنگیاں اور سونے کی دو چھوٹی، چھوٹی بالیاں اس نے اس سارے سامان کو ایک ٹھل کے دوپٹے میں باندھا اور احتیاط سے سامان کے ساتھ رکھ کر صندوق کو تالا لگا دیا۔ بیڑیوں سے نیچے اتر کر اس نے کارخانے

کے لالہ کو گھر کا خیال رکھنے کو کہا اور خود محلے کے ایک گھر میں داخل ہو گئی۔ اب زیادہ اسے باہر نہیں جانے دیتا تھا مگر مولے سوہنی کی بیٹی سے اس کی گھڑی یاری تھی وہ اس سے مل کر جانا چاہتی تھی۔ اب ایسے کہہ گیا تھا کہ وہ ساری مصلومات کر کے آتا ہے وہ رات کے کسی پہر بھی نکل گھڑے ہوں گے۔

دینو کو چنان کا تالکا دینی اور اور اس رفتار سے پینال کی گلیوں میں منہ گشت کر رہا تھا آج اس نے کوئی سواری نہیں اٹھائی تھی وہ بھی پینال مارکیٹ، بھی نہال سنگھ چوک، بھی گرداس روڈ بھی صاحب جی فیل بھی نواب پینال کی حویلی ہر ایک جگہ سے گزر رہا تھا۔ ہر اس جگہ پر جہاں اس کے اپنی جوانی اور نورچہ گزرا تھا۔

پھر وہ اپنے تالکے کا رخ قبرستان کی طرف پھیر دیا وہ جاتے سے پہلے اماں اور آئندہ کی قبروں پر آخری سلام کرنا چاہتا تھا۔

ہاتھ پڑھنے کے بعد اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر چڑھ کر پھیرا اور اس کا رخ کرتا رکھنے کی دکان کی طرف پھیر دیا۔

”اے چھوٹے اپنا پار آیا ہے نکلت گرا گرم روٹی پانی کا بندوبست کرو۔“ وہ نگلے والی جگہ چھوڑ کر بڑگ بارتا جلدی سے دینو کی طرف لگا۔ آج اسے سالوں میں پہلی بار ہوا تھا کہ دینو اس کی دکان میں جب داخل ہوا تھا جب سورج سر پر چڑھ چکا تھا۔ ”خیر ہوئی بادشاہو..... آج سویرے تاشتا کرنے نہیں آئے، میں دکان بند کر کے تیری طرف آنے ہی والا تھا۔“ کرتا رنگھ نے اور اس، اور اس دینو کو دیکھ کر گھر مندنی سے پوچھا۔

”کرتارے میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“
”اے کی بھل کیجی یا رٹو، تو کہتا تھا کہ وہ چھوڑا نہیں آئے گا اور پھر تجھے یہاں کیا کی ہے۔ میں ہوں

لے کر اسٹیشن پہنچ جائے۔ رات کو وہاں سے انجیل ٹرین چلتی تھی جو انیسویں صدی کے پٹیل امرتسر سے لے کر لاہور اتار دے گی۔

رات ہوتے ہی بانو اور دینو ایک صندوق لے کر باہر نکلے انہوں نے آخری نگاہ اپنے مکان اور گلی پر ڈالی۔ دینو نے پاس کھڑے گھوڑے پر پیار سے ہاتھ بھیرا آخری بار اسے دیکھا اور انکھوں میں آنے آنسو پیچھے دھکیلیے اور نکل پڑ گئے۔

دونوں باپ بنی انجی توڑا ہی آگے گئے تھے کہ سامنے والی گلی سے مشطوں کی روشنی نمودار ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ لوگوں کا ایک جم غفیر ہے جو نعرے لگاتا آگے بڑھ رہا ہے۔ دونوں باپ، بنی جلدی سے کوئلوں کی دکان کی دیوار کی اوٹ میں چھپ گئے۔ سامنے گلی کا شہراب واضح ہو رہا تھا۔

بہت سارے لوگ ہاتھوں میں کرپاٹیاں اور ترشیاں لیے گلی میں واقع مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا رہے تھے اندر آگ اور باہر قتل و غارتگری کا بازار گرم تھا۔ بچوں اور عورتوں کی چیخوں سے سارا آسمان گونج رہا تھا۔ دینو کو چاہن کو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا کرائی جلدی اور چاک اس کی اسے امید نہیں تھی اس نے مضبوطی سے بانو کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ گلی کی طرف دوڑ لگا دی۔ جہاں سے سڑک پار کرتا رہے گا گھر تھا۔

کرتار سنگھ روٹی کھا کر لٹی پی کر چار پانی پر بیٹھا تھا کہ پان اس کے سر ہانے ہی رنگی ہوئی تھی۔ دینو نے میں کھڑی بیٹیس نے چینی سے ڈکار دی تھی جیسے کسی انہولی کی خبر ہو گئی ہو۔

کرتار سنگھ کی بیوی من بیٹ کور وچڑے میں رنگی چار پانیوں پر ہنستا رہی تھی۔ پاس رکھے موڑوں پر کرتار سنگھ کی دونوں بیٹیاں بیٹھی بائیں کر رہی تھیں سڑک پار ہونے والی قیامت سے باخبر کرتار سنگھ اپنے پار دینو کے بارے میں سوچ رہا

تھا تو کیوں فکر کرتا ہے۔ کرتار سنگھ نے اس کا کندھا چھپتاتے ہوئے کہا۔

”بس یاد رکھتا ہے یہاں سے دانت پانی اٹھ گیا ہے۔“

”تو تو سارا دن بھینس دکان پر رہتا ہے، میں ہر طرح کی سواری اٹھاتا اور بٹھاتا ہوں۔ حالات چنگے نہیں ہیں۔ دلی، جودھ پورہ، الد آباد، پٹانا سے بہت بری خبریں آرہی ہیں اور تو جانتا ہے مجھے بالو کھنی عزیز ہے، میری کل دولت وہی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جس بنی کو میں نے پھولوں کی طرح پالا اس کے ساتھ کچھ غلط ہو۔“ وہ نہایت اداسی سے کہہ رہا تھا۔

”انجی اپنے یہاں کچھ نہیں ہے، میں غلطی سے غلطی یہاں سے نکل جاؤں تو بھڑ ہے۔ اور پھر کرتار سے اپنا دیکھو تو اپنا دیکھو ہوتا ہے ناں۔۔۔۔۔“ دینو نے غصہ کی سانس بھرتے ہوئے ساری بات بتائی لگتا تھا جوں کا توں بڑا غصہ ہو رہا تھا۔

”پر یاد وہاں جا کر تو کرے گا کہ ناگنا تو ساتھ لے جائیں سکتا۔“ کرتار سنگھ نے اودھیں ہلک کر

رک جانے کی ایک آس دکھائی۔ ”کرتار سو ہوتا ایک ہے، ہر دو طرف سے کرہے ہی حالات ٹھیک ہوں گے میں تجھ سے ملنے آؤں گا۔ اپنی یاری میں دوری کی وجہ سے کسی فرق نہیں آئے گا۔“ دینو نے وعدہ لینے کے اعزاز میں ہاتھ آگے کیا جسے کرتار سنگھ نے نرم آنکھوں سے جم کر قہام لیا۔ دونوں آخری بار بغض کیر ہوئے تو لاکھ روکنے کے باوجود آنکھوں میں ٹھہرے آنسو بہہ نکلے۔

☆☆☆

دینو کے تانگے میں ایک وکیل باہر روزانہ پکھری آتے جاتے تھے۔ اس نے ان سے بات کر لی تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ پاکستان چارے تھے۔ انہوں نے دینو کو سکھا دیا تھا کہ جیسے ہی شام کے سائے اندھیرے میں گم ہوئے لگیں وہ بانو کو

تھا۔ اس کے بتائے ہوئے وقت کے حساب سے وہ ابھی طرح میں سوار ہو چکا ہوگا۔ اچانک دروازے پر زور دار دنگ ہوئی، کرتار سنگھ ایک دم چونکا ورنہ وہ بچانے والے کا انداز پر بیان کنن اور بدحواسی لیے ہوئے تھا۔

کرتار سنگھ نے چمک دار پھل والی کرپان اٹھائی اور دروازے کے پاس جا کر گرج دار آواز میں بولا۔
"کون ہے؟"

"کرتارے دروازہ کھول....." دینو کی گھبرائی ہوئی آواز دروازے کے پار سے بلند ہوئی، کرتار سنگھ نے بیوی اور بیٹیوں کو اندر جانے کا اشارہ کیا اور جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

دینو جلدی سے اندر چلا آیا پالو بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کرتار سنگھ نے اس کے سر پر ہاتھ بکھیرا اسے پاس دھکی ٹاوی سے پانی پلایا اور اسے اندر بیوی اور بیٹیوں کے پاس بٹھا آیا۔

دینو نے ساری بات کرتار سنگھ کو بتائی۔ رات کے اندھیرے میں جا کر چپا کرتا ہوں کہ وہیل صاحب روانہ ہوئے یا نہیں یا دوسری طرح کب جانے لگی۔ جب تک ایک رات میری دھکی میرے پاس امانت ہے۔ کرتارے تو جانتا ہے میرا اس کے سوا دیا میں کوئی نہیں ہے، میں بہت بھروسے اور مان کے ساتھ اسے یہاں لایا ہوں، بیچ تک ہم کچھ نہ کچھ بندوبست کر کے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے جو کچھ آج میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے اس کے بعد تو یہاں ایک ہفتہ بھی نہیں رہا جاسکتا۔" وہ اس سے اٹھا کر رہا تھا۔

"کوئی گل بکھی اے بادشاہو جب تک میری جنت باقی ہے ہانڈی ٹول کوئی میلی اکھاٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جیسے میری دل جیت کور اور سن جیت کور ہیں ویسے ہی ہانڈی ہے ہراک رات لاکھیا گل تم دونوں جب تک

چاہو میرے کول رہ سکتے ہو۔ تیری دھکی میرے کول باکھل محفوظ رہے گی یہاں تک کہ کادھن ہے اور اگر وہی سولہاں ہر حال میں اسے بھانوس گا۔"

دینو کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے تھے۔ گھر دل میں نہیں اب بھی ایک دوسرے کھڑی بارے بیٹھا تھا۔ جنہیں وہ باہر اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا۔ ان سے بھی ساری عمر کا ساتھ تھا۔

"اور ہاں بارے جب تک باہر آگ لگی ہے، میں تجھے باہر نہیں جانے دوں گا۔ تو بھی رات یہاں رک۔ سو کہو دونوں پارل کر حالات کا جائزہ لیں گے اور کچھ بندوبست کریں گے۔ گردی کرپا سے کچھ چنگا ہو جائے گا۔" کرتار سنگھ نے دینو کے دونوں ہاتھ پکڑے اور بڑی بات سے کہا۔

"کرتارے! اپنی باری تو بہت گوزی ہے مگر میں بھی آتا جاتا نہیں، میری وجہ سے بھائی اور بیویوں کو بچانی نہ ہو۔"

"تو فکر کیوں کرتا ہے، یہ بچھواڑے میں بھینس کی توڑی رکھنے کا چھوٹا سا کمر ہے تو بے فکر ہو کر ہاں آرام کر میں یہاں وسیع پیمانے میں کھجی ڈال کر پیرو دیتا ہوں، دیکھتا ہوں کون ساںں داھیا یہاں قدم رکھتا ہے۔ وہ کے دکھ دوں گا سب کو تو توڑی والے کمرے میں چل، میں تیری بھر جائی سے کہہ کر روٹی، پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔ پتر دل جیت چاہے کے لیے چٹکی سی کھجی ہست پرلے کمرے میں لگاؤ۔"

کرتارے نے بیٹی کو آواز دی اور دینو کرتارے کے ساتھ توڑی والی کوٹھڑی کی جانب چل دیا۔
تھوڑا سا کھانا ڈھیر مار کرنے کے بعد دینو چار پانی پر لیٹ گیا۔ خینڈا آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گزرنے والے حالات اور آنے والے وقت کے بارے میں سوچ، سوچ کر اس کا دل ہول رہا تھا۔ سامنے ویڑے میں کرتار سنگھ اپنی کرپان لے کر چوکس بیٹھا سگریٹ کے شش لگا رہا تھا۔ برآمدے

اور وہ انہیں دیکھ کر غور و خوض ہو جائے۔

”تاؤ بات کو سمجھ، ان مسلوں نے پاکستان میں ہماری ماؤں، بہنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، تم نہیں جانتے اور اب ہم انہیں زندہ سلامت اور محفوظ پاکستان نہیں جانے دیں گے۔“ دوسرا ڈراما اور تورا سے فرمایا۔

ابھی یہ بات ہوئی رہی تھی کہ تارنگھ نے مقبلی دروازہ کی طرف دیکھا۔ سات، آٹھ اور سبب افراد گھر کے اندر کودے۔ گھر کے باہر بھی دباؤ یا شور سنائی دے رہا تھا۔ مشعوں کی روشنی واضح طور پر نظر آرہی تھی۔ تارنگھ کو حالات کی کھینچی کا اندازہ ہوا مگر وہ کرپاں لے آئے، دونوں کے آگے ڈٹا رہا۔

”تارنگھ بات مان جا..... مسلوں کی چھوری ہمارے حوالے کرے۔“ دوت ہم بناوت اور ننداری کے جرم میں تھے اور تیرے گھر والوں کو بھی نہیں بخشیں گے..... ہم نے تھان لی ہے کہ رام کی کرپاے مسلوں کا ناپاک وجود اس دھرتی سے مٹا دیں گے۔“ ایک ہندو آگے بڑھ کر تھوڑی اونچی آواز میں بولا۔

تھوڑی دیر بحث کے بعد تارنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ معاملہ صرف اس کیلئے کی جی داری سے اوپر کا ہے وہ سب کے سب سچا تھے، لٹے میں تھے اور انتقام کی اندھی آگ میں جلتے رہے تھے۔

توڑی والی کوٹھڑی سے جیسے ہی کسی آہٹ کی آواز آئی تارنگھ نے جلدی سے اسے باہر سے کنڈی لگا دی..... تارنگھ نے دو منٹ تک سوچا اور پھر مشعل جھوم میں سے ایک لڑکے کی طرف دیکھ کر برآمدے میں بھی چار پانچوں میں سے درمیان والی کی طرف اشارہ کر دیا۔

ایک اونچا لہا سکھ جلدی سے آگے بڑھا اور چادر میں لپٹے وجود کو کندھے پر اٹھا کر جلدی سے کنڈی کھول کر باہر نکل گیا۔

اس سے پہلے کہ دیکھ کر سکتا، کنڈی سے نظر

میں پیچھے کرتا رہ سکے کی بجائے چار پانچ تھی اور آگے لائی سے تین چار پانچوں ڈلی ہوئی تھیں جن پر تارنگھ کی پٹلیاں اور بانوسوری تھیں۔

بانو کو اس ماحول میں اپنا تپت اور تحفظ ملا تھا اور پھر کچھ کچھ مگر کی بے لکڑی تھی، وہ کھانا کھا کر آرام سے سو گئی تھی۔

ہجرت، پاکستان اور آنے والی زندگی کے بارے میں سوچتے، سوچتے کب دیکھ کی آنکھ لگی اسے پتا ہی نہیں چلا بند ہوتی آنکھوں میں آخری منظر دیکھنے کا ہی تھا جہاں تارنگھ کرپاں سمٹا لے ابھی تک جوں کا توں بیٹھا ہوا تھا۔

رات کا آخری پہر تھا تارنگھ کو تھوڑی سی اونگھ آئی تو اسے لگا وہ بڑے میں کوئی دم کر کے کودا ہے۔ اس نے جلدی سے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی مگر تانائی کی روشنی میں اسے کچھ نظر نہیں آیا، چاند کی آخری تاریں تھیں۔ اس لیے تانائی کی مدد روشنی میں منظر کچھ دھندلا، دھندلا جاتا تھا۔

آنکھیں جب اندھیرے سے آشنا ہوئیں تو اس کی چار پانچ کی گرد گرد پال اور کھول کھول گئے تھے ان کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی کرپاں تھیں اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”تاؤ ہم نے ساتھ والی کھات سے دیکھا ہے تو نے کسی مسئلے کی کنڈی کو پتا دی ہے بس تو وہ لڑکی ہمارے حوالے کر دے تو ہمارا تیرا کوئی حساب نہیں۔ ہم چپ چاپ وہاں چلے جائیں گے۔“ لڑکوں نے جیسی آواز میں تارنگھ سے کہا۔ اس کی جی داری اور کڑک حالت کی وجہ سے سب اس سے بچتے تھے۔

”او کھوتے دے پڑوں تو ڈی اتنی ہمت.....“ وہ غصے سے کرپاں لے کر اٹھا۔ ”توڑی اتنی جرات کے رات کے اس ویلے میرے گھر میں کودو، میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔“ وہ بھی جیسی آواز میں کرپا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کی آنکھ کھلے

آنے والے منظر نے اسے یہ ضرور سمجھا دیا کہ اس کی دنیا ٹٹ چکی ہے۔

کر تار سنگھ نے اپنا گھر اور گھر والے بچانے کے لیے وہی کیا جو دنیا کا دستور ہے جیسے ہی دند کے حواس میں اس بات نے اپنے نچے گاڑے اس نے دیوانہ وار دروازے کو پھینکا شروع کر دیا۔ وہ ان خالوں کے پیچھے جانا چاہتا تھا جو اس کی ہانکوں کا گھر لے گئے تھے۔

کر تار سنگھ اچیلے قدموں کے ساتھ تیزی والے کمرے کی طرف آیا اور اس نے کانچے ہاتھوں کے ساتھ دھیرے سے کٹڑی کھول دی اور خود دیوار کے ساتھ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ سر پر کس کر بندی ہوئی ایک ڈھکی ہوئی تھی، ہاتھ میں کرپان اب بھی موجود تھی مگر اس کی گرفت میں وہ مضبوطی نہیں تھی جو کر تار سے کا خاصہ تھی۔ دینو نے چھرائی آنکھوں سے کر تار سنگھ کی طرف دیکھا اس سے پہلے کہ وہ اس کا گریبان پکڑ کر اس کو اس کا وہہ یاد کرواتا باقی تو بے کراس کے۔ گلے سے آگئی وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

دینو نے تڑپ کر برآمدے کی طرف دیکھا۔ کر تار سنگھ کی بیوی بد حواس تیار ہو رہی تھی چادر پانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی بیٹی تھوڑے پچھلی اس کے ساتھ گئی کھڑی تھی مگر اس کی چھوٹی بیٹی کی چار پائی خالی تھی۔

دینو نے کر تار سنگھ کی طرف دیکھا وہ دھیرے دھیرے دیوار کے ساتھ ڈھسے گپ۔ وہ جلدی سے لپک کر اس کی طرف گیا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ برآمدے میں اس کی بیوی اور بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ کر زار و قطار رو رہی تھیں۔ وہ بڑے میں کھڑی ہانوی بھی ہلک۔ ہلک کر رو رہی تھی۔ اپنے نچے جانے کی خوشی میں یا دل بیت کور کے کھو جانے کے دکھ میں وہ کچھ نہیں پاد رہی تھی۔

کر تار سے یہ فونے کیا کیا۔ ”دینو“

آنسوؤں اور حیرت بھرے صدمے کے عالم میں بس اکتاہٹی کہہ سکا۔

”ہو کر کیا کرتا یا۔۔۔۔۔۔ تیرے ساتھ وہیں بھی تو بھانا تھا۔ اس لیے میں نے ایک دھکی بچانے کے لیے دوسری دھکی قربان کر دی۔“

کرپان اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی پکڑی میں بندھے کس کھڑے تھے، چہرے پر آنسوؤں کی ٹیکریاں تھیں، یہ وہ کر تار سنگھ نہیں تھا جسے دینو کو چھان جانتا تھا۔

☆☆☆

”نانا جان! اٹھ جائیں باہر بہت سردی ہو رہی ہے آپ کے کپڑوں میں درد لاحقہ جائے گا۔“ عبداللہ نے آکھین عرف دینو کو چان کو آواز دی۔

”نانا جان۔۔۔۔۔۔“ عبداللہ نے دینو کے کندھے کو ہلا دیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔۔“ چنانچہ چلو، میں اندر آتا ہوں مگر ایک بار۔۔۔۔۔۔ یاد رکھنا انسان کو اس کی انسانیت اور اچھے دل سے پرکھنا چاہیے کیونکہ سب انسان ایک سے نہیں ہوتے۔“ عبداللہ اندر جا چکا تھا اور اتار کے بیڑ پر ٹھہر گئی چڑیا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے یا دوں کا اک میلا سا کراہا تھا۔۔۔۔۔۔ بھر جھرت، ہانوی کی شادی اور عبداللہ کی پیدائش۔۔۔۔۔۔ وقت گزرتا گیا۔ آٹھ برسوں بعد دینو کو چھان کے نام پر اک تار آیا۔ دینو نے تیار کی پکڑی اور فریج کے ذریعے اس سر زمین پر جا پہنچا جہاں سے وہ نکلا ہوا تھا ہوا یا دیں اور کھینیں اور غریب جانے کیا کچھ ساتھ لے کر چلا تھا، کر تار سنگھ کی بیوی بیٹی نے اسے چھٹی لکھی تھی اور آج وہ اپنے پار کو آخری سفر کی طرف رخصت کرنے آیا تھا۔ آج اس کی آٹھ برسوں بعد کر تار سے سے آخری ملاقات تھی۔ کر تار سنگھ کے کرپا کرم کے بعد وہ بھر دھیر ساری یا دوں کو بھٹی میں باندھے لوٹ آیا تھا کہ یہ یا دیں ہی اسے اس کی بھائی زادگی کا سر بایہ تھیں۔





بوجھ بیٹیوں کے

شیریں حیدر

”ہاں..... سکون آ گیا؟“ میں نے اپنے بڑے اور چھٹی اینڈی کی سینڈل کی گرفت سے آڑ لکے اور سکون سے ایک گہری اور فرحت بھلی سانس لی۔ ”ویسے ہمارے یہ فیملی آرام دہ جوتے نہ ہوں، پارلر سے بنے ہوئے بال نہ ہوں، سونے کے بھاری زیورات نہ ہوں اور ہمارے وزن سے کبھی بھاری پلیوساٹ نہ ہوں تو کیا کسی بیاہ میں شرکت نہیں کی جاسکتی؟“

”کی جاسکتی ہے..... ضرور کی جاسکتی ہے..... مگر کسی اور کے، اپنے بچے کے بیاہ میں نہیں۔“ خدا نے میری بات پر غور کیا۔

”اچھا..... یہ کیا بات ہوئی؟“ خانا نے حیرت سے پوچھا۔

”کیونکہ.....“ اساتے مداحلت کی۔ ”لوگ یہ نہ سمجھیں کہ طیب کی بھویوں کے پاس شاید اچھے

2014

لبوسات، قیمتی زیورات، نئے جوتے اور پار میں طرح کرنے کے لیے رقم نہیں ہے۔“

”وہی مجھے اس بات پر شک ہے تاکہ کوئی لباس تم سے بڑھ کر بھاری ہو سکتا ہے۔“ میمونہ نے بھاری بھر کم..... تاکہ وزن پر چوٹ کی۔

”تم خود تو گویا بیڑی دہلی ہو۔“ شاکی طرف سے فوراً تپا ہوا جواب آیا۔

”تم سے دہلی تو ہوں۔“ میمونہ نے اترا کر کہا۔

”کیا بچوں کی طرح ڈر رہی ہو تم؟“ میں نے مداحیت کی۔

”آپ خود دیکھ لیں آپنی..... اس نے مجھ پر جان بوجھ کر چوٹ کی ہے، میرا وزن بڑھ گیا ہے تو کیا میرے اختیار میں ہے اسے کم کرنا؟“ شاکیا لہجہ بھرا گیا تھا۔

”اچھا..... چھوڑو اس بات کو، وزن بڑھنا آسان ہوتا ہے مگر اسے کم کرنا مشکل، مگر تھوڑی بہت کوشش سے ہو جاتا ہے۔“ میں نے مصالحت کے انداز میں کہا۔ ”تم کوشش کرو تو ضرور کم ہو جائے گا، کم از کم میونہ جتنا تو ہو ہی سکتا ہے۔“ میں نے طریقے سے اس سے کہا۔

”کتنا تھکا دیتی ہیں آج کل کی شاکیاں.....“ خدا نے اپنے بالوں سے جوڑے کی پٹلیں نکالتے ہوئے کہا۔ ”مہندی سے پہلے کئی، کئی ڈھولکیاں..... کیسے نئے، نئے رواج چل نکلے ہیں، شکر ہے کہ کل دیر ہو گا۔“

”درست کہتی ہو میری جان.....“ میں نے سب سے چھوٹی خدا کو دیکھا۔ ”شاکیوں کی رسومات طول بکرتی جا رہی ہیں، چھٹی زندگی مصروف ہو گئی ہے اتنی ہم لوگ زیادہ فضولیات میں بڑھ گئے ہیں۔“

”مجھے تو شاکیوں میں شرکت کرنا اچھا لگتا ہے۔“ خدا نے کہا۔ ”وہی ہم کہاں اس طرح مل پاتی ہیں، پانچ دن سے ہم چھٹی کی چھ بکشی دن رات اٹھنے

مگر ادرہ ہیں، ایسا موقع پہلے کب ملے گا؟“ خدا۔ ٹکا اور میونہ آئی بھی دوسرے شہروں سے تھیں۔

”ہاں یوں لگتا ہے کہ ہم سب چھوٹی، چھوٹی بچیاں ہیں..... ماضی میں لوٹ جاتی ہوں میں تو بار بار.....“ میں نے کہا۔ ”خصوصاً جب تم لوگ آپس میں بیٹوں کی طرح لڑتی ہو۔“ میں غصی۔

”اباکی کی وفات کے بعد پہلا موقع ہے کہ ہم سب بہن بھائی اکٹھے ہوئے ہیں۔“ اسانے دل گرفتہ انداز میں کہا۔

”چند روز سالی.....“ میں نے کہا۔ ”کتنا عرصہ ہوتا ہے ناں۔“

”غصے کے ہم بھڑکے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں۔“ خدا نے ہمارا کہا تو ماحول پر پھینکنے والی اور اسی صحت کی اور سکرگت مخرجی۔

”جس جگہ ابان حیات ہیں تب تک تو ہم اس طرح میں آتے ہی رہیں گے۔“ خدا نے کہا۔ ”ابھی تو کسی ماحول کے مل نظر بھی نہیں آتے..... ابان کی خاطر ہر بات کو ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔“

”ہر ایسی بات کو ہنس کر ٹال دیتے میں ہی کامیابی کا راز مضمر ہے۔“ میں نے انہیں سمجھایا۔ ”اپنے گھروں میں بھی تو ہم یہی اصول رکھتے ہیں ناں، بچوں کے ساتھ۔ شوہر کے روئے سانس، سر کی ڈانٹ، تندہ دیوہوں کے مزاج اور باقی لوگ۔“

”ساری زندگی میں ہی پیتا ہوتا ہے ناں۔“ خدا نے منہ ہوسدا۔ ”بچیاں ہونا کتنی بڑی فطرتی ہے..... کیا تمہارے اختیار میں ہوتا ہے کہ ہم اپنے لیے انتخاب کریں کہ ہم بچیاں ہوں یا بیٹے؟“ کا کش ہوتا۔

”ہاں..... کتنا اچھا ہوتا ہوا بیٹا ہوتا۔“ خدا نے کہا۔ ”میں تو آپ سب کا بھائی ہوتی ہوں۔“

”مجھے تو انتخاب کا اختیار ملتا تو بھی میں بچی ہونے کو ترجیح دیتی۔“ میں نے پورے یقین سے کہا۔ ”جانتی ہیں آپنی آپ کہ بچوں کے کتنے بوجھ

بوجھ بیٹھوں تھے

دینا دلا نا اور نہ جانے کتنی رسومات اور تقویات.....
 "جانتی ہوں....." میں نے رساں سے کہا۔ "اسی لیے تو میں نے تم سب لوگوں سے پوچھے بھائی ان کو اماں کے ذریعے کہلوادیا تھا کہ ہم بیٹوں میں سے کسی کا جوڑا نہ بنائیں..... نہ ہی ہمارے شوہروں کے۔"
 "ابھائی کیا آپ نے....." ثنائے تانیدی۔
 "اس سے کیا فرق پڑا آپنی....." اسانے کہا۔ "انہیں بھائی کے گھر والوں کے، طیب کے ماموں اور ممانیوں، خالاؤں اور خالوؤں، نانا، نانی اور دادائی کے قریبیوں جوڑے بنانے پڑے ہوں۔"
 "انہوں نے تو شکر کیا ہوگا کہ طیب کے چچا اور چچاں نہیں ہیں....." حنائے فس کر کہا۔
 "اور ان میں سے کوئی بھی جوڑا سات آٹھ ہزار سے کم کا کیا ہوگا؟" غنائے کہا۔
 "فرق کیوں نہیں پڑا....." حنا فوراً بولی۔ "مگر چھ ہمارے اور چھ ہمارے شوہروں کے جوڑے نہ بنے تو لاکھ روپے تک کی بچت تو ہوتی ہوگی ناں ان کی....."
 "کاش آپ انہیں سب کے ہی جوڑے بنانے سے منع کر دیتیں....." ثنائے کہا۔
 "میں اپنے اختیار کی حد سے تمناؤں نہیں کرتی۔ حتیٰ کہ تم لوگوں کے لیے بھی منع کیا تو بھائی کو اس بات پر اعتراض تھا کہ میں کون ہوتی ہوں منع کرنے والی..... حالانکہ تم میں سے کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔"
 "ایک جوڑے سے کسی کا کیا بن جاتا ہے آپنی اور ہم کون سا انہی جوڑوں کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں مگر آپ کے اس اقدام سے ان کی کتنی بچت ہو گئی....." غنائے کہا۔ "ہیں بھی ان کے دیئے ہوئے جوڑوں میں..... ہم دس ٹھاکس نکال دیتے۔"
 "نکل کو جب بھائی کو یہ ساری رسومات اپنی بیٹیوں کے لیے کرنا پڑیں گی تو بھاد معلوم ہوگا۔"
 حنائے جل کر کہا۔
 "اللہ کرے کہ ان کی بیٹیوں کو ایسی سرسالیں

ہوتے ہیں.....؟" غنائے ہوئے سے کہا۔ اس کی تین بیٹیاں تھیں اور چچا کوئی نہیں۔
 "جانتی ہوں....." میں نے کہا۔ "تمہاری تو فقط تین بیٹیاں ہیں ناں..... لہجی کی تو ہم چھ بیٹیاں تھیں مگر جی کسی نے ان کے ماتھے پر ہل نہیں دیکھا، بھائی تو جب اس قافلہ تھا کہ لہجی کا ہاتھ بنا تا اور قافلہ ہو بھی جائیں بھائی تو ان کے اپنے بال بچوں کے اخراجات ہوتے ہیں، ہم سب کے بھی اسی طرح ہیں۔"
 "نہ پوچھیں آپنی یہ سب ایک ساتھ جو ان ہو رہی ہیں تو کس طرح میری فینڈی یہ سوچ، سوچ کر اُڑ جاتی ہیں کہ کس طرح انہیں بچا ہوں گی۔" غنا کا لہجہ واقعی پریشان کن تھا۔ "شادیوں کے اخراجات کیسے، کیسے بڑھ گئے ہیں۔"
 "ان کے نصیب کے لیے دعا کیا کرو....." ماں کی دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے بھاری۔ "میں نے اسے اپنے ساتھ لے لیا۔" بیٹیاں تو ہم سب کے گھروں میں دو، دو تھیں، تین ہیں ناں۔
 "مگر آپ لوگوں کے ہاں سے بھی تو ہیں....." اس نے جیسے شکوہ کیا۔
 "سب اللہ کی دین سے میری بہن۔" اسانے مخالفت کی۔ "بہنی کا رشتہ بہت بچا ہوتا ہے، بیٹیوں کی پرورش کر کے اس کے فرض سے فارغ ہونے والے کو جنت کی بشارت دی گئی ہے..... بیٹوں کی تو نہیں ناں؟" اسانے دعا کو تپلی دینے کی کوشش کی۔
 "واقعی..... اس پر تو بھی غور ہی نہیں کیا....." غنائے کہا۔
 "ویسے کہنے کی حد تک ہی ہے آپنی مگر بیٹیوں والوں پر بڑے بوجھ ہوتے ہیں، بیٹیاں تو بوجھ نہیں ہوتیں مگر بنا دی جاتی ہیں۔" ثنائے بھی مایوسی سے بولی۔ "آج کا ہی دیکھ لیں..... بھیا بھو بھاد کر لائے ہیں، کہاڑا نکل گیا ہے لڑکی والوں کا، مہندی پر ہم سو لوگوں کو لے کر گئے، آج دو سو لوگوں کی بارات تھی، پھر

تیرے بن عید

ایک اور عید

آج میں گز اروں کی تھا

آج پھر میں چاندرات کو

جہاز کے تارے کے ساتھ

تیری یاد میں

محبت کا دیار اک ہلاؤں کی

آج بھی بن تیرے

عید یوں مناؤں گی

میں بھی اس دے کے ماتھ

ویرے دھجے جلتی جاؤں گی

چپ چاپ سکتی جاؤں گی۔

مرسلہ: یاسین اقبال، لاہور

دیا تھا تو کیا ہمیں اس بات کا اندازہ ہو جاتا چاہے کہ ہمیں سعد کی شادی پر اس کی سرال سے کوئی توقع نہیں رہی تھی چاہے..... کیا آپ ان کو بھی منع کر دیں گی کہ وہ سعد کی پھوپھوں کے لیے تحائف نہ دیں؟“ کرن نے مایوسی سے پوچھا۔

”نہ صرف سعد کی پھوپھوں بلکہ کسی کو بھی نہیں..... ان سے تو میں کسی کے لیے بھی تحائف نہیں لوں گی۔“ میرے لہجے میں غم تھا۔

”وہ کیوں بھائی؟“ کرن نے فوراً سوال کیا۔

”بھئیوں والے بچی دے دیتے ہیں تو اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے.....“ میں نے پیار سے کرن کی طرف دیکھا۔ ”بچی کی شادی کی خوشی اپنی جگہ مگر ان پر بچی کی جدائی کا صدمہ بھی ہوتا ہے، ایک فرض سے فارغ ہو کر جہاں خوشی ہوتی ہے وہاں ان پر ان فرسودہ رسومات کا بوجھ بھی ہوتا ہے۔“

”آپ نے تو ہمیں مایوسی کر دیا بھائی۔“ فرحت نے منہ لٹا کر کہا۔ ”ہمیں تو یہی امید تھی کہ آپ.....“

”تمہیں جس طرح کا بھی اچھا جوڑا چاہیے..... وہ میں خود نہیں دلاؤں گی، بلکہ تم نے کہو تب بھی میں سعد کی شادی پر اس کی ساری پھوپھوں، خالائیں، بچپن اور زمانوں کے علاوہ اس کی ساری کزنز کو بھی تحائف میں جوڑے دینے کا ارادہ رکھتی ہوں۔“ میں نے کرن سے کہا۔

”اگر آپ نے اپنے بھتیجے کی سرال میں اس لیے منع کیا کہ ان پر بوجھ ہوگا تو پھر آپ ایسا کیوں کریں گی؟“ کرن نے پوچھا۔ ”آپ پر بوجھ نہیں ہوگا کیا؟“

”جھ پر بوجھ نہیں ہوگا.....“ میں مسکرائی۔ ”میں یہ سب اپنی خوشی سے کروں گی، اگر کر سکی تو..... اور یہ کوئی رسم بھی تو نہیں..... کسی اور کے لیے کروں نہ کروں، تم دونوں سے تو وعدہ ہے کہ تم دونوں کے جوڑے بنے۔“

”بھائی ہمارے ملاتے ہیں تو لوگ بڑے دیا لو ہیں..... قسم سے میرے بھائی کی شادی ہوئی تو لڑکی والوں نے تین ٹوکوں میں پھر کر سامان دیا..... سارے خاندان کے لیے بے شمار تحائف..... آدھے خاندان کی عورتوں کے لیے تو سونے کے تحائف تھے، کیسے کیسے تحائف بھائی، کیا بتاؤں؟“ فرحت نے بتایا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ یہ سب ٹھیک ہوا؟“ میرے لہجے میں تاسف تھا۔

”حقیقت میں یہ بھی بھائی تو اس وقت مجھے بھی یہ سوچ کر بہت افسوس ہوا تھا، حالانکہ مجھے بھی تجھے میں اتنا جتنی جوڑا اور سونے کے جھمکے ملے تھے مگر میں سوچ کر وہ جتنی بھی کہ کل کلاں کو ہم اپنی بھئیوں کو کیسے چاہیں گے.....“

”اسی وجہ سے سوچ کر بدلنے کی ضرورت ہے فرحت..... بات کسی کے دیا لو یا کتنوں ہونے کی نہیں، جب ایک دیتا ہے تو وہ دوسروں کے لیے ایک مثال قائم کر دیتا ہے، یہ مثال مجبوری بن جاتی ہے،

ہم جان سے چلے جاتے ہیں مگر ان بے پردہ رسوم و رواج سے نہیں بچتے۔۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔۔۔ ہمارے گاؤں کے ساتھ ایک گاؤں ہے جہاں کی رسم ہمارے سارے ملک سے نرالی ہے اور اچھائی قابلِ عمل اور قابلِ تقلید بھی مگر اسے سراہتے بھی ہیں۔ اپنانے کا حوصلہ کوئی نہیں کر پاتا۔۔۔۔۔

”اچھا۔۔۔۔۔ وہ کیا رسم ہے بھائی؟“ کرن نے دلچسپی سے پوچھا۔

”وہاں پر بھندی کی تقریب منائی جاتی ہے، لڑکے والے لڑکی والوں کے ساتھ پورا خرچ مل کر کر دیتے ہیں، اگلے دن ناشتے کے بعد ہارات لڑکی والوں کے گھر جاتی ہے، وہاں پر گرمیوں میں خشکے مشروب اور مٹھائی اور سردیوں میں چائے اور مٹھائی پر نکاح ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس کے بعد رخصتی ہوتی ہے۔ شام کو لڑکی کا سارا خاندان بھی لڑکے والوں کے گھر آ جاتا ہے اور دسپے کی دعوت۔۔۔۔۔ ہوتی ہے، اتنی مختصر سی شادی کی تقریب ہوتی ہے اور لڑکی والوں پر ایسا کوئی بوجھ بھی نہیں پڑتا۔۔۔۔۔“

”ارے واقعی۔۔۔۔۔ یہ تو بہت اچھی رسم ہیں بھائی!“ فرحت نے کہا۔ ”واقعی ایسی شادی کی تقلید کرنے کی ضرورت ہے، اچھائی کے پیغام کو جتنا پھیلا یا جاسکتا ہے پھیلا نا چاہیے۔“

”اچھا کچھ گھٹے یہ سن کر۔۔۔۔۔ ہم میں سے کوئی یہ نہ سوچے کہ ہم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے، ایک تنہی بھی کر لیں تو وہ خرب و ضرب کے عمل سے چمکتی ہے اگر دوسرے ہماری نیت اور اس تنہی کے مفہوم کو سمجھیں تو کیا اچھا ہو۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی بہت سی نا پسندیدہ اور قبیح رسوم ایسی ہیں جن کے ہونے کی پوری ذمہ داری خود ہم پر ہی عائد ہوتی ہے، تم دونوں اگر میری طرح سوچو گی اور کم از کم اپنے خفیوں کی شادیوں میں ان رسوم کو تبدیل کرنے کی کوشش کرو گی تو ضرور معاشرہ تبدیل ہو گا۔ انشاء اللہ۔۔۔۔۔“

میرے لچکے میں یقین اور غرور تھا۔۔۔۔۔
”صرف بیٹوں کی شادیوں پر ہی کیوں۔۔۔۔۔؟“
کرن نے فرحت سے کہا۔ ”خفیوں کی شادیوں میں بھی تو ہم ایسی شرائط رکھ سکتے ہیں کہ ہم تحائف دیں گے نہ بھیجیں۔۔۔۔۔“

”بد قسمتی سے یہ معاشرہ اس بات کو لڑکی والوں کی طرف سے تسلیم نہیں کرے گا، چناجھت کو نہیں چھوڑ سکتا (کمزور، زبردست کا کچھ نہیں کر سکتا) کیونکہ ہمارے ہاں لڑکے والے زبردست اور لڑکی والے زیر دست ہوتے ہیں۔ تیار اندھ ہب نہیں بلکہ معاشرہ لڑکی والوں کو تنہا بنا دیتے۔۔۔۔۔ وقت آئے گا کہ ایک دن ہم سب کی سوچ بدلے گی، انشاء اللہ!“

”انشاء اللہ۔۔۔۔۔“ دونوں نے بیک آواز کہا۔
”میرے لڑکی خفیوں کو بھی بوجھ نہیں سمجھتے تھے اور ان کی سمت ایسی کر انہیں کوئی ایسا سہارا نہیں ملا جہاں کوئی ان بے ہودہ رسومات کے خلاف ہوتا۔۔۔۔۔ میں سب سے بڑی تھی، اپنی شادی سے لے کر ہر بہن کی شادی پر اپنے ابا بانی کے کندھوں کو پہلے سے زیادہ جھکے ہوئے دیکھتی اور خود کو بھرم محسوس کرتی کہ ہم بہنوں کے بوجھ اپنے کندھوں پر سے اتارتے ہوئے وہ اپنی عمر بٹا گئے۔ صرف شادیوں کے ہی نہیں بلکہ خفیوں کے بوجھ تو ماں باپ عمر بھر اٹھائے بھرتے ہیں۔“ میں طول ہو گئی۔

”مبارک ہو آئی۔۔۔۔۔ کسا کی آواز میں جوش تھا۔
”خیر مبارک۔۔۔۔۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کس بات کی مبارک ہے بھی؟“

”طیب کی سرسراہل سے عدا کی دو بڑی خفیوں کے لیے دشمنی آئے ہیں۔۔۔۔۔“ اس نے اطلاع دی۔
”ماشاء اللہ۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔ ”کون کون کی ہیں؟“ عدا کو اپنی خفیوں کی طرف سے بہت پریشانی رہتی ہے تو یہ میرے لیے بہت اچھی اطلاع تھی، اس

شریف لوگ تھے۔

”یاد ہے ہاں عدا۔۔۔ اس دن ٹانے پر بچھا تھا کہ میرے اس بچے کے عمل کی کسی کو خبر بھی ہوئی ہوگی کہ نہیں، کبھی تم لوگوں نے انہی خاتون کے بارے میں بتایا تھا۔“

”ہاں ہاں۔۔۔ یاد ہے مجھے آپ! ا“ عدا نے کہا۔
”نیک ایک خوشبو ہوتی ہے پیاری۔۔۔ خوشبو جو وجود رکھتی ہے مگر نظر نہیں آتی، ہوا کے نغصے سے جو گئے کے ساتھ بھیجتی ہے، ہر اچھا عمل نیک کی خوشبو کی طرح ہوتا ہے، پھیلتا ہے تو محفوظ کرتا ہے۔ دیکھ لو۔۔۔ اللہ کے ہاں نیکوں کے کئے، کئے اجر ہیں، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرے اس نغصے سے عمل کا اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا صلہ ہو گا جو اسی دنیا میں ہمیں مل گیا۔ میں اس روز تیار ہو رہی تھی کہ بہت پریشان ہوئی تھی کہ تم بچوں کے بچوں کی طرف سے کافی غرور مند ہو، میں نے دل سے تمہارے لیے دعا کی اور دیکھو اللہ تعالیٰ نے میرے اس چھوٹے سے عمل کا اجر ہمیں کتنا اچھا دیا کہ اس نے تمہارے حق میں کی گئی میری دعا سن لی۔“ میں نے عدا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

”واقعی آپ! ا“ عدا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔ ”اگر دینا میں چندا مجھے لوگ بھی آپ جیسے ہو جائیں جن کا عمل دوسروں کی سوچ بدل دیتا ہے تو یہ دنیا مثالی ہو جائے۔“

”اور بچوں کے بوجھ تو پھولوں کی طرح چلے ہو جائیں، بچوں کی پیٹھ پر کسی کا چہرہ نہ اترے۔“ اس نے کہا۔

وقتِ رخصت، دعا پڑھتی اور دایرے آ کر میرے گلے سے لگ گئی۔۔۔ ”اس روشنی کو پھیلاتی رہے گا آپ! اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دوں جہانوں میں دے گا۔“
”آمین! ا“ اس نے کہا اور میں مسکرا دی۔
”ان شاء اللہ! ا“

کی تیسرے نمبر کی بچی کا رشتہ تو میں نے لوں گی، میرے دل میں خواہش تھی کیونکہ بڑی دونوں تو میرے سوا سے بڑی تھیں۔

”یاد ہے آپ کو، جو میں نے اور میمونہ نے آپ کو بتایا تھا۔۔۔ جو خاتون آپ کے اس اقدام کی بہت تعریف کر رہی تھیں کہ آپ نے لڑکی والوں سے تحائف لینے کو منع کر دیا تھا۔“

”ہاں ہاں۔۔۔ کچھ یاد تو ہے۔“ میں نے ذہن پر زور دیا۔

”وہ طبیب کی تالی ساس تھیں، انہوں نے اپنے پورے خاندان میں آپ کے اس اقدام کی نہ صرف تعریف کی بلکہ دعا کیا کہ اس اچھی سوچ والی خاتون کی بچی کو بیاہ کر لائیں مگر جب انہوں نے چیک کیا تو علم ہوا کہ اس اچھی سوچ والی خاتون کی فقہ ایک ہی بچی ہے اور وہ بھی بیاہی جا چکی ہے۔۔۔ جب انہوں نے مزید چھان بین کی اور ان کی نظر انتخاب عدا کی بڑی دونوں پر پڑی۔۔۔ انہوں نے کہا ہے کہ انہیں صرف بیچیاں چاہئیں اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔ آج کل میں ہی عدا آپ کی طرف آئے کی خوش تھی، کہہ دی تھی کہ آپ سے مشورہ کہہ کے ہی کرنا کہنا چاہیے۔“

”بہت اچھی خیر نائی ہے تم نے اس۔۔۔“ میں نے دل میں شکر ادا کیا کہ عدا کی پریشانیوں کچھ تو کم ہوں گی۔ اس نے مجھے تفصیلات بھی بتائیں جو بہت حوصلہ افزا تھیں، اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جاتا، کم تھا۔ اگلے ہی روز اسامہ اور عدا آ گئیں، مجھ سے مشورہ کرنے کے لیے۔

”اس سے اچھا اور کیا ہو سکتا ہے۔“ میں نے اس رشتے کی حمایت میں ووٹ دیا۔ چائے پیتے ہوئے مجھے عدا نے وہ تفصیلات بھی بتائیں جن کا کہ اسامہ کو بھی علم نہ تھا۔ سال بھر کے اندر ان کا دونوں شادیوں اگلے اور سادگی سے کرنے کا ارادہ تھا، دونوں بیٹے بہترین ملازمتوں پر تھے اور اچھائی



ناولٹ



پریمیر ایڈیشن

سیرامید

نکاوے..... رات کا دوسرا پہر تھا۔۔۔۔۔ شانزے
سو بجی تھی۔ لیکن وہ اسے جگا گئی۔ اس کی بیٹی جو اس
کی زندگی کو اس سوز پر لے آئی ہے۔ اب سو بجی تھی
اور وہ خواب جاگ رہی ہے۔۔۔۔۔ وہ جو تین الاقوامی

وہ قیو آدم کھڑکی کے پاس کھڑی باہر سوگ کی
طرح پہلے اندھیرے کو کھوج رہی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ
یہ اندھیرا اس کے اندر سے نکل کر چار سو پچیس لگیا ہو۔
اس نے کھڑکی کے شیشے پر اپنے گل



شہرت کی حامل ایک کامیاب اداکارہ تھی اب صرف ایک عورت بنی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے شیشے کے پار بہت کچھ تلاش کرتے اسے اب احمد یاد آرہا تھا۔
 ”کیا وہ بھی احمد سے محبت کرتی تھی؟“

اسے یاد کرنے سے بھی کوئی یادداشت نہ ملی جس میں وہ بھی بنی رہ گئی تھی کے مانند اس کے گرد رقعاں ہوئی ہو..... اسے یاد کیوں نہیں آرہا..... اسے احمد ہی کیوں یاد آرہا ہے۔ اسے اس کی محبت اب کیوں یاد آرہی ہے..... وہ جانچا تھا اور اس نے خود ہی اسے جانے دیا تھا۔ پھر.....؟

کچھ لوگوں کو تاہم یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ وہ کس خزانے کے مالک ہیں..... جن گھنے ہیں اور بنے رہنے والے ہیں..... ”محبت کے خزانے“ جس کی چاکرئی کرنی پڑتی ہے نہ تشویش..... یہ اُن ہی کا تو ہے اور وہ خود اس خزانے کی حقیقت سے انہماں..... اسے وقت کے ہاتھوں کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دیتے ہیں..... اور پھر بھی انہماں بنے پھرتے ہیں..... بد قسمت لوگ..... وہ اس سے محبت کرتا تھا اور وہ اس سے شادی کر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسے وہ وقت یاد آرہا ہے جب وہ محبت کا سال لے کر اس کے پاس آیا تھا اس کے پیچھے بھاگتا تھا۔
 ”کیا آپ میرے ساتھ ایک کپ چائے نہیں کی؟“ وہ بڑا منسوب بنا اس کے سامنے کھڑا تھا۔
 ”سوری..... میں.....“ وہ بہ مشکل مسکرا کر کہنے لگی..... وہ پروڈکشن ہاؤس کسی کام سے آئی تھی، دس، پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا اسے..... اور وہ اس کی کار کے پاس کھڑا تھا۔
 ”پلیز..... اٹھارہ دست کیجیے گا۔“

”مجھے اٹھارہ گنا ہی ہے کیونکہ میں بہت جلدی میں ہوں۔“

”میں نے چارے دو سال اس ایک کپ

چائے کا انتظار کیا ہے۔“

”دو سال.....؟“ وہ حیران ہوئی۔

”میرا یقین کریں۔“

”میں یقین کرتی ہوں..... لیکن میں.....“

”صرف دس منٹ لگیں گے یا پندرہ اس سے زیادہ نہیں..... اسی سڑک کے کنارے پر کافی شاپ ہے۔“

”میرے پاس بہ مشکل پانچ منٹ ہیں۔“
 ”چائے کا کافی آنے کے بعد کے صرف پانچ منٹ..... پلیز.....“ اس نے کھڑی دیکھی پھر اسے دیکھا۔

”پلیز..... میں اپنی کار میں آپ کو لے کر کرتی ہوں۔“

”پھر کے پاس موٹر سائیکل ہے..... کیا ہم واک کر کے جاسکتے ہیں؟“

”لیکن میرے پاس وقت.....“
 ”اچھے اچھے، لیکن ہوا چل رہی ہے، فٹ پاتھ پر وہ ختوں کے سائے کتنے پھیلے لگ رہے ہیں۔ واک کرنا تو ایک خواب جیسا ہوگا۔“ وہ مسکرا اٹھی اور آگے چلنے لگی۔

چائے آگئی اور اس نے جلدی سے سہ لیا۔
 ”میرے پانچ منٹ شروع ہوتے ہیں، کیا میں آپ سے بات کر سکتا ہوں۔“
 ”آپ بات ہی کر رہے ہیں۔“

”نہیں، وہ بات جس کے لیے میں نے اتنا انتظار کیا ہے۔“ وہ خاموشی سے چائے پیتی رہی، مطلب تھا آخرم بولتے رہو۔“

”میں آپ سے سوال کروں.....؟ یا جواب لوں مجھے تو کچھ نہیں آ رہی۔ انتظار کروں یا اپنا حال دل جان کروں۔“

اس کے چہرے پر ناگواری نظر آنے لگی۔ ظاہر ہے اس نے بہت بار ایسے ڈرامے دیکھے تھے

”میں آپ سے محبت کرتا ہوں..... یہ غلط نہیں ہے۔ یہ صرف الفاظ نہیں ہیں.....“ لیے درختوں کے سائے سے ڈھکے فٹ پاتھ پر وہ اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کرنے لگا..... وہ ”بوسہ“ کی شکل بنائے تیز تیز قدم اٹھاتی رہی..... وہ خوب صورت تھی۔ ملک کی مشہور اداکارہ تھی، ہزاروں ہار اسے کہا جاتا تھا کہ ”میں آپ کا بڑا نصیب ہوں۔ آپ سے محبت کرتا ہوں، آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔“ شادی کے بارے میں بھی لوگ ڈھکے چھپے اعزاز سے کہہ رہے تھے..... لیکن ایسے اس طرح بچے پڑ کر..... ایسے ساتھ ساتھ بھاگ کر.....

”مجھے چاہئیں چلا، مجھے آپ سے محبت کب اور کیسے ہوگی لیکن ہوگی..... میں نے اداکارہ سے محبت نہیں کی..... میں آپ کا نصیب نہیں ہوں میں۔ ماہ زیب کا مداح ہوں..... مجھ پر آپ نے پاک جادو کر دیا ہے۔ اور میں اس میں خوش ہوں..... آپ مجھ میں طویل کر گئی ہیں۔ پہلے مجھے ڈرتا تھا کہ آپ کے بغیر مر جاؤں گا مگر اب یقین ہو چکا ہے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یہ محبت ایسے کیسے ہونے لگتی ہے..... کیسے چھپ کر دوار کرتی ہے تو میں اپنا بھاء کر لیتا..... لیکن اب تو.....“ ماہ زیب کی خوب صورت میٹل کی ہینل تک، ایک فٹ پاتھ کے فرش سے اٹھ کر سارے میں پھیل رہی تھی..... احمد کی بی بی..... بیابا کی صدا صدیوں پیاسے صحرائی پکار کے مانند تھی۔

ماہ زیب کی رفتار اور تیز ہو گئی اس نے اپنے پاتھ کو اسے چائنا مارنے سے روکا..... ”میرے لیے آپ اداکارہ نہیں ہیں..... مجھے آپ کی شہرت سے بھی غرض نہیں ہے۔ صرف ایک ہار میرے بارے میں سوچ لیں..... مجھے خود پر ہنسی آتی تھی جب میں یہ سوچتا تھا کہ کبھی آپ سے یہ سب کہہ سکوں گا..... پھر میں رونے لگا..... اور روتا ہی رہتا اگر نہ کہتا.....“

تھے۔ اس میں یہ نظر پڑے ہی جان گیا کہ وہ بہ مشکل ہی اب یہاں تک کر بھی رہے گی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو گود میں رکھ لیا جیسے غما سچے گم گیا ہو۔ ”مجھ سے شادی کریں گی؟“ غما بچہ رو رہے کو ہوا۔

”نہیں.....“ اس نے ایسے کہا جیسے ہانی نہیں ملے گی باہر جا کر کھیلو..... اس نے آرام سے چائے کی ایک آخری ٹپک لی۔

”میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے سوال بدل دیا۔

”میں جا رہی ہوں، چائے کے لیے شکریہ.....“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں آپ سے محبت کرتا ہوں..... آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اب آپ کے بغیر میں وہ سکتا.....“

وہ قدم آگے بڑھتی ماہ زیب نے ایک دم ملک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس کی شکل ”بوسہ“ کی ہو گئی۔

”اچھا“ اس نے خطرے کی بجائے کھول کر کھول اس کی طرف اچھا.....

”آپ میری سہیلی کو آڑا سکتی ہیں۔“ اس کا رنگ فنی سا ہو گیا۔

اس بار ماہ زیب نے اچھا کہنا بھی گوارا نہیں کیا اور چیزی سے آگے چلنے لگی۔

”ایک بار میری پوری بات تو سن لیں۔“ وہ اس کے پیچھے آیا اور بہت چیزی سے کہا۔

”تمہاری بات بھی سن لی ہے اور تمہارے چانچ منٹ بھی ہو چکے ہیں۔ اب جاؤ۔“ وہ ریسنورٹ سے باہر نکل آئی..... وہ ایسے اس کے پیچھے لپکا جیسے سانپ نے دی وادوم دور ملک الموت اس کی روح نکالنے کے لیے جارہا ہو..... وہ اپنی جان بچانے کو اس کے پیچھے لپکا۔

ماورب انی کارک بنجی بکلی قم۔

بات.....

”اگر اس پروڈکشن ہاؤس میں اپنی نوکری بحال رکھنا چاہتے ہو تو ملے جاؤ۔“

”صرف ایک بار میری بات میں لیں۔“

”تم صرف ایک بار میرے انکار پر یقین کرلو۔“ احمد نے ڈرامائی رنگ سیٹ کے ڈور کو لہجاءت سے پکڑ لیا۔

”میں جانتا ہوں، میرا جذبہ آپ کے مقابلے میں کیا ہے..... میں درجے میں بہت چھوٹا ہوں..... لیکن اگر میری محبت کا مقابلہ کیا جائے تو وہ ہر میدان کی فتح ہوگی..... آپ کے لیے اس محبت کا بہت بڑا جذبہ ہے۔“

ماہ زیب خاموش اسے دیکھے مئی..... اگر وہ
جھوٹا تھا تو وہ کمال کا سچا لگ رہا تھا اگر وہ لڑکا تھا تو
آسکرابارڈ اس کا تھا۔

”زندگی میں آپ کو وہ تو ضرور ملے گا جو آپ کے ساتھ رہے گا لیکن وہ نہیں ملے گا، جو آپ کے لیے ضرور ملے گا اور وہ..... وہ نہیں ہوگا۔“

”پاکمل ہو تم.....“ ماہر یب نے اس کے ہاتھ کی گرفت سے دروازہ آواز کو روانا چاہا۔

خوش ہوں۔۔۔۔۔ مہرے علاوہ کوئی اور کہاں آپ کا

خیال رکھئے گا۔۔۔ کبھی تو وہ آپ سے ناراض ہوگا۔۔۔ غصہ کرنے لگے گا۔۔۔ لڑے گا۔۔۔ آپ کو برا

عاجت کرے گا۔۔۔۔۔ بھی تو وہ خود کو آپ سے برتر
عاجت کرے گا۔۔۔۔۔ بھی تو وہ آپ کو کمتر کرے گا۔۔۔۔۔

وہ آپ کو رنجھے گا اور خوش ہوگا..... نہ دیکھنے پر ناخوش
نہ ہوگا..... کبھی نہ کبھی تو وہ آپ کو یاد کرنا بھول ہی

چائے کا..... مہرماہ زیب میں نہیں..... میں بھوکوں کا
تو یاد کروں گاناں..... ماہ زیب کوئی آپ کو اچھی دنیا

میں شامل کرے گا۔۔۔۔۔ اس کے پاس بڑا سا گھر ہوگا۔۔۔۔۔ بہت ساری کاریں ہوں گی۔ مگر میں آپ سے صرف آپ سے اپنی دنیا سہاؤں گا۔۔۔۔۔ میری ساری دنیا آپ ہی رہیں گی، کسی اور کے ساتھ آپ میں اور تم ہوں گی۔۔۔۔۔ لیکن ماہِ ربیع میں آپ ہی آپ ہوں۔۔۔۔۔ میں ختم ہو چکا ہوں۔ میں آپ ہو چکا ہوں۔۔۔۔۔ اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

ہوں۔" یہ صدا دور آسمان تک گئی۔۔۔ اور بہت

قدیم..... قبروں میں دفن ہے بچے ماضیوں تک بھی.....
اور جیسے سب نے سر ہلایا اور کہا.....

”نہاں کی غیبت کجبات ہے..... ایسا ہی ہوتا ہے۔“
 اگلے روز وارے پر اپنی ”ضبوط گرفت کو چھوڑ

تالیاں جلائے۔۔۔ لیکن اس نے تالیاں نہ

خوب سمجھو کہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ اس خوب

کے ساتھ چلنے سے دور اندر دیکھ رہا تھا۔ باورِ حقیقت نے سب سے روٹی سے دور واڑہ بند کیا..... دور اندر کہیں

کرے۔۔۔ ایک عورت نے چاہا کہ اسے اور بتایا جائے کہ اسے کسے چاہا جاسکتا ہے۔ اسے بتایا

اس کی اہلی

سکتے ہیں۔ اسے بتایا جائے کہ وہ کس قدر رحمت کے
لا لائق ہے۔ اتنی ہی بات کہ اس کے آگے ہاتھ

ہاں بعد کر کھڑا رہا جائے اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر گیا ہوتا ہے..... یہ بھی ممکن ہے۔

کار آگے جاری تھی..... احمد بیچھے رہ گیا تھا..... وہ وہاں ایسے کھڑا تھا جیسے آسمان سے ایک دم سرگرم ہو کر اس کی طرف نظر پڑا ہو۔

آک کے کولے لے آئے آلیا اور زمین اسے چھپے بہت چھپے چھپتی ہو اور اب وہ نہ غدوں میں رہا نہ

”ساکھ۔“

”تو بات کس کی ہے۔۔۔ صائم کی؟“

”صائم صرف کوئیگ ہے۔“

”اور میں؟“

”تمہاری بات کہاں سے آگئی؟“

”میری ہی تو بات آئی ہے۔۔۔ میں جب بھی

آتا ہوں تم سوچنے لگتی ہو۔“

”خُڑے۔۔۔ کون سے خُڑے۔۔۔؟“

”تم مجھے بار بار یہ بتاتی ہو کہ میرے لیے تم

اپنا کام چھوڑ کر آؤ گے، شوٹنگ کینسل کرواؤ گی۔“

”کیا تم مجھے نہیں کہتے کہ تم اپنا بزنس، اپنی اہم

بزنس چھوڑ کر آؤ گے؟“

”اوہو! کس زمانہ ماہ زیب۔۔۔ خدایا مت کرو۔۔۔

میرا کہہ دوں گا۔ بزنس ہے۔۔۔ پورپ کے دس ملکوں

میں لیڈ کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ اسے اپنی کھپا شوٹنگ

سے مت ملاؤ۔“ اس کی آواز گرجت ہوئی۔

”دنیا کے بیس ملکوں میں میرے ڈارے۔۔۔۔۔“

”ہو جہ تمہارے ڈارے۔۔۔۔۔ پاپا ٹھیک کہہ

رہے تھے کہ شو بڑ کے لوگوں سے دور رہو۔۔۔۔۔ یہ زہر

ہو کر بھی خود کو بھیر دیکھتے ہیں۔“

”کون ہے زہر۔۔۔۔۔؟“

”تم خود سمجھ لو۔۔۔۔۔ میں تمہارے لیے کینیڈا

سے آتا ہوں۔۔۔۔۔ اور تم ان فضولیات کے لیے مجھ

سے بہانے بناتی ہو۔۔۔۔۔ تمہیں کیا لگتا ہے ماہ زیب؟

ہلا تم ہو کون۔۔۔۔۔؟“

”میں ماہ زیب ہوں۔۔۔۔۔ اس نے اطمینان

سے نکیل پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر کہا۔۔۔۔۔ آس پاس کے چند لوگ اس

کی تیز آواز کی وجہ سے ان دونوں کی طرف متوجہ

تھے۔

”تو کس ماہ زیب یہ جو آپ چند لاکھ کے

ڈراموں میں کام کر کے سمجھتی ہیں کہ دنیا کی شو بڑ

میں کیوں گرفتار ہوتے ہیں ماہ زیب۔۔۔ کیا چھپا رکھا

ہے تم نے اپنے اندر کہ سب دوڑے آتے ہیں تمہاری

طرف۔“ دوسری بہن سویرا کہتی۔ اس نے

ایمانداری سے نتیجہ نکالا کہ اس قمار کا معمولی ہونا

اسے بے وقعت کر گیا۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ وہ رنگوں

میں طویل کرتا۔۔۔۔۔ روح تک پہنچ جانے والوں

میں تھا۔ دس منٹ کی ملاقات میں اس نے غضب

کر دیا۔ ساری زندگی کے ساتھ میں تو وہ حیران

کر دے گا۔

☆☆☆

ماہ زیب اور زمان کی شادی کی تیاریاں کی

جانے گئیں۔ ماہ زیب جلدی، جلدی اپنا کام مکمل

کروانے لگی۔۔۔۔۔ زمان آیا اس دوران دونوں کو ڈنر

کرنا تھا اور وہ ہمہری کوشش کے باوجود ہوئی دیر سے آئی

تھی اور زمان غصہ ضبط کیے بیٹھا تھا۔۔۔۔۔ ڈنر کے

دوران ہی اس نے اسے نرمی سے آگاہ کیا کہ وہ سنا

۔۔۔۔۔ کرشل کی شوٹنگ کے لیے جا رہی ہے۔

”کب جاتا ہے؟“ اس نے بھی کھنکھار کر

پوچھا۔

”کلی۔۔۔۔۔“

”لیکن کل ہی تو میں آیا ہوں۔۔۔۔۔ اور کلی تم

جا رہی ہو۔“

”مجھے بھی رات ہی بتایا گیا ہے۔۔۔۔۔ صرف دو

دن کا کام ہے۔“

”دو دن کا ہو یا دو مہینے کا چھوڑ دو۔“

”صائم نے مجھے اس ایڈ کے لیے چھ ماہ پہلے

سائن کیا تھا۔۔۔۔۔ میں عین وقت پر انکار نہیں

کر سکتی۔۔۔۔۔ صائم سے میرے بہت اچھے تعلقات

ہیں۔۔۔۔۔ لیکن نے مجھے بتا دیا تھا کہ کچھ قری ڈی اے کیلش

کی وجہ سے کرشل لیٹ ہو جائے گا۔ انہوں نے مجھے

مت مانگا معاوضہ دیا ہے۔“

”وہ معاوضہ تم مجھ سے لے لو۔“

”بات پیسے کی ہے ہی نہیں صرف۔۔۔۔۔ میری

”کیا بہت پاگل بن کا نام نہیں؟“
 ”جس طرح کی حرکتیں تم کر رہی ہو
 انہیں برداشت کرنا پاگل بن ہے۔“

اس کا وجود..... ڈز نیل کی کرسی پر بیٹھا
 شائیں، شائیں کرنے لگا۔ ماہ زیب نے آنکھ اٹھا کر
 دیکھا..... لاور غضب ہو گیا..... وہ فانیو اسٹار ہوئی
 کے ہال میں ہر طرف استار تھا..... ماہ زیب کو....
 جھجھکی نے آیا۔

”تم بھی ابھی سے طعنہ دینے لگے ہو..... ابھی
 سے تمہاری بدداشت کی حد فتح ہو گئی ہے۔ میری
 تذلیل کرنے لگے ہو، ایک انٹرویو پینا کر تم مجھ پر
 نگرانی کرنے لگے ہو۔“
 ”محضت بھی ہے، تم سوچ لینا، جنہیں میں
 پتہ ہے ہو گیا.....“

”تم کون ہو.....؟“ ماہ زیب نے بہت نرمی
 سے پوچھا۔ زبان لنگ رہ گیا۔
 ”یو لو تم ہو کون..... پیسے کے علاوہ تمہارے
 پاس کیا ہے؟“

”شٹ اپ.....!“ اس شٹ اپ نے جیسے
 کوئی مہر لگا دی۔ ماہ زیب کی لکھے اسے دیکھ گئی۔
 ”میں ایک عورت ہوں زمان، میرے پاس
 دنیا کی ہر چیز ہے، اب مجھے مزید چڑی تو نہیں چاہیے
 ہوں گی ناں..... اور تمہارے پاس صرف چڑی
 ہیں..... تم میرے کسی کام کے نہیں ہو..... مجھے ابھی،
 ابھی اسی وقت یہ ادراک ہوا ہے کہ مجھے وہ انسان
 چاہیے جو ماہ زیب کو جانے، ماہ زیب کو سمجھے، جو کم از
 کم میرے لیے ایک وقت کا کھانا چھوڑ سکے، نہ کہ
 میری توہین کرے اور مجھے غلام اور جھوٹا جاہل
 کہتا ہے۔“ اس نے ابھی سے انگوٹھی اتار کر میز پر
 رکھی۔

”ابھی تم مجھے اسے پیارے نہیں ہونے کے

اندھڑی آپ کے ہی دم قدم سے قائم ہے تو وقت
 نکال کر اپنی غلط فہمی دور کر لیں..... تم مجھے اس سب
 سے متاثر نہیں کر سکتیں۔“

”میں نے یہ غلط فہمی پالی ہی نہیں تھی۔ ہاں یہ
 خوش فہمی ضرور رہی ہے کہ تم آگے بڑھنے میں میرا
 ساتھ دو گے..... تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں تھا
 میرے کام کرنے پر.....“

”اعتراض نہیں تھا جب تک یہ معطوم نہیں تھا
 کہ آف کیرا بھی تم ایک ”بیروش“ ہی ہو۔“

”میں اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہوں.....
 مجھے ایڈ کے لیے جانا ہے پاگل..... اس کا فیصلہ
 صرف مجھے کرنا ہے..... مجھے یاد ہے ابھی طرح سے
 کہ میں نے تمہارے ساتھ ٹھکنی کی ہے، ڈیل نہیں کہ
 جو تم کو مجھ میں وہی کروں گی..... ویسے تم نے مجھ
 سے ٹھکنی کی کیوں..... تم نے کہا تھا کہ تم مجھے بہت
 پسند کرتے ہو؟“

”اور میری پسندی کوئی دلیل نہیں ہے تجھ کے لیے
 نزدیک؟“

”دلیل نہ ہوتی تو ٹھکنی نہ کرتی۔“
 ”تمہیں تو احسان مند ہونا چاہیے نہ..... تم
 پیو ہو..... تمہاری بارہ سال کی ایک بیٹی ہے..... لاور
 میں سنگل کا سماج بڈز میں..... پاکستان میں تو
 تمہیں طلاق یافتہ ملتے بارہ دوسرے.....“ اس کا انداز
 بدترین ہو گیا۔

”یہ عورت ابھی پیو نہیں ہوئی ہے۔ جس وقت
 تم مجھے رنگ پرتا رہے تھے اور خاص کر اس وقت جس
 وقت تم مجھے کہہ رہے تھے کہ میں تمہاری زندگی کو مکمل
 کروں گی..... یہ عورت جب بھی پیو ہی
 تھی..... ادا کا رہی، بارہ سال بچی کی ماں بھی، تم نے کہا
 تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو، اب کیا ہوا؟“

”محبت کرتا ہوں، پاگل نہیں ہوں میں کہ یہ
 سب برداشت کرتا رہوں۔“

ختم ہو چکا ہوں..... میں آپ ہو چکا ہوں۔" وہ کرسی پر ہی جا رہی تھی۔ اٹھ کر جا ہی نہیں سکی تھی۔
"میں آپ ہو چکا ہوں۔" اب وہ پروہ کسٹن ہاؤس فون کر کے اس کے حلق جان رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اس گھر کی لوکل آبادی سے ڈرا دور سڑک پر کار کو پارک کیے کھڑی تھی۔ فون کر کے اس نے اسے وہاں آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ کار کی پشت سے ٹپک لگے کھڑی تھی۔ وہ اس کے پاس آیا تو بری طرح باپ رہا تھا۔ ماہ زریب نے اسے دیکھا تو دنگ سی رہ گئی وہ کسی مرضی بیماری کا مریض نظر آ رہا تھا۔
"اٹھ جا رہے ہیں؟" ماہ زریب کی آواز تیز ہوئی۔
"نہیں، ڈر رہا۔"

"کیا ہوا ہے؟"

اس نے نظریں اٹھا کر ماہ زریب کو دیکھا.....

تمہارے لیے میں ان سب کچھ برداشت کروں..... ہاں ابھی اتنے پیارے نہیں ہوئے۔"

"اچھا تو کون پیارا ہے تمہیں..... صاحبم؟"
"کون، کون، کون..... ہاں کون کی گویا فضا میں بکھری ماہ زریب جیسے ایک دم سے تیز روشنی کا شکار ہوئی۔ چھپوٹے ہنی ہنی کی لمبی جان بھینگی..... کسی کی ہاتھیں پاد آگیا۔"

"بھئی تو وہ آپ سے ناراض ہوگا..... آپ کو برا ثابت کرے گا، بھئی تو وہ آپ کو یاد کرنا بھول ہی جائے گا۔"

زمانہ فیسے سے اٹھ کر جا رہا تھا۔ انگلی اٹھا کر اس نے فیسے سے دور پھینک دی تھی، محبت کی نکتہ فی خاک نشین ہو چکی تھی۔ وہ زمان کی پشت کو گھور رہی تھی۔

"کسی اور کے ساتھ آپ..... میں اور تم" ہوں گی..... لیکن ماہ زریب میں آپ ہی آپ ہوں..... میں.....

طاہرہ امین

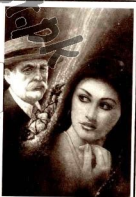
کے وہاں گھر سرائی تم کا چاہتا ہوں

ستاروں پر کمند

چاندنوں کو دروہام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے بھی کبھی بھول جاتی ہیں..... روزوں کو ریدنے والے اپنے حوصلے سے انہیں دہانہ بنا دیتے ہیں سن و شمع اور کرامت و رفعت کی چاشنی کے لیے ایک دلہن بادیہستان

سپیشل ڈائجسٹ
ماہنامہ

کے صفحات پڑھا، جولائی 2014ء سے ملاحظہ فرمائیں



اور ماہ زیب کچھ گئی۔ وہ ماہ زیب کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اب اس کی سانس بحال ہوئی ہو۔ اب اس کی چٹائی نے کام کرنا شروع کیا ہو۔ زندگی اس کی شریالوں میں اب دوڑی ہو۔

”تم جانتے ہو میں یہاں کیوں آئی ہوں؟“
”نہیں۔۔۔۔۔“

”اس پوری دنیا میں جس پہلے پورا غری مرد کو میں آزما رہا تھا اب وہ تم ہو۔ اب وہ تم ہو۔“
”وہ میں ہوں؟“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔

”میں تم سے محبت نہیں کرتی، چلے گا۔۔۔۔۔“
”چلے گا۔۔۔۔۔“ وہ مسکرائے لگا۔

”ہو سکتا ہے میں صرف تمہیں پسند کروں۔۔۔۔۔“
”صرف پسند۔۔۔۔۔ چلے گا؟“

”یہ بھی چلے گا۔۔۔۔۔“ اس کی آنکھوں میں خوشی سے نمی آئی۔

”ہو سکتا ہے میں تمہیں برداشت نہیں کر سکوں اور اپنی زندگی سے کبھی نکال باہر کروں۔۔۔۔۔ یہ چلے گا؟“

”ضرور چلے گا اگر میں ضرور چاہوں۔۔۔۔۔“ اس کے سارے وجود پر سیاہی پھیل گئی۔ اس کی جلیں لڑنے لگیں۔

ماہ زیب شدید گھبراہٹ کا دکھارہوئی جیسے اسے لگا اس نے بہت بڑی فٹکلی کی اس سے یہ بات کہہ کر۔

اسے خدا حافظ کہہ کر وہ جاری تھی اور سڑک پر کھڑا وہ اسے دور ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ پشت دکھانے والوں میں سے نہیں تھا۔

ماہ زیب نے اپنے گھر والوں سے پہلے بات کی۔۔۔۔۔ اس کی توقع کے عین مطابق اسے کافی کچھ سننے کو ملا۔۔۔۔۔ پہلے سب نے اس کا مذاق اڑایا پھر اسے پاگل کہنے لگے۔۔۔۔۔ ایک عرصے سے وہ اپنا لنگ

گھر لے کر رہی تھی۔ وہ احمد کو اپنے ساتھ لے جا کر لایا، پاپا سے ملوا لائی۔۔۔۔۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا اس کی کافی بے عزتی کی گئی۔۔۔۔۔ اس نے احمد کے ساتھ اپنی سچی کا اعلان کر دیا تو اس کے خاندان والے چپ سے ہو گئے اگر وہ شادی بھی ایسے ہی کرے گی تو ان کے لیے ایک نئی مصیبت آجائی۔۔۔۔۔

وہ کس۔ کس کے سوالوں کے جواب دیتے۔۔۔۔۔

”تم اتنی پاگل ہو جاؤ گی مجھے اندازہ نہیں تھا۔“
پاپا ایک بار پھر اسے سمجھانے لگے۔

”میں جانتی ہوں، میں اس کے ساتھ مطمئن رہوں گی۔“

”زمانہ سنی وقت گزر رہا ہے تمہاری۔۔۔۔۔ اپنی ضد چھوڑ دو۔“

”میں اس کا خاتمہ کر کال سہلانے والا۔۔۔۔۔ اب ایک اور چارہ مار رہے تھے؟“

”میرے ہر ٹکڑے کو تیرے دے رہی ہو؟“
”میں نے وہ پتھر اتار پھینکا ہے جو زمان نے مجھے دیا تھا۔“

”زمانہ نہ کبھی کسی اور سے۔۔۔۔۔“
”میں نے فیصلہ کر لیا ہے پاپا۔۔۔۔۔ مجھے میرا فیصلہ آزما لینے دیں۔“

”گھانے میں رہو گی۔“
”ہمیشہ فائدے میں رہی ہوں، گھانے میں رہ کر بھی دیکھ لیتی ہوں۔“

”وہ تمہاری دولت کے لیے۔۔۔۔۔“
”مگر میرے نام ہے۔۔۔۔۔ جینک اکاؤنٹ بھی۔۔۔۔۔“

”اس نے کیسے تمہیں اپنے دام میں پھنسا لیا۔ حیثیت کیا ہے اس کی۔۔۔۔۔ اس کا گھر دیکھا ہے؟ ایک بار جا کر دیکھ تو آؤ۔“

”وہ مجھے لے گیا تھا اپنے گھر والوں سے ملوانے۔۔۔۔۔ سادہ سے لوگ ہیں بھی۔“

”اسنے ہی سادہ ہیں کہ تمہیں اپنے قابو میں کر لیا۔“

”میں نکاح کرتا چاہتی ہوں..... آپ مان جائیں..... ورنہ دو ہفتے بعد یہ کام ویسے بھی ہو ہی جائے گا۔“

وہ لب بھیج کر رہ گئے۔

ایک ہفتے بعد ماہ زیب کے آبائی گھر اس کی بہنوں اور ان کے خاندان والوں کی موجودگی میں اس کا نکاح ہو گیا..... وہ لوگ میڈیا پر کوئی تازہ کاری نہیں چاہتے تھے اس لیے اس کا نکاح اپنی موجودگی میں کروایا..... دل بٹے صحافیوں نے اس نکاح پر کڑے تبصیریں دیں۔ چند ہفتے اندر ہی میں اسے خوب فیسکس کیا جاتا رہا..... پھر ماہ زیب کے ساتھ احمد کو بچنے کے سبب عادی ہو گئے۔

ماہ زیب کے خاندان والے اس سے ناراض تھے اور سب نے ماہ زیب سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ شانزے بھی اپنے نانا، نانی کی گھر ہی گئی اسے اتنا معلوم تھا کہ اس کی ماما نے کسی گندے سے تعلق کو اس کا باپ بنا دیا ہے۔ اس کی والدہ توں نے بھی اس سے ایسی باتیں کہیں کہ اس نے کیا دن ٹھیک ٹھاک ہنگامہ برپا کر رکھا..... ماہ زیب نے اسے ہر طرح سے مٹانا چاہا لیکن وہ ٹھیک مانی..... پھر اسے اس نے نانا، نانی کے پاس ہی چند ہفتے رہنے دیا..... یہ اور برا ہوا..... اس کے ماموں اور خالائوں نے اسے مکمل طور پر احمد سے باقی کر دیا۔

احمد نے اسے شادی پر چند لاکھ دیے تھے کہ وہ اپنی مرضی کا بیوی بنوے..... اس نے اپنے اکاؤنٹ کو اس کے ساتھ جو اکاؤنٹ کر لیا تھا۔ وہ لاکھوں نہیں کماتا تھا لیکن جتنے ہزار بھی کماتا تھا وہ لاکھ ماہ زیب کو دیتا تھا۔ وہ ماہ زیب کے ساتھ اسی کے گھر میں رہ رہا تھا کیونکہ ماہ زیب اس کے ساتھ اس کے آبائی گھر میں نہیں رہ سکتی تھی۔

وہ اس کے ساتھ اس کی شوہر کی پارٹیز میں نہیں جاتا تھا کیونکہ ماہ زیب کو اب بھی لوگوں کے نظر سننے پڑتے کہ اس نے اپنی عمر سے چند سال چھوٹے اور ایک معمولی سے شخص کے ساتھ شادی کر لی تھی۔

ماہ زیب کو اس معمولی سے انسان نے فی الحال بڑے سکھ میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے کوئی بچہ نہ تھا نہیں تھی، وہ کب آتی ہے کب جاتی ہے، وقت پر ڈنر کے لیے کیوں نہیں آتی، کوئی اس پر دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ احمد صبح جلدی اٹھتا، اپنی گھرانی میں گھری میٹھی کر دیتا..... ماہ زیب کے لیے صحت بخش ناشتے کی تیاری مکمل کر دیا کر آفٹس چلا جاتا، شام کو گھر آ کر وہ رات کے کھانے کی تیاری دیکھتا..... اور پھر اپنی موٹر سائیکل پر ماہ زیب کے پیٹ پر بیٹھ جاتا..... وہ رات کو ایک بجے جاگ بیدار ہوتی یا دو بجے وہ میٹ پر ہی موجود ہوتا..... وہ اسے اسکرپٹ یاد کرواتا..... گھر سے اس کے لیے جو اسٹیکس وغیرہ بخا کر لے گیا ہوتا اسے کھانے کے لیے دیتا رہتا..... میٹ پر موجود لوگ پہلے اس کا مذاق اڑاتے تھے پھر وہ اس عزت کرنے لگے۔ ماہ زیب کے سامنے پہلے اسے طرہ اور حضرات نظروں سے گزرتے..... پھر وہ جیسے اس کے ہڈ نہ محبت کے ہونے لگے..... ایک سامی اداکارہ جو احمد سے اس کی شادی کے حوالے سے کئی طفر کر چکی تھی ایک دن رشتہ سے اسے دیکھنے لگی۔

”پہلے مجھے لگا..... کہتا تھا کہ تم صرف شہرت کے اعتبار سے خوش قسمت ہو..... تم جس سیریل میں کام کرتی ہو وہ سیریل ہوتا ہے..... اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ تم زندگی کے ہر معاملے میں خوش قسمت ترین ہو..... میرا شوہر میری اداکاری کو اپنی جوتی کی لوک پر دیکھتا ہے اور رات کے اس وقت وہ حڑے سے اپنے بند پر سوراہا ہو گیا جانے بغیر کہ اس کی بیوی اس وقت شہر کے کس حصے میں کیا کر رہی

ہے..... اور یہ احمد..... یہ کیسے تمہارے ساتھ، ساتھ رہتا ہے، کیا یہ نہیں سمجھتا.....؟ کیا اسے خند نہیں آتی..... کیا اسے آرام پوارا نہیں؟“

ماہ زیب نے کمرے کے بچے کرسی پر بیٹھے احمد کو دیکھا اور اسے احساس ہوا کہ اس کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔

اگر وہ جھکی ہوتی تو وہ اس کے بھر بھی دبا دیتا..... نیم گرم پانی کا ب لانا اور اسے صبر ڈیونے کے لیے کہتا..... اپنی مگرانی میں وہ ماہ زیب کے سارے کام خود کرتا بھی اور کرواتا بھی..... اس کی وارڈ روپ ٹھیک کرتا..... اس کے جوتے اٹھا کر رکھتا..... جو چوہاری وہ آتے ہی اتار کر پیچک دیتی اسے سیلیطے سے سینٹا..... اس کا تکیہ دیکھتا کہ کیا وہ ہمیشہ کی طرح نرم ہے..... یا اسے تھوڑا کیا جانا چاہیے..... اپنی مگرانی میں اس کے لیے کھانے دھواتا۔

ماہ زیب مکمل طور پر مگرے انہماں ہو گئی..... مگر مکمل طور پر احمد نے سنبھال لیا تھا..... ملازموں کے مسائل..... بڑ..... گرمی..... سب.....

ماہ زیب کو کام کرنے کے لیے ایک مکمل غیر مل گیا..... مگر آتے ہی وہ سوچتی احمد زیب کو سوئی ہوئی احمد کسی ملازم کو اس کے کمرے کے باہر سے گزرنے تک نہ دیتا کہ مہاوادہ قدموں کی آہٹ سے اٹھ جائے۔

شانزے مگر آج بھی تھی اور وہ اکثر کوئی نہ کوئی ہنگامہ کرتی تھی وہ احمد کو برا بھلا کہتی اس پر چیزیں اٹھا، اٹھا کر دھکتی..... اس نے کئی بار اس پر گرم دودھ بھی پھینکا اور یہ سب باتیں ماہ زیب کو ملازموں سے معلوم ہوتی تھیں۔

”شانزے بچی ہے احمد وہ سمجھ جائے گی، میں اس کی طرف سے سوری کرتی ہوں تم سے۔“

”وہ ہمیری بھی بچی ہے..... تم سوری کر کے یہ

ثابت مت کرو کہ وہ صرف تمہاری ہی بچی ہے۔“

احمد نے لاکھ طریقے آزمائے لیکن شانزے اسے برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ اسے گھبرا آؤی کہا کرتی۔ برا بھلا کہتی، وہ سمجھتی تھی کہ وہ تھیک کر رہی ہے، ماہ زیب نے اسے کئی بار بکھایا مگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

لیکن شانزے نے احمد کی زندگی ابھرن کیے رکھی..... ماہ زیب مگر ہوتی تو وہ کم ہنگامہ کرتی ورنہ یہاں، یہاں سے احمد کو رنج کیے رکھتی۔ اس کے لاکھ شور مچانے پر بھی وہی اسے اسکول ڈراپ کرتا اور لے کر جاتا مگر ملازموں کو سختی سے منع تھا کہ وہ گھر کے اندر نہیں جائیں گے۔ ایک گل وٹنی ملازمہ شانزے سے کہیں اس پاس ہی رہتی..... شانزے اسے باب نہیں سمجھتی لیکن وہ اسے بچی ہی مانتا تھا۔ ایک سال کے اندر ماہ زیب کے بہن، بھائی اور والدین کی نہ کسی طرح احمد سے حشر ہونے لگے تھے، ان تک احمد کے متعلق اچھی خبریں پہنچی تھیں۔ احمد کے آباؤی گھر کے دو بھائیوں اور ایک بہن میں حصے ہوئے تو اس نے اپنے حصے کے چند لاکھ بھی ماہ زیب کو دے دیے۔ شادی کی سالگرہ کے چھپے کے لیے اس نے اوور ٹائم کیا تھا..... اور اس نے ایک بیش قیمت سازی اور پر نجوم..... ماہ زیب کو گفت کیا تھا۔

ڈائریکٹر اور پروڈیوسرز کو اب ماہ زیب کے بھائے احمد سے رابطہ کرنا ہوتا تھا کہ وہ اسے اسکرپٹ بھیج دیتے تھے، مگر آ کر اس سے مل لینے تھے وہ پوری توجہ سے ان کے پراجیکٹ کے بارے میں سنتا ایک ایک تفصیل پوچھتا..... اور اگر اسے پراجیکٹ کسی قابل لگتا تو وہ ماہ زیب کو بتا دیتا..... اس کا اس معاملے میں تجربہ اتنا وسیع تھا کہ وہ ماہ زیب کو بتا دیتا کہ وہ کون سا ڈراما کمرہ ملی بنیاد پر کتنا کامیاب ہوگا اور کون سا صرف پر تقدیر میں..... آنے والے وقت

ہم رچ میں ہی کھڑی تھی اور مینے میں ایک دو بار جب وہ دُور کے لیے جاتے وہ اسے تھپکاتا کرتا۔

اس کے بارے میں سوچے گئے سب خیالات
 غلط نکلے۔ کچے گئے سب دعوے جھوٹے نکلے۔
 اسے صرف باہر زب چاہیے تھی۔ اور اس کے ساتھ
 گزاری جانے والی وہ زندگی چاہیے تھی جو اسے مل گئی۔
 اب بھی اگر وہ چیزوں سے جب بھرتا تو خالی دل رہ
 جاتا۔

اے یوں کے بعد شانزے امریکا چلی گئی حریہ
تعلیم حاصل کرنے..... اس دورے میں ان کی
زندگی خوارانہ و فحش ہو گئی۔ احمد کی پرورش ہو گئی
جس اور اس کی بڑھ گئی۔

اور وہ نے تین آدھ سو روپے بھی کر لیں۔ جس کا اس کی شہرت ملک سے باہر جا چکی..... وہ پہلے سے زیادہ مصروف ہو گئی۔ اس کے غیر ملکی دورے بڑھ گئے..... جب وہ بیرونی ملک جاتی تو امریکی جیسے مٹھی میں جان دیتی۔ اسے یہی فکر ستانے رہتی کہ وہاں اس کا خیال کون رکھے گا۔ وہ اس کا سامان پیک کرتا اور اس کا وہ کچے ضرور سامان میں رکھتا جس کے بغیر اس کا سفر نہ کئے لگتا تھا۔

ایسا عجیبی نہیں ہوا تھا کہ وہ ملک سے باہر ہو اور اس نے اسے فون کر کے کہا ہو کہ اس کی خاں چیز تو سامان میں آئی ہی نہیں۔

وہ اکثر اسے ساتھ چلنے کے لیے گنتی بھی پڑی۔
صرف اپنے خرچ پر جانا چاہتا تھا اور اپنے خرچ پر وہ
صرف وہ بار اس کے ساتھ دینی چاہتا تھا۔
وہ ایک شخص تھا۔
وہ ایک شاگردِ رسالت تھا۔

میں نے تیس ایک دن ماہ زیب کے سب گھر والے ان کے ساتھ ڈنر کرتے اور احمد کے گھر والے بھی آ جاتے..... وہ ایک اچھا میزبان تھا اور سب کو

میں ماؤز پر صرف اس سے اکتانچ بچتی۔ "کروں یا نہیں....."

وہ کہہ دیتا..... کرلو..... یار سبک ہے..... زیادہ
پاپور نہیں ہوگا؟ اور ماہ زیب اس کی رائے کے
ساتھ ہی چلتی۔ پروڈیوسر کو صرف احمد کو کال کرنا
ہوتا۔

ابھو کو اس کے ہر پراجیکٹ کی ہر تفصیل ازبر ہوتی۔ تاریخیں یاد رکھیں، وہ اخبارات، میگزینز میں اس پر آنے والی خبریں اور تبصرے کاٹ، کاٹ کر ان کا اکٹم بناتا رہتا اور قارئین وقت میں انھیں لے کر بیٹھ جاتا..... وہ ماہ ذیہب سے ملنے آنے والے صحافیوں، انٹرنی کے دوسرے لوگوں کی پاکمال سیر بائی کرتا..... اس نے ماہ ذیہب کی زندگی کی اتنی سہل یاد دی کہ ماہ ذیہب کو لگتا وہ صرف دنیا میں راج کرتے آتی سے دنیا کی وقت کے۔

اس کے ماں، باپ، بہن، بھائی گم ہو گئے تھے، وہ احمد کو پہنچا کرنے لگے تھے۔ احمد صاحب کے باپا نے کہا کہ احمد کو کوئی کاروبار کروادیں یا کسی ایسی ایسی ہوسٹ پر کسی کمپنی میں رکھوادیں لیکن اس نے انکار کر دیا۔

جو یہ کہ شہر نے اس بلا چاہے میں بھی
دوسری شادی کر لی تھی اور وہاں ریب کو بتائی تھی کہ
زندگی میں ایک وفا دار انسان کی ضرورت کس قدر
شدید ہے۔

ماہ زیب کو فنی آتی تھی جب وہ ساحلی
 اوداکاروں کے شوہروں کے اظہار کی خبریں
 پڑھتی تھیں۔ اسے ایسا کوئی دارقائد تشویش..... احمد
 اس کی دولت کے چھپے تھانہ اس کی شہرت کے.....
 اس کی دولت کا وہ رنکولا تھا اور شہرت پر خوش.....
 اپنے اخراجات وہ خود پرے کرتا تھا۔ اپنے آئین
 بھی وہ انجی مولر سائیکل پر تعلق جاتا تھا۔ ماہ زیب نے
 اسے اس کی سالگرہ پر کارکنٹ کی تھی پر وہ گھر کے

غرض رکھنا جانتا تھا۔

اور بے ہوش ہو جاتی..... اس کی حالت تشویش ناک تھی..... وہ کونے میں تھی، سر پر گہری چوٹ آئی تھی۔

”جنگ تاقا احمد یہ سب تم نے کیا ہے؟“

احمد تنگ اسے دیکھے گیا۔

”ماہر زیب تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو؟“

”انسان کا کیا اعتبار ہے احمد، وہ بھی بھی بدل سکتا ہے۔“

”میں عام انسان نہیں، احمد ہوں..... تمہارا شوہر شانزے کا باپ.....“

”نہ وہ نہیں اپنا باپ سمجھتی ہے، نہ تم اس کے باپ ہو۔“

”اور تم؟ تم کیا سمجھتی ہو؟“ اسے ایک شاک لگا۔

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

”میں صرف.....“

اسنے سارے غرض پاش افراد میں صرف شانزے ہی تھی جو اب بھی ویسی ہی تھی..... وہ جب، جب پاکستان آئی احمد کی زندگی جہنم بنا دی۔

شانزے نے اپنے نکاس فیلو افراد میں سے مصلحتی کر لی تھی۔ اور مصلحتی کے نقشہ کش کے دوران اس نے ہزاروں افراد کی موجودگی میں احمد کو وہاں سے چلے جانے کے لیے کہا..... وہ خاموشی سے چلا گیا اور جب اگلے دن آیا تو جیسے بھولی ہی چکا تھا کہ کل رات کچھ ہوا تھا۔ پھر شانزے تعلیم سے فارغ ہو کر آگئی اور اس کی شادی کی تیاریاں کی جانے لگیں..... اور اس کے ساتھ ہی آئے دن سنے سے نئے واقعات ہوتے۔

”آپ کے شوہر نے مجھ پر جانے کراوی ہے.....“ ایک دن وہ اس کے پاس اپنا جلا ہوا ہاتھ لے کر آئی۔

”تم ایسی بچکانہ حرکتوں پر بھی اترا آتی ہو۔“

”یہی کہا تھا..... مسز احمد نے..... کہ کوئی بھری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ اور دیکھیں یہی ہوتا ہے..... انہوں نے مجھے جلا دیا.....“

”اچھا بارود پھر آئی اس نے کیا کیا؟“ اس کا گھا دبانے کی کوشش کی تھی۔ ”شانزے..... پھر بری طرح سے رو رہی تھی اور یہی کہہ رہی تھی کہ وہ جانتی ہے اس کی بات کا یقین نہیں کیا جائے گا اسی لیے وہ سب کر رہا ہے۔“

”اچھا بار اس نے کہا کہ احمد نے اسے بیڑیوں سے دھکا دیا ہے..... مگر کے ملازموں نے اسے بیڑیوں کے پاس بے ہوش کرے چڑے دیکھا تھا اور اس کی پیشانی سے خون نکل رہا تھا جبکہ احمد مگر کی مرمت کا ٹھوس اہمیت کام کر رہا تھا۔“

”افراسیاب کو خبر ہوئی تو اس نے احمد کا آکر مگر بیان پکڑ لیا..... شانزے بار، بار ہوش میں آتی

عید پر گزنا

روپیہ چاہے کتنا ہی گر جائے مگر اتنا نہیں
گر سکتا جتنا کہ ایک انسان اللہ واحد حاصل
کرنے کے لیے کر جاتا ہے اور عید کے موقع پر
زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے لیے
کتنے لوگ کہاں تک گر جاتے ہیں اس کا انہیں
شاید اندازہ تک نہیں ہوتا۔

مرسلہ: ایضہ علیہ وسلم انوالی

کنہا میتھا

بیوی: ”آج کوئی ایسی بات کہو کہ میں
خوش بھی ہو جاؤں اور محل بھی جاؤں۔“

شوہر: ”تم میری زندگی بھلاؤ۔“

بیوی: ”اور..... اور کیا؟“

شوہر: ”اور لعنت ہے ایسی زندگی پر۔“

التجا

اے خوش رہنے والے لوگو!

خوشیوں کی سوغات سے ہم کو

تھوڑا سا بکھو دان کرو گے

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

عید آتی ہے

ہاتھوں میں مہندی

ماٹھے پر بند لگا لی ہے

ستونکی میوہ آئی ہے

بڑھی ہے آنکھوں کی نمی میری

اور یاد بھی کسی کی آتی ہے

ستونکی میوہ آئی ہے

شاعرہ: شاکا جالا، بھولال

اس کے ساتھ..... ”ماہ زیب بولتی رہی اور وہ کھڑا
سنتار پا۔“

”ہاں میں نے ہی اسے گرایا تھا ماہ زیب۔“ یہ
آخری بات اس نے کی اور وہ چلا گیا..... بارہ
سالوں میں بیکہ پار اس نے گھر سے باہر رات
گزاری..... ماہ زیب پھر سے شانزے کے پاس گئی
اس سے پوچھا..... اس کا بچہ کہا تھا کہ احمد نے ہی
اسے دھکا دیا تھا۔ وہ رو رو کر بکی بکیتی رہی کہ احمد
اسے مار ڈالے گا۔

ایک بیٹے کے اندر، اندر احمد نے اسے اپنے
باہر جانے کا قصد یہ دے دیا۔ اس کا پروڈوکشن ہاؤس
اسے کافی عرصے سے چند کورسز کے لیے لندن بھیجتا
چاہ رہا تھا لیکن وہ نہیں گیا تھا اور اب وہ جا رہا تھا۔
وہ جا رہا تھا۔

ایک سردی لہر ماہ زیب کے اندر دوڑ گئی۔
”تو یہ بھی جا رہا ہے..... اتنا کچھ کہے.....
خود ہی جا رہا ہے۔“

وہ اچٹال گیا..... اس نے شانزے سے معافی
مانگی تھی۔ شانزے نے چٹخا، چٹخا، شرم سے کہہ دیا تھا۔
وہ خاموشی سے واپس پلٹ گیا اور ایک نئے بعد وہ چلا
گیا۔

شانزے مگر آئی اپنی شادی کی تیاریاں کرنے
لگی۔

احمد روز ماہ زیب کو فون کرتا..... لیکن ماہ زیب
انہی سرد مہر ہوتی ہو گئی کہ احمد کو اپنی فون کاٹر کے
دور ایسے کم کرنے پڑتے۔

ماہ زیب جو اب تک اپنی پوجا کرداتی رہی تھی
کی اتنا کوٹھیں لگی تھی۔ کوئی اسے پشت دھکا کر کیسے
جا سکتا ہے۔

وہ جو کہتا ہے کہ وہ تمہارے بغیر مر جائے گا.....
پھر بھی وہ زندہ ہے، پھر وہ مرنے کیوں نہیں.....؟ مرنے
دکھائے ہیں۔

اختلاف رکھتے ہوئے بھی ٹھہرا نہ کرنے والا.....
 ٹھیک ہو کر بھی خود کو غلط مان لینے والا..... میرا مسٹر
 آپ کے مسز جیسا کیوں نہیں۔ وہ شادی سے پہلے تو
 مسز احمد جیسا تھا، شادی کے بعد وہ مسز احمد جیسا
 کیوں نہیں رہا۔" وہ رو رہی تھی اس کا زیاں ہوا تھا،
 کیوں نہ روئی..... گرم سیال نے دیوی کا ہات توڑ
 ڈالا..... اندر ایک دل دھڑکنے لگا..... وہ مستحضر
 اپنی بیٹی کو دیکھ گئی۔ اس کی بیٹی کا اینڈ میل احمد
 تھا..... اسے احمد جیسے مرد چاہے تھا۔
 "ٹھیک ہو کر بھی خود کو غلط مان لینے والا۔"

"میں کب سے ایک مہینے سے یہاں آ سکی
 ہوں ماما..... سارے کام کرتی ہوں..... مارکیٹ
 چاتی ہوں..... مجھے اس حالت میں چھوڑ کر
 افراسیاب آ کر طے چلا گیا، اس کے گھر والے بھی
 ناراض ہیں، کچے ہیں میں افراسیاب کا خیال
 نہیں رکھتی..... ماما دیکھیے میرے سر..... یہ بہت
 درد کرتے ہیں..... یاد ہے مسز احمد آپ کے
 جیروں کا مساج کیا کرتے تھے..... اور وہ آپ کا
 نکلے جو وہ ہمیشہ باہر کے نورز میں آپ کے سامان
 میں بیک کیا کرتے تھے۔ ماما میں نے ایک رات
 افراسیاب کو اٹھا کر کہا کہ وہ دوسرے بیڈروم سے
 مجھے دو ٹکے لا دیں۔ میری کمر میں درد ہے۔ میں
 انہیں کمر کے پیچھے رکھنا چاہتی ہوں تو جانتی ہیں اس
 نے کیا کہا..... اس نے کہا میں اپنی ہائے ہانے سے
 اسے ڈسٹرب کر رہی ہوں اور میں دوسرے بیڈ
 روم میں جا کر سوؤں....." وہ ہلک رہی تھی۔

"ماما! میں ساری، ساری رات جاگتی رہتی تھی،
 مجھے حسی ہوتی تھی اور افراسیاب حے سے سوتا رہتا
 تھا۔ وہ اٹھ کر مجھے ایک گلاس پانی تک نہیں پلاتا
 تھا..... انا وہ مجھ پر آ کر چلاتا تھا کہ میں نے کھانا
 کیوں نہیں پکایا..... بیڈ روم ٹھیک سے صاف کیوں
 نہیں کیا۔ ماما اس نے مجھے دھوکا دیا..... وہ جھوٹا

ایسے ہی خاموش، خاموش سی رہی..... پہلے سی
 شائزے نہیں کھو گئی۔
 "افراسیاب کا فون کب آتا ہے؟"
 "وہ رات میں کرتا ہے مجھے....."
 "رات میں کس وقت.....؟"
 "کل رات بھی آیا تھا آپ سو رہی تھیں۔"
 "تم جھوٹ بول رہی ہو..... مجھے بتاؤ کیا ہوا
 ہے..... تم دونوں میں لڑائی ہوئی ہے کیا.....؟"
 "نہیں..... ہم میں بھی لڑائی نہیں ہوئی۔"
 "اس نے مجھے بھی فون نہیں کیا، نہ ہی میرا فون
 اٹھا رہا ہے۔"

"ماما وہ بڑی ہوتا ہے۔"
 "اس کے گھر والے بھی تو اسی شہر میں ہوتے
 ہیں، وہ ان میں سے کسی ایک کو تھارے پاس کیوں
 نہیں چھوڑ گیا..... میں تو مطمئن تھی کہ تھاری ساری
 رسال یہاں ہے..... اور تم یوں آ سکی..... آگے کوئی
 اختلاف ہے تھارے درمیان تو بتاؤ..... میں بات
 کرتی ہوں افراسیاب سے۔"
 "کوئی اختلاف نہیں ہے، ہمارے درمیان وہ
 مجھے بہت چار کرتا ہے، میرا بہت خیال رکھتا ہے
 بالکل مسز احمد کی طرح۔"

ماہ زیب شا کڑ سی ہوئی، اپنی بیٹی کا منہ دیکھنے
 لگی..... اس نے احمد کا نام لیا تھا..... وہ احمد کی خوبی
 بیان کر رہی تھی۔ اور پھر وہ ہاتھوں میں منہ رکھ کر
 روئی ہی رہی.....

"ماما! میری قسمت آپ بھی کیوں نہیں.....
 میرا مسٹر آپ کے مسز جیسا کیوں نہیں....." وہ ایک
 دم پٹی۔

ماہ زیب کے وجود پر جیسے گرم گرم سیال گرا۔
 "میں نے افراسیاب کا انتخاب کیا تھا.....
 صرف اس لیے کہ وہ آپ کے شوہر کی طرح لگتا تھا
 مجھے..... خیال رکھنے والا..... محبت کرنے والا.....

اب ماہ زیب، شانزے کی شکل دیکھنے لگی۔ اس کی بیٹی احمد جیسا نہ ملنے پر کونجی لگی، درود ہی لگی اور وہ احمد کو کھوکھو کر کھینچ لگی۔

ماہ زیب کے دل میں نہیں کی ایک حیرت لہر اٹھی..... اسنے سالوں میں اس نے احمد کو صرف پسند کیا تھا جیسے کسی اچھے وقار ملازم کو کیا جاتا ہے، وہی ملازم کہیں دور چلا جائے تو اسے یاد بھی کیا جاتا ہے تو صرف کام کے لیے وقار داری کے لیے اور بس.....

بیٹھے، بیٹھے ماہ زیب بخود بخود ہرگز نہیں ہوس ہوئی۔

..... خالی پلٹ آنے پر یہ صدا کی ضرورت ہوتی ہے..... چٹا کن کا دیا پریم کو..... کی کو..... لگتا ہے۔

ماہ زیب کھڑکی کے پاس رات کے آخری پہر کھڑکی کی اب وہ دہائی تھی ہے..... اب اس نے اپنا بت توڑا ہے۔ اب اس کا وجود وہ پائرسی بنا ہے جو بچا، بچا کے سر بکھیرتا ہے۔ صبح ہوتے ہی اس نے شانزے کو آگاہ کیا۔

”میں لندن جا رہی ہوں..... احمد کو ساتھ لے کر آؤں گی۔“ اور جب رات اس نے احمد کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی اور احمد باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ تو برسوں کا مرلیض ہے جسے وہ دیکھ رہی ہے وہ اس کا احمد تو نہیں.....

اس پر نظر پڑتے ہی احمد کے وجود میں دم توڑنے لگی، پچھلی پچھلی نام کے دے مل اٹھے۔

”تم آئیں.....؟“ اس کی آواز کا پ رہی تھی۔

”ہاں..... اب بھی نہ آتی تو مر جاتی.....“ وہ رونے لگی تھی۔

ہے۔ اس کے سارے دھڑے جھولنے لگے..... وہ مسٹر احمد جیسا بالکل نہیں ہے۔ میں نے اس کی منبت کی کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جائے تو وہ بھڑک اٹھا..... وہ جلاوہ بات، بات پر بھڑک اٹھتا ہے۔ اہتوں ناراض رہتا ہے..... ہر بار میں ہی اسے مناتی ہوں..... میں اسے آخر پلٹا فون کرتی ہوں اور وہ فون ہی نہیں اٹھاتا..... مادامیری قسمت آپ بھی کیوں نہیں..... آپ میں ایسا کیا ہے کہ آپ کو مسٹر احمد ملے..... مجھ میں کیا کیا ہے کہ مجھے افراسیاب ملا.....؟“

ماہ زیب کو سمجھ آگئی تھی کہ شانزے اتنی کمزور کیوں ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں اندر ہی اندر کیوں گزرتی جا رہی تھیں..... شانزے نے احمد کو سوتیلے باپ کی حیثیت سے سخت ناپسند کرتی تھی لیکن اپنی ماں کے شوہر کی حیثیت سے وہ اسے ہی آہیلہ بالانظر کرتی تھی..... وہ احمد جیسے شوہر کو مصروفی رہی اور۔

ماہ زیب نے خود اسے اپنے ہاتھوں کھو دیا۔

”مجھے آپ کے مسٹر کی بد دعا لگ گئی ہے۔ ہاں انہی کی لگی ہے۔“

”وہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں شانزے۔“

”لیکن میں نے ان کے ساتھ کیا، کیا.....

میں نے بہت ہمت کی کہ آپ کو فون کر کے بتا دوں لیکن ماما..... میرے بھی لڑکیاں اگر جلد شرمندہ ہو بھی جائیں تو اعتراف نہیں کرئیں.....

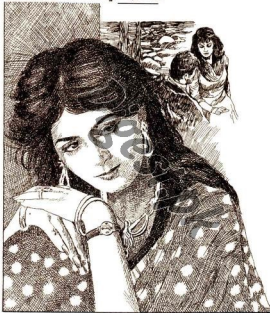
میرے بھی باپ، ماما لڑکیاں دنیا کو اپنی شو کروں پر رکھنے والی غلطی کا اعتراف انٹینس دیکھ کر کرتی ہیں..... میز جیوں سے میرا پھر پھسل گیا تھا اور ہوش

میں آتے ہی میں نے آپ کے مسٹر کا نام لے دیا تھا۔ انہوں نے مجھے بھی کوئی قصاص نہیں پہنچایا تھا..... میں اندر ہی اندر ان سے بہت حسد کرتی تھی خود آپ سے بھی..... میں چاہتی تھی کہ آپ

الگ ہو جائیں.....“

تجدیدِ محبت

شائستہ مسرور



ہوئی تھیں۔ اسے دو بچے کا انتظار تھا۔
 جو انہی دو بچے سو بائیں کی لائٹ آن ہوئی، اس
 کی آنکھوں سے نیند ہوا ہوگی۔ وہ چوری طرح اس
 طرف متوجہ ہو گیا۔

ذکا نے پندرہ سیاتی آنکھوں سے سو بائیں میں
 وقت دیکھا..... رات کے دو بجنے والے تھے۔ اسے
 بہت زوروں کی نیند آرہی تھی۔ بھائیوں لے، لے
 کر اس کا برا حال تھا مگر اس کی نظریں سو بائیں پر جمی

اندراجہ دی آئے گی تو تمہاری تحریر میں بھی یہ رنگ نمایاں ہوگا اور میں تمہیں خوش باش، مطمئن، زندگی سے بھرپور مدد دیکھنا چاہتی ہوں۔ اچھا شب بخیر..... میرا شوہر کروٹیں بدل رہا ہے۔" اس نے جلدی سے لکھ کر موبائل آف کر دیا۔

ڈکا دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ اس کی روز کی کہانی ہو چکی تھی۔ اس نے مڑ کر اپنے برابر میں سوئی زہرا کو دیکھا وہ نیند میں کسمپرسی تھی۔ اسے بھی زوروں کی نیند آ رہی تھی، اس نے چار منٹ تک تان لی۔

اس کے ذہن میں ایک ہی بات چل رہی تھی۔ "میرا ریشہ شرت بہن کر جاتا ہے۔"

☆☆☆

صبح وہ الماری کے آگے کھڑا سارے کپڑے والٹ بلیٹ کر کے نکالے، ہاتھ مگر ہمال ہے جو کوئی شوش رنگین کی باہر شرت برآء ہو جاتی۔

زہرا چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی اور اسے چل سارے الماری کے کپڑے گرائے کھڑا دیکھ کر حیران ہی ہوئی۔

"یہ کیا میج، صبح صبحی بے کھڑے ہو، اب دفتر سے دیر نہیں ہو رہی؟" کمر پر ہاتھ رکھ کر سختی انداز سے مہاس کو گھورتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"تین دن سے ایک ہی جوتہ پہن کر رہا ہوں، کیا مجال ہے جو کوئی ڈھنگ کے کپڑے میرے پاس ہوں۔ سارے ہی بد رنگ، بد وضع سالوں پرانے کپڑے، لال رنگ کی کوئی شرت نہیں ہے کیا؟"

"لال رنگ؟ کیا شر بالا بنے جا رہے ہو؟" زہرا کی آنکھیں حیرت سے پھٹیں۔

"افوہ..... تم سے تو بات کرنا بھی فضول ہے، دیکھو اگر رضا کی کوئی فی شرت ہو تو لے کر آؤ، آج میرا موڈ ہے ذرا میسج کرنے کا..... رہی نہ ہو تو پنک لے آؤ اور ہاں اس کے جوگر بھی لیٹی آنا، میرے

"سو تو نہیں گئے تھے؟" دوسری طرف سے وہ بچہ چوری چھپی، روزانہ کا سوال..... اس نے بھی روز والا ہی جواب دیا۔

"نہیں..... تو..... تمہارے مسجج کا انتظار کر رہا تھا۔"

"تمہاری بیوی بے خبر سو رہی ہوگی تم پر اندھا اعتماد کر کے..... کیوں.....؟" وہ تھوڑا شوش ہوئی۔

"ہاں، بیوی جو ہے۔" اس نے بھی چپا کھا جواب دیا۔

"آج کا دن کیسا گزر رہا.....؟ اچھا..... میرا یا بہت میرا.....؟" وہ یہ سوال بھی روز ضرور پوچھتی تھی۔

"آہ..... کیسا گزر رہا ہے غریب مزدور کا دن..... وہ ہی رکھا پیکا، بے حرہ..... بیوی کی طرح....." اس کے جواب پر وہ دل کھول کر ہنسی۔

"ہا..... ہا.....، ابھی تم پورے شوہر جیتے ہو، مسکین، معصوم اور بے زبان۔ اچھا یہ ہوا؟"

آفس کیا بہن کر جاؤ گے؟" آج کا سوال نیا تھا۔

ڈکا کی انگلیاں تیزی سے چلنے لگیں۔

"مزدور شوہر کے پاس وہی شیں چار جوتے ہیں، ان میں سے ہی کوئی پہن جاؤں گا۔ میں نے کون سا محبوبہ سے ملے جاتا ہے جو بہن سنو کر جاؤں گا۔"

"تمہارے پاس کوئی ریڈ (سرخ) فی شرت ہے؟ کل وہ پہن کر جاؤ، ہو سکے تو چار گرڈ بھی پہن لینا اور ہاں پر فیمو لگانا نہیں بھولنا۔ زندگی میں کچھ تو بدلاؤ آئے۔" ڈکا نے جلدی سے جواب لکھا۔

"دیکھو گا رضا کی اگر کوئی فی شرت ہوئی تو..... اب تو ہم دونوں کے برابر کپڑے آتے ہیں۔

مگر میرے بننے سنو نے سے تمہارا کیا فائدہ ہوگا؟ کون سا تم مجھ کو کچھ سکتی ہو؟"

"میں دیکھ نہیں سکتی مگر جب تمہارے

”بہت دھڑم اور بہت ڈھنگ لگ رہے ہیں
ذکا صاحب آج تو آپ۔۔۔ کسی پرانی کا دل آگیا تو کیا
ہوگا؟“ اس کی کوئی گھڑی تروت نے اسے چھیڑا تو گویا
اس کا منوں خون بڑھ گیا۔

”کیا بات ہے ذکا اتنی زبردست تہدیلی؟
بھائی سے زیادہ بن رہی ہے کیا آج کل۔۔۔۔۔؟“
جس کے جودل میں آ رہا تھا کہہ رہا تھا۔ وہ بھی دل
ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ ذہرا تو جلتی ہے مجھ سے،
بھلا میں بندہ رنگ سکتا ہوں؟

”تھیک پوسٹرین، آج کا یہ خوب صورت دن
تیار ہے۔۔۔۔۔“ اس نے دل ہی دل میں سرین کا
بھیرا کر دیا۔

☆☆☆☆

”سری سے بد حال ذہرا بار بار یہ۔۔۔ پوچھ کر
سری اور ذہرا کی گھڑی گھڑی دے رہی تھی۔ سچ سے
وہ تین مرتبہ نہا چکی تھی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین
بات۔

دس مرتبہ کے پہننے گھسے گھسائے کپڑوں میں
تھوڑا سا سکون مل رہا تھا۔ پورے جسم پر پانی
ہیٹ پاؤڈر ل کر وہ دودھ پانی میں سیون اپ ٹاکر
پلی رہی تھی کہ ذکا گھر میں داخل ہوا۔ ذہرا منہ سے
لے کر ہاتھ ہی دل تک سفید ہو رہی تھی۔

”نہا کی قسم بالکل پاؤڈر لگ رہی ہو۔“ اس
نے ذہرا کو چھیڑا۔ وہ ابھی تک خامسے خوشگوار موز
میں تھا۔

”کچھ بھی لگوں۔۔۔۔۔ بند تو نہیں لگ رہی؟ صبح
سے رات تک چھ لے کے آگے کام کرو تو چاہے کہ
کون پاؤڈر ہے اور کون لنگور۔۔۔۔۔؟ اور یہ تم اتنے
چمک کیوں رہے ہو؟ ساری دنیا تو گری سے بولا کی
پھر رہی ہے اور تم لال اتار بنے پھر رہے ہو؟“ وہ
چپے چپے لگے میں بولی۔

”یہ سب اس لال قیص کا کمال ہے۔“ وہ اپنی

مجھ آتی ہیں اس کی چیزیں۔۔۔۔۔“ ذہرا حیرت واپس
سے اسے دیکھے جاری تھی۔ دوپٹہ بچھا کر بولا۔
”اتنا گھور کر مت دیکھو پھل جاؤ کی، جاؤ جو
کہہ رہا ہوں کرو جا کر، وہ یہ ہو رہی ہے۔“ ذہرا
مرے، مرے قدموں سے پار لکھی آئی، اب اسے
رضائی الماری کھینچ لی تھی۔

☆☆☆☆

ذکا تک سک سے تیار ہو کر آخر میں پرلوم
اچھے کر کے اپنی تصویر موبائل سے اتار رہا تھا تو
ذہرا کے تین بدن میں گویا آگ سی گئے تھی۔

”کسے دکھانے کو یہ سب ہٹاؤ سنکار ہو رہا
ہے؟“ اس کی آواز میں شعلوں کی سی لپک تھی۔ ذکا
نے موبائل بند کر کے دل جلانے والی مسکراہٹ سجا
کر جواب دیا۔

”اپنے دل کی تسلی کے لیے، اپنے روئے دل
کو مٹانے کے لیے سب کر رہا ہوں۔“ تھیں کیا
اعتراض ہے؟“

”اس رنگی شرت میں بالکل بندہ لگ رہا ہے
ہو، ہونہ بدھی تھوڑی لال لگام۔۔۔۔۔ جیو جان ہو گیا
ہے اور باپ کو اس میں جس دل کو مٹانے کی سوچ رہی
ہے۔ ارے کچھ تو شرم کرو، کیا اس مجھے سے لکھو گے
تو لوگ کیا کہیں گے، سب نہیں گے تم پر۔“ ذہرا
کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ نوج نوج کراس کا طلیہ
بگاڑ دیتی۔

”ہا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔“ اس نے جاندار قہقہہ لگایا۔
ذہرا کے قریب آ کر اس کی تھوڑی چھو کر اس نے
کہا۔ ”ہم چلے، دشمن چلے۔“ اور ٹھٹھاتا ہوا باہر
نکل گیا۔
ذہرا ابھی تک اپنی جگہ بت بنی کھڑی تھی۔

☆☆☆☆

آفس میں اسے دیکھ کر سب حیران تھے۔ سب
نے اس کی اس تہدیلی کو سراہا۔

جواب دیا۔

”کیسا رہا آج کا دن.....؟ ریڈ شرٹ اور جاگرز پن کر گئے تھے؟“

”بہت اچھا رہا آج کا دن..... بہت عمدے۔ اتنا اچھا دن گزرا اور اس کے لیے تمہارا بہت شکریہ۔ تم نے میرے اندر کے چھپے مرد کو دریافت کر کے اسے گہری فیصد سے چمکا یا ہے، جسٹس اکیمن.....“ ڈاکا کارڈاں، اندواں ممنونیت میں ڈوبا ہوا تھا۔

”رنگ ہماری زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں، شروع رنگ ہماری حس جمالیات اور حس مزاج کو اجاگر کرتے ہیں جبکہ چمکے اور بد مزہ رنگ تجسّس زندگی اور اس کی رعنائیوں سے دور لے جاتے ہیں۔“ اس کا فلسفیانہ جواب چہ کروہ حیران ہوا۔ آج اس کا تیار روپ سامنے آیا تھا بلکہ پچھلے چہ ماہ کی اس کی وہی سن روزانہ ہی اس کا ایک نیا روپ تھا۔ رنگ سامنے آتا تھا۔ وہ بے ساختہ ہی پوچھ بیٹھا۔

”کیا تم راکٹر ہو، شاعر ہو یا پروفیسر.....؟“

”میں بس ایک عورت ہوں۔“ اس کا مختصر جواب آیا۔

”تمہارے اتنے روپ کیونکر ہیں پھر.....؟“

وہ جاننے پر بلند تھا۔

”میں نے کہا تھا کہ میں ایک عورت ہوں اس لیے میرے اتنے روپ ہیں۔“

”عورت تو میری بیوی بھی ہے..... مگر اس کا تو ایک ہی روپ ہے ماں اور بس ماں۔“

”عورت کا یہی روپ سب سے عظیم تر ہے۔“

برہما جواب آیا۔

”کیا تم ماں نہیں ہو.....؟“ ڈاکا کی طرف سے پھر سوال آیا۔

”اوہو..... شاید میرے مہاں کو پیاس لگی ہے، وہ اندھ رہے ہیں کل باتیں ہوں گی۔“

”اچھا شب بخیر.....“ ہیٹ کی طرح درمیان

قیس چھوڑ کر یو لاء پھر اس کے قریب آکر ادا لے بے نیازی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

”تم بھی اپنی بات کا لالہ شرارہ پن کر دیکھو، اگر تمہارے جذبات و احساسات میں خوشگوار پہل نہ پیدا ہو تو میرا نام بدل کر رکھ دینا۔“ اس کی آنکھیں حیرت سے پہلے پچھلیں پھر سکڑیں، برا سامہ بنا کر اس نے..... اس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

”بکشتو مجھے..... تمہاری طرح مجھے جگہ ہنسائی کا شوق نہیں..... جتنا جوان ہو رہا ہے اور باپ کو نئے نئے فعل میلے سوچ رہے ہیں۔“

”افوہ یہ تم ہر بات میں جتنا جوان ہو رہا ہے کی رت کیوں لگا دیتی ہو؟ اس کا تو کام ہی جوان ہونا ہے، اس کی جوانی سے میری جوانی کو کیوں عارت کرنے پر تکی راقی ہو۔ میرا سوڈ خراب نہ کرو، آج میں بہت خوش ہوں۔ جاؤ جا کر اچھی سی دودھ پی کر لالہ اور خدا کے لیے یہ منہ ہاتھ دھو لو۔“ تم سے چلے ہوئے بالکل سا بھرا کی جھکونٹ لگ رہی ہو، وہ ناگوں والی.....“ یہ سن کر زہرا کے سر سے گلے گوداں پر بھی اس نے زہر خدا انداز میں میاں کو مودا۔

☆ ☆ ☆

آج بھی دو بج کر نہیں دے رہے تھے، ہراناں لے، نے کروہ فیصد کو بھگا رہا تھا۔

”کم بخت کو کیسی ناہم رکھنا تھا سیٹنگ کے لیے۔“ اس کے دل و دماغ نے وہائی دی۔ ٹھیک دو بجے اس کا بیج آیا۔

”سو تو نہیں گئے تھے؟“ ہیٹ والا سوال پوچھا گیا۔

”نہیں تو۔۔۔۔۔ جاگ رہا ہوں تمہارے بیج کا انتھار کر رہا تھا۔“ ایک ہاتھ سے بھائی روک کر دوسرے سے بیج لکھ کر اس نے روزانہ والا

☆ ☆ ☆

تربیت اولاد

اکثر والدین اپنی اولاد کی دینی اور اخلاقی تربیت کے حوالے سے پریشان رہتے ہیں۔ جب بچے بلوغ کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں تو والدین کی پریشانی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے دین کی باتوں پر عمل کریں۔ باقاعدگی سے نماز پڑھیں، روزے درمیں قمران کی حلاوت کریں۔ اسی طرح ان کی تنہا ہوتی ہے کہ ان کی اولاد پاکیزہ عادتیں اپنائے، برے طریقہ سے گریز کرے اور اپنی ذلت داریوں کے بارے میں علمی کی اختیار کرے۔ ان چیزوں کو اپنے بچوں میں پیدا کرنے کے لیے وہ باہم دینی اور زہدیت کا طریقہ اختیار کرتے ہیں جو سراسر غلط ہے۔ دراصل انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس ساخت پر پیدا کیا ہے کہ پہلے وہ کسی بات کو اپنے ذہن و فکر اور شعور و ارادے کا حصہ بناتا ہے اور اس کے بعد اپنے عمل کو اس کے مطابق کرتا ہے۔ یہ طریقہ اللہ تعالیٰ نے صرف جانور کے لیے رکھا ہے کہ اس کو جس طرف ہانکا جائے وہ اسی طرف مڑ جائے۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ دینی راستوں سے کوئی بات قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ ایک عمل کے راستے سے اور دوسرے جذبات کے راستے سے۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدوں نے ہمیشہ انسان کے ذہن کو غائب بنایا ہے اور اس کے ذہنی پر دھجک دی ہے۔ والدین اگر اپنی اولاد کی صحیح معنوں میں تربیت کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ دینی و اخلاقی تربیت کے حوالے سے جو بات بھی اپنے بچوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، پہلے اسے ان کے شعور کا حصہ بنائیں۔ یعنی دھوکس، دباؤ، زبردستی اور جبر کے تمام طریقے ترک کر دیں۔ ان کے علم کو اور ان کے فہم کو بھتر کریں۔

مرسلہ مسرتقسیم، جہلم

میں اس کے شوہر کے اٹھنے نے بات بگاڑ دی تھی بلکہ اوچھری چھوڑ دی تھی۔

”اس سائے کو بھی.....“ دکانے موٹی سی گالی دے کر موہاں بند کیا اور زہرا کی طرف دیکھا، وہ اوچھلی آنکھوں کے ساتھ خراٹے بھر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ صبح سے بیزار، بیزار سی پھر رہی تھی، مگر نے اسے بوکھلا دیا تھا اوپر سے گھر کے بیکڑوں کا کام..... کوئی مای نہیں رہی تھی اس نے..... اسے خود گھر کے سامنے ۲۰ کپڑا پھیند تھے اور اسی چکر میں وہ اپنا آپ فراموش کر بیٹھی تھی۔

سب سے پرانا اور کھسا پالا ان کا سوٹ تھا کہ پائین کر اس نے داغ دک مشن لگائی، جھاڑو پر چھٹا کرنے کے بعد وہ پھر سے بیٹے میں نہا گئی تھی، ابھی کھانا بھی بنانا تھا۔ رشتا دو بچے اسکول سے آتا تھا۔ میزک کا طالب علم تھا، کھانے پینے میں اس کے بڑے خڑے تھے، اب وہ کر لیے لے بیٹھی اس سوٹ میں تھی کہ اس کے لیے کیا بنائے؟ خود اسے کر لیے بہت پسند تھے اور وہ ان باپ کے لیے کو کر لیں سے ازلی ہوتے۔

رشتا کے لیے تو چلو وہ چھٹی جاوے گی، شام کی شام کو دیکھی جائے گی۔ یہ سوچ کر تیزی سے کر لیے پھیلنے لگی۔ اسے میں پاس پڑے موہاں پر اوپر تلے تھیں چار بیٹل ہوئیں، اس نے کوفت زدہ انداز میں موہاں کو دیکھا۔ شجاک دیکھنا بھی ضروری تھا کوئی کام کی بات نہ ہو..... ہاتھ صاف کر کے اس نے جھپٹا تے ہوئے موہاں کا منہ دیا۔

”آپ ایک خوب صورت خاتون ہیں، بس اپنے آپ کو در یافت کرنے کی دیر ہے، ہمیں پھر آج سے ہی خود کو در یافت کرنا شروع کر دیں۔“ شجاک پر کوئی نام پتا نہیں تھا سوائے اس نمبر کے وہ بھی عجیب سا نمبر کہ اس پر رنگ یک کیا کرتی وہ الجھ سی گئی۔

”میٹ وریک والوں نے بھیجا ہوگا۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔ جتنی دیر وہ کر لے جیسیتی رہی یہ بھیج اس کے دل و دماغ میں کھلا تار ہا۔ کر لے تیار کر کے وہ پھر نہانے چلی گئی۔ کہا کرتی تھی غیر ارادی طور پر اس نے خود کو آئینے میں ڈالا۔

بھکی رنگت، گالوں پر چھانیاں، بے رونق آنکھیں، چھوڑے بال، ڈھلان ہوئی جلد..... وہ کہیں سے بھی پچیس سال کی زہرا نہیں بلکہ آٹھ دن بچن کی۔ سارے روز وہ عورت دکھائی دیتی تھی۔

اس نے اپنا کیا حال بنا ڈالا تھا۔ خود پر توجہ دیتی بھی چھوڑ دی تھی۔

جوان بیٹے کی ماں ہونے کا سوچ، سوچ کر بھی اس نے خود کو مٹا ڈالا تھا۔ وہ بیوی سے صرف ماں بن کر رہ گئی تھی۔ جھکے، جھکے انداز میں وہ لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔ اپنا آپ سوچنے اور کھوتے لگی۔

کب سے اس نے میک اپ کے نام پر لپ اسٹک تک نہیں لگائی تھی، آنکھیں، کاہل کے بغیر وہی دینے لگی تھی۔ گھسے رنگ، بڑے کپڑوں میں وہ اچھے اچھے بالوں کا جوڑا کس کر بیٹھنے لگی تھی۔

دو دنوں میاں، بیوی میں جبر و جبروت، تو میں، میں ہونے لگی تھی۔ دو دنوں ایک دوسرے سے بیزار اور لاتعلیق سے رہنے لگے تھے۔ سولہ سالوں میں وہ ساٹھ سال کے میاں بیوی دکھائی دینے لگے تھے۔

”اپنے آپ کو کیسے دریافت کیا جائے؟“ اب وہ اس سنے میں الجھی ہوئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اب اسے دوسرے بھیج کا انتظار تھا۔

☆☆☆

”آج کا دن کیسا ربا.....؟ اچھا، شاندار یا زبردست؟“ وہ ہمیشہ کی طرح پوچھ رہی تھی۔ ذکا کی انگلیاں تیزی سے جھپٹنے لگیں۔

”یار! آج تو کمال ہی ہو گیا۔ تمہارے کہنے

کے مطابق میں نہ ہرا کے لیے کھڑے لے کر گھر آیا تو وہ روزانہ کی طرح منہ بسورے بیٹھے کے بجائے سکڑا کر آگے بڑھی۔ اور تو اور اس نے آج لال لپ اسٹک بھی لگائی ہوئی تھی، روزانہ کی طرح پاؤں نہیں بنی ہوئی تھی۔ گلتا ہے اسے بھی میری طرح کوئی نرسین مل گئی ہے۔“

”ہااا.....“ وہ دل کھول کر فہمی۔

”تمہارا کیا خیال ہے، کیا میرا نام واقعی نرسین ہے؟ میرا تو کوئی بھی نام ہو سکتا ہے۔ تمہیر، تقدیر، تاج، وغیرہ، وغیرہ..... ہم روح سفر جس میں ناموں سے نہ پہچانیں۔“ اس نے پھر الجھی، ابھی بات کی تو وہ بھی لگنے لگی۔

”بھائی! وہی تو اپنا عرصہ ہو گیا ہے مگر میں ابھی جسے نہیں سمجھ پائی ہوں، تم ابھی تک ایک عرصہ سے اس کے ساتھ ہو میرے لیے، ہندی خدا بھی تو اپنا اصل حادف کرواؤ، کوئی تصویر بھیجو..... مجھے تو دیکھو کہ اپنا آپ کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اپنی تصویر بھیجیں بھیج دی ہے، بیوی کی بھی بھیج دوں گا..... مگر تمہیں تو میں نے دیکھا بھی نہیں ہے، روزانہ تمہارا وہ سڑیل میاں جاگ کر میں موقع پر کہانی کے کٹا کٹس میں آ جاتا ہے۔“

”اب بھی وہ جا گئے والا ہے، پانی مانتے.....“ اچھا ابھی شب بخیر۔“ ذکا نے دل ہی دل میں ایک نئی مونی تازی گالی اس کے شوہر کو دے کر کروت بدلی۔

☆☆☆

بھندیاں دم پر رکھیں اور اس نے لمبوں نچوڑ کر ڈھکن بند کر دیا۔ لمبوں کا چھلکا لے کر وہ کمرے میں آگئی۔ پچھا تیز کر کے کمرے پر اطمینان سے بیٹھ کر اس نے چھلکا منہ پر لٹاؤ شروع کر دیا، اسے بارہ بیٹھے کا انتظار تھا۔ روزانہ وہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر بارہ بجے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ اپنے اندر وہ

آج کل وہ اسے کتا ہیں پڑھنے اور نیٹ جوائن کرنے کا مشورہ دے رہی تھی۔ اور وہ سدا کا پڑھنے کا چور۔۔۔ نیٹ سے اسے دلچسپی نہیں تھی، وہ تو پرانی فلموں اور پرانے گانوں کا رسیا تھا۔ وقت ملتا تو رات کوئی وی بی پر کوئی پرانی فلم لگا لیتا مگر زہرا کی غیبت خراب ہونے لگی، وہ بچ، بچ کر سارا مزہ کر کر کر دیتی۔ مجبوراً اسے ٹی وی بند کر دینا پڑتا، چند فری لک کر گانے سننے لگتا۔ مگر آج وہ حیرت سے گرتے، گرتے بھابھ زہرا نے کہا۔

”آج کوئی پرانی مووی دیکھتے ہیں۔ بہت دن ہو گئے ہیں مووی دیکھے ہوئے۔“

بھابھ دونوں نے پاکیزہ چوری دیکھی اور اس دوران زہرا نے نادانستگی میں اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا تو بھابھا اس نے بھی اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ دونوں میں گہری چپ تھی بس سناٹا چل رہا تھا۔

☆☆☆

صبح سے زہرا مستقل مکتا رہی تھی۔

”بوجہ کوئی مل گیا تھا سہرا، وہ چلے۔۔۔۔۔“
ذکا زہرا لب مسکرا رہا تھا۔ وہ گتے دونوں سے اس میں خوشگوار جد لیلاں دیکھ رہا تھا مگر اظہار نہیں کر رہا تھا، بس سبکی ایک کی تھی اس کے اندر کہ وہ محبت کے معاملے میں اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

زہرا عورت تھی، اظہار چاہتی تھی، والہانہ پن چاہتی تھی۔ وہ روزانہ رات کو ہی اس کے کپڑے اس کی کر کے رکھ دیا کرتی تھی۔ جوتوں کو پالش کر دیتی تھی ورنہ اب وہ یہ کام صرف رضا کے کرتی تھی۔

اب وہ آہستہ آہستہ ماں سے بیوی کے روپ میں واپس آنے لگی تھی۔ اسے ذکا کے چھوٹے، موٹے کام کر کے دلی خوشی اور سکون ملتا تھا، وہ چاہتی تھی کہ ذکا اسے دل سے سراہے، اس کی تعریف

آج کل ایک نئی زہرا کو دریافت کر رہی تھی۔ شائستہ اور پُر اعتماد، اب اس کے اندر روزانہ والی کھلی، بیزارگی اور افراتفری نہیں رہی تھی۔ کام بھی وقت پر ہو جاتے تھے اور اسے خود پر بھی توجہ دینے کا وقت مل جاتا تھا۔ منہ پر مسکے کے بعد اب وہ اپنی کالی کبھیوں پر لیپوں رگڑ رہی تھی کہ میسج کی فون ہوئی، وہ پوری طرح چو کنا ہو کر پیغام پڑھنے لگی۔

”جو محبت روزانہ نگلے اللہ کرتی وہ روزانہ مرنے رہتی ہے۔ اپنے اندر کی عورت دریافت کرنے کے بعد اب اپنی گمشدہ محبت کو دریافت کر س، دنیا آپ کی ہوگی۔“ موبائل کی روشنی منہم ہو گئی تھی۔ وہ سو بچ میں پڑ گئی۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا اس نے ذکا سے کوئی محبت بھری بات نہیں کی تھی، دونوں اپنی ہی دنیاؤں میں الجھے رہتے تھے۔ نہ کہیں گھومنا چھڑتا، نہ بیٹھ کر خوشگوار باتیں کرنا۔ نہ بارش میں نہانا اس کے سارے خوف سارے غدشات جوان بننے سے بڑ کر کٹھالی مار کر بیٹھے تھے۔

”لوگ کیا کہیں گے؟“ یہ واہجہ اسے عاجز ماردیتا تھا۔

”جوان بیٹے کی ماں ہو کر یہ طور پرچہ، یہ لہجہ۔۔۔۔۔ تو بے۔۔۔۔۔ وہ طیلانی ہی طیلال میں ڈاکر تو بہہ گئی۔

مگر جس دن اس نے نہادھو کر لب اسٹک لگا کر کاجل لگایا اور گھڑی بگھڑی سی نکلنے لگی تو رضا نے بھی بہت خوش ہو کر کہا۔

”واہ، واہ۔۔۔۔۔ آج آپ صبح کی پہری لانا لگ رہی ہیں، روزانہ ایسی ہی رہا کریں۔ اہلسلیٹ!“
جب اس نے خود پر سومر تہ لہنت بھیجی کہ وہ ناحق جوان بننے کا فلم پالنے لگی تھی اور اپنا آپ مارد رہی تھی۔

☆☆☆

”کتا میں بالکل میری ذات بھیجی ہیں الفاظ بہت، مگر خاموش۔۔۔۔۔“

کرے..... مگر وہ چپ تھا۔ اور یہ چپ نہ جانے کب ٹوٹی تھی۔

☆☆☆

”جسم سے غلوں تک نمودار لیتا ہے
عشق، جب ہر اوزد لیتا ہے“
آج کل اس پر شاعری کا بھوت سوار تھا،
روزانہ نئے، نئے اشعار پیچھے لگتی تھی۔ وہ شاعری میں
نرا گورا تھا اس کے سر سے شاعری گزر جاتی۔
”آسان ہاتھ کیا کرو نسرین، یہ شاعری،
فلسفہ وغیرہ میرے بس کی باتیں نہیں.....“ وہ شکوہ
کرتا تو وہ سادہ اور آسان باتیں کرنے پر اتر آتی۔
”زندگی خوب صورت اور آسان سمجھنے کی ہے
ہاں اب.....؟“

”ہاں..... بہت۔ تمہارا بہت شکر یہ..... تم نے
زندگی کے ایک نئے رنگ اور انداز سے مجھے آشنا
کر دیا ہے۔ لیکن تم نے کبھی اپنی زندگی، اپنے
شوہر اور بچوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہ مجھ
سے مجھے تم سے۔“ ذکا کی انگلیاں تیزی سے
تھرکتیں۔

”ضرور بتاؤں گی، پہلے تمہاری دلچسپی ضرور
جائے۔“ فوراً جواب آیا۔
”میری دنیا تو آدھی سے زیادہ سوراخوں پر ہے،
میری گمشدہ بیوی مجھے مل گئی ہے لیکن کچھ نہیں آتا کہ
اسے سوار نے اور سمجھانے والا کون سمجھا ہے؟“ وہ
حیران تھا۔

”دنیا میں سمجھاؤں کی کمی توڑی ہے، ہو سکتا
ہے اس نے خود کو ہی تراشا اور تلاش لیا ہو۔ تم ان
باتوں میں نہ پڑو..... اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے،
جیسے ہماری دوستی..... ایک لمحہ اور بھڑو نہیں ہے
کیا.....؟“ وہ بڑے سؤ میں تھی۔

”بالکل..... نہ تم دوست بن کر میری زندگی
میں آئیں اور نہ میری ٹھہرے۔“ ذکا کی زندگی

میں بالکل ہوتی، میں سدا کوئے کا چتر بنا رہتا، پیکار،
بے مصرف، رنگ آلود۔“

”واہ..... آج تو فلسفہ بول رہے ہو، چپے رستم
لکھتے تم تو.....؟“ ترت جواب آیا۔

”تم نے..... تمہاری دوستی نے بنا دیا ہے،
میں تو بالکل سیدھا سادہ آدمی ہوں۔“ اس نے فوراً
یہ اعتراف کیا۔ موبائل اچانک بند ہو گیا تھا، شاید
چار بج گئے ختم ہو گئی تھی، اس نے سکون سے
آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

زیر اہٹائے کے بعد بال سکھاری تھی، وہ بچے
کے لیے کڑی نگرانی اور خود پر نگرانی تھی۔
”یہ ہے، بھئی دلوں کا اندھیرا نہ گھبرا ہے
جہاں ایک جگہ ہے میرے گیسوں کی بجائے آئے۔“
وہ ہوا، ہوا ایک ہی جگہ کی تھرر کر رہی تھی۔
وہ لوں نے رات کو درجہ یہ مووی دیکھی تھی۔ اب
بھی اس کے دل و دماغ پر اسی فلم اور کانوں کا نشہ
ماری تھا۔

کری پر جم کر بیٹھ کر اس نے موبائل ہاتھ
میں تھا ہوا تھا اور مقررہ وقت کے انتظار میں تھی۔
جیسے ہی بارہ بجے موبائل کی لائٹ بجلی۔

”اگر رشتے سچے ہوں تو زیادہ سنبھالنے نہیں
پڑتے اور جن رشتوں کو زیادہ سنبھالنا پڑے وہ
سچے نہیں ہوتے، سو سچے رشتوں کی قدر کرو، ان
کی اچھائی کی قدر کرو، تمہارے ارد گرد بے شمار
سچے رشتے ہیں انہیں اپنا اور غلط سمجھو دوسری جان
کر ان سے پیار کرو، ان میں فتنہ ہو جاوے، وہ
تمہارے ہو جائیں گے۔“ آج سمجھا پر فلسفیانہ
گفتگو کا دورہ پڑا تھا۔

”کوئی کام کی اچھی بات کرو، یہ کیا بد رنگ
باتیں ہیں؟“ اس نے تھوڑا بد مزہ ہو کر لکھا۔

”کچھ اپنے بارے میں بتاؤ، تم کون ہو، مرد یا

”نس۔۔۔ نسرين نام ہے اس کا۔۔۔۔۔“ ذکا کے منہ سے بے ساختہ ہی نکل گیا۔ ”اوہ نہیں، نہیں پتا نہیں کیا نام ہے۔ مجھے کیا پتا کون ہے۔۔۔۔۔؟“ اس نے تیزی سے بیان بدلنے کی کوشش کی مگر زہرا کے آگے ایک نہ چلی، اس کے قہقہے پر گویا سانپ لوٹ رہے تھے۔

”جیجی میں کہوں انھوں میں کا کا راجا میاں صاحب کیسے بنتے جا رہے ہیں؟ اور یہ؟“ نسرين نام کی عورتیں تو ہوتی ہی چنڈال چنڈالی اور مردوں کو پھانسنے والی۔۔۔۔۔ ذکا نے ہلکا کر دہائی دی۔

”دیکھو، دیکھو زہرا۔۔۔۔۔! اب تم زیادتی کر رہی ہو، میری آپا کا نام نسرين ہے اور جنہوں نے مجھے قرآن پاک پڑھایا تھا وہ بھی نسرين آپا تھیں۔۔۔۔۔ ناموں میں کچھ نہیں رکھا۔ عورت کا کردار اس میں بچ ہوتا۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔“

”کردار کی ایسی کی جیسی۔۔۔۔۔“ زہرا نے موبائل زمین پر پھینک کر تنگ کر لیا۔ ”کب سے چل رہا ہے یہ معاملہ۔۔۔۔۔ یہ عشق و عاشقی۔۔۔۔۔ تاؤ تو ذرا۔۔۔۔۔؟“

”جسم سے کوئی معاملہ نہیں، تم خواہ تو اہ شک کر رہی ہو۔ ایسے سمجھو تو عام سی بات ہیں، تم بلا وجہ بات کو بڑھا رہی ہو، سو جاؤ چپ کر کے۔ رضائے گا تو اس پر کیا اثر پڑے گا، خواہ تو اہ بات کو طوں ندو۔۔۔“ اس نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو شیرینی کی طرح پھیری ہوئی تھی۔

”ہاں، ہاں اچھا ہے، اسے بھی تو پتا چلے کہ جو ان بیٹے کے باپ کے کیا کروت ہیں۔۔۔۔۔“ اس نے جبکہ گرد زمین سے موبائل اٹھایا، اس کی بیٹری دو بارہ سے لگائی اور ایک مایک کر کے سارے سمجھو پڑھنے لگی۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

عورت؟ کہاں رہے اور جتنی ہو؟ میرا نمبر تمہیں کس نے دیا؟ میں روز تم سے یہ بات پوچھتی ہوں، تم ہو کہ جواب نہیں دیتے اور جتنی۔۔۔۔۔ آخر کیوں۔۔۔۔۔؟ تم نے خود کو اتنا پوشیدہ کیوں رکھا ہوا ہے؟“

”سمجھا کا کوئی نام اتنا پتا نہیں ہوتا۔ وہ تو بس منگر بنے بچنے اور خار، خار ہونے کے لیے وجود میں آیا ہے۔ جتنا کھوجو گے اتنا ہی الجھو گے۔ بس خود اپنی ذات کی اور اپنی ذات سے وابستہ رشتوں کی قدر کرنا سیکھو۔“ آج سمجھا کسی اور ہی رنگ۔۔۔۔۔ رنگ میں تھا۔

وہ آگے سے کچھ بول ہی نہ پائی۔ موبائل کی لائٹ بند ہو چکی تھی۔ زہرا نے منگھڑے بالوں کو سمیٹ کر ان کا جوڑا بنایا اور الماری کے سامنے کھڑی ہو کر رات کے لیے کپڑے دیکھنے لگی۔ آج ذکا کہہ کر گیا تھا کہ رات کا کھانا باہر کھائیں گے۔

☆ ☆ ☆
”دل کی دنیا سنوارنے کے لیے۔۔۔۔۔“
عشق کرنا بہت ضروری ہے۔
ذکا نے رات دو بجے آنے والا یہ شعر بھی بار بار زہرا کے دل پر حا اور مطلب جان کر، دل ہی دل میں سنا کر رہا۔

زہرا نے کروت بدل کر اسے چوں مسکراتا دیکھ کر اور موبائل ہاتھ میں لیے خوش ہاش دیکھ کر چیزی سے اس کے ہاتھ سے موبائل چھینا، ذکا دیکھتا ہی رہ گیا، مزاحمت بھی نہ کر سکا۔

زہرا نے چپا، چپا کر شعر پڑھا۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلے گئے۔

”اچھا تو رات کو چپ، چپ کر عشق و عاشقی کا کیل کھیلنا چاہا ہے۔ میری ناک تلے سب ہو رہا ہے اور مجھے ہی خبر نہیں ہے، کیا نہ ہو اس چنیل کا۔۔۔۔۔؟“ وہ ابرو چنھا کر کچھ ٹھنکی نظروں سے اسے منگھور رہی تھی۔

اپنے دھڑوں، اپنے پہنوں کی ہوا بھی نہیں تھکتے دیں گے۔ ہم لڑیں گے، جھگڑیں گے اور پھر ایک ہو جائیں گے..... کیونکہ کسی تیسرے نے ہمیں جینے کا ہنر سکھا دیا ہے، ہے ناں ذکا؟“

ذکا نے پھر سوچے کچھ بغیر گردن ہلا دی۔ ذہرا نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جسے ذکا نے متاعِ حیات کچھ کر چینے سے لگا لیا۔ دونوں کے چچ اب کوئی تیسرا نہیں تھا، بس محبت تھی۔

☆☆☆

تعبیر نے رات بیک نخل پر اڑتے ہوئے اوراق کو سمیٹ کر بچھا لیا اور اپنے ٹھہرے ٹھہرے بالوں کو سمیٹا، چائے کا ٹھونٹ بکھرتے ہوئے اس نے دوسری بار اپنے گیسے پر ٹھہرا دی، ہر لفظ عمل تھا۔

ذکا نے ایک سال سے وہ اس کہانی پر کام کر رہی تھی، آج آج کل بجا کر یہ مکمل ہوئی تھی۔ ذکا نے آج خود فون کر کے اسے اپنی کہانی سنائی تھی۔ پھر فون پر بعد ہی ذہرا کا بھی فون آ گیا تھا، اس نے بھی کم دینیں وہی کچھ بتایا جو ذکا نے بتایا تھا۔ اس کے اندر تک روشنی اور سکون پھیل گیا تھا۔

انجام اس کی توقع کے عین مطابق تھا، کہانی مکمل ہوئی تھی۔ وہ سمرین سے اب دوبارہ تعبیر بن گئی تھی، ایک نامور نگہبازی، جو ہمیشہ سچ لکھا کرتی تھی اور اس سچ میں اسے اپنا حصہ بھی ڈالنا پڑتا تھا۔

”جھپک بھو ذکا..... جھپک بھو ذہرا..... تمہارے سچ کے بغیر یہ کہانی بھی مکمل نہ ہوتی۔“ اس نے دل میں سوچ کر فائل بند کر کے رکھ دی اور طمانیت سے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے لیگ لگا دی۔ اب اسے کسی اور نئی کہانی پر کام کرنا تھا۔

ذکا اندر ہی اندر دہل رہا تھا کہ اب اس کا ری ایکشن نہ جانے کیا ہو؟ وہ بہت ٹھسے میں تھی، پڑھتے، پڑھتے اس پر بھی نظر ڈالتی جا رہی تھی۔ ذکا سے غلطی یہ ہوتی تھی کہ سمجھ ڈیلیٹ کرنا بھول گیا تھا۔

”اب..... اب نہ جانے کیا کرے گی یہ عورت.....؟ اس کا قصہ تو ویسے بھی بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اسے اللہ، تو رحم کرنا، جو ان بننے کے باپ پر۔“ اس نے دل ہی دل میں وہائی دی تھی۔ ذہرا نے تمام سمجھ پڑھ کر گہری سانس لی۔

ذکا اس کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔

”بس دوست ہے میری۔۔۔ اور کوئی بات نہیں..... خدا کی قسم یقین کرو میرا۔“ اس نے منہ کر کہا۔

”ذکا.....!“ ذہرا کو اپنی آواز گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

”اب نہ جانے کیا کہے گی؟“ ذکا کا رواں، نرم ہاں مجسم کان بن گیا۔

”ذکا کیا تجھ پر محبت کے لیے کسی تیسرے کا ہونا ضروری ہے؟“ اس نے کہا تو ذکا نے جلا وطنی کے لیے میں گردن ہلا دی۔

”نہیں، ناں..... رشتوں کے جال کا جھنجھ میں اگر دروازہ پڑ جائے تو جوڑنے کے لیے کوئی سیما کوئی چارہ مگر ہی کیوں ہو، خود بھی تو پہلوں سے ٹکرنے سے بچنے چاہتے ہیں، ناں..... اپنی صلیب اپنے ہی کاغذوں پر اٹھانی چاہیے، دوسروں کا کاغذ ہانگی دغا دے سکتا ہے۔“ وہ کسی فیئر مرنی نکتے کو سمجھتے ہوئے بولے جا رہی تھی، ذکا ہوتی ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

”وعدہ کرو ذکا..... اب کسی تیسرے کو اپنے اور میرے درمیان نہیں آنے دو گے، میں بھی تم سے یہی وعدہ کرتی ہوں۔ ہم اپنی محبت کی تجدید اور آج جا رہی اپنے خون سے کریں گے، ابھی کسی اور کو

کے گری۔ بیٹے اور چاس سے بے حال وجود کو جیسے کسی حد تک چمکون کرنے میں مدد دی تھی۔ غور کشن تھپت کر وہ حرمت کے پہلو میں ہی لیٹی لیٹ گئی جوتی وی میں منہک گویا اس کی آمد سے بھی بے خبر

”السلام علیکم! گزشتہ نون..... پاؤ آری حرم۔“
قادر نے اندر تھپتے ہی بیگ اور چادر صوفے پر پھینک کر جو اس بحال کرتے ہوئے آگ مگھری سانس بھر کر کہا۔ کمرے میں آتے ہی اسے ہی کی کوٹنگ نے اس

چاندنی گنگنائے لگی

امام



تھی..... جو اپا سلائی بھیجتا تو دور کی بات۔ فارہ نے ذرا سا سراٹھا کر اس کی محویت کو دیکھتے خود ہی احساس دلانا چاہا۔

”یار اتنی دھوپ سے آئی ہوں..... پانی ہی چلا دو، دیکھنا سا۔“ اس نے حرمت کے ہاتھ سے ریوٹ چھیننا چاہا..... ارادہ وہی آف کرنے کا تھا مگر وہ تو ٹھیک کی طرح بھیجی تھی۔

”غیر وار..... غیر وار فارہ کی بیٹی ڈسٹرب نہ کرو، دیکھ نہیں رہیں کہ میں اپنا پسندیدہ شو دیکھ رہی ہوں۔“ وہ جس طرح بغیر لحاظ حرمت کے آنکھیں نکال کر غرائی تھی فارہ کا منہ بن گیا تھا۔ اس نے اسکرین پر شاہزادوں کی سی شان بے نیازی سے جلوہ گر مشہور و معروف اور ہر دل عزیز ڈراما آرٹسٹ آذر خان کو کھٹا جانے والی نظروں سے گھومنے پر انکس نہیں کیا بلکہ دانت کچکھا کر بولی تھی۔

”قانون یہ پروگرام تو رات کو بھی دیکھ چکی ہوگی اور اب پھر..... جی نہیں بھرا ابھی تک آنکھیں کھینک سیک کر۔“ اس نے بھی لحاظ حرمت والا نہ جانی رکھ کر بے نقط سنائیں اور منتھنی ہوئی اٹھ کر خود فریج سے پانی کی بوتل نکال لائی۔ پروگرام جس وقت آچکا تھا بھی مزید جی حرمت کی توجہ اس پر مرکوز تھی۔

”اچھا تازہ، کیسا گزرا پہلا دن تہادی سو کالڈ جا ب کا؟“ وہ اپنی مسکراہٹ دبا رہی تھیں۔ آنکھیں پٹیٹا رہی تھی۔ چہرے پر شرارت کا عکس نمایاں تھا جو اس کی معصومیت بھری دلکشی کو مزید اجاگر کر رہا تھا مگر فارہ مطلق تک بیزار تھی۔

”یکو اس مت کرو مجھ سے..... خیر وار جو میرے منہ لگیں تم..... جس تم اس آذر خان کو دیکھتی اور آجیں بھرتی ہی مر جانا..... کس کم جہاں پاک.....“ پانی کی بوتل کا دھکن اتار کر منہ سے لگاتے سے گلے فارہ نے اس کی ابھی خاصی طریقت صاف کرنا ضروری خیال کیا تھا۔ وہ برامانے بغیر دانت نکالتی رہی۔

”کف..... اچھا ضرر..... آج تو مجھے لگ رہا ہے اپنے بھائی کا زیادہ ہی درد اٹھا ہے جنہیں ہم جلتی کر جلتی رہتا مجھے کیا..... ہم حال بھول ہے تہادی کی اس کا کوکو میں بھی منہ لگاؤں گی۔“ جو اب اس نے بھی جلتی پر نیل ہی ڈالا تھا۔ فارہ کا چہرہ غم و غصے کی زیادتی سے سرخ پڑنے لگا مگر حرمت کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس کی جانب دیکھتی اور اس کے دکھ کو سمجھ پاتی..... پروگرام ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔

سہانی شام پوری طرح پر پھیلا چکی تھی۔ ہواؤں میں خوشگوار تھی۔ بھیجی گئی کا زور تو نہ ہوا لگ رہا تھا۔ ورنہ سارا دن تو کون جلتی رہی تھی..... وہ بڑے فریش سوڈ میں تھی ہاتھ میں پائپ بجائے پودوں کو پانی میں نہلاتے اپنی سانس نکالتے میں مصروف تھی۔ جب سو باسو باسو چہرہ اٹھ کھڑے ہال لیے فارہ بھی اپنے کمرے سے نکل کر اس سمت چلی آئی۔

”تیرے نال میں لائیاں نکلیاں دے توں فیر وہی دوریاں دکھیاں تیری ہے پردانی جہاں مینوں مار گئی“ اس طرح تو ہوتا ہے میم! اس طرح کے کاموں میں۔“ فارہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے پائپ لے لیا۔ تل وہ پہلے ہی بند کر چکی تھی۔

”مثلاً کس طرح کے کاموں میں؟“ حرمت بھوری چڑھا کر بولی۔

”بھی غور تو کرو حرم! کہاں وہ مشہور و معروف آرٹسٹ جس کی شہرت پاکستان سے نکل کر باہر کے ملکوں تک جا پہنچی اور کہاں تم ایک عام سی گھریلو لڑکی! تہادی طرح کی نہ جانے کتنی اور بھی عام اور..... بدوقوف لڑکیاں ہوں گی جو یہ حماقت کر رہی ہوں گی۔ حرم! جنہیں نہیں لگتا کہ تم مراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو؟“ اس کے لہجے میں غصوں کیے جانے والا دکھ اور تاسف تھا..... شاید جیسی حرم خلاف معمول کچھ نہیں بولی۔ ہونٹ پیچھے دوسری جانب دیکھتی رہی..... البتہ

تھی۔ بس نہ چلتا تھا جسے کالج کوئی کالج کا برتن ہو جسے وہ دیکھا۔ مار کھول میں توڑ دے اور جان چھڑا لے۔

”بد قیزہ نہیں کرو حرم..... شوہر ہے وہ تمہارا..... قیزہ سے ذکر کیا کرو سمجھیں؟“ ماما کے لہجے میں صرف تحیہ نہیں تھی بے حد نگاہیں بھی اتر آئی۔ وہ ہر جتنے لگی۔

”ہو نہ شوہر..... زبردستی کا بنایا ہوا..... نہیں مانتی میں اس رشتے کو“ وہ کسی بھی پل روتے کو تیار تھی مگر ماما نے اس کا بازو پکڑ کر بے حد جتن سے بھلا دیا تھا۔

”آج جو نکاح تم نے یہاں میرے سامنے کر دیا ہے حرم وہی کافی ہے، آج کے بعد میں ایسی کوئی معمولی بات نہ سنتی۔ یہ بند من تمہارے بابا کا ہاتھ تھا۔ اسے اور بھائی جان کی شدید خواہش اور ہم سب کی رضا مندی کی مثال تھی۔ تمہاری بیکار خدی کا خاطر ہم اپنے رشتوں کو نہیں توڑ سکتے۔ سوئی کینٹر فل ٹیکسٹ چائیم اور کے؟“ ان کے سخت لہجے میں غیب سی کاٹ وادہ تھی۔ وہ خائف نہیں بھی ہوئی تو تھکا ضرور ہو گئی تھی مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ اس نے سانولے سلونے عام سے نقوش کے مالک عمر حسن کو بھی جبراً قبول کر لیا تھا۔ اس نے اپنا کھیل دوسرے انداز میں کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جس میں حج کا امکان سولہ صد تھا اور وہ پریقین تھی۔

☆☆☆

”السلام علیکم..... صبح بخیر.....“ گھرے چہنٹ کوٹ میں بیٹوس ہاتھ میں پکڑا۔ سلی فون جیب میں منتقل کرتا ہوا وہ اپنے مخصوص باؤ کا انداز میں ڈانٹنگ ہال میں داخل ہوا تھا۔

”والیکم السلام! جیتے رہو میری جان..... خوش آباد رہو۔“ بابا نے اخبار رکھتے ہوئے مسکرا کر بیوی خوش دلی سے اس کا خیر مقدم کیا اور فارو کو..... ناشتا لانے کو آواز دی دینے لگے۔

چہرے پر ناگواری کے تاثرات تیار ہے تھے کہ اسے فارو کی بات سنی بری محسوس ہوئی۔ دونوں کے درمیان طویل خاموشی کا تکلیف دہ وقفہ آیا۔ جب فارو نے ہی اس خاموشی کے پردے کو چاک کیا۔

”لوہ ہاں! میں جانتا بھول گئی..... رات بھائی ہمارے لیے لان اور کافین کے سوت لائے ہیں، ابھی ویسے ہی رکھے ہیں..... میں نے سوچا پہلے تم پسند کر لو۔“ اب اس کا انداز پہلے کی طرح ناراض اور کسی حد تک صلح جو، انصافیت لیے ہوئے تھا مگر حرم کی ناگواری اس کے لہجے میں بھی در آئی تھی۔

”دیکھو..... تم اپنے بھائی سے کہہ دینا کہ وہ اپنی توقعات اور امیدوں کو کم از کم مجھ سے، میری ذات سے الگ ضرور کر لے۔ کیونکہ میرا بھی اس کی بڑائی کرنے کا ارادہ نہیں تھا اور نہ ہوگا۔“ فارو نے دکھ کی شدید کیفیت میں گہر کر آنکھوں میں سرخی لیے اسے اک نظر دیکھا اور بولی۔

”کیا سمجھوں میں اس کی وجہ..... آؤ خان؟“ فارو کا سوال بہت جلدی تھا، حرم دانستہ جھپٹے کھڑی رہی، جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا۔ ماما نہیں پکار رہی تھیں، وہ بول نہ سکتا ہوا چہرہ لیے آگے بڑھ گئی۔ فارو وہیں کھڑی کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔

☆☆☆

جب پہلی بار حرم پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ اپنی نادانی کے دور میں ہی عمر کی سیکھو صد بنا دی گئی تھی تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ کتنا جیتی اور چلائی تھی وہ اس ایک بات کی وجہ سے۔

”ایک جی شخص ملا تھا ونا میں آپ کو میرے لیے؟“ اس کے لہجے کی رعوت وہ بھی لاڈ لے اور انکو تے بھاننے کے لیے ماما کو بالکل اچھی نہیں لگی، جیسی اسے چھپا گھورا۔

”کیوں..... کیا بھی ہے عمر میں؟“ ”خوبی کون سی ہے وہ بتا دیں؟“ وہ پتھکاری

پوچھ رہی ہو؟“ عمر نے جانے کا بہانہ اڑا کر اٹھا کرے ہوئے اسے ایک نظر دیکھ کر کہا۔

”اگر آپ کو جلدی ہے تو بھر رہے ہیں..... کیچے نیلی آج مجھے ایک گھنٹا لیت جانا تھا مگر حرم کا بے خبری کا نام تو جی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر آپ اسے ڈراپ کر دیتے تو.....؟“ وہ اپنا مسئلہ بتا رہی تھی، حرم نے سخت جڑ بڑ ہو کر فاروہ کو گھورا وہ متوجہ نہیں تھی یا رانستہ نظر انداز کر رہی تھی۔

”اوکے..... کر دوں گا..... کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ وہ فی الفور جواب دے رہا تھا۔ فاروہ نے.....

پیشگی مسئلہ.....

”مگر آپ کو دیر ہو چکی ہے، اتنا اہم کام ہے آپ کا۔“ وہ نے سنی سمجھ گئی سے کہا تھا اتنی سنجیدہ وہ تھی.....

”اس اوکے..... مینشن ٹاٹ..... حرم تم ناشتا کر رہی ہو تو اٹھ جاؤ..... ہری اپ۔“ اس نے پہلے فاروہ کو سلی دی تھی پھر حرم کو کھانا طلب کیا جو سخت نالاں اور جڑ بڑ نظر آ رہی تھی۔ عمر جانے کے ساتھ سلاکس کے چند نوالے لے کر رہی گئی پیچھے ویکسل کر اٹھا گیا تھا۔ فاروہ کے ساتھ مانا نے بھی فوک کرنا مشا کرنے کو کہا مگر وہ رکا نہیں تھا اور حرم کو پورے ٹیکہ میں آنے کا کہنا اپنا کوٹ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ وہ فاروہ کو گھورتے ہوئے اپنا جزل اور ایک اٹھائے ڈاک طرح سے چر چلتی ہوئی اس کے پیچھے لگی تھی۔ فاروہ بے اختیار ہنسنے لگی کہ اب ہنسی سکرول کرنا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ مانا نے اسے کچھ حیرانی سے دیکھا۔

”نہیں آج کیوں دیر سے جانا ہے اور یہ خواہ مخواہ..... جس کیوں رہی ہو؟“ ان کے احتضار پر وہ.....

”فاروہ جلدی آ جاؤ بھی..... آج مجھے ذرا جلدی لگتا ہے.....“ وہ گھڑی دیکھتے ہوئے خود بھی بکا رہا تو وہ چونک کر اسے سمجھ گئے۔

”کیوں، غیریت ہے ناں بنے؟“

”جی ہاں! آج بہت اہم آپریشن تو ہے جی..... مجھے جنرل اسپتال کے دورے پر بھی جانا ہے، کچھ ڈفیوں کی حالت تشویش ناک ہے، دیگر ڈاکٹرز کے ساتھ مجھے بھی ان کے چیک اپ کو جانا ہے۔ اس کے بعد فیصلہ ہو سکے گا کہ انہیں علاج کے لیے باہر بھیجا جائے یا نہیں۔“ وہ کل ہونے والے ہم دھما کے میں ڈفیوں کی حالت ڈسکس کرنے لگا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔

”جی ہاں! صحت کا بھی خیال رکھا کرو..... بڑ بڑو رنگت مانہ پڑتی جا رہی ہے، رات بھی بارہ بجے کے بعد آئے ہو، مانا بتا رہی ہیں تمہاری۔“ ان کے ٹوکنے پر وہ غری سے مسکرایا تھا کہ حرم کو شرارت سوچ گئی تھی۔

”چاہو انہیں فیکس کریم کر سکتی ہیں۔“

”دکھائیں..... چند روز دن کا کھار..... گارٹی کے ساتھ، اگر بڑ یادہ بڑی ہیں تو میں لا دوں گی ان کے لیے۔“

”ظاہر مسکراتا شریر لہجہ مگر اس میں سوچنا، بہت کو کھار رہی محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے ایک ٹیکسی اور ٹیکسی لگا کر حرم پر ڈالی مگر وہ متوجہ ہی کہاں تھی۔ وہ تو اپنے ہی خیال میں تھی۔

”جتنی بھی بھاگ دوڑ کر لو ڈاکٹر حرم سن.....! بہر حال تم آذر خان کے جیسے تو بھی نہیں بن سکتے..... یاد رکھنا ویسے بھی تم زندگی کو خواہ تو اب مشکل بنا رہے ہو، جتنا پیسہ ہے ناں چاہو کے پاس..... تم چھو کر بھی اڑاؤ تو قسم نہ ہو مگر تمہیں تو.....“ وہ سوچ کر رہ گئی تھی۔ فاروہ نے سر آہ بھر کر عمر کے سامنے ناشتے کے لوازمات کھانے شروع کر دیے۔

”آپ کو جلدی اسپتال پہنچنا ہے بھائی؟“

”ہاں پہنچنا تو ہے۔ غیریت ہے؟ تم کیوں

بھی اس میں حوصلے اور جرأت کی کمی ہے تو اس میں میرا کیا قصور۔" وہ کھس کر بولی اور کانٹے لپکا دے۔ فارہ کو اس کی بات البتہ ہرگز پسند نہیں آئی تھی جیسی گھوڑا۔

"نکومت..... میرا بھائی بزدل نہیں ہے کہ حوصلے کی کمی ہو، بس عزت کرتا ہے تمہاری اور بہت شریف بھی ہے۔" حرم کو یہ صفائی اور یہ طرف داری کرسٹین کر رہی تھی۔ "بھئی پلڑک اٹھی۔"

"افوہ عزت..... بہتر نہ کسی خوش فہمی میں جتنا ہو تو بھڑے اور شرافت کا اوصاف اس تمہارے سامنے چنا ہے، گنہگار کے پورے ہیں موصوف..... پتا بھی ہے اسے کہ مجھے اس کے ساتھ جانچکے پر جیسا پسند نہیں..... اس کے باوجود کٹاڑی کی خرابی کا بھانہ بنا کر مجھے جانچکے پر لے کر گیا..... اور پھر سے اسپیل اٹھی زیادہ..... تاکہ چاہا قاصلہ پر قرار رکھوں مگر کرنے سے پہلے کو اس کا کندھا بوجھنا ہی پڑا....." وہ کھس کر کہہ رہی تھی۔ فارہ کا ہنسنے ہنسنے پر امال ہونے لگا۔

"اس میں خیانت کہاں سے آگئی۔ یہ تو محبت ہے میری جان۔ فاس کے پاس آکر گئے میں بازو حاصل کرتے ہوئے دھڑ انداز میں مشکٹائی۔ حرم نے بھر پور فیس سے اس کے ہاتھ جھٹک دیے اور اسے گھورتے ہوئے قاصلے پر ہوئی۔

"مگر مجھے ایسی محبت نہیں چاہیے۔" اس کا لہجہ انداز قطعیت سے بھر پور تھا۔ فارہ کے چہرے پر تاریک ساسا بیلہ لگ گیا تھا۔

"ایسے مت کہو حرم! مجھے یہ بھائی کا دل نوٹ جانے گا۔ وہ بہت چاہتے ہیں تمہیں..... اس بات کی میں تمہیں گارنٹی دیتی ہوں۔" فارہ تو جیسے تڑپ اٹھی تھی۔ حرم نے نظر یہ کات داد نظروں سے اسے دیکھا۔ "ارسلان بھی بہت چاہتا ہے تمہیں۔ تم نے آج تک اس کی پروا ہی کیوں نہیں کی؟ جبکہ وہ تمہارے ساتھ کھڑا اتنا عجیب بھی نہیں لگتا جتنا تمہارا بھائی اپنے

ادھر اچھوڑا ہوا نشیما کرنے میں مصروف ہوئی، بہت خوب صورتی سے بات کا رخ بدل چکی تھی۔ سماجی مسکراہٹ نکلیں۔

ہاں بیٹے..... اللہ دونوں کی جڑی سلامت رکھے۔ ہزاروں خوشیاں دکھائے، پیارے لگتے تھے دونوں جیسی تو ایک مضبوط بندھن میں باندھ دیا۔ "ان کے جواب پر بھائے خوش ہونے کے وہ غم صم ہونے لگی۔

"شاہ مضبوط بندھن بھی حرم کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا ماما! بس کیا بتاؤں آپ کو وہ کیا حماقت کر رہی ہے، اپنے پیروں پر خود ہی کھانڈی مارنا چاہتی ہے گویا احساس ہی نہیں ہے مگر میں اسے یہ حماقت نہیں کرتے دوں گی۔ وہ میرے بھائی کی بہت اہم و غماز خوشی ہے۔" وہ بعد بخیر ہورہی تھی۔

"تمہارے لیے کھانا لاؤں؟" آفس سے والہی پڑھاب نہیں ہو کے باہر نکلی تھی جب حرم نے اسے بڑے دوستانہ انداز میں آفس کی گئی۔ فارہ کے ہاتھ اپنے گیلے بالوں میں حرکت کرتے اسی وقت یہ پتہ ساکن ہوئے اور چہرے پر بڑا خوشگوار سا جھلکا ابھرا۔ گویا اس نے کھانے کی آفر نہیں کی اس کے بھائی کو قبولیت کی سند بخش دی جو مگر بڑا ہر نعمت دکھائی تھی۔

"کیوں.....؟ آج وہ کھارے رقیب روسیا کا پروگرام نہیں آ رہا ہے کیا ہی وی پر؟ جیسی یہ اخلاقیات بھائی جا رہی ہیں۔" اس جواب پر حرم کی بڑی بے ساختہ قسم کی ہنسی چھوٹی تھی۔

"واہ..... کیا ڈانچا لگ ہے یار..... قسم سے، ویسے میرا خیال ہے یہ تمہیں نہیں تمہارے بھائی کو بونا چاہیے تھے۔" وہ جھوم جھوم لگی تھی۔ صاف ظاہر تھا موڈ تو ٹھکرا رہا ہے۔

"انہیں کبھی تم کوئی موقع دو جب ہے ناں۔" فارہ کا شکوہ جیسے ٹوک زبان پر آدھر تھا۔ "ہونہ..... اگر ایک ڈتے دار پوسٹ پر آکر

دے ہوئے رنگ کی بدولت میرے ساتھ کھڑا ہوا لگتا ہے۔" اس کا لہجہ بے حد تھک چکا تھا اور کات وار تھا۔ فارہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو کر رہ گیا۔ اگلے کئی گانوں تک وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں ہو سکی تھی پھر خود کو خاصی دقت سے سنایا کر بولی تو لہجہ نرمل تھا۔

"بھائی کی رحمت سانولی ہے مگر وہ رزکش نظر آتے ہیں حرم! پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہمارے بزرگوں کی خوشی بھی اسی میں ہے۔"

"میں نے تمہیں اپنے بھائی کی شان میں قصیدہ پڑھنے کو نہیں کہا، اطلاع عرض ہے، محترمہ۔ یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" اس نے فارہ کی بات کاٹی۔

"وہ اور معاملہ ہے اسے چھوڑ دو۔" فارہ نے ایک گہری سانس لی تھی اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس سے لگا ہیں چار کسے بنا اسی جلیبی کی سے بولی تھی۔ حرم کو عجیب سی آگ لگ گئی تھی اس جواب سے جیسا کہ وہ لکھ میں بول پڑی۔

"کیا وہ محبت کا معاملہ نہیں ہے؟ اور کیسی چھوڑ دوں اسے؟" فارہ نے بے بسی کا شکار ہونے ہوئے اسے دیکھا جو بہت کچھ جانتے ہوئے بھی دانستہ سی سی اذیت کا سامان کر رہی تھی اور پیچھے ہٹنے پر آمادہ بھی نہیں لگتی تھی۔

"بتاؤ مجھے؟ کیا کمی ہے ارسلان بھائی میں۔؟ آری میں کبھی ہیں، چند کم ہیں اور سب سے بڑا کہ تمہارے خواہش مند ہیں۔" اس کا لہجہ صاف طنزیہ ہوا تھا۔ فارہ نے ہونٹ پیچھے اور جھکتی ہوئی نظریں اس پر جمائیں۔

"کی تو میرے بھائی میں بھی کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ بھی پڑھے لکھے ہیں، اچھی پوسٹ پر ہیں، اور۔۔۔۔۔" اللہ کے واسطے اب چند کم نہ کہہ دینا۔۔۔۔۔ مانا باقی کی خوبیاں ہوں گی مگر اس معاملے میں بہت

غریب ہے تمہارا بھائی۔۔۔۔۔ مجھے آزر پسند ہے، واضح رہے آزر اور تمہارے بھائی کا کسی بھی لحاظ سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔" اس کا انداز سراسر تحسین اڑاتا ہوا تھا۔ فارہ کا چہرہ ایک دم سے بے تحاشا سرخ پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر اک لفظ کے بغیر وہاں سے جا چکی تھی۔ آج وہ اس کے چھٹکے حیروں سے اتنی ڈبلی ہوئی تھی کہ جواب اسے سرزنش کرنا، صفائی دینا بھی یاد نہیں رہا۔ اسے لگتا تھا اگر وہ اک مل بھی اس بے حس لڑکی کے آگے غمخیز تو اپنا ضبط کھودے گی اور کم از کم وہ اس کے سامنے اپنے آنسو بے مابینیں نہ جاتا تھی۔ آزر خان کا تجزیہ اور تعریفیں تو ایسے کرتی تھی کہ وہ اسے اپنا پر واپ زل ہی تو پیش کر پاتا۔

☆☆☆

میرا ہے دھیان میں سلام کرتا اندر آیا تھا مگر وہاں پہلے سے ارسلان کو برا بھلا پا کر مسکرایا۔ ارسلان کا تپاک بیٹھ کی طرح تھا وہ اٹھ کر بہت نے جوش انداز میں گئے لگا تھا اس کے۔

"ولیمک اسلام۔۔۔۔۔! آپ کیسے ہیں؟" عمر نے اس کا سبب چوڑا۔۔۔۔۔ وجہ سراپا۔ نہایت محبت سے اپنے مضبوط بازوؤں میں، سمیٹا اور مسکرایا۔

"زات کو آیا تھا۔۔۔۔۔" عمر ہوتے ہی یہاں بھاگا آیا مگر لگتا ہے کسی کو ہمارے آنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی۔" اس کی ٹھوکہ کناس نظریں بالخصوص فارہ پر جا پڑیں۔ جو نہیں پتا شے کے لوازمات سمجھ رہی تھی۔ اس کی اس حرکت پر وہ بھی عمر کے سامنے بری طرح شینا کر رہ گئی۔

"ارے نہیں ڈیئر۔۔۔۔۔ تمہیں لگتا نہیں ہوئی ہوگی۔ یہاں سب کے لیے بہت خاص عوتم۔" عمر جو اپنے نکل فون پر کوئی فیسر پیش کر رہا تھا۔ اس کے ٹھوکے کے جواب میں فطری سادگی سے وضاحت پیش کر گیا۔

حقیقی سنا کر تھی۔ جہاں فارہ چوکی وہیں عمر بیل اور خلیفہ سا نظر آنے لگا۔ کوئی وضاحت نہ ہی کوئی اقرار۔۔۔۔۔ البتہ فارہ کے اشتیاق کی کوئی حد نہیں رہی۔

”یہ کب کی بات ہے؟ ہمیں تو پتا بھی نہیں بلکہ بھائی نے ذکر ہی نہیں کیا ہم سے۔“ وہ شاکی بھی تھی اور بے تحاشا پرجوش بھی۔ عمر کی کامیابی گویا اس کے لیے بھی ترقی امتیاز تھا۔ عمر نے اس موضوع کو چلنے نہیں دیا بھی دانستہ بات بدل دی۔

”کاش آپ نے یہ بات حرم کے یہاں سے اٹھ کر جانے سے پہلے کی ہوتی۔۔۔۔۔ اس پانگل لڑکی کو بھائی کی صاحب سے عجیب و غریب قسم کی شکایتیں ہیں۔“ فارہ نے لہجے میں خال خال تھا۔ ارسلان البتہ اس کے احتجاجات عمر سے امتیاز جھگڑا طلب پر ضرور خوش ہوا تھا عمر کی موجودگی میں مکمل کرا عہدہ کرنے سے باز رہا۔

”کیا وہ ابھی تک مسٹر آذر خان سے انسپائر ہیں؟ سنا ہے وہ محترم بھی ڈاکٹر ہیں بیٹے کے لحاظ سے۔“ وہ انجینے میں گھر کر سوال کر رہا تھا۔ عمر کے چہرے پر ایک سپاٹ تاثر ابھرا۔ فارہ نے گہری سانس بھری۔

”ابھی تک سے کیا مراد ہے آپ کی؟“ فارہ نے عمر کو نارمل امتیاز میں دشتا کرتے دیکھ کر ارسلان سے سوال کیا۔

”یعنی میرا مطلب ہے، یہ انسپائریشن تو ہمیشہ رہنے والی ہے، ویسے آذر خان بندہ ایسا ضرور ہے کہ اسے لائیک کیا جائے مگر اس کی یہ پسندیدگی کچھ قابل اعتراض اس لیے ہو رہی ہے کہ وہ اس وجہ سے حقیقی خوشیوں کے دروازے خود پر بند کر رہی ہے، نہ صرف خود پر بلکہ اپنے سے وابستہ لوگوں کو بھی ہرٹ کر رہی ہے۔“ فارہ نے یہ سب کہتے ہوئے عمر کو دیکھا جو کانوں میں گویا کڑوا تیل ڈالے بیٹھا تھا۔ فارہ کو ایک دم سے فضا آنے لگا جیسی وہ پھٹ پڑی۔

”زبلی۔۔۔۔۔؟“ وہ فوراً مکمل اٹھا تھا اور چپکتی جھسم معنی خیز نظروں سے فارہ کو دیکھا جو بہت خوب صورتی سے اسے نظر انداز کیے ہوئے تھی جیسی اس کا من بھر لگ گیا۔

”کیسے مان لوں میرے بھائی۔۔۔۔۔ دو دیکھنے سے آیا بیٹھا ہوں۔ مجھے تو کسی نے چائے کا بھی نہیں پیا تھا۔ اب بھی دیکھ لو۔۔۔۔۔ کب میرے بھائے تمہارے آگے رکھا گیا ہے۔“ اس نے تھلا ہونٹ دبا کر مسکراہٹ شبید کی تھی مقصد صرف فارہ کو کچھ بولنے پر اکسانا تھا مگر وہ ہنوز نظر اندازی کے فارمولے پر عمل پیرا تھی۔ عمر کو ہی معاملہ سنبھالنا پڑا۔

”کیوں جیسی فارہ مگڑیا! کیا واقعی مناسب پر دو کول نہیں ملا ہے کیپٹن صاحب کو؟ بھی خیال رکھا کرو۔“

عمر کا ہلکا چھکا لہجہ ارسلان کے چہرے پر فحاشت بھری مسکان سمیٹ لایا۔ جیسی وہاں حرم بھی آگئی۔ حرم نے دلوں کو ٹوٹھکا اور سواٹیں پھینک کر اسے دیکھا تو صرف سرد نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کیا اور غوث سے سر جھٹک کر فوراً وہاں سے چلی گئی۔ عمر کے چہرے پر تردد سا چمک گیا۔ با واقعی اکتھوٹا نہیں اکتھوٹا جی رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے عمر بھائی، حرم آپ سے خفا ہیں؟“ ارسلان کی قیاس آرائی پر عمر چند ثانیوں کو ساکن رہ گیا۔ اگلے لمحے خود کو سنبھال کر زری سے مسکرا دیا تھا۔

”نہیں، جھپیں تھلا جی ہوئی، تم سناؤ؟“ چاب کبھی چل رہی ہے؟“ اس نے جلدی سے بات چلی تو فارہ سرد آہ بھر کے رہ گئی۔

”بہت اچھی، آپ کے حوالے سے جو خبر تھی جی ہاں اخبار میں وہ چرچی جی میں نے۔ بہت اچھی کاوش ہے آپ کی خبریوں کے لیے اچھا خیال خوانے کی۔ اللہ پاک قبول فرمائے۔“ ارسلان کے سراپے لہجے میں

”بھائی آپ کچھ بولنے کیوں نہیں؟ آپ اسے کول کیوں ہیں آخر؟ وہ آپ کی منگوتہ ہے اور.....“
 ”نہیں..... مجھے برا نہیں لگتا..... شاید اس لیے کہ آذر کو میں خود بھی بہت پسند کرتا ہوں۔ وہ آدرشت ہے اور لوگ اسے لایک کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے اس میں کوئی ایسا برا سامانہ والی بات نہیں ہے۔“ اندر کی تمام تر کیفیات کو کہاں کیے بغیر وہ بہت رومان سے کہہ رہا تھا۔ ارسلان نے عجیب لگا ہوں سے اسے دیکھا جبکہ فارہ کے چہرے پر دوا بدامنی تھا۔

”مگر وہ پسندیدگی کے اس راستے پر اندھا دھند جس طرح بھاگ رہی ہے بھائی یہ تشویش ناک امر ضرور ہے..... محترمہ کے مستقبل کے ارادوں کا شاید آپ کو پتا نہیں..... شو بزم میں نام کتنا چاہتی ہیں، آذر خان کے ساتھ کام کرنے کے خواب دیکھتی ہیں محترمہ۔ بقول اس کے وہ اس گھر کے دیگر کنبھوں کی طرح کنویں کی مینڈک نہیں بنے گی۔“ فیصلے انداز میں وہ تیز تیز بول گئی۔ میر نے بے اختیار نظر میں چہ الیں۔

”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں، مگر چاہو، چاہی جان کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو.....“
 ”یعنی وہ شو بزم میں جائے وہ کام کرے، آپ کو اعتراض نہیں ہوگا؟“ فارہ شاندار سی عمر کو بچھڑی تھی۔
 عمر نے گہری سانس بھر کے کاندھے اچکا کئے۔

”میں اعتراض کیوں کروں گا؟ میں آج تک اس کے راستے کی دیوار بنا ہوں نہ بٹنے کا ارادہ ہے، اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسند کا راستہ چلی لے۔“ اب کی مرتبہ عمر کا لہجہ دھیمہ مدھم اور عجیب سی یاسیت لیے ہوئے تھا جسے فارہ ہی محسوس کر سکتی تھی۔ وہ خاموش مگر اندر وہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی..... پھر ہم آٹھویں بج گئی تھی تیزی سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔
 ”اگر حرم نے میرے بھائی کا دل ہمیشہ کو کھلایا تو میں کبھی اسے حریف نہیں کروں گی۔“ سارا دل وہ یہی

سوچ کے خود سے عہد بانداختی رہی تھی جبکہ دوسری جانب عمر حسن تھا۔ جس کے اندر آج کی باتوں کے بعد عجیب سی بے چارگی وہ بے مانگی اتر آئی تھی۔ وہ فارہ کی طرح جذباتی نہیں تھا..... نہ اپنے جذباتوں میں بے اعتبار..... اسے خود پہ بھی اعتبار تھا اور وہ اپنے جذبات کی پامالی ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اب بھی جب وہ ان کے ہاں عارضی طور پر رہنے آئی تھی تو ساتھ میں آذر خان کے بڑے بڑے پوسٹر بھی اتار کر لانا نہیں بھولی تھی۔ جب وہ بہت ذوق شوق سے انہیں کمرے کی دیواروں پر چھانے میں مصروف تھی۔
 فارہ خاموش نہیں رہ سکی۔

”چند دن کی بات تھی، کہا ضرورت تھی ان تصویروں کو اتار کر لائے گی..... خری فضولیات۔“
 ”خیر..... جو اند کو کچھ کہا..... اور سنو.....“

ابھی تو ضرورت تھی۔ جی بات ہے تمہارے بھائی کی نفسی حالت دن دینے اور سنے کا حوصلہ نہیں تھا مجھ میں..... فرائض میں کا یہ سامان ضروری تھا۔“ اور عمر جو کسی کام کی غرض سے فارہ کو کچھ کہنے آیا تھا جی بات سن کر ہی اسے قدموں مڑ گیا تھا۔ دیکھ کی بات حرم کے لگاؤ کا نہیں اس کا جتنا تا لہجہ تھا۔ وہ اس کی دردناکے میں جھلک دیکھ لینے کے بعد ہی اتنی سناک ہوئی تھی پھر اس کے بعد بھلا تھا کس تھی کہ وہ کوئی خوش فہمی پاتا، کوئی خواب بنتا..... فارہ تو پاگل تھی، اس کی امیدیں بھی اس کی طرح سادہ اور معصوم تھیں جبکہ وہ تو احمق تھا نہ ہی خوش فہم۔

☆☆☆

”جان چھوڑ دو مجھی اس کی..... اب ذرا بڑھائی بھی کرلو۔“ انگریز اندر نزدیک ہیں تمہارے۔“ اسے فی دی میں گن دیکھ کر فارہ جو اس کی لان کی شرتی رہی تھی تو کہے ہوئے ہوئی۔

”یار یہ آذر کو کیا سوچتی؟“
 ”کیا ہو گیا.....؟ خیر بحث؟“ وہ شرٹ مشین

جب میرے کفیل میرے والدین تھے اور میں نابالغ
..... ایسے نکاح کو لڑکی کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ نابالغ
ہونے کی صورت میں قائم رکھنا چاہتی ہے یا
نہیں؟“ ایک ایک لفظ چبا کر کہتی وہ اس قدر بے حس
نظر، سفاک اور بے لحاظ لگتی تھی مگر کچھ تو تمام تر ضبط
تھل اور برداشت کے باوجود دھواں دھواں ہو کر رہ گیا
تھا۔ جمی وہ فی الفور خود کو نہیں سنبھال سکا اور کچھ کہے
بغیر وہاں سے ہونٹ پیچھے ہوئے تیز قدموں سے
واپس چلا گیا۔ اس کے بعد فارہ اور حرم کے درمیان
کیا اور کس طرح بات ہوئی وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ جانتا
بھی نہیں چاہتا تھا۔ حرم کی اس قسم کی فضول اور بے لگ
باتوں اور حرکتوں کو آج سے قبل وہ اس لیے بھی نظر
انداز کرتا رہا تھا کہ اس کے خیال میں وہ ابھی کم عمر اور
بے تجربہ تھی۔ اتنی بچہ بنی عمر میں لڑکیاں ویسے بھی نادان
اور بہت چلبھالی ہوتی ہیں مگر اس طرح قدم قدم پر
اسے حقیر کر دینا اور بے مایہ کرنا بھی اسے زیب نہیں
دیتا تھا۔ کتنی دیر وہ ٹھنڈی ٹھنڈی اندر جا کر اٹھنے والے
الاؤ کو بچھانے کی سعی کرتا رہا تھا۔ تب ہی دروازہ کھ
دھک ہوئی اور فارہ اجازت لیتی اندر داخل ہو گئی۔ حرم
نے جھک کر سرگینٹ دروازے سے ٹکرائے کے بھانے گویا
اپنے تاثرات اس سے مخفی رکھنے چاہے۔

”آئی ایم سوری بھائی۔“ وہ اس کے بازو
سے آکر گھٹتی سی سکی۔ حرم نے کچھ کہے بغیر اس کا سر
سہلایا تھا۔

”وہ بہت بد لحاظ ہو رہی ہے۔ مجھے ڈر لگتا
ہے، اس کا کوئی التا سیدھا قدم اس خاندان کو نہ بھیر
کے رکھ دے۔ آپ بھی کچھ نہیں کہتے ہیں
اسے۔“ وہ التاس سے شاکی ہونے لگی۔

”تم پریشان نہ ہو۔۔۔ اس پر کوئی جبر کوئی دباؤ
نہ ڈالو۔ فارہ یہ رشتے ایسے قائم رہتے بھی
نہیں ہیں۔“ حرم نے نرمی سے اسے سمجھایا تھا۔ اس کی
آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے۔ یہ خیال بہت سوبان

سے نکال کر فحشی سے دھماکا کاتے ہوئے بولی۔

”اتنی فضول لڑکی ہے ہمس۔۔۔ اس کے ساتھ
مکھی کر رہا ہے۔“ اس کے لہجے میں تاسف اور
نظر بند کی تھی جبکہ وہ بے نیاز رہی۔

”ہاں تو کیا ہوا۔۔۔؟ مرضی کا مالک ہے ہر
کوئی؟“ فارہ کا اعجاز لاشعوری طور پر جتنا نے والا
ہو گیا۔

”بالکل ہی احمق ہے آرز۔۔۔ اتنی جلدی کا ہے
کی ہے۔۔۔ آخر ہمس میں ہے کیا جو اسے نظر
آیا؟“ سخت مضطرب لگ رہی تھی وہ ہر اعجاز سے
ہونٹ بے دردی سے کھینچتی۔ گلابی نازک موسی
انگلیاں مردانہ فارہ کو بھی اس پر دم آیا۔

”تمہارے اس طرح خود کو بھگانے سے کیا
وہ یہ احتیاط فیصلہ نہیں کرے گا؟ دم نہ کرہ کچھ خود پر کیونکہ
تم میرے بھائی کی امانت ہو۔“

فارہ کی اس درجہ فضول بات پر وہ اتنا جھٹکی کہ
جو ہاتھ لگا اس کی طرف کھینچتی چلی گئی۔ یہ طعنے اس
وقت مزید بے حال کر گئی تھی جب اس نے دروازے
میں کھڑے عرسن کو دیکھا تھا جنہی صحت منانے کو اس
چالٹ پڑ گئی۔

”اپنی مجلس کسی چیز کا ذمہ ہے ذرا اس پر بھی
دماغ کھپایا ہوتا۔۔۔ ہونہ۔۔۔ کبھی کے کمرے میں
آنے سے پہلے غائب دھک دینی چاہیے۔“ لال
جیہو کا چہرہ عین غصیلی آنکھیں۔ اس کا بس نہ چہن تھا
کہ کیا کرے۔

”مانکنڈاٹ حمزہ۔۔۔ یہ ان کی بیوی کا کمرہ ہے،
جس میں آنے سے قبل اجازت کی وضع قانون نافذ
کرتا ہے نہ ہی شریعت۔۔۔ اس سے قبل کہ عمر کچھ بڑا
فارہ نے بہت خوبی سے اس کی طبیعت صاف کر دی تھی
کہ کچھ وہ اس جتنا تے ہوئے اعجاز پر مزید تب گیا۔

”تم بھی غور سے سن لو، بیوی نہیں منکوحہ۔۔۔
اور واضح رہے کہ یہ نکاح بھی میری نادانی کا نتیجہ تھا۔

چہا کر رہی تھی۔

"ہونہ..... بات تو تم اس طرح کر رہی ہو جیسے مجھے ہی تو دیکھیں گے بس وہ محترم....." اور فاروہ کو یہ باز بھرا شکوہ ہی لگا تھا۔ "بھیجی جی جان سے خوش ہو جاتی تھی۔"

"ہوں..... بات تو تم بھی ایسے کر رہی ہو جیسے کبھی کسی موقع پر تم نے انہیں کسی اور پر لائیں مارتے پکڑا ہو۔" اس کے لہجے کی شوخی اس کے الفاظ سے عیاں تھی اور حرم نے جواب میں غصے سے ناک چڑھائی تھی اور کچھ قدر دیر بعد اس میں گویا ہوئی۔

"نہیں بھئی..... یہ اسام تو میں واقعی نہیں لگا سکتی۔ شریف تو جسے اس دور کے کسی مجھ پر بھی لائن نہیں ماری۔" وہ گویا اس کا حقیقی ادا کر رہی تھی۔

☆☆☆

صبح آوازِ خان کی آمد خانوں سے باقاعدہ معنی کی طرف ہو رہی تھی۔ وہی شو بڑ کے چوٹیلے اور اولیٰں، میڈیا ہیرا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ لہجہ کی تھاہیں..... بلکہ ایک ہی جھلجھل تو قریب کو ہوا درست نظر کر رہا تھا۔ حرم سارا دن کمرے میں بند ہی رہی دیکھنے میں مصروف رہی اور ساتھ چلتے کڑھنے میں بھی۔ اگلی صبح پونہر بستی جانے کو چار ہو کر باہر آئی تو چہرہ ٹپٹا ہوا جبکہ آنکھیں بے خواب لگ رہی تھیں۔ فاروہ نے کن آنکھوں سے اسے دیکھتے اس خبر کو خوب مریج مسالا لگا کر سب کو بتایا تھا۔ مقصد اسے دکھ دینا نہیں..... اس پر کچھ باور کرا تھا۔ حرم چپ چاپ اپنا بیگ اٹھائے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لو کے چاہی..... اب اجازت دیجیے۔" وہ ان کے آگے بھگی۔

"بی امان اللہ! میری بیٹی....." انہوں نے اس پر آیت الکرسی پڑھا کر پلوٹیک ماری اور بیٹائی ہوئی۔ وہ باہر نکل تو فاروہ نے جانے کب کی سیٹے میں اٹھی ہوئی سانس آراوکی۔

روح تھا کہ وہ دونوں خدا خواست ایک نہیں ہوں گے۔ "پہلے وہ اتنی بد تمیزی نہیں کرتی تھی مگر اب..... بھائی مجھے بھی کھار لگتا ہے وہ آپ کی توجہ کی خواہش میں یہ ساری فضول اور اوٹ پٹا کھ کر نہیں کرتی ہے، ہے ناں.....؟" وہ کسی خیال میں گم ہوئی کہہ رہی تھی۔ عرصہ کے چہرے پر بہت سا غم کی مسکراہٹ ابھری۔

"خوش لگتی کی حد بھی تم پر ہی غم ہوتی ہے، اسحق لڑی....." اس کا ایک ایک لفظ ذہر میں ڈوب کر ابھرا تھا جیسے فاروہ غصت زدہ رہی ہوگی۔

"نہ کی..... لیکن آپ اسے ڈالنے کا ضرور..... اپنے رشتے کا استحقاق استعمال کریں بھائی..... اگر ڈانٹ نہیں سکتے تو پھر بھی اس سنجیدگی کے دائرے سے نکل کر اس پر بہت توجہ..... بہت محبت لگا کر ضرور پرکھیے گا اسے۔ آئی ایم شیور..... وہ بہت مثبت رہا جس دے گی۔" اس کا لہجہ بہت مضبوط اور حریفانہ تھا وہ محض سر جھٹک کر رہ گیا۔ اس نے کہا نہیں تھا کہ وہ رشتوں میں زور نہ بدلتی اور جبر کا بھی قائل نہیں رہا تھا اور وہ بھی میاں بیوی کا رشتہ.....

☆☆☆

وہ سب ماموں کی طرف آئے ہوئے تھے۔ آج ساڑھ (ارسلان کی بہن) کی ماموں کی تقریب تھی۔ حرم کی سچ دوج دیکھنے والی تھی۔ سلور کلر کے پتلے کے ساتھ ہارل کا سینہ، بالوں کا بہت خوب صورت اسٹائل بنا رکھا تھا۔ اس پر موہیے کے گھڑوں کی کھانچوں میں رہا رہی..... وہ سچ معنوں میں حواسوں پر حیر طاری کر رہی تھی۔ فاروہ نے تو اسے دیکھتے ہی بالکل ماما کے انداز میں ہی اس کی بلائیں لی تھیں پھر شوخی سے آنکھیں کھرا کر بولی تھی۔

"انف..... اتنی تھر سائیاں، آج بے چارے میرے بھائی کی خیر نہیں ہے، صحن کے سارے ہی جھینڈا چیز کر لیے تم نے۔" اور وہ جواب میں ناک

”تم کیا سمجھتی ہو فارہ..... اگر میں ایسا کر لوں گا تو حرم اپنی چوٹیں بدلے گی؟“ وہ جتنی جتنی ہوتی تھی عمر ای حد تک رخ اور سفاک ہو گیا۔ سوال اور نظریں ایسی تھیں کہ فارہ کی نظریں شرمندگی سے جھک گئیں۔ اس کے لہجے کا آٹن کہا کرپ جیسے پھانس بن کر فارہ کے دل میں جو ست ہو گیا تھا۔

”بھائی میں.....“ اسے عمر کا یوں بکھرتا اچھا نہیں لگا تھا بھی بلکہ کہتا چاہا عمر الفاظ اس پلہ ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

”چھوڑ دو فارہ گڑباسب۔ بس جانے دو، جو جیسا ہے اسے چلے دو، ہم اپنی کسی بھی کوشش سے تقدیر کے گتے نہیں پال سکتے..... سوئی ہو یا کسی اس جوکل ہوتا ہے بکھرے اس کے لیے خود کو آج تیار کر کے رکھو..... وہ خود بخود ختم ہو کر اسے حوصلہ دینے کو لفظ ختم ہو رہا تھا۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں؟ اس طرح اسے آذر خان مل جائے گا؟ آپ کی قربانی ہے؟ پالے گی وہ امل لڑکی اس شخص کو؟ بھائی آذر خان جتنی کر چکا ہے اور.....“ وہ بے ساختہ چپٹنے لگی تھی کہ عمر نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ تڑپ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

”فارہ..... کوئل یار..... کیا ہو گیا ہے بیٹے.....“ ایک انٹ ایجی.....“ عمر کتنی محبت سے اس کے آنسو پوچھ رہا تھا۔ بے حد توجہ اور نرمی سے دھیرے دھیرے سمجھاتا ہوا وہ ایک بے حد پیار کا دل کا مالک بہت خاص انسان تھا، ہر گز بھی ٹھکرائے جانے کے قابل نہیں مگر یہ بات وہ..... بے وقوف لڑکی کہاں سمجھتی تھی۔

”تم اپنے دل پر بوجھ نہ ڈالو فارہ..... یقین کرو، مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ میری شادی حرم سے ہوتی ہے یا کسی اور سے.....“ اسے ساتھ لگائے چھپکا ہوا جو کلمہ وہ بہن کو دے رہا تھا اس میں کس حد تک صداقت تھی یہ وہ بھی بہت اچھے سے جانتا تھا اور

”آپ کیسے دیکھیں اس کی ماما..... مانی گاڑ..... جیسے روتی رہی ہو..... مجھے تو اب ڈر لگتے لگے ہیں۔“ فارہ نے جھرجھری سی لی تھی۔ ماما نے سبب کا سٹتے ہوئے چھری ہاتھ میں رکھ دی۔

”پریشانی کی بات نہیں ہے کوئی..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بچیاں اس عمر میں ایسی ہی جذباتی حرکتیں کر جاتی ہیں۔“ ان کی بات پر فارہ کو نقصان سا ہونے لگا۔

”آپ ہی عمر بھائی کو کچھ سمجھائیں.....“ اس کے زور ڈالنے پر ماما نے اٹھ کر اسے دیکھا۔

”مطلب کیا سمجھاؤں؟“ وہ حیران تھیں۔

”یہی کہ حرم سے مکمل کے بات کریں، وہ آخر اس طرح انہیں اگلوں کیوں کر رہی ہے۔“

”ہاں میں کہوں گی عمر سے بھی..... اور خود بھی کروں گی بات حرم سے..... تم پریشان نہ ہو۔“ وہ مسکرائیں تو فارہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

”بھائی ایک منٹ رکھیے.....“ فارہ کے پاس سے پر وہ جو بہت اہم کیس کی فائل کا مطالعہ کر رہی تھیں مصروف تھا جو تک کر چھو ہوا۔ فارہ سانسے بند کر چک تھی مگر یہی تھی کہ اس سے بات کرنے کے مواقع مل گئی۔ بھی عمر نے فائل بند کر کے سائڈ پر رکھ دی اور اس کا لا کر دکھایا جائے کھنگ اٹھا یا۔

”آپ اس پمپا ٹریشن کے لیے کیوں نہیں جاتے آخر؟“ وہ بے حد سنجیدگی سے سوال کر رہی تھی مگر عمر ای قدر راجھسے میں گھر گیا۔

”خیریت..... تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”اک بات مانیں گے بھائی؟“ عمر محض اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی نظروں کا انداز ایسا تھا کہ پتا چکے اس کا مطالعہ جان گیا ہو جیسی بے حد خاموش بیٹھا رہا۔

”آپ حریف بننے کے لیے باہر چلے جائیں بھائی..... پلیز بھائی میری بات مان لیں۔“

خود فارہ بھی..... جیسی وہ مزید دکھ سے بھر گئی تھی لیکن یہاں خاموش رہ کر حرم قائم رکھنا تھا۔ جو آپ اور بھی ضروری ہو تا جا رہا تھا مگر یہ خاموشی کسی کی سکتی ہوئی روح کو مزید بھڑکانے کا باعث بن گئی تھی جو بہت جوش و خروش کے ساتھ فارہ کے پاس آئی تھی۔ واپس چلی تو قدموں سے بے حد کھینچ لینی ہوئی تھی اور آنکھیں برہم دھندلائی جا رہی تھیں۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ بیڈ پر اوندھے منہ گری تھی اور جیسے آنسوؤں کو اپنی من مانی کے لیے آزادی کا پروان مل گیا۔ خود پر جرحایا ہوا خول آج بہت بڑے طریقے سے چٹکا تھا۔ رکتھن کا لفظ جتنا تکلیف دہ ہے اس عمل سے گزرتا اس سے کہیں بڑھ کر اذیت ناک..... وہ تو بار بار اس جائیداد کینیت سے گزرتی تھی۔ بہت فوہری سے ہی ایک طرف محبت کا عذاب اس پر مسلط ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ خود یہاں نہیں تھی مگر اس کے نام کا احساس ایسا بھرپور تھا جو اس کے گرد حصار باندھ رکھتا۔ اس نے ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ حرم کا نام سنا تھا۔ ماما، بابا اس کے تذکرہ اتنے پیار سے کرتے۔ ایسے اس کے عقیدے پر حا کرتے گویا وہ دنیا کا سب سے حسین شخص ہو چکا۔ جب اس نے اسے دیکھا تو وہ چہرہ دیا کاسے سے حسین چہرہ نہ ہو کر بھی اسے سب سے زیادہ پیارا ضرور ہو گیا تھا۔ اس کا سامنا حرم کا رنگ بے اختیار کر دیتا۔ اس کا نام دل کی دھڑکنوں میں انتشار برپا کرتا رہتا۔ لیکن ضروری نہیں جیسا ہم چاہیں ویسا ہو بھی جائے..... یہ شمار اترنے کا باعث وہ باتیں تھیں جو یکے بعد دیگرے ہوتی تھیں۔ ماما کی فرمائش بلکہ بے حد اصرار پر وہ حرم کو پچھس پڑ جانے پر آمادہ ہو پایا تھا مگر بہت جلد مگر کو یہ آمادگی اپنی زندگی کی بھلائی تکلیف دہ تھی۔ وہ اسے دنیا کی ناقص لڑکی تھی تو جب کچھ حرم کی پڑھائی میں عدم دلچسپی اور لا لابی پن تھا۔ دوسری اہم وجہ عمر کی ذاتی الجھنیں تھیں جن کے باعث وہ ہر وقت بھٹکایا رہتا تھا۔ اسی بھٹکا ہٹ میں جب اس

نے معمولی لٹلی پر حرم کو بے دریغ تھپڑ دے مارا تھا تو صحیح معنوں میں حرم کے سترے خوابوں کا تاج مکمل اس درجہ تو چین و غم میں چھل پھل گیا تھا۔ اہمیت و محبت کے جواب میں اسکی بے رغبتی و..... بے اعتنائی کا مظاہرہ اس کے دل کو صرف شامی نہیں کر رہا تھا بلکہ شادی دکھ سے بھی دو چار کر گیا۔ بات اگر یہیں تک رہتی تب بھی ٹھیک تھا۔ کالج میں ایڈمیشن کے بعد جب اسے یک ایڈڈ ڈارپ کرنے کی ڈنٹے داری بھی عمر پر ڈالی گئی جسے طوعاً و کرہاً قبول کرتے وہ اسے نصیحت کرتا نہیں بھولا تھا۔

”بات سمجھو..... کوئی ضرورت نہیں ہے کالج میں کسی کو اپنے اس خصوصی تعلیم کے متعلق داخلہ دے پانے کی جھجک..... اسے چاہئے وہ دیکھے اور مرد اعزاز میں اسے بار بار دیکھے اور حرم کی آنکھوں سے سچے سچے خوش فہمی کے باقی ماندہ احساس میں توجہ کر پھینک گیا تھا۔ اس کے بعد اس حقیقت سے آگاہ ہوا بھی ضروری نہیں تھا کہ مرنے یا پابندیاں اس پر کس وجہ سے لگائی تھیں۔ وہ نہ صرف چڑی تھی بلکہ ہرٹ ہوئی تھی..... اس تو چن آجیہ انداز پر بھگری گئی تھی۔ وہ محبت جو کسی پر بھی آشکار نہ ہوئی تھی۔ ان جذباتوں کو اس نے اذیت کی آگ میں چلنے دیکھا تو جو با اہتمام پراثر آئی۔ نازک، معصوم اور دلچسپی اور محبت حرم بہت آگے بڑھتی اور بے لحاظ ہو گئی تھی مگر اس کی اصل وجہ سے تو کوئی بھی آگاہ نہیں ہو سکا۔ یہ تو اس کی قسمت الجھی تھی کہ مگر کے بھی افرار کیڑک اور لوٹک تھے۔ اس کی بدقیازی کو اگنور کر کے محبتیں لگانے میں مصروف..... ایسے میں وہ کہاں تک یہ روش اپناتی جیسی یہ ہتھیار کند ہوئے تھے..... مگر حرم کے لیے نہیں..... اس کا عہد تھا خود سے..... اس نے اس شخص کو اپنے سامنے جھکا دیا تھا..... کھیرنا تھا مگر انا اسے کتنے لگا تھا کہ وہ خود کھیر گئی ہے..... ٹوٹ رہی ہے..... آذر خان اور اس سے وابستہ ہر بے وقوفی سر اس عمر کی توجہ حاصل کرنا کسی طرح بھی کسی مگر اسے

شرمندگی اور یوگلا ہٹ سے وہ جا رہا ہوا تھا۔
 ”کون.....؟“ وہ ڈریجک روم سے ہی
 پوچھنے لگا۔

”سوری میں کچھ دیر میں آجاتی ہوں۔“ اس کی
 آواز پر وہ واپس پلٹ گئی۔

”مجھے وائٹ ڈرائس کی شرٹ ہی نہیں مل
 رہی..... پتا نہیں فارو نے دھلائی کے بعد میرے
 کپڑے واپس کیوں نہیں رکھے۔ وارڈ روپ
 میں..... پلیر تم میری مدد.....“ عزم ان سنی کیے تیزی
 سے نکل آئی۔ دل خالی سا تھا مگر اب اس میں جھپ
 اچھل بچھل مٹی تھی۔ ہونٹ کھینچے ہوئے وہ واپس اپنے
 کمرے میں آئے کمرے کے سونے پر ڈھسے گی۔ یہ فیصلہ ہرگز
 بھی آسان نہیں تھا۔ محض انا کی سر بلندی کی خاطر وہ
 نیٹ کی دقت پر بھی اختیار کر سکتی تھی اس سے۔ عرصہ
 کی عمر بھر کی نگہبانی کو سہنا بھی آسان نہیں تھا۔ وہ اس
 کا جبری لاییت سے خود کو بچانا چاہتی تھی۔ اس سے دور
 بہت دور جا کے..... یہ ضروری تھا اس کے لیے۔

”خیریت.....؟“ مجھے لگا تمہیں کوئی کام تھا مجھ
 سے..... میں نے مناسب سمجھا پوچھ لینا.....“ اس کی
 سوچوں کے بہاؤ کو روکنے کا باعث دروازے پر
 دھک کے بعد ابھرنے والی عرصہ کی ہماری آواز
 تھی۔ وہ سلیپنگ گاڈن میں ملیں آنکھوں میں نیند
 کے خمار کی سرخی لیے کتنی چمید کی سے متوجہ تھا اس کی
 جانب..... حرم چنداںوں کو کچھ بولنے کے قابل ہو سکی
 نہ اس سے لگا ہٹانے کے۔

”اچھا کیا آپ نے..... یہاں تشریف لے
 آئے اگر یہ زہمت کر لی لی ہے تو.....“ اس نے پہلے
 خود کو سنبھالا تھا پھر اپنے دل اور نظروں کو قابو میں
 کرنے کے بعد اپنے مخصوص کاٹ دار لہجے میں گویا
 ہوئی تھی۔ عرصے کو کچھ وقت کیا پھر قدم بڑھا کر کمرے
 میں اس کے قریب مقابلی صوفے پر آ بیٹھا..... اتنا تو وہ بھی
 جان گیا تھا حرم نے اگر رات کے اس پیر کا انتخاب کیا

اس نظر اندازی سے روکنا تھا..... مگر اک وقت آیا تھا
 جب اسے لگنے لگا ایسی محافقتیں کر کے اس نے خود اپنی
 راہوں میں کاٹنے بچھا دیے ہیں، عمر کی بے نیازی تو
 کیا ختم ہوئی۔ وہ تو اسے خود سے کچھ اور بھی فاصلوں
 پر محسوس ہونے لگا تھا..... اور یہ نقصان ایسا نقصان تھا
 جو اسے ٹکھنوں کے حساب سے مڑلاتا تھا، بھجھلائے رکھتا
 تھا اور فارو کا خیال تھا۔ وہ آذر خان کی کسی اور میں
 انوالومنٹ سے بہت ہوئی ہے۔

اب کے عمر کے الفاظ اس کے اندر خانے اتار
 گئے تھے..... اسے واقعی اس کے ہونے نہ ہونے سے
 فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ خیال..... یہ احساس بھٹنا بھی
 ہلکے آئینہ اور دھشت انجیز کسی مگر وہ کوئی حقی فیصلہ
 کرنے پر ضرور مجبور ہوئی تھی۔ بہر حال اسے عمر بھر کی
 یہ ذلت یہ نظر اندازی ہرگز گوارا نہیں تھی۔

☆☆☆

اس نے ٹھہلا موقوف کیا اور مضطرب نظروں کو
 وال کلاک کی جانب پھیرا..... رات کے گیارہ بجے
 رہے تھے۔ فارو اس وقت تک لازمی سو جاتی تھی۔
 چاچا اور چاچائی تو رات کے کھانے کے بعد ہی اپنے
 کمرے میں چلے جاتے تھے۔ ان کی مداخلت کا ہرگز
 خدشہ نہیں تھا۔ گہری سانس لے کر اس نے خود کو
 قدرے کچھڑ کیا اور آگے بڑھ کر احتیاط سے دروازہ
 کھولا۔ راہداری نیم تاریک اور سنسان تھی۔ عرصہ
 روشنی میں میران کا رہت کا گلابی ڈیزائن موتیوں کی
 طرح چمکتا نظر آتا تھا۔ جیسے رو دیتی ہوئی وہ بے آواز
 قدموں سے آگے بڑھتی عرصہ کے کمرے کے
 دروازے پر آئے رکی۔ دھک کو اٹھا ہاتھ پھر سے
 احتیاط کا دامن تھا پھلوں میں گر گیا۔ عرصہ ہی آواز پیدا
 کر کے بھی وہ کسی کو چھٹانے کے حق میں نہیں تھی۔ یہ
 احتیاط اس امر میں راز داری کی اہم ضرورت تھی۔
 تاب سمجھا کر اس نے دروازہ کھلایا اور ڈوبے دل
 کے ساتھ اندر قدم دکھ دیا مگر پہلے ہی سر چلے پر

ہے تو وہ مگر کے افراد کے سامنے یہ بات کہنے سے گریزاں ہوگی۔ اس نے اپنی سوالیہ نگاہوں کو حرم کے چہرے پر جمایا تھا لگائی چہرہ اس میں حشمت اور کستا ہوا لگتا تھا۔ تم بچوں کا جو جمل پین دکھائی دیتے ہوئے تھا۔

لگائی چہرہ کی لڑکی

اس کے ذہن میں ایک نظم کا مصرعہ گردش کرنے لگا۔

”تمہیں اندازہ تو ہو گیا ہوگا مہر حسن کہ ہم دہلی اعتبار سے بہت فاصلے پر ہیں، مجھے نہیں لگتا کہ ہم دونوں اس بندھن کو بھانسیں گے جو بہت پہلے ہمارے بزرگوں نے باندھ دیا تھا۔ ہماری رضا مندی کو اہمیت دیے بغیر۔“ وہ جتنے رومان سے گویا ہوئی تھی، مگر کا چہرہ اسی تیزی سے پھیکا پڑنے لگا۔

”تم میری ناپسندیدگی سے آگاہ تو ہو چکے ہو گے۔۔۔۔۔ ایسے میں تم جا ہو گے کہ زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے کر چلو۔ کیا اس مقام پر جب وہ سب باردی تھی۔۔۔۔۔ اس نے اپنی عزت کس قدر خودداری کو بھر بھی ہارنے نہیں دیا تھا۔ مہر حسن نے ہونٹ سمجھنے لیے تھے۔۔۔۔۔ اتنی بے دردی سے اتنی سختی سے کہ منہ میں خون کا ٹھیکن لگتا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ وقت اس کی زندگی میں آتا ہے، اس کے باوجود وہ خود کو تیار نہیں کر سکا تھا یہ کہ زمانہ اس کی اپنی غلطی تھی۔

حرم نے اس کی جلد خاموشی پر اسے بخند دیکھا تھا۔ اس مقام پر جب وہ سب بارے پر آمادہ تھی مگر دل کے کسی کونے میں ایک خواہش بھی تھی۔ وہ دروایتی مشرقی ہونٹ کی طرح ری ایکشن ضرور دے۔۔۔۔۔ پھر جائے، اسے جیسے پھر رسید کر ڈالے۔۔۔۔۔ مگر اس پر اپنا حق جتانے اور اس کا مطالبہ ماننے سے صاف صاف انکار ہی ہو جائے۔۔۔۔۔ اس کی رضا پر اپنی مرضی کو ترجیح دے اور اس کی ماننے سے صاف انکار کر ڈالے مگر یہ سب ہوتا اگر مہر حسن کو اس کی ضرورت ہوتی۔ اس

کے الفاظ نے ثابت کیا تھا، اسے اس کی ضرورت بھی تھی نہ ہوگی۔

”ہاں، میں آگاہ ہوں۔۔۔۔۔ اور زبردستی کا قائل بھی نہیں، تم بے فکر رہو میں وہی فیصلہ کروں گا جو تمہاری خواہش کے مطابق ہو۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ اس کے تاثرات دیکھے بغیر چلا گیا تھا۔ حرم۔۔۔۔۔ بے مائیگی اور فکری کے احساس سمیت اس سیکے سے نکل کر پھوٹ پھوٹ کر دوتی چلی گئی۔ اس کا آخری وار بھی بیکار گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر جینے کی خواہش میں بری طرح کٹ گئی تھی۔ عمل طور پر بارگزی تھی۔

☆ ☆ ☆

”مجھے ان باتوں سے ہرگز کوئی مطلب نہیں ہے مام۔۔۔۔۔ میں بس جانتا جا رہی ہوں کہ آپ فوراً سے چتر چلیں گی۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی، ایک۔۔۔۔۔ میں نہیں۔“ اسے یہاں میں اندر آتی ہوئی قارہ سے اس کی چمکانی تندہ تیز آواز تھی تو ایک دم جیسے ایک سے رو گئی۔ وہ سب فون پر بچہ گنگو تھی۔ چہرہ خنک و فیس کی زیادتی سے جیسے انکار ہو رہا تھا تو آنکھیں خون چمکانے پر آمادہ تھی تھیں۔ دوسری جانب مام نے کیا کہا تھا قارہ کو مطمئن ہو سکا کہ وہ تو اس کی آخری بات کو سن کر شدید جسم کی تشویش میں مبتلا ہو چکی تھی۔

”بھج جانا آخر ضروری نہیں ہے، کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔۔۔۔۔ اور سن میں میرا دماغ ہرگز بھی خراب نہیں ہوا ہے۔“ اب کے وہ جینے کے انداز میں کہہ رہی تھی مگر گلے میں اتنی کمی نے اس کی آواز سے تھا شاید جمل کر دی تھی۔ دوسری جانب مام نے اس مطالبے۔۔۔۔۔ یقیناً اسے جھڑپائی تھی جیسی وہ ایک دم سے سلسلہ منقطع کرتی طیش میں سب فون دیوار پر کھینچ مارنے کے بعد یقیناً انکا اقدام دھواں دھار انداز میں رونے کا انجام دینا چاہتی تھی کہ اس پر نگاہ پڑتے ہی پھرے کو دھواں ہونے سے نہیں بچا سکی۔

”اتنی خفا کیوں ہو حرم؟“ اسے تیزی سے پلٹ کر

تھی..... سسکا ہاں بھی بھرے گی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ
مصلح آدمی تھے بعد مریم حسن اس کے سامنے تھا۔ تمام
ترہ پریشانی و تشویش کے آثار چہرے پر چائے ہوئے۔
"فارہ....." تم ٹھیک ہوناں کیا ہوا ہے؟"
اس کا اضطراب چھلکا پڑتا تھا۔

"اس بات کو چھوڑیں، یہ بتائیں آپ مگر کیوں
نہیں آ رہے تھیں دنوں؟ کس سے بھاگ رہے
ہیں؟ اور حرم کو کیا کہا آپ نے کہ وہ یہاں سے جانے
پر مجبور ہو گئی۔" فارہ کی نظریں اس کے چہرے پر جس
مستحکم انداز میں جمی تھیں اس کے الفاظ کی نسبت حرم کو
ان نظروں کے کشاکش..... اعزاز سے تکلیف سے
دوبھاری تھا۔

حرم کے تمام فیصلے اس کی ذاتی سوچ اور پسند
کے مطابق ہوتے تھے، میرا ان میں ہرگز بھی کوئی دخل
نہیں تھا۔ میں نہیں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں، بہتر
ہے تم خود کو اس معاملے سے الگ رکھو۔" وہ بولا تو اس
کا لہجہ بے حد سرد اور فصیلا ہو رہا تھا۔ فارہ تو اس کو
اسے نصیحتیں دیکھ کر ہی مستحضر ہونے لگی۔

"بات سنیں بھائی.....! آپ میری بات کا
جواب دیے بغیر نہیں جاسکتے۔ اس لیے بھی کہ میں پہلی
بار حرم کو نہیں آپ کو خطا سمجھ رہی ہوں۔ اس رات میں
نے خود آپ کو آدمی رات کے بعد حرم کے کمرے سے
نکلنے دیکھا تھا۔ حرم کے اس فیصلے کے پیچھے یقیناً یہی
وجہ....." عمر جو دروازے تک پہنچ گیا تھا کچھ ایسے
زمین میں گڑا کہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکا۔ لیکن
کے الفاظ نے اسے عرق ریز کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ
نظریں نہیں اٹھا سکا، اس کی ساتھیوں سن رہی تھیں۔
ہوٹ بجھنے وہ ایک لفظ کے بغیر پلٹا تھا اور راہ میں آئی
ہر شے کو ٹھوکر دینے کی زد پر رکھتا تھا۔ حدِ خطرناک سڑکیں
جس وقت حرم کے سامنے آ رہی سردرد کی دوا لینے کے
ارادے سے لیکن میں آئی تھی مگر اسے سامنے پا کر وہ
بھی نہایت خوفناک تاثرات کے ساتھ چند لمحوں کو

باہر جاتے دیکھ کر وہ بے حد دلچاست اور عاجزی سے بولی
تھی۔ حرم کے آنسو گالوں پر اتر آئے۔ فارہ کو ان
آنسوؤں نے شدید حرم کے کرب سے دو کار کر ڈالا تھا۔
"اگر ہماری کوئی بات بری تھی ہے تو میں معافی
مانگ لیتی ہوں۔" اس کی اپنی آواز بجھنے لگی۔ اسے
ابھی ابھی اعزازہ ہوا تھا حرم کوئی عزیز ہے اسے۔ اپنی
تمام تر بے اعتنائیوں اور بے دردی کے باوجود بھی۔

"تمہیں اگر معاف کر بھی دوں ناں فارہ تو
تمہارے بھائی کو نہیں کر سکتی۔ شدید نفرت ہے اس
سے مجھے، صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی ہوں میں اس
کی۔ اسی لیے یہاں سے جانا چاہتی ہوں، سنا تم
نے.....؟" وہ لمبی بھرے لہجے میں فرمائی تھی اور کتر کر
بھاگتی چلی گئی جبکہ فارہ کتے کے عالم میں کھڑی کی
کھڑی رہ گئی۔ وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کی ضد اور خود سری کے سامنے وہ سب بے
بس نظر آ رہے تھے۔ چار چنگ بھی یہ بات پہنچ گئی اور
چاہی..... یہ پہلا موقع تھا کہ حرم کے اپنے شدید
روئے کے باوجود وہ حرم سے تعلق نہیں ہو سکی۔ بکواسے
بھلانے اور مرنے کی کوششیں صرف رہیں۔

"ان سب باتوں کا آپ کوئی فائدہ نہیں ہے
فارہ! فارگیت اٹ....." فارہ کی دلجوئی سے بھی وہ
نارل نہ ہو سکی۔ یہ سب کہتے ہوئے جتنی مایوسی اس
کے لہجے میں اتری تھی فارہ کو اس نے مزید اپ سیٹ
کر دیا تھا۔ کچھ کے بغیر وہ اس کے سامنے سے ہٹ گئی
تھی اور مسلسل عمر کا ٹمبر مارا کہ یہی تھا خنکرتی رہی۔
"آپ فوری طور پر مگر آ کے میری بات سنیں۔"
"خنکرت.....؟ تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"
جواب میں مریم حسن نے سنجیدگی سے نہیں دیکھا۔

"یہ تو آپ کو رو رو ہی بتا سکتی ہوں میں
..... بس مگر آج میں فوراً اور نہ میرا دماغ چھٹ جائے
گا۔" اس کے فیصلے نے جواب دیا تو وہ صرف جھنجھکی نہیں

اور خاص محرک نہیں ہے۔ "ایک، ایک لفظ چبا کر کھتا اسے سمجھتا اس میں ہمیشہ سے کہیں زیادہ گروڈ اور سفاک لگا تھا وہ حرم کو۔ اس کے اسی شہ پر موڈ میں واپس لوٹ جانے کے بعد وہ جیسا ہی کھٹکی کے احساس سے دوچار ہوتی وہیں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ اسے کچھ نہیں آسکی اس شخص کی بدگمانی پر آزدہ ہو یا پھر اس کے ہمیشہ کے لیے مل جانے پر باقی تمام نقصانات بھلا کر غوثی منائے۔

☆☆☆

"یہ تو کمال ہی ہو گیا ہے بھئی! بھائی نے تو بالکل ہیر ہوا! کام کر کے دکھایا۔ کاش میں نے بہت پہلے اس پر شک کیا ہوتا چاہے مجھ کو ہی تھی۔ ورنہ اب کے مجھے بہت پہچانی ہی یہ کام انجام پا گیا ہوتا۔" عمر نے کس طرح بات کی تھی۔ ان کی شادی کی تاریخ بھی سنے ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ مام اور ڈاڈے نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ لوگ جی کی ادا نیکی کے فوری پور پاکستان آرہے تھے۔ البتہ تاریخ مقرر کر کے شادی کی تاریخوں کی اجازت ضرور دے دی تھی پھر وہ جتنی ہراساں بھی بیچ کے یہ دن اتنی ہی تیزی سے گزرتے چلے گئے تھے۔

"تم بتاؤ بورانی.....! ابھی سے رخصت ہو کر جانا ہے یا آپ کے دو گھارا چا کے گھر ابھی سے لے چلیں؟" فارہ جتنی خوش تھی اسی حساب سے اس کا موڈ خراب ہوا تھا۔ سننے ہی پہلے سوچ رہے تھے۔

"تم نے کیا کہا تھا عمر سے فارہ کہ وہ اتنے فیسے میں تھا جبکہ تم جانتی تھی ہو کہ میں نے اس کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی تم سے۔" حرم کا ذہن اسی ایک بات پر اٹکا ہوا تھا..... اسے نقصان اور نقصان کے اس سلسلے کو رد کیا تھا۔ وہ اسے صرف ناپسند نہیں کرتا تھا۔ اسے اب غلط بھی سمجھتا تھا اور زندگی غلط گئیوں اور نفرت کی نذر کرنا ہرگز مصلحتی نہیں تھی۔

"سوئی یاں..... اس روز تمہاری محبت میں

خائف ہو کر رہ گئی۔

"چلو میرے ساتھ....." اس نے حرم کا ہاتھ دو بچ کر چھین لیا۔

"کیا بد تمیزی ہے یہ..... چھوڑ دو مجھے۔" وہ حواس ہائے ہو کر کہتی۔

"تم خود وضاحت کرو گی جو بھی کہو اس تم نے فارہ کے سامنے کی ہے سمجھیں؟" اس کی کھائی کو زور دار بھٹکا دیتے ہوئے وہ دے ہوئے لہجے میں جواب دیا یا تو حرم کی گھبراہٹ ابھرنے میں بدلنے لگی۔

"واٹ نان سٹس..... مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی تم کیا چاہتے ہو اور دوسری بات یہ کہ اپنی حد میں رہو۔ میں تمہارا گھر چھوڑ کر یہاں آئی ہوں تو اس کا صاف مطلب یہی لگتا ہے مجھے تمہاری شکل ہی نہیں دیکھنی۔" اس کے لہجے میں جتنی بھی اتنی اور غصے کی وہ اس کے لیے تیار تھا مگر عمر اس میں جیسے تمام لحاظ بھلائے بے حد ہلکے ہوئے انداز میں اسے بازوؤں سے جکڑ کر اشتعال پھرے انداز میں اپنے رویہ کو چھینٹ لایا۔

"تم نے جینے کی چاہی تھی مجھ سے..... میں یہ تمہارا مطالبہ ضرور پورا کروں گا مگر تم سے اب داس صاف رکھنے کی خاطر مجھ پر کچھ کڑا چھوڑا ہوتا..... میں رات کو تمہارے کمرے میں غلط ارادے سے کھسا تھا اسی لیے تمہیں میرا گھر چھوڑ کر آنا پڑا؟ مگر تم حرمت صلب! یہ فضول کہانی سناتے آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے تھا کہ آپ میری منکوحہ تھیں، میرا اہل کسی بھی لحاظ سے ناجائز نہیں تھا۔ جسے آپ نے ناجائز بنا کر پیش کیا گو کہ تم بھی جانتی ہو میرا ارادہ کیا تھا مگر اس کا بہتان تم اس طرح جھٹکتی کہ میں اب ہرگز بھی تمہارے ساتھ تعاون پر آمادہ نہیں ہوں، تمہاری تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود تم سے ہی شادی کرنا پڑے گی تو اس کی وجہ صرف اپنی نہیں مجھے تمہاری عزت کا بھی ہرم رکھنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس فیصلے کے پیچھے کوئی

جانسنی جھگڑانے لگی

اس کا دل لمبے کے ہزاروں حصے میں اچھل کر مچل میں آ گیا۔ وہ جیسے بنا آہٹ کے آیا تھا ویسے ہی چلا بھی گیا۔ حرم نے قہقہے کے ساتھ فاروہ کو دیکھا جو کھڑے زردی کھڑی تھی۔ فاروہ بھلا کر اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ "بھائی..... میری بات تو سنیں۔" مگر وہ ان سنی کر کے باہر نکل گیا۔ حرم منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں دہاتی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

"میرے خدا یا..... کیا ہو رہا ہے یہ میرے ساتھ....." اس کی آہیں کراہوں میں بدلنے لگیں۔ فاروہ اسے سنبھالنے کی کوشش میں ہلکا سا تھکی جو ریت کے ماتھے پر گر کر ٹھہر رہی تھی۔

☆☆☆

اسی نے ہونٹ تھکی سے جھپٹے اور اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ ایک دھماکے سے بند کیا تھا۔ اس انکار کا بڑا دل آگاہی شدہ تھا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ مہیاپہ تو جیسے ٹپکی طاری ہونے لگی تھی۔ اتنی جتن سے دو ٹوک انکار وہ بھی شادی سے دو دن پہلے جبکہ کارڈ تک بٹ بٹکے تھے اور شام میں ماہیوں کی رسم ادا ہونا تھی۔ مہمانوں کے ساتھ خود حرم کی پہلی بھی آج ہی سعودیہ سے یہاں پہنچ رہی تھی۔ مگر جیسے جگہ شخص سے تو انہیں پر گز رہی ایسی جذباتیت اور اطمینان بات کی توقع نہیں تھی مگر اب وہ جس شدت سے اپنی بات پر انکار تھا اور کسی کی پروا نہیں کر رہا تھا یہ بات بہت تشویش ناک تھی۔ ان کے اعصاب مفلوج ہونے لگے تھے جیسی.....

بہتر اثر شوٹ کرنے لگا۔

حرم اور فاروہ تک بھی یہ خبر پہنچ گئی تھی۔ حرم کا رنگ تو بالکل سفید پڑنے لگا تھا۔ فاروہ ماما کی بیٹی سے لگ کر جیسی تو حرم کچھ سوچے کچھ باغ و نمے کی شدید کیفیت میں عمر کے کمرے تک پہنچی آئی تھی۔ مگر جو بیڈ کی پانچویں پر لگا جوتے اتارنے میں مصروف تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی بیٹھانی ناگواری کی شکلوں سے بھر گئی۔

"شادی سے انکار کیوں کرو ہے ہو تم؟" وہ

میں کچھ باہر ہو گئی تھی بھائی سے بات کرتے ہوئے لیکن دیکھو ناں..... نتیجہ تو اچھا ہی نکلا۔" فاروہ نے دانت نکالتے ہوئے حدودِ حماقت کا ثبوت پیش کیا۔ حرم اسے دیکھ کر رہ گئی..... ہونٹ کھینچتے ہوئے وہ حطرب سی بیٹھی رہی۔

"تمہارے دل میں کوئی بات ہے..... جو تمہیں پریشان کر رہی ہے تو بتاؤ مجھے؟" فاروہ نے اس کی پریشانی مٹانی نہیں رو سکی تھی۔ حرم نے جواب نہیں دیا تو وہ اٹھ کر اس کے قریب آئی کاٹھ سے پر ہاتھ رکھ کر رمانیت سے گویا ہوئی تھی۔

"بھائی کا عنصر تو اترا بھی گیا ہے پارا کیوں خواہ نکلاؤ پریشان ہوئی ہو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ دلہن بن کر تم اپنی عیاری گتھی کی ان کی رہی کسی ناراضی بھی دور ہو جائے گی۔" اس کا پہلی دینے کا بھی اپنا ہی اسماں تھا۔ حرم بھائے رہائیس ہونے کے چپکس جھپک کر آنسو انداز تارنے لگی۔ فاروہ جو اس کی جانب متوجہ تھی کچھ دسرب نظر آئی۔

"پلیز حرم..... مگر ادا وہ اب ورنہ میں بھی رو دوں گی....." وہ سو رہی تھی حرم نے سر ہٹا کر دھڑکی۔

"وہ بہت ناگلاں ہیں مجھ سے فاروہ.....! سارے بدلے چکائے کا اب..... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، اتنا کہ جتنی چاہ رہا ہے کہ کمرے سے ہی بھاگ جاؤں۔" وہ واقعی رونے لگی تھی۔ ایک لمبے کو تو فاروہ بھی کچھ نہیں بول سکی۔ آکر خان کے حوالے سے اس سے جو حماقتیں سرزد ہوئی تھیں۔ وہ کسی بھی مرد کی اتادِ غیرت پر تازہ یاد ہو سکتی تھی۔

"نہیں اسی آخری حماقت کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ مختصر ماسِ زحمت کی ضرورت ہے نہیں۔ میں شادی سے ہی منع کر دیتا ہوں۔" دنیا بھر کا خشک ترین لہجہ یہ حد قریب سے گونجا تھا۔ حرم کے ساتھ فاروہ بھی ہڑبڑا کر رہ گئی۔ حرم کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے پر لگاؤ ڈالتے ہی جس پر اپنی خوبی کی کاٹھ تھا کہ

ہونے لگا۔ کچھ کے بغیر وہ کرنے کے انداز میں گھنٹوں کے بل بیٹھ گئی اور اپنے منہ پر ہاتھ رکھے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

”بس یہی فکارت تھی آپ کو مجھ سے؟“ اس کے گلے کے ساتھ اس کی آواز بھی بھڑانے لگی۔ مرنے جلا کر اسے اس کے انداز کو دیکھا تھا۔

”ان فضول سوالوں کا اب مقصد؟“

”آپ اس شادی سے منع نہیں کریں گے۔ مرنے بلکہ ایسا مت کریں۔“ وہ عاجزی سے کہتے سکی۔ مرنے اسی حساب سے پہچاننے لگا۔

”میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں، جبر کا بھی نہیں، میں جاننا ہوں کہ پسند نہیں کرتیں مجھے اور۔۔۔“

”آپ پسند نہیں جانتے مسٹر عمر! کچھ بھی نہیں۔۔۔ بات نہیں۔۔۔“

انسانی اور انسانی کے اس اہم موقع پر صورت حال بدلتی ہے۔ لے جیتی۔ آپ سمجھتے تھے میں آپ کو پسند نہیں کرتی۔۔۔؟ مجھے آپ کی سائنوں کی رنگت پر اعتراض ہے۔۔۔ مرنے! وہ منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں دہانے لگی۔ آنسو اتارے بہہ رہے تھے۔

”یہ سب دھوکا تھا، خود کو ڈھانپنے کا ایک بہانہ اور پردہ۔۔۔ میں آزاد خان سے نہیں روزی اول سے آپ سے محبت کرتی تھی۔ اس سے قبل کہ اس کو میاں کرتی۔۔۔ میں نے جانا اس شخص کو میری محبت سے تو کیا مجھ سے بھی غرض نہیں ہے، جسے میرا سامنا خوش نہیں دیتا جسے اس رشتے کی تصدیق پسند نہیں سمجھی وہ اپنا مجھ سے بدعہایہ مقدس تعلق آشکار کرنے سے بالخصوص منع کرتا ہے، وہ مرنے کی بھی جب میرے جذبے کو خیر سمجھتے اور پرانی کے خواہاں بھی، آپ نے ان پر اس ڈال دی۔ اتنی بے دردی سے کہ میں اندر ہی اندر چھٹی اور سسکتی رہ گئی۔ تو چون اور رو ہو جانے کا احساس اتنا جان لیا ہوا تھا کہ میں قدم قدم پر آپ کو رو کرنے اور جھٹلانے میں مصروف ہو گئی۔ بات اگر یہیں تک

منہاں پہنچ کر فرمائی۔

”کیا کرنے آئی ہو یہاں۔۔۔؟ ناؤ گیت لاسٹ فرام ہیئر!“ اسے گھورتا وہ زور سے دہاڑا۔۔۔ لیکن وہ ہرگز خائف نہیں ہوئی۔

”یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔۔۔ جو بوجھ ہے اس کا جواب دو۔۔۔“ حرم کو آگ سی لگ گئی تھی۔ اس کا لہجہ تند بھی تھا اور صراحت بھی۔۔۔ مرنے کو اسی حساب سے قصداً آیا۔

”میں پابند نہیں ہوں تمہارا سمجھیں۔۔۔؟ اور اب یہاں سے جاؤ۔۔۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی وضاحت کی ضرورت اب باقی ہے۔“ اس کے بے لحاظ سرود

سنا کہ انداز نے ایک لمحے کو حرم کو بالکل سن کر کے رکھ دیا مگر اگلے لمحے وہ اس تو چون آئینہ انداز پر پھری گئی تھی۔ جیسی ایک جھٹکے سے اس کا گردن پکڑ لیا۔

”کیسے پابند نہیں ہو تم۔۔۔ کیوں ضرورت نہیں ہے وضاحتوں کی۔۔۔ مسٹر عمر سن تم میری زندگی سے

تعمیل جاؤ۔ مجھے تمہارا بچہ رکھ دو، میں چپ چاپ سہ لوں۔۔۔ کیوں؟“ وہ چھٹی ہوئی آواز میں چھٹے ہوئے بولے گئی تھی۔ مرنے کا چہرہ جانے کس جذبے کے

تحت بے تھا شام سرخ پڑ گیا۔ اس کے پیچھے اس کا ہاتھ اپنے گرد بچان سے جھٹکا تھا پھر درمیان کی فاصلہ بن جایا۔

اس کے بعد بولا تھا اس بچپنے ہوئے لہجے میں نونے کا لچ کے بھی چمک چکی۔

”تمہارا میں نہیں تم خود اپنے آپ کو بھاتی رہی ہو، یہ تمہاری عزت کا ہی خیال تھا کہ میں اس فیصلے پر مجبور ہوا ہوں۔ تم مکر سے بھاگو، اس میں صرف تمہارا

نہیں پردے خانہ ان کا تمہارا گلے کا، یہ منظور نہیں تھا مجھے، بڑے نقصان سے چھوٹا نقصان برداشت کر سکتے ہیں یہ لوگ، لیکن چھوٹا غم۔۔۔ آجائے گا مرنے بھی ان

سب کو۔“ وہ اب اسے نہیں دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں کا رنگ اس ملی خطرناک حد تک سرخ تھا۔ حرم کا شرمندگی کے ساتھ غصہ و ملال سے بھی برا حال

یقین دلانے کو کچھ نہ کچھ تو ضرور کروں گی۔" وہ یک دم بدلی ہوئی مگر خوفناک حد تک سرد آواز میں بولی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتا وہ پلٹ کر بھاگتی کرے سے لگی۔ اس کا انداز کچھ ایسا غیر معمولی تھا کہ مرنے پڑا کر اس کے پیچھے لپکا تھا۔ اسے سمجھنا نہ انداز میں ٹھہر کر اس کی جانب بھاگتے پا کر وہ کچھ اور بھی المٹ ہوا تھا اور اگر ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی اسے پکڑنے میں تو وہ اسی جھوٹی کیفیت میں ٹھہر کر ریٹنگ سے خود کو بچے کرانچکی ہوتی۔

"کیا حماقت ہے حرم۔!" عمر کے اپنے حواس سمجھتا اٹھے تھے اس کی اس وجہ حماقت پر۔ "چھوڑنی مجھے، اس بدنامی سے یہ موت ہزار درجے بگڑے ہوئے ہے جو آپ میرا نصیب کرنا چاہتے ہیں۔" وہ بچی کی جی پھولی قوت سے روتے ہوئے چلائی۔ عمر اسی قدر رونا تھا ہوا۔ بہر حال اس وقت وہ کبھی آکر ڈھونڈ میں اس کے بازوؤں میں تھی کسی کا سامنا ہرگز بھی مناسب بات نہیں تھی جبکہ حرم ایک حشر اٹھا دیتے کے درپے تھی۔

"اوکے، اوکے فائن۔۔۔۔۔ اور ٹیکس حرم! مجھے یقین ہے تمہاری بات کا وہی ہوگا جو تم چاہو گی، ایک ات ایجی۔" وہ اسے نارل کرنے کو قدرے تیز تیز بولنے لگا تھا اور بونٹی تھا سے ہوئے کرے میں لایا۔ حرم خود سسک رہی تھی۔

"پلیز حرم! چپ ہو جاؤ، مان لیا غلطی میری تھی۔" وہ سخت عاجز ہوا کہہ رہا تھا۔ "تم نے یہ سوچا بھی کیسے کہ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ بونٹی سن سکتے ہوئے تھکی۔ "سوری۔۔۔۔۔" عمر نے بلا جھجک کہا۔ انداز جان چھڑانے والا تھا۔

"میں تمہاری جانب سے اعتبار اور رپوٹ عمل کی خواہش مند تھی مگر۔۔۔۔۔" "اگین سوری۔۔۔۔۔" وہ پھر اسی انداز میں بولا۔

روایتی تو بھی ٹھیک تھا میں نے آپ کی توجہ حاصل کرنے کو بے حد فضول حرکتیں شروع کر دیں۔ آواز خان سے صحت اور جذباتی وابستگی کا اظہار۔۔۔۔۔ میرا خیال تھا عام روایتی مردوں کی طرح آپ بھی شدید ری ایکشن دیتے ہوئے مجھ پر اپنا حق جتلائیں گے، مجھے اس حرکت سے سختی سے منع بھی کریں گے مگر آپ کی چشم پوشی نے اتنا مجھے کھیر کے رکھ دیا جب میں نے یہ جانا کہ آپ کو مجھ میں اتنی بھی دلچسپی نہیں کہ۔۔۔۔۔ بات ادھوری چھوڑ کر وہ اور شدت سے رونے لگی۔ عمر سسک زدہ کھڑا تھا، کھڑا رہا۔ غیر جتنی کے شدید احساس سمیت۔۔۔۔۔ یوں جیسے اس کی کبھی ہوئی باتوں نے انہیں میں جھلا کر دیا ہو، محاسن کے تاثرات بدلے، حقیر کی جگہ غفر نے لی اور پھرے کے مصلحت فیصلے انداز میں تن کھئے۔ وہ بولا تو اس کا لہجہ بھی سچ و ترش اور فیصلہ یں لیے ہوئے تھا۔

"میں تو روایتی مرد نہیں تھا، ثابت ہو گیا مگر جس میں بھی خود کو روایتی لڑکی بنا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ مجبور۔۔۔۔۔ بے بس، لاچار، روناؤں میں بھڑکی ہوئی۔۔۔۔۔ معافی بھوئی، لوگ چند دن باخبر ضرور کریں گے پھر بھول بھال جائیں گے، تم میرے لیے غلو کو مصلوب کیوں کر رہی ہو؟" الفاظ ایسے تھے جو پھر چھریاں بن کر حرمت کو گتے تھے۔ وہ پہلے تو جیسے کبھی نہیں، جب بھی تو غم دھیسے اور صدمے کی کیفیت کے باعث پھرا سی گئی۔ یعنی وہ اتنا ہی سمجھا تھا کہ اسے یا پھر اتنا کا صلے پر تھا اس سے کہ جی اور موت کو ہر کچھ بھی نہیں پار رہا تھا۔

"آپ کو میری بات کا اب بھی یقین نہیں؟" وہ بولی تو اس کی آواز میں پانچ کا رنج اتر رہا تھا۔ گلے کی ہمارا ہٹ لچک میں اتر آئی تھی۔

"تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم جو کہہ رہی ہو وہ سچ ہے؟" وہ اتنا تھا ہوا۔ "کوئی ثبوت نہیں ہے، ہاں مگر میں آپ کو

”مجھے دیکھو اور کمزور مرد اچھے نہیں لگتے جو پسند یہ گی کے باوجود اظہار سے ڈرتے ہیں۔“ وہ اسی انداز میں بولی تو اب کے مزور سے چونکا اور اسے بے ساختہ انداز میں لٹکتا چلا گیا۔

”پسند یہ گی کے باوجود.....؟“ اس کا انداز خود نکامی کا تھا۔

”تم کیا سمجھتے تھے کہ مجھے خبر نہیں تھی۔“ میرے دھیان کے تمام ارتکاز تہاری جانب لگے تھے تو کسے ممکن تھا مجھے تمہارے جذبات و احساسات کی خبر نہ ہو پائی۔“

وہ صرف شاک نہیں ہوئی، رہ بانسی بھی ہوئی تھی۔ مگر کو انہماکی ہی غامت نے آن لیا۔ اسے ایک احساس ہوا وہ اس بے حد خاص لڑکی کے ساتھ واقعی زیادتی کرتا رہا ہے انہماکی میں۔

”اک بات بتاؤ؟ تم میرا کتنا خیال کیوں رکھتے تھے؟ کیوں میری ہر بات مان لیتے تھے؟ میری بہنیز یوں کے باوجود تم نے مجھے کبھی ڈانٹ کر اس تعلق اور محبت کا احساس کیوں نہ بخشا؟ میں نے کیا

مجھے تم سے الگ ہونا ہے، تم نے کہا ٹھیک ہے، کیا جسیں فرق نہیں پڑتا کہ میں تمہاری زندگی میں نہ ہوں۔“

”ہتے آنسو پونچھے بغیر وہ بھڑکی ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔ مگر کو غامت کے ساتھ اب بے بیانی نے بھی اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ وہ ہشیریک ہو رہی تھی

پتہ نہ ہے کہ خود تری کا شکار.....

”مجھے تمہاری بات ماننا اچھا لگتا تھا۔“ میرے نزدیک تمہاری خوشی اہمیت کی حامل تھی۔ اپنی خوشی سے بھی زیادہ..... کیا تمہیں اچھا نہیں لگتا تھا کہ میں تمہیں خود پر فوجیت دیتا تھا۔“ وہ بہت سوچا کچھ کہہ رہا تھا کہ وہ قدرے پر سکون ہو سکے مگر وہ کچھ اور ہانپ رہی تھی۔ بھیجی چکی۔

”نہیں لگتا تھا اچھا.....“ میرے بتاؤ تم مجھ سے محبت کرتے تھے؟ واقعی.....؟“ اس کے لہجے میں

بھیپ سی حسرت تھی۔

”یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے حرم! میری محبت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ میں تمہاری خوشی کی خاطر تم سے دستبردار ہو گیا حالانکہ مجھے صریح اور صراحتاً بتا چکا تھا.....“ وہ پہلی بار مکمل کریں اظہار کر رہا تھا۔ حرم کو کچھ اندر بھڑکی آگ۔ پہ شخص سے پیچھے گرنے لگے ہوں۔

حرم کچھ دیر اسے آنسو بھری نظروں سے پوچھی تھی رہی پھر آٹھنی سے سر جھکا کر لٹکی آواز میں گویا ہوئی۔

”کوئی بھلا ایسا کرتا ہے۔“ لہجہ بکا یک حلاوت لیے ہوئے تھا۔

”کیا اب بھی تمہیں یقین نہیں آ رہا کہ میں آذر سے نہیں بدلے تھی۔“ وہ چنچا ہے دکی بھر بولی۔

”جواب میں لگتی جانی تھی مگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو مگر مجھے اس انداز کی محبت نہیں چاہیے تھی۔

یہ خاموشی اور سکین سم کی بے بسی میں محبت مرد کی شان نہیں ہوتی اگر میں تمہاری محبت تھی تو ڈنکے کی چوٹ پر اظہار کرتے..... مجھ پر حکومت کرتے نہ کہ میرے تابع بن جاتے..... مجھے تو ایسی ہی محبت چاہیے۔

آنسو وہ تم مجھے غلط بات پر ضرور ٹوکو گے اگر میں نہ مانوں تو اپنی طاقت کے بل پر منواؤ گے تاکہ.....“

”تاکہ..... یعنی؟“ وہ اس کے رک جانے پر چونکا ہوا ہوا۔

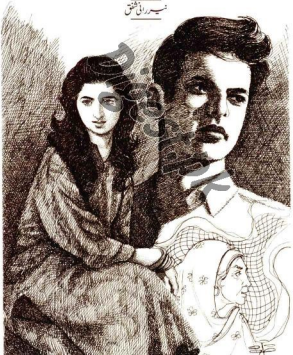
”تاکہ میں کوئی غلط قدم نہ اٹھاؤں۔“

”او کے باوام! بھر لہجہ ہے..... اب چند دنوں بعد ہی ہماری شادی ہے، تم اس وقت اتنی پیاری لگ رہی ہو، کیا خیال ہے ابھی سے نہ روک لوں تمہیں اس کمرے میں..... آنا تو بالآخر تمہیں یہ کہنا ہے ناں۔“ وہ ایک دم پٹری سے اترتا ہوا بے حد صبر لہجے میں بولا تو حرم کی گز بہاوت دیکھنے لگی تھی۔ وہ تیزی سے بھاگی تھی اور عمر کے قہقہے اس کا دور تک پیچھا کرتے گئے۔

”افوہ..... پھر لائٹ چلی گئی۔“ علی سر ہلا کر
 بیٹھ گیا۔ ابھی اسے گھٹنا بھی نہیں ہوا تھا کیپیوٹر پر کام
 کرتے ہوئے کہ اچانک بجلی منقطع ہو گئی۔ وہ ہنسنے لگا
 رہ گیا۔ اس کا بی بی اسے کا آخری سمسٹر چل رہا تھا۔
 انٹر نیٹ اور کیپیوٹر سے اسے ڈینا اور بہت سی
 افکار و بحثیں لینا ہوتی تھیں مگر یہاں بھی دیگر علاقوں کی
 طرح بجلی کی ترسیل پر کھٹے بعد منقطع ہونا معمول تھا۔
 اسی لیے اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ جلد از جلد اپنا

امید کے جگنو

سیرانی شفق



کام مکمل کر لے۔
جلی گئی۔ مسلسل لود شیڈنگ نے زندگی عذاب بنا رکھی

ہے۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے، مجھے یاد نہیں کہ ہم نے کبھی سکون سے چڑھ کر امتحان دیے ہوں۔ اس کا قصہ بے بسی لے ہوئے تھا۔

”یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔“ اس مرتبہ ربیعہ بھی اس کی ہم خیال ہو گئی۔ ”یہ تو رمضان شریف کی وجہ سے واقعہ ہے ہم پر احسان کیا ہوا ہے کہ محترمہ کی صابن آج کل نظر آرہی ہیں۔ ورنہ لود شیڈنگ نے تو کاروبار حیات معطل کر کے رکھ دیا ہے۔“ ربیعہ نے اپنے ابو کے چیلے چکل ہی انہوں نے چٹکی کی موجودگی پر شکرانے کے طور پر کہے تھے دُہرا کر تانبہ طلب نظروں سے بھائی لود شیڈنگ وہ ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا۔

”ہم تو کون سے عیش و عشرت موم جی اور امیر جنسی وقت کی عیش و عشرتوں میں چڑھ، چڑھ کر امتحانات دیے ہیں اور اور پھر محنت اور اساتذہ کو بھی ترس نہیں آتا کہ چیکنگ کرتے وقت طلبہ کو کوئی رعایت دی دے دیں۔“

”تو جہان نسل جن واپی انڈیوں کا فکار ہے، کسی کو پروا ہی نہیں۔“ زیب القسانے قلم آہیز لگا ہوں سے پڑتے کو دیکھا اور بولیں۔

”ہاں! یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔“ علی نے داوی کی ہمدردی پا کر اپنے دل کا غبار نکالا۔

”پانی کا بکرا، چٹکی کا بکرا، کبھی آئے اور کبھی چٹکی کا بکرا، دہشت گردی اور ہم دھماکوں نے اعصاب شل کر دیے ہیں۔ لاشے ڈھوتے، ڈھوتے پوری قوم بے حال ہو چکی ہے۔ تعمیرات کے نام پر وطنی حکومت نے پورا شہر ادھر گر رکھ دیا ہے۔ صاف سقری فضا تانبہ ہو چکی ہے۔ دھوکے اور فضا کی آلودگی نے جینا حرام کر دیا ہے۔ عام آدمی انصاف کو ترس رہا ہے۔ پولیس غریبوں اور مظلوموں کا فکار سمجھتی ہے۔“ اس کی پلاٹکان محنگو اس کی حساسیت

”یہ ملک اب شریلوں کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔“ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ اسی وقت ربیعہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس کا فکرا وہ چک کر شرارت سے بولی۔
”آپ کب سے اس میں شامل ہو گئے ہیں۔“
”نیا! چپ ہو جاؤ، مجھے بروقت کا مذاق بالکل پسند نہیں۔“ علی دانت چکچکا کر بولا۔
”مگر بھیا میں نے تو کوئی مذاق نہیں کیا۔“ وہ مصیبت سے آنکھیں پٹ پٹا کر بولی۔

”ارے پھر تمہاری ٹوک جھوک شروع ہو گئی۔“ اس نے میں زیب القسانے میں داخل ہو گئی۔
”دیکھیے ناں دادو! بھیا خواہ مخواہ مجھ پر ناراض ہو رہے ہیں۔“ ربیعہ کے سچے میں شرارت چھپی چھپی۔ زیب القسانہ بڑبڑا کر مسکرا دیں۔

”کوڑھ مٹاؤ!“ علی نے چیخ کر کہا اور ساتھ ہی صوفے پر پڑا کشتی ربیعہ کو دے مارا، جسے اس نے بڑی پھرتی سے کچک کر لیا اور ساتھ شرارت بھری مصیبت سے سوال کیا۔

”او.....! اچھا تو وہ شریف آپ ہیں، تو کیا جو اس ملک میں باقی ایک کم اتھرو کہو اور افراد ہیں وہ بدعاش ہیں؟“

اس سے پہلے کہ علی ایک مرتبہ پھر اس پر لٹ پڑتا، زیب القسانے میدان گرم دیکھ کر فوراً داخلات کی اور مصنوعی عقلی سے بولیں۔

”نیا! چپ ہو جاؤ، بھائی کو تنگ نہ کرو۔“
”علی بیٹا! کیا بات ہے پریشان کیوں ہو؟“ وہ اپنے لاڈ لے پڑتے سے مخاطب ہو گئی۔

”دادو! میں صرف پریشان ہی نہیں بلکہ انتہائی غصے میں بھی ہوں۔“

”کیوں ہوا کیا؟“
”مجھے ابھی انٹرنیٹ سے انفارمیشن ملے کہ کچھ ٹر پر اسائنمنٹ تیار کرنا تھا کہ حسب معمول لائن پھر

امید کے جنگ

”بیٹا! ہم آزادی تو کب کا گزر چکا۔ رمضان شرم ہوئے میں دو چار دن باقی ہیں۔ عید کی آمد آمد ہے۔ ظاہر ہے جھنڈیوں کو اتارنا تو تھا۔“ راجہ نے فرحان کو کانٹے سے پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا اور بہت پیار سے سمجھانے والے انداز میں بولی۔

”کنزنی نے ماما کے کہنے پر جھنڈیاں اور پرچم اتار کر رکھا ہے۔ تمہیں یاد ہے پچھلے سال بادش اور آرمی کی وجہ سے جھنڈیاں چوری گئی اور محلے میں بھری پڑی تھیں اور لوگ ان پر پاؤں رکھ کر گزر رہے تھے۔ اسی وقت پاپا نے کہا تھا کہ آئندہ کم از کم اپنے گھر اور گلی کی جھنڈیاں جشن آزادی کے فوراً بعد لٹا دی جائیں گی تاکہ ان کی بے حرمتی نہ ہو۔“ وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ ”اور تمہیں پتا ہے کہ گلی کی جھنڈیاں پاپا نے خود گلی کے بچوں کے ساتھ مل کر اتار دی ہیں۔“

”اچھا!“ وہ حیران رہ گیا۔

فرحان، کنزنی سے دو سال بڑا تھا اور جماعت ہشتم کا طالب علم تھا۔ کنزنی جماعت ششم میں پڑھتی تھی۔ دونوں انتہائی سمجھ دار اور فرمانبردار بچے تھے۔ ریجہ محلے سے دو سال چھوٹی تھی اور ایف ایس سی کر رہی تھی۔ محلے جراتی دیر سے یہ سب محفلوں میں رہا تھا بڑا ہی سے بولا۔

”بھائی! بند کرو اس ٹاپک کو..... تم اتنا بولتی ہو تمہیں روزہ نہیں لگتا؟“ سدا کی حاضر جواب اور فحش کھربہ ایک مرتبہ ہلکھلا کر فحش دی۔

”نہیں! مہیا! بھئی! روزہ نہیں لگنا صرف پیاس لگتی ہے۔“ ”اچھا دادو! اگلے کی نماز کا وقت ہو رہا ہے، میں مسجد جا رہا ہوں۔“ محلے اسے گھور کر رہ گیا اور اٹھتے ہوئے بولا۔

”بھیا! میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں۔“ فرحان بولا۔

”ہاں چلو۔“ ساتھ ہی وہ دونوں کمرے سے

اور اس کی پٹلی اڈھوں کی ترچھان تھی۔ انہوں نے اسے نوکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتی تھیں کہ اس کے دل کا غبار نکل جائے۔ اس مرتبہ ریجہ کی زبان بھی تالو سے جا لگی تھی اور وہ افسردہ لہجے بھائی کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ ”میں کچھ کہہ رہا ہوں دادو! یہ ملک اب کم از کم ہم جیٹوں کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔ میں بی بی اے کرتے ہی ملک سے باہر چلا جاؤں گا اور تعلیم مکمل کر کے وہیں جا پ کر کے رہائش اختیار کروں گا اور کبھی پلٹ کر نہیں آؤں گا۔“

زیب القسا کا دل دھک سے رہ گیا۔

”اللہ نہ کرے۔“ ان کے منہ سے ...

بے اختیار نکلا۔

”دادو! آپ کو معلوم تو ہے ہاں پچھلے سال جو یہاں بم دھماکا ہوا تھا، اس میں جہاں اتنے سارے بے گناہ شہید اور زخمی ہوئے تھے، وہاں میرا دوست..... اس کی آواز بھرا گئی۔“ شاید..... شاید بھی اس حادثے کا شکار ہو گیا۔ وہ کانچ میں موم کرا کی تھیلیاں کے سبب اپنی خالہ کے ہاں لاہور گیا ہوا تھا۔ اس دن شاید اور اس کا کزن تھیں وہاں جا رہا تھا کرنے گئے اور دونوں شہید ہو گئے۔“ وہ سب اٹھا۔ زیب القسا نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ وہ جانتی تھیں کہ شاید اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور محلے کا بچپن کا دوست تھا۔ اس حادثے نے محلے پر بہت بڑے اثرات مرتب کیے تھے۔ وہ شدید ڈپریشن کا شکار تھا۔ اتنے میں کنزنی اور فرحان لڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ ”کنزنی کی پتی تم نے میری جھنڈیاں اور ہاں کستانی پرچم کیوں اتارا ہے؟“ اس نے کنزنی کی پتی کیچھے ہوئے کہا۔

”کوئی ماما.....“ وہ رو دی..... اب زیب القسا نے اپنی مداخلت ضروری خیال کرتے ہوئے کنزنی کو چکارا اور ساتھ ہی فرحان سے مخاطب ہوئیں۔

باہر چل دیے۔

”کیا انتہاری مہمانداری کی بنیاد پر معصوم ہیں۔
نماز ادا کر کے ان کا ہاتھ ٹاڈ دینا۔“ زبیب القسا کو اپنی
بہو کو خیال آیا کہ وہ اس قدر گری میں روزے سے
اکیلی بنیں میں معصوم تھیں۔

”جی دادو۔۔۔۔۔ زبیبہ وضو کرنے چلی دی۔

زبیب القسا کھٹول پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوئیں تو اسے
میں سلطنت خود ہی بڑے کرے میں چلی آئیں۔

”اماں! آپ کھانا بھی کھا لیں گی یا نماز پڑھ کر۔“

”بیٹا۔۔۔ اگلے نماز پڑھ لوں۔“ وہ محبت سے

اپنی خدمت گزار بہو کو کچھ کر لیں۔

”اور ہاں، ہم بھی اب نماز پڑھ کر کچھ دیر آرام

کر لیں۔“

”جی امی جان۔۔۔۔۔“ سلطنت ساس کی لگرمندی

پر مسکرائیں۔

زبیب القسا شائستہ، چرمی نکستی اور سلجی ہوئی

خاتون تھیں۔ وہ روایتی ساس نہیں تھیں بلکہ ہمیشہ

انہوں نے اپنی بہو کا ایک ماں اور ایک مجلس دوست

کی طرح خیال رکھا۔ 75 سال کی عمر میں اب خاتون

ان سے گھر کے کام انجام دینے پر تھکتے تھے اور نہ ہی

جوڑوں کے درد، امیٹا کی تکلیف اور بلی بلڈ پریش

کے سبب وہ روزے رکھ سکتی تھیں۔ اسی لیے اللہ کے

حکم کے مطابق وہ اپنے روزے کسی غریب خاتون

سے رکھوا رہی تھیں اور شرع کے مطابق نہ صرف ہجر

اور افطار کے وقت کھانا اسے بھجواتیں بلکہ معقول رقم

بھی اسے کھانے پینے کی مدد میں ادا کر چکی تھیں۔

وہ انتہائی عبادت گزار اور چھ گزار خاتون

تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ رمضان المبارک کی وجہ سے

ان کی عبادت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ سب سے

محبت یرتھا، سب کا خیال رکھنا اور دعا مانگنا ان کا

خاص وصف تھا۔

☆☆☆

زبیب القسا غازی دلا میں اپنے بیٹے سرھا

غازی، بہو سلطنت اور ان کے چار بچوں علی الخریب

علی غازی، ربیعہ غازی، فرحان غازی اور کنزی

غازی کے ساتھ بہت پر سکون زندگی گزار رہی تھیں۔

ان کے شوہر عبداللہ غازی کی وفات کو تقریباً 6

برس گزر چکے تھے۔

رمضان المبارک میں ان کے گھرانے میں

جہاں خصوصی عبادات کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ وہاں تمام

اہل خانہ مع بچوں کے بھی نہ صرف روزے رکھتے بلکہ

افطار اور صبح کے وقت غریب رشتے داروں اور غریب

بستیوں میں کھانا پہنچانے کے علاوہ ذکوۃ، خیرات،

صدقات اور عید کی مدد میں تھا تک، مانگی خاصی

رقم اور عطیات بھی تسلیم کرتے۔ اس روایت کا جو

آقا زبیب القسا کے پاس، سسر نے کیا تھا اسے آج

بھی خیرات کا عمل ان کے ہاں بھایا جا رہا تھا۔

انہوں نے اعلیٰ تربیت کا جو تحفہ اپنی اولاد کو دیا

تھا۔ انہوں نے وہی تحفہ ورثے میں اپنے بچوں کو دیا

تھا۔ جس پر وہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے۔ مگر آج

علی کے ذہن نشین اور اس کی مانجھ سانس نکلتو نے

انہیں اندر تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ علی کی

ہر بات بالکل ٹھیک ہے۔ اس وقت پوری قوم علی

وہی اتاری کا ڈھار ہے۔ معاشرہ اخلاقی لحاظ سے مختلف

بجوانوں اور وہشت گردی کے باعث روپ زوال

ہے۔ مگر نوجوان نسل اس طرح اپنے ملک اور قوم

سے بیزار ہے، اس کا اندازہ نہیں تھا۔ علی کی کھٹک نے

انہیں کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ نماز کے بعد

ملک و قوم کی خوشحالی اور نوجوان نسل کے اچھے مستقبل

کے لیے رقت آمیز انداز میں دعا گو ہو گئیں۔

☆☆☆

”اب بس بھی کرو بھیا جو ہونا تھا ہو گیا۔“

سلطنت نے ربیعہ کو چپ کروانے کی کوشش کی مگر

ربیعہ کو اپنے خوب صورت سنے ڈر نہیں کا دیکھ کھائے

امجد کے منہ

بات سن کر گفتگو سے پوچھ بیٹھے۔
 ”کوئی کہیں نہیں جا رہا، بس ربیعہ آج کے
 واقعے سے پریشان ہوئی ہے۔“ ذہب افسا
 مسکرا دیں۔

”مگر ہوا کیا...؟“ سرمد حیرت سے بولے۔
 ”پاپا یہ پوچھیں کیا کہیں ہوا؟“ ربیعہ ایک
 مرتبہ ہلکے سے اٹھی۔ سلطنت نے بیٹی کو آنکھ کے
 اشارے سے خاموش کر لیا اور جلدی سے بولیں۔

”بس ہونا کیا تھا، عید کی شاہجگہ کے لیے
 ربیعہ اور کزن کی میرے ساتھ بازار گئی تھیں۔ کچھ
 شرابی لڑکے اچانک سڑسائیگل پر نمودار ہوئے اور
 عید کے ہاتھ ت کیڑوں کا بیگ جھین کر فرار
 ہو گئے۔“ سلطنت نے بکے، پھینکے اعداد میں شوہر کو
 مطمئن کرنا چاہا۔ بات ختم ہوتے ہی سرمد کی پیشانی
 پر گفتگو نمودار ہوئی۔

”یہ بات طے تھی کہ عید کی شاہجگہ رمضان

جا رہا تھا۔ جو وہ کالج میں عید ملن پارٹی میں پہننا چاہ
 رہی تھی اور آج ہی اسے مشہور بوٹیک سے خریدا تھا۔
 وہ سمجھتے ہوئے بولی۔

”علی بسایا اٹھک کہتے ہیں، یہ ملک اب واقعی
 شریفوں کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔ میں بھی سمجھتی
 تھی یہ ملک چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔“ اس کی دھمکی
 سن کر سلطنت کو ہنسی آگئی۔

”نہ کہوں؟“ علی نے شرارت سے ربیعہ کی
 پونی کھینچ کر اپنا دلہا تارا۔

”بھیانہ کریں۔“ وہ رو ہنسی ہو رہی تھی۔ کزن کی
 اور فرحان بہت پریشان تھے۔

”لیکن بیاہجب آپ اور علی بسا اس ملک سے
 چلے جائیں گے تو ہم یہاں کیا کریں گے؟“

”ارے ابھی اکون کہاں جا رہا ہے؟“
 سرمد جو کسی اظہار پارٹی میں گئے ہوئے تھے

کمرے میں داخل ہوئے تو کزن کی اور فرحان کی

لکڑیوں کے اسیر

کچھ ہاتھ کیاریا نہیں قدموں کے ایسے سے بھجا رہی ہیں
 کہ گھر کر گئے کے باوجود چٹا بھوری بن جاتا ہے۔ آخری صفحات
 پر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا نیا انداز

فقیر دوست

تاریخ کے سمندر سے واقعات کی سرکش موجوں کا احوال
 ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کے گھر کی روایتی

سناروں پر کمنہ

بعض اوقات لرزیدہ قدموں کو محبت ایسا استحکام بخشتی ہے کہ دنیا
 حیران رہ جاتی ہے۔ طاہر جاوید مغل کا دیگر نیا انداز

ماروی

ہم فٹل، ہم مزاج مگر قدرتی کی اظہاریت کا اظہار تاشیہ کیسے رنگ
 دکھاتا ہے۔ محی الدین نواب کے خیالات کی اڑان

اگست 2014ء کا شمار

رمضان اور عید کے لمحات کے ساتھ

خوابوں کی کہانیاں کا مجموعہ



مزید
 ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
 محفلِ شعر و سخن
 ملکِ منورہ حیات کی عرقِ داغی

”کاشفِ خفیہ“ ڈاکٹر شہیر شاہ سید، تنویرِ باغی
 منظرِ افسانہ اور سلیم انور کی دلچسپ تھارے



کے آخری عشرے میں اور رات کے وقت نہیں ہوگی تو پھر آج اس وقت آپ لوگ بازار کیوں گئے؟" انہوں نے دستِ واضح میں وقت دیکھا تو پوچھنے لگے کیا وہ بچے تھے۔ راجہ تو رونہ دھونا بھول کر ایک دم چپ ہو گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے بطن پر نرم حراج پاپا اپنے اصولوں کے بہت بچے ہیں۔ ماحول کا رنگ بدلتے دیکھ کر راجہ انہوں نے بات کو سنبھالا۔

"اے جیٹا! عید کی شاپنگ تو یہ لوگ کب کی کر چکے۔ بس چھوٹی موٹی چیزیں رو گئی تھیں وہ اب لینے گئے لیے گئے تھے۔ سلطنت بے چاری کو گھر کے کاموں سے فرصت کب ملتی ہے؟ اور کیا؟ میری بیٹی اکیڑی اور اپنی ہنرِ حنائی سے یہ مشکل وقت نکال کر ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ اوپر سے گرنی نے مت ماری ہوئی ہے۔" وہ ابھی بکھا اور تھیں کہ سرمد بھنبھلا کر بولے۔

"وہ تو ٹھیک ہے اسی جان انکر اس وقت جانے کیا ضرورت تھی؟"

"میرے ہی اصرار پر گئی تھی۔ میں نے بہت ضروری چیزیں منگوائی تھیں۔" انہوں نے سارا الزام اپنے اوپر لے لیا۔

"نیکین بھتر ہوتا کسی کو ساتھ لے جائیں۔" ماں کی بات سن کر وہ نرم ہنسنے لگے۔

"ڈرائیڈ اور فرحان ہمارے ہمراہ تھے۔ ویسے بھی ہم لوگ مطرب کی نماز ادا کر کے فوراً ہی چلے گئے تھے اور ساڑھے نو بجے تک واپس آ گئے؟" سلطنت فوراً بولیں۔

"جی پاپا! ہم لوگ ساڑھے نو بجے اپنے گھر میں تھے۔" اس مرتبہ پاپا کا قصہ دروغ ہوئے ہی راجہ نے گھٹکھوکھا ڈول ڈالا۔

"گھر ہوا کیا تھا؟" اب وہ تحصیل جانتا چاہ رہے تھے۔ سلطنت نے ہچکچاتے ہوئے تحصیل بتایا کہ "اماں نے کسی فریب رشتے دار کے لیے بکو حنائف منگوانے تھے جو فرحان نے پہلے ہی گاڑی میں رکھ

دیے تھے۔ اسی لیے بچا گئے جبکہ راجہ کا بہت خوب صورت ریلیٹی میڈ سوٹ اور کتڑی کا یو نیفارم کا بیک وہاڑ کے لیے بھاگے۔"

"اور تم وغیرہ.....؟" انہوں نے حریف پر چما۔ "نہیں، وہ سب محظوظ ہے۔" سلطنت اطمینان بھرا انداز سے بولیں۔

"شکر گو کسی بڑے نقصان اور حادثے سے محظوظ نہ گئے آپ لوگ۔ جرائم میں بہت اضافہ ہو گیا ہے آج کل۔" وہ تاسف سے ایک گہری سانس لے کر بولے۔ "تجربہ کیا ہے گا ہماری قوم کا؟"

"واقعی زندگی بہت مشکل ہوئی جا رہی ہے۔" علی نے کہا تو سب چونک گئے۔ وہ دل ہی دل میں علی کی بات سے اس قدر متعلق تھے کہ علی کے بڑھتے ہوئے ڈیم میں سب متعلق ہو گئے۔

"اللہ آخر کرے گا یا راجہ ہر بات دل پر نہ لیا کرو۔ جہان ہولناک ابھرائے کرو۔"

"ہائے میرا یو نیفارم....." کتڑی کو ایک دم اپنا یو نیفارم یاد آ گیا۔

"کیا تم نے یو نیفارم عید پر پہنا تھا؟" سرمد حیران ہو کر بولے۔

"نہیں پاپا! اس مرتبہ موسم گرما کی تعطیلات چونکہ عید کے بعد ختم ہوں گی۔ لہذا میں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ جس دن اسکول کھلے گا اس دن مارننگ اسمبلی میں چھ تبرکے حوالے سے ہوم دفاع کا پروگرام ہوگا اور میں نے اسمبلی میں چھ تبرکے شہداء کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے نوٹہ گاٹا ہے۔" اس نے تحصیل بتایا تو سرمد مسکرا دیے اور اپنی لاڈلی بیٹی کو چھینرتے ہوئے بولے۔

"ہاں، یہ تو واقعی مسئلہ ہو گیا۔ میری بیٹی کس یو نیفارم کے بھیر گیا کرے گی؟"

"پھوڑو کتڑی اس دن چھین کر لیتا، ویسے بھی جشنِ آزادی اور ہوم دفاع میں کیا رکھا ہے؟ کیا دیا

شرکت نہیں کروں گا۔" اس نے صاف انکار کیا۔
ذیب انسا کو علی کے اس قسم کے رویے کی پہلے سے
توقع تھی۔ لہذا وہ اپنی مخصوص شفیق مسکراہٹ کے
ساتھ بولیں۔

"دیکھو بچہ! میں باقی ہوں کہ اس محفل کو منعقد
کرنے کا خیال مجھے تقریباً دو سال بعد آیا ہے۔ آپ
سب کو معلوم ہے کہ آپ لوگوں کی قطعی مصروفیات
کے سبب ہم نے ان محفلوں کا انعقاد ترک کیا تھا۔"
انہوں نے کچھ توقف کیا اور بڑے رمان سے
کہا۔ "مگر ایک ہا مقصد اور خوب صورت روایت
اگر بھوری کے سبب محفل کا شمار ہو جائے تو اسے
دوبارہ شروع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

"اسی وجہ! بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آج
چونکہ میرے آفس کی بھی چھٹی ہے لہذا میں بھی اس
محفل میں شرکت کروں گا۔" سر نے ڈرامائی انداز
میں اغری دی اور علی جو وہاں سے ٹھکنے کے لیے ہرقل
رہا تھا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برابر صوفے پر
بٹھالیا۔ نہ جائے رفیق نہ پائے ماعن کے صدیقی علی
کو بھی چارواں چار اپنے باپ کے ساتھ وہاں بیٹھنا پڑا۔
"اے جی اتنی اچھی محفل میں کون بیٹھنا نہیں
چاہے گا۔ میں نے سوچ لیا ہے آج سارا کام ماسی خود
کرے گی۔ روٹی اظہار کی تجارتی تو اللہ کا شکر ہے کہ
آج سے ماسی کی بیٹی صفیہ بھی میرا ہاتھ بیٹایا کرے
گی۔" یہ کہہ کر سلطنت بھی اٹھینان سے بیٹھ گئیں۔

دراصل ذیب انسا بیٹا، بہو سے اس سلسلے میں
پہلے ہی بات کر چکی تھیں اور ان کے آپس کے مشورے
عجی سے علی کے رویے کے سبب یہ محفل منعقد کی گئی
تھی۔ برسوں پہلے بچوں کی اخلاقی اور ادبی تربیت
کے خیال سے بچوں کے دادا امجد اللہ غازی نے اپنے
گھر میں ہر جمعرات کی شام بزم ادب کا آغاز کیا تھا۔
اسکولوں کی طرح اس بزم میں بھی تقریب کا آغاز
تلاوت کلام پاک سے کیا جاتا اور بعد ازاں

ہے اس جگہ اور قوم نے ہمیں؟"
"کیا کہہ رہے ہو علی؟" علی کی بات پر ذیب
انسا تڑپ کر رہ گئیں تو ایک دم سناٹا چھا گیا۔
"بیٹا! ملک و قوم نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔
ہم ہی قرض نہیں اتار پائے اس وطن کا۔" سر نے
شفقت سے بیٹے کے کاندر سے جھپٹائے اور ساتھ ہی
اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اس موضوع پر چکر ہات کریں
گے۔" وہ جانتے تھے کہ ان کی ماں کے لیے یہ دونوں
موضوع کس قدر حساس اور اہم ہیں۔

"ہاں، بارہ بج چکے ہیں۔ صبح سحری کے لیے
انسا آپ لوگوں کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ چلے
بچوں! آپ لوگ سوئیں جا کر مشاہد۔" سلطنت
نے بھی فوراً کہا۔ سب اپنے، اپنے کمروں کی طرف
چل دیے۔

"آپ کی اظہاری کسی رہی؟"
"ٹھیک تھی، وہیں چونکہ عشا کا وقت ہو گیا
تھا لہذا میں نے سوچا کہ تروایع بھی نہیں ادا کر لی
جائے۔ اسی لیے مجھے دیر ہو گئی۔" ذیب انسا بھی کئی
گم صدمہ بھی تھیں۔ سر نے نرمی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔
"آئیں امی جان! آپ کو آپ کے کمرے
تک چھوڑ آؤں۔"
"ہاں چلو۔۔۔" وہ گہری سانس لے کر اٹھ
کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

"دادا! رمضان میں تو آپ نے بھی بزم
ادب نہیں سہائی تھی۔" ربیعہ نے حیرانی سے۔۔۔
ذیب انسا سے پوچھا۔

"ہاں دادو!۔۔۔! یہ اتنی مدت کے بعد آپ کو
بزم ادب کا خیال کیوں آیا؟" علی نے نقیشتی انداز
میں پوچھا۔

"ویسے بھی روزے کی حالت میں کون حصہ
لے گا اس پروگرام میں۔ اور کم از کم میں تو برگز

بچوں کے مابین مقابلہ فٹ خوانی، مقابلہ ہتھکڑی اور دیگر مقابلہ جات کرائے جاتے اور نمایاں پوزیشن لینے والے بچوں میں انعامات تقسیم کیے جاتے۔ ان پروگراموں میں قریبی عزیزوں کے علاوہ اہل محلہ بھی شرکت کرنے لگے اور تمام بچے نہ صرف جوش و خروش سے ان مقابلوں میں حصہ لیتے بلکہ بے چینی سے جمہوریت کی شام کا انتظار کرتے تھے۔ عبداللہ غازی کی وفات کے بعد بھی زیب افسانے نے مقابلہ جات باقاعدگی سے کرائے مگر بچوں کی تعلیمی مصروفیات کے سبب تقریباً دو سال پہلے ہی سلسلہ متوقف ہو گیا تھا۔ زیب افسانے کے ساتھ سردار اور سلطنت بھی اپنے بڑے بیٹے علی کی وجہ سے بے حد پریشان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ علی اب وہ بچہ نہیں ہے جسے بے آسانی بہلا لیا جاتا تھا۔ وہ اب حساس طبیعت کا باشعور نوجوان تھا، جسے ایک خاص طریقے ہی سے شدت پسندی اور زلف پائی اور وطنی دہانے سے باہر نکالا جاسکتا تھا۔

زیب افسانے مسکرا کر اس چھوٹی سی تقریب کا آغاز کیا۔ ”بچو! آپ کی داد دینی میرا ذمہ نہیں ہے اور آپ سب کا روزہ ہے۔۔۔۔۔ لہذا آج سب صرف سنیں گے۔ میں یوں ہی اور سب میری جی کہانی سن ہو جائے تو اس کہانی کا اظہار حق سنی اور اصل مقصد آپ لوگوں نے بتاتا ہے۔ جوئی جواب دے گا اسے عید کا خصوصی تحفہ دیا جائے گا ٹھیک ہے!“ کھڑی اور فرحان خوشی سے چلائے۔ اب ربیعہ کو بھی داد کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ البتہ علی خاموشی سے بیٹھا رہا۔

”ہاں تو بچہ سنو۔۔۔۔۔!“ سب ہمد تن گوش ہو گئے۔ ”یہ 1947ء کی بات ہے، جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ ہمارا گھرانہ ایک چڑھا کھٹا گھرانہ تھا۔ ہمارے بابا جانی اور اماں جان سمیت سبھی لوگ تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن تھے۔ وہ بھی ماہ رمضان تھا۔ سب روزہ رکھتے، مسلم نوجوان

بلوائیوں کے ڈر سے رات بھر جاگ کر پھردے رہتے۔ ہندو، مسلمان ذات زدوروں پر تھے۔ خوف و ہراس کی فضا میں ہندو اور مسلم سبھی لوگ سانس لے رہے تھے۔ بالآخر 14 اگست 1947ء کو 27 رمضان المبارک کی مبارک شب کو پاکستان بننے کا اعلان ہوا۔ اس اعلان کے ساتھ جہاں قاتلوں کی ہجرت اپنے اپنے علاقوں کی طرف تواتر سے ہونے لگی وہاں ہندو، مسلمان ذات شدت اختیار کر گئے۔ میں اس وقت تقریباً دس برس کی تھی۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ ہمارے گھرانے نے دیگر اہل محلہ اور رشتے داروں کے ہمراہ راجستھان پاکستان کی طرف سفر شروع کیا۔ برسوں بعد گئے محروم و خوفناک محلات آج بھی میرے دل و دماغ کو جکڑے ہوئے ہیں۔ میری اماں جان نے کہا تھا۔ ”میں بچوں! ہماری منزل مسیحی علاقہ ہی ہے، اسلام کے مطابق آزادی سے اپنے وطن چلنے والیں میں اب ہم سب مل کر۔۔۔ بمبی، خوشی ڈھرنی بسر کریں گے۔“

”وہ ہمارے خوف کو کم کرنے کے لیے امید کے جکڑوے کر ہمیں بہلا رہی تھیں مگر راستے میں اچانک ٹرین رک گئی۔ معلوم ہوا کہ پڑوسی پرکاش نے کھڑی کی گئی تھیں۔ جوئی ٹرین رکی بلوائیوں نے نئے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ کچھ نوجوانوں نے لاشیوں سے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی مگر کھواروں اور بھالوں کے سامنے وہ نہ زیادہ دیر ٹھہر سکے۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے دادا، اماں جان اور بابا جانی شہید ہو گئے۔ لوگ میری پچھو کو اٹھا کر لے گئے صدمے اور خوف سے میں نے بسند ہوتی ہوئی آنکھوں سے بس اتحاد دیکھا کہ میری پیاری اماں مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو گھمبیر کر کہیں لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ بچی رہی تھیں۔“ ”زیب چنا بھاگو۔“ مگر میں بے ہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو پاکستان کے مہاجرین کیمپ میں اپنی نانی جان، خالہ اور

بولیں۔

”وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ یوں وقت گزرتا گیا اور مجھے میٹرک تک تعلیم دلوا کر آپ کے دادا... عبداللہ غازی سے میرا علاج کر دیا گیا تو میں دہلی بن کر اس غازی دلا میں آگئی۔ سسرال میں سب کی بھتیجیوں نے مجھے بہت سہارا دیا۔ مگر اس رمضان کی باتیں اور اگست کا مہینہ بھی نہ بھلا سکی۔ میرے بزرگوں نے وطن عزیز کی آزاد لڑائیوں کی خاطر جانیں تک قربان کر دیں۔ آپ کے دادا کے گھرانے کے بھی کم و بیش ایسی حالات تھے۔ ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے پاکستان بننے دیکھا اور اپنی نسل کو خلائی سے بچانے کے لیے مصائب برداشت کیے۔ 1965ء میں میرے گھرانے کو ایک مرتبہ بھر آرمی میں سے گھر پر ڈالا۔ جی ہاں! عبداللہ غازی کے بھتیجے بھائی میں سسرہ کے بھتیجے چچا کیپٹن آفاق دہلی کی سلاخ جی کی خاطر شہید ہو گئے اور پھر کارگل کے محاذ پر 1999ء میں میرے خستہ بھگرنے یعنی آپ لوگوں کے چھوٹے چچا احمد غازی دہلی کی آمد پر قربان ہو گئے۔“ کمرے میں سناٹا طاری تھا۔ وہ علی کی طرف دیکھ کر محبت سے بولیں۔

”یہ مگر ہم نے بہت محنت اور محبت سے بنایا اور سہا یا ہے۔ علی بچپن میں بہت شرارتی تھا۔ کبھی، کبھی اس کی شرارتیں ہمیں ذبح کر دیتیں اور بعض اوقات یہ اپنی بات منوانے کے لیے چیزیں بھی تو ڈرتا تھا۔ جس کی وجہ سے سب کو بہت تکلیف بھی اٹھانا پڑتی تھی۔ مگر کیا ہم میں سے کسی نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دی؟“ اب وہ باری، باری سب کو سوالیہ انداز میں دیکھ رہی تھیں۔

بے ساختہ سب نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بولتے، بولتے تھک چکی تھیں۔ سوت نے پانی کا گلاس اٹھیں لا کر دیا تو وہ مسکرا دیں اور شکر یہ کہہ کر گلاس لوں سے لگا لیا۔ علی بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

ماموں کے ہمراہ جی۔ صد شکر کہ خیال والے مجھے ڈھونڈ کر لے آئے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میری ماں..... میری پیاری امی جان، مجھے شردہ کچھ کر چھوٹے بھائی کو لے کر جنگل کی طرف جان بچانے کے لیے بھاگ گئی تھیں اور آج تک ان کا پتا نہیں چل سکا۔“ انہی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

”میں اپنے بچے مجھے تھیالی رشتے داروں کے ساتھ اپنے پیاروں کی یاد کا درد سینے میں بسا کر زندگی بتاتے لگی۔ میرے ماموں نے میری امی جان کو بہت ڈھونڈا پر وہ کہیں نہ ملیں۔

”اسی کپ میں ایک تقریباً 20 سالہ ہندو لڑکی بھی تھی، جسے کوئی شخص زبردستی اٹھالایا تھا۔ وہ لڑکی جب میری خالہ اور نانی سے ملی تو انہوں نے میرے ماموں کی مدد سے کپ انچارج کے ذریعے پیغمبر رضا لیاقت علی خان تک یہ بات پہنچائی اور اس لڑکی کو وہاں ہی عزت اٹھایا جگوا یا۔ وہ شخص اس بات پر بہت چراغاں پا ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ہماری ہزاروں بیو، یتیمیاں اٹھالی ہیں۔ ہمارے خاندان کے خاندان پر قلعہ کر دے۔ میں نے ان کی ایک بیٹی اٹھائی تھی تاکہ ان سے انجمن بن سکوں۔

میرے ماموں نے اس سے کہا، ”سوراجش بھائی! پاکستان دین اسلام کے نام پر بنایا اور میرا دین یہ کہتا ہے کہ کڑو سے انتقام نہ لو، کسی انسان کی جان بچانا اور عورتوں کی حرمت کا پاس رکھنا انسانیت کی معراج ہے۔ اگر آپ نے اس چیز کا خیال نہ دکھا تو آپ میں اور کسی فتنے میں کیا فرق رہ جائے گا۔“ مجھے غور ہے کہ میرے ماموں کے معتدل رویے اور حسن سلوک نے ایک گمراہ شخص کو راہِ ہدایت دی اور اس کا اثر اس شخص پر یہ ہوا کہ وہ خود ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہندو لڑکیوں اور بچپن ہونے لوگوں کو سرحد پار کرانے لگا۔“

سب بچے دم بخود بیٹھے سن رہے تھے۔ ان کی محویت پر ذریعہ افسا اور اس مسکراہٹ کے ساتھ

اسے اب تک کچھ آپکا تھا کہ آج کی یہ محفل اس کی برین وائٹک کے لیے متعلقہ کی گئی ہے۔ وہ ذرا توقف کے بعد پھر غلط ہو گئی۔

”بس اب آخری بات جس ویس کے لیے سب نے اتنی محنت کی قربانیاں دیں، جس نے ہم سب کو اپنا پتہ دیا، عزت اور وقار دیا۔ کیا اس کو چھوڑ کر مسائل سے گھبرا کر بھاگ جانا خود غرضی نہیں؟“

”دادو! آپ کی کہانی نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔“ ربیعہ آبدیدہ ہو گئی۔

”شکر دادو! آپ میری معصوم شرارتوں کو دہشت گردوں اور پائل کرپٹ حکمرانوں اور بیورو کرپسی کی جاہ کاریوں سے کیوں ملاری ہیں؟“ علی ناراضی سے بولا۔

”بیٹا! میرا مقصد صرف یہ ہے کہ بڑے جھگڑے اور جاہ کاریاں ہوں یا معمولی شرارتیں گھر تو آخر اپنا ہے۔“ یہ کہتے وقت ان کے لہجے میں درد تھا۔

اب علی نے سر جھکا دیا۔

”ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے مسائل سے فرار ہونا بہادری نہیں۔“ اب محفل نے بھی محفلگوں میں حصہ لیا۔ سرمد نے ہاتھ گھوما تھا۔

”ابلی محفل اگر مجھے اجازت دے تو میں بھی کچھ کہوں؟“ علی نے جھکا ہوا سر اٹھایا مگر کھاموش رہا۔

البتہ محفلت اور بچے زور سے بولے۔

”ضرور ضرور.....“

”قصہ مختصر! ہمارے آباؤ اجداد نے غلامی کی گھوردش کے اندھیرے کو دور کرنے کے لیے اپنے خون کے چراغ روشن کیے اور اس کے بعد کی نسل نے ان چراغوں کو اپنی نااہلی اور کرپشن کی بدولت آندھیوں کے سپرد کر دیا..... مگر تو جوان نسل زیادہ ہاشور و خفص اور حساس ہے۔ اب ملک کی ہاگ ڈاؤ میرے علی جیسے سپوتوں اور ربیعہ جیسی بیٹیوں کے ہاتھ میں ہے۔

”نہ صرف مجھے بلکہ مجھ جیسے ہر درد مند شہری کی امید اور اس کی نوجوان ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہی وہ طبقہ ہے جو نہ صرف اپنے اسلاف کی قربانوں کو فراموش نہیں پیش کرنے کے لیے جتنی آزادی، ایوم و قیام اور کارگیل کے واقعات کی یاد دلاتا رہے گا۔ تمام شہداء کو سلام کرتا رہے گا بلکہ اپنے ملک و قوم کا وقار بحال کر کے آنکھوں کیلئے مسخ نہیں بھی تاجناک بنائے گا۔“

”البتہ مالٹہ! بے ساختہ علی کے منہ سے نکلا۔ اس کی فضاک آنکھوں میں امید اور عزم کے نئے سورج چمک رہے تھے اور چہرہ جوش سے جھٹک رہا تھا۔ کنزنی اور فرحان خاصے بایں ملک رہے تھے۔ اچانک سی ان کی گفتگوں کو سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ہاں فرحان! تم کچھ کہہ رہے ہو، پایا، بھیا اور بیانیے کی بجائے بے دیا ہے۔ اب امید کا آئینہ محفلت و دادو کی نیند کو دیں گی۔“

”بھیس تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔“ فرحان نے بھی مایوسی سے کنزنی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اس پر سب غصہ دیے۔ علی نے بڑا جاندار قبیلہ لگا کر کہا۔

”غور نہ کرو، امید کا کج مزہ تو اب آنے لگا اور امید کا خصوصی ختمہ بھی آپ دونوں ہی کو ملے گا..... کیوں دادو.....؟“

زیب القاسم شراری سے مسکرا دیں۔ ”چھیک بواہی جان! جہاں آپ بھیجیں نامیں ہوں۔ وہاں مایوسی کا اندھیرا کیسے بھیل سکتا ہے؟“ سرمد نے ماں کے ہاتھ تھام لیے۔

”واقعی ہمارے گھر میں تو امید کا کج مزہ اب آنے لگا۔“ محفلت نے بھی فکرانہ انداز میں بیٹکی آنکھوں سے ساس کو دیکھا اور علی اور ربیعہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا، امید کے جتنوں سب کی آنکھوں میں جھلک رہے تھے۔

بہر و آتا ہے اور بیرونِ ایشیا ہمارے جیسے ایک عام سے گھر کی لڑکی ہوتی ہے۔.....“ غنائے ایمن کی بات حسب عادت سچ میرے انجلی اور قلم بہارتے ہوئے کہا۔

”اگر کوئی خطی ایسا ہی ہوتا ہے ہاں.....“ ایمین نے اپنی بات کی تائید چاہی۔

صورت..... لڑکی کے بھائے جن میں کام کرتی۔

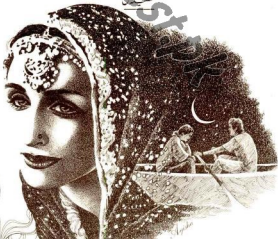
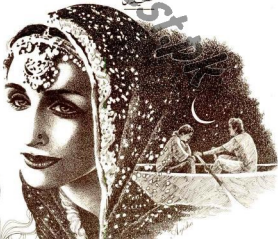
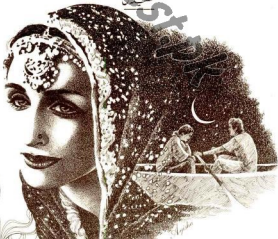
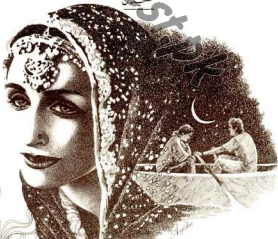
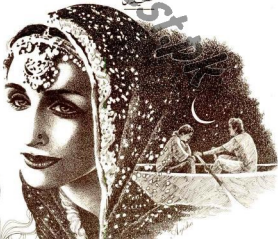
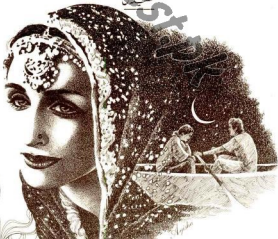
معمولی صورت شکل والی جیم لڑکی پسند آ جاتی ہے۔
جو مہرے نے ایسٹن کی بات آگے بڑھائی۔

”جیسا کہ ہم نے کہا، تو کوئی جہیم لڑی نہیں ہے۔ اب جو بھی، ابھی بچن میں داخل ہوئی تھی نے

”جو بھی میری کوکھی دکھام ہوا.....“ قنبر نے

چند دن پہلے آنے والے رضا کے فون نے گھر میں ہینل بھاوی تھی۔ رضا امریکا میں وارث اسپیشلس تھا۔ اس نے اپنی ماں کی بچپن کی کھلی صابروہ بیگم کو فون کر کے کہا تھا کہ وہ زندگی کا ایک بڑا فیصلہ کرنے چارہ ہے اور ای نے مرنے سے پہلے تاکید کی تھی کہ رضا جب بھی اپنا ایسا فیصلہ کرے تو صابروہ بیگم سے ضرور رابطہ کر لے۔ سو وہ اسی غرض سے پاکستان آرہا تھا۔ زادھر صابروہ بیگم اپنی بہن جیسی کھلی کے بچنے کی آمد سے بہت اچھا لطف تھیں اور ان کی اس بے انتہا خوشی کے پتھر میں سارا گھراٹا پکڑا رہا تھا۔

ہاں..... امریکا کے بہت مالدار..... تعلیم یافتہ اور منظم



ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے سلاوا کی ٹرے ساڑھ پر رکھی۔۔۔۔۔ جو وہ بنا کم اور کھانا زیادہ دہی تھی۔ اس وقت وہ سب کچن میں شام کے کھانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

”خیر ہم لوگ ختم ہوں یا نہ ہوں۔۔۔۔۔ ہماری اماؤں نے جس طرح ہم کو دبا دبا کر پالا ہے، ہماری شکلوں پر شبی، مسکینی اور لا چاری سب دل کھول کے برستی ہے۔“ امین نے جمل کر کہا۔

”اور یہ بھی تو ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہم سوچتے ہیں کہ بیرونی گھر کی سب سے مظلوم۔۔۔۔۔ معصوم۔۔۔۔۔ سی لڑکی ہوگی اور بیرو کو لے اڑتی ہے گھر کی شورش و خشک اور لاؤالی بنی۔“ نعب دور کی کوڑی لائی۔

”اور بھی سبھی۔۔۔۔۔“

”یار چھوڑو یہ سب باتیں۔۔۔۔۔ فکر کی بات یہ ہے کہ سارے افسانے ہماری ماؤں نے بھی جنم رکھے ہیں۔“ ذیب نے سب لڑکیوں کو معاملے کی تکفینی کا احساس دلا یا۔

”oh my God“ منہ سے بے ساختہ نکلا۔۔۔۔۔ اور پھر سب کو جھپک جھپکائی۔

”یہ تم اس وقت کہاں جا رہی ہو۔۔۔۔۔“ نعب جو بیگ کا تھم سے پر ڈالے یو نیورسٹی کے لیے نکل رہی تھی۔۔۔۔۔ صابروہ بیگم کی آواز پر چونک کر کھٹی۔

”یو نیورسٹی جا رہی ہوں امی۔۔۔۔۔ اور کہاں جاؤں گی۔۔۔۔۔ اور اس وقت اس لیے جا رہی ہوں کہ روز کی طرح 7:50 کا پمانٹ لے لوں گی۔“ نعب نے سوال بنی ماں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ تم یو نیورسٹی جا رہی ہو، روز کی طرح۔۔۔۔۔ لیکن چنا آج رضا آرہا ہے۔“

”کون رضا۔۔۔۔۔“ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی نعب نے معصومیت کے سارے پکارا تو ڈر اے۔

”لو بھئی حد ہوتی ہے۔۔۔۔۔ چاروں سے گھر میں رضا، رضا کا شور مچ رہا ہے اور ہماری باؤلی بنی پوچھ رہی ہیں کون رضا۔۔۔۔۔ واہ بھئی واہ۔۔۔۔۔ ارے میری سبکی مگی ناں ساجدہ۔۔۔۔۔ جس کا چند سال پہلے نیو یارک میں کینسر سے انتقال ہو گیا تھا۔ اس کا چنا ہے ڈاکٹر احمد رضا۔“ صابروہ بیگم کے لہجے میں کم از کم دو کلو فخر اور فردو ذیب کو بھی محسوس ہوا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا وہی ساجدہ آئی ناں جو ہمیشہ پاکستان آتے ہوئے ڈالر ڈ اسٹورز سے one dollar کیل میں سے دو تے سورتے چند تھا کف لے آتی تھیں۔ اور آپ ان کے تھکوں کے عوض صرف امریکا کی ٹکٹ سے سٹار ہو کر ٹیٹ قیمت تھا کف ہو یا کرتی تھیں اور جس زمانے میں وہ آتی تھیں تو ہم کو بھی بڑا سبب اندکھی دھرتی بھی پڑا تو کبھی کچھ اور مل جاتا۔۔۔۔۔ کاش وہ پھر سے آجائیں۔“

نعب نے صابروہ بیگم کے کفایت شعار مزاج کو لگا دیا۔

”ارے ذبی باؤلی ہو گئی ہے۔ کیسی باتیں کر رہی ہے تو۔“ صابروہ بیگم کی ہنسی نکل گئی۔

”ذبی۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔ یا اللہ اس شخص، چند میں سالہ اور زندگی میں بھی آپ نے مجھے اس قدر پیار سے نہیں پایا۔۔۔۔۔ بلکہ مائی ذخرائی مجھے تو آج ہی پنا چاہے کہ میرے نام کا تو ایک بہت خوب صورت تک نیم بھی بن سکتا ہے ذبی۔۔۔۔۔“ نعب نے ذبی کو کھینچا۔

”بیاری امی ایک دفعہ اور کہے ناں۔۔۔۔۔ ذیب۔۔۔۔۔“

نعب نے پھرے پر درد اور خوشی کے ملے جلے تاثرات لاتے ہوئے گلو کیر لہجے میں کہا۔

”چپ رہو۔۔۔۔۔ بہت ہی بولتی ہو۔“ صابروہ بیگم کی برداشت جواب دینے لگی۔

”رضا آرہا ہے۔۔۔۔۔ بس گھر میں بیٹھو۔ تاکہ یہ جو یو نیورسٹی چاہنا کر تمہاری شکل در پائی گھوڑے جیسی ہو گئی ہے، یہ کچھ بہتر ہو کر۔ اگر خوب صورت نہیں تو کم از کم انسانوں میں تو لگے۔“ صابروہ بیگم

نے خوب صورت نقش و نگار رکھنے والی نصاب کو دیکھتے ہوئے اس لمحے میں کہا۔
 ”مجھے دیکھو ہماری اماں کا حکم ہے کہ جتنی مظلومیت میں چہرے پر لاسکتی ہوں لے آؤں.....
 اور ہر وقت سر جھکا کر جگن میں کام کرتی رہوں۔ ان کا بس چلے تو میرا بستر ہی جگن میں لگوا دیں..... مجھے روز چار چوٹ کی مار ماریں..... مجھے اپنی بیٹی ہی ماننے سے انکار کر دیں..... کیونکہ ان کا خیال ہے ہمیشہ بیرو کو گھر کی سب سے مظلوم لڑکی ہی پسند آتی ہے۔ روزوں میں کام کرتے کرتے میرا برا حال ہو گیا۔ جبکہ اللہ کے واسطے میرے بارے میں سوچ..... انھن نے اپنے دیکھ بھلے انداز میں کہا تھا ان سب کا بے ساختہ قبضہ نکل گیا۔

نے دل جلانے والے انداز میں کہا۔
 ”اگر اسی میری شکل دریا کی ٹھوڑی بھی ہے تو پھر آپ مجھے کسی دریا میں پھوڑ دیں..... گھر میں کیوں بٹھار دی ہیں۔“ نصاب نے برا مانا۔
 ”بس باتیں بند کرو..... کچھ میں نہیں آتا تم لوگوں کو اتنی باتیں کیسے آ جاتی ہیں..... چلو اندر جا کر اس گھر کو گچ کرنے کی کوشش کرو.....“ صابرو حکیم نے اپنی بات مکمل کر کے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
 ”کیوں امی..... آخر کیوں؟“ نصاب نے کسی ماہر وکیل کی طرح بلند آواز میں سوال کیا۔
 ”ارے نصاب تم بے وقوف بھی باتیں کیوں کر رہی ہو..... جو بھی آتا ہے۔ یہاں ایسا ملا ہی ہوتا ہے۔ میرا تو بس رخصا پر دل آگیا ہے۔ امریکن سٹیشن ہے۔ اور سے ڈاکٹر بھی..... اپنا ذاتی گھر بار ہے اور کیا چاہیے۔ میرا تو رونا، روناں رات و دن دعا کر رہا ہے۔ اللہ کوئی سبب پیدا کر دے..... میں تو کسی بزرگ سے جا کر دعا بھی لے آئی ہوں۔“ نصاب نے آج سے ہی مصرکی نماز کے بعد پڑھنا شروع کیوں کی۔ میرا دل کہہ رہا ہے نصاب، تجھے خوب چلنے والا ہے..... لیکن تقدیر کے ساتھ ساتھ یہ خبر بھی پہنچے ضرور دی ہے۔“ وہ خوش ہوئی کہہ رہی تھیں۔

”جانتا ہے وہ بزرگ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ رشتہ حسبِ فطرت ہوگا۔ ساری دنیا دیکھتی رہ جائے گی اور..... جہدار جو تم نے کسی سے ذکر کیا..... ارے جب جانے چڑھے گا تو کل عالم دیکھ ہی لے گا۔“ صابرو حکیم پانچواں کی کلیا صاف کرتے ہوئے مسلسل بول رہی تھیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ نصاب تو سب کی سب چلتی وہاں سے چاہتی تھی۔

☆☆☆

”میری پیاری سی نصاب..... تمہاری کہانی اتنی دردناک نہیں ہے، کم از کم اس بہانے تم کو مجھے کپڑے اور پارلر کے وزٹ تو مل گئے.....“ انھن

سپنس، سرگزشت، پانچویں، چاسویں

سول ایجنٹ فیضانے یو۔ اے۔ ای

WELCOME BOOK SHOP

ویکم بک شاپ

پتی اوپیکس: 27869 کراچی

فون: 04-3961015 فیکس: 04-3961015

موبائل: 050-6245817 ای میل: welbooks@emirates.net.ae

WELCOME BOOK SHOP

ویکم بک پورٹ

ڈیٹیل، ہول بیل، ڈسٹری بیوٹر، پبلشر، ایکسپورٹر

میں اردو بازار کراچی

WELCOME BOOK SHOP

فون: 02-2113263666 فیکس: 02-2113263666

ای میل: welbooks@hotmail.com

ویب سائٹ: www.welbooks.com

انہیں بھی پسند آیا تھا لیکن سب سے تحمل دل جانے کے باوجود رضا کی مرضی کا اعزاء نہیں ہو رہا تھا۔

سو آج افطار کے بعد جب روز کی طرح ساری ٹیلی جانے پہنچے پر بیٹھی تو رقیہ بیگم نے وہ موضوع پھیلڑ دیا۔ جس پر ہر کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔

"تو جیسا جب بھی پاکستان آتا، ہمارے ہی گھر میں ٹھہرنا۔۔۔۔۔ بلکہ ہمارا کیا، یہ تمہارا ہی گھر ہے۔"

آمد بیگم (ایمن کی ماں) نے جلدی سے کہا۔

"بالکل ہے۔۔۔۔۔ میں آپ کو پاکستان کی سب سے خاص بات بتاؤں۔ کیا ہے۔" رضا نے سنسنی سے کہا۔

"ہاں، جتنا فرق۔۔۔۔۔ تمہارے بیگم نے بے صبری کی حد تک اس کرتے ہوئے کہا۔

"ایمن کے ہاتھ کی جانے۔" رضا نے سامنے سے آتی ایمن کو دیکھ کر غلط فہمی میں کہا۔

ایمن کو دیکھتے ہوئے اسے ذوق صابرہ بیگم کے تھوڑے سے غل نظر آئے اور ہی گھر میں داخل ہوتی ناہید بیگم کی گھورتی نظریں۔۔۔۔۔ نظر تو اوروں کو بھی بہت کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن پھر بھی۔۔۔۔۔

☆☆☆

"اماں آپ بھی حد کرتی ہیں۔ میں آپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور آپ نے میری شادی نہ جانے کن لوگوں میں کر دی۔۔۔۔۔ زندگی گزر گئی میری، ساس نندوں کا منہ دیکھتے، دیکھتے ساری سسرال بیچہ بیٹیوں بھرا کباب ہے۔" وہ نہایت غم زدہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"بس گزر رہی گئی اب زندگی تیرا میرا منہ دیکھتے، دیکھتے۔۔۔۔۔ اور تمہاری بھادھیں۔۔۔۔۔ واہ ساری زندگی دنگاتی رہیں اور اب۔۔۔۔۔ اب بھی آپ کو حنا کا ذرا برابر خیال نہیں۔۔۔۔۔ اب بھی آپ نے میری بیٹی کے بارے میں نہیں سوچا۔۔۔۔۔ جبکہ وہ آپ سب سے کس قدر پیار کرتی ہے۔" ناہید بیگم نے غصے سے کھولتے ہوئے رقیہ بیگم سے کہا۔

"تو جیسا۔۔۔۔۔ تمہاری ٹیلی کا کب تک آنے کا ارادہ ہے؟" رقیہ بیگم نے افطاری کے بعد جانے پہنچتے ہوئے رضا سے پوچھا۔ رقیہ بیگم ایک لمبے دیے رہنے والی خاتون تھیں لیکن رضا کے اعلیٰ اخلاق اور مؤدبہ پانہ اعزاز نے ان کے دل میں اس کے لیے ایک خاص جگہ پیدا کر دی تھی۔

رضا کو آنے کی دن ہو گئے تھے اور وہ بہت جلدی گھر کے فرد کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ اس میں اس کی اچھی عادتوں کے ساتھ ساتھ گھر میں موجود رقیہ بیگم کی بہوؤں کی خواہشات اور امیدوں کا بھی دخل تھا۔

ساس کے منہ سے نکلے سوال کو سن کر صابرہ بیگم جلدی سے رقیہ بیگم کے برابر آ بیٹھیں کہ وہ دل سے چاہتی تھیں کہ جلد از جلد رضا کی ٹیلی پاکستان آئے۔ اور ان کو یقین تھا کہ وہ ان کی نوبت کا ہی ہاتھ مانتے گا۔

"بس داؤی اماں انشاء اللہ وہ لوگ عید سے ایک دو دن پہلے آ جائیں گے۔ دراصل میرا تو کوئی بلا نہیں تھا ان لوگوں کو بلانے کا لیکن آپ لوگ اس قدر اچھے ہیں۔۔۔۔۔ اتنی محبت کرنے والے، اسے کچھ غلطی۔۔۔۔۔ میرا دل چاہتا ہے۔۔۔۔۔ میرا ایک غلطی آپ لوگوں سے کام

رہے۔" رضا کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جس سے

"ویسے پتا کیا تم نے یہاں اعلیٰ اپنی ساری پر اپنی سچائی دی؟" حبیب احمد نے بیوی کے اشارے پر زبردستی مداخلت کی۔

"نہیں اگل پہلے تو میرا ارادہ تھا کہ سب مل کر دوں لیکن اب آپ لوگوں سے ملنے کے بعد میں چاہتا ہوں پاکستان سے بچ رہوں سو ڈیڑھ گھنٹہ میں خیابان انتظار داخل کوئی میں نہیں سچ رہا۔۔۔۔۔ وہ میں نے روک لی ہے تاکہ بھی پاکستان آؤں تو ٹیلی کے ساتھ اپنے ہی گھر میں ٹھہروں۔" رضا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

رضا کو آنے کا کافی دن ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ رقیہ بیگم بہوؤں کی بے چینی بھی محسوس کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ رضا

میرے لیے ساری ہی بچیاں برابر ہیں۔" رقیہ بیگم نے ہنسیا کر بیٹی کو کونکا۔

"کوئی برابر و برابر نہیں ہے اماں.....! آپ نے ہمیشہ اپنی ہی بیٹیوں کو میری حاکم و قیادت دی ہے..... اب دیکھیں رضا کتنا اچھا لڑکا ہے، آپ خود اپنے ایمان سے بتائیں کیا آپ نے سوچا کہ رضا کی شادی حاکم سے ہوئی چاہیے؟" ناہید نے فوراً ماں کی بات کو رد کیا۔

"اچھا خیر..... تم فکر مت کرو، میں دیکھتی ہوں رضا کی فیملی انشاء اللہ چاند رات کو آ رہی ہے..... پھر دیکھو میں کوئی بات کرتی ہوں....." ناہید کی باتوں نے رقیہ بیگم کو ایک عجیب سی الجھن میں ڈال دیا تھا۔

"کیسے اماں..... رضا کے ماں، باپ تو ہیں نہیں..... سب اس کی فیملی میں کون کون ہے؟"

آج جب وہ آنکس اور انہوں نے اس طرح بھائی بہادری کے درمیان گھرے ہوئے رضا اور شرمائی ہوئی ابھن کو دیکھا تو ان کے دل پہ گھٹے ہی لگ گئے۔

رضا انھیں بہت پسند آیا تھا۔ وہ امریکا میں ڈاکٹر تھا اور حاکم میڈیکل اسٹوڈنٹ تھی..... انہوں نے ساری زندگی سسرال والوں کی خدمت گزاری کی تھی، وہ چاہتی تھیں جو زندگی انہوں نے گزاری ہے ویسی زندگی کم از کم ان کی بیٹی کو نہ گزارے اور رضا میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو ایک بہت کرنے والی ماں اپنے داماد میں چاہتی ہے۔

آج کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد وہ اس سلسلے میں اپنی اماں (رقیہ بیگم) سے مشورہ کرنے آئی تھیں لیکن یہاں تک پہنچی بساط پر رکھے میرے دیکھ کر ان کی تو جان ہی جل ہی گئی۔

"کیا ہو گیا ناہید، کسی باتیں کر رہی ہو..... جو منہ میں آئے بس بولتی چلی جاتی ہو..... اسے بھی

مید کی خوشیوں کے رنگ
جاسوسی کے شہر کے دلچسپ رنگ

ماہنامہ جاسوسی

● اولین صفحات ● جرم کی نگین دلدل میں پڑے مسکراتے لوگوں کے دھنسنے کا دل خراش فسانہ... روبینہ رشید کے قلم سے

● آوارہ گرد ● دیکھ کھسکے شہر کے راز میں ایک نئی اور نئی دنیا کی جھلک... ہر ایک کوئی ہمارا کاہن ہے...

● جوازی ● احمد اقبال کے شہرہ قلم سے ایک جوازی کے کھیل کے نکتے اور

● مہربانی والے انداز ● مغربی اور ایک تہذیبی حوالہ کی تلاش اور بہت کی تلاش اور بہت کی تلاش

سرور ق کی کہانیاں

● بھٹی کہانی ● مسعود بھٹی کے انہوں نے ان کے سپرد ہونے کی مشغول سوز و گداز

● دوسری کہانی ● فطرت کی سیمیں میں رہنے کی حیات کے نقطہ نظر اور پیش نظر کے نئی دنیا کی



آپ کے تحریر
تاریخ
میں

آپ کے تحریر...
مشاورہ...
اور قی کی دلچسپ باتیں... کہاں

ہوگا.....؟ میں نے پوچھا تھا ایک بار تو جس کر کہنے لگا..... دادی بس یہ سر پر اتار ہے....." زرقہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا اور کھڑی ہو گئیں کہ انہیں ترانہ بھی تو پڑھنی تھیں۔

☆☆☆

"میں نے سوچا مگر روزے میں کانا بے صحتی ہوئی آئی ہوگی اور آج تو گری بھی بہت ہے۔ سو میں لے آیا..... کہ افطار کے بعد کھانا..... بھلا اس میں تکلف کی کیا بات ہے۔" رضا نے کہوں میں آکس کریم نکالتی جو یہ کہہ رہا تھا اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور سے میرے بھولے بھالے سے رضا بھائی! بات تکلف کی نہیں، دیکھ بے قدری کا ہے۔ آپ کو لگا ایک حاضی کانا جاتی ہے، وہی سورج کی گرمی میں جھکتی ہوئی آتی ہے..... اور میں....." جو یہ بے خطری سانس بھری..... "میں تو جیسے بھولوں میں جھومتی ہوں۔" بادل کا ایک ٹکڑا میرے سر پر سایہ کیے ہوتا ہے۔" جو یہ بے منت بنایا۔

"ویسے تم مسلسل آکس کریم کھا رہی ہو....." نے تو اب تک ایک اسکوپ بھی ختم نہیں کیا تھا رضا نے خاموش بیٹھی حنا کی سائڈلی۔

"اور سے رضا آئے ہیں....." ناہید بیگم جو ڈرائنگ روم میں سے آئی آوازوں کو سن کر اپنے کمرے سے باہر آئی تھیں..... رضا کو دیکھ کر جیسے کل کی ٹیکہ لگائی۔

"دیکھیے..... رضا بھائی، حنا کے لیے سخی ساری آکس کریم لائے ہیں۔"

"حنا کے لیے.....؟ ناہید بیگم نے حنا کے شرمائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر رضا کے جھگڑاتے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا اور پھر جیسے ڈیروں اطمینان انہیں اپنے اندر اتارتا ہوا محسوس ہوا۔

☆☆☆

"رضا ہر وقت میرے ہاتھ کے پکے کھانوں کی تقریریں کرتے رہتے ہیں..... لگتا ہے اب مجھے کو کنگ پر توجہ دینی ہی پڑے گی..... ہماری ای بھی تو خوب ہیں روز اسے مشکل، مشکل کھانے پکا کر میرے نام کر دیتی ہیں۔

"مجھے تو یہ بھی کچھ میں نہیں آتا کہ آخر زمکی کو نفع میں اظہار سلامت کیسے رہتا ہے اور ہماری مای صلیبہ بیٹی کتنے فخر سے کہہ رہی ہیں کہ میری زینب تو ایسے نرمی کو نفع پکاتی ہے کہ غمہ ہونٹوں سے توڑ لے۔

"زمکی کو نفع تو بڑی بات..... مجھ سے تو فروزن فز کے سب کو نفع نہیں کچھ..... لیکن بے چاری ای کا کس کیا..... ہر ماں ہی چاہتی ہے کہ اس کی بیٹی محسن کرے..... بس رضا کی بیٹی آج..... اور بات ذرا آگے بڑھے تو میں انشاء اللہ..... کو کنگ اور چانگ کے گورنر کرلوں گی..... تاکہ باقی زندگی رضا یہ نہ سوچ سکیں کہ میری ای نے سمجھاٹ بولا..... اور ویسے بھی مرد کے دل کا راستہ..... دے سے ہو کر ہی گزرتا ہے..... اور لگتا ہے رضا بھی ایسے ہی مرد ہیں۔"

زینب نے بکن کا ڈنڈر صاف کرتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے عہد کیا۔

☆☆☆

"آپ کو پتا ہے کہ آپ کی مسکراہٹ بہت خوب صورت ہے..... آپ خود بھی بہت خوب صورت ہیں اور آپ مگر بہت ہی خوب صورت بنتی ہیں۔"

"پانگل....." رضا کی آواز زینب کے دل سے ہوتی اس کے کانوں میں گونجتی تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

☆☆☆

آج زینب کی برچھوڑے تھی..... رضا کو کیسے پتا چل گیا۔ یہ بات زینب کے لیے معافی تھی..... ابھی

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمنا جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پکھلیہری
قابل علاج مرض ہے

قائل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

اجمل زیدی  کی دینی و علمی کتب کے مصنف اور پروفیسر
 ملتان
 ایوان
 مولانا



ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARDS



AWARD OF BEST ACTRESS



Abstract

[illegible]

100

1975/275

۱۰۰۰
 ۱۰۰۰
 ۱۰۰۰

271-271-14

[illegible]

Abstract

تلفون: 00921 3218218-9

2011年11月
2011年11月

000-000-000

100

1-855-4328

DOI: 10.1002/eqe.242

28 جولائی 2019ء

[illegible]

4-5774-03

KFC 1247-4430
 801-701-2004-8

١٣- جلد ۲۷، صفحہ ۱۴



رضا انہیں لینے اڑ پڑ گیا ہوا تھا۔

انظار کی تیسری عروج پر تھی..... ساتھ ساتھ
مہمانوں کے استقبال کے لیے سب دھوپ و دل فرخ
راہ کے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ ناہید بیگم جو بھی اپنے گھر
سے بیٹی ہوئی وال کے کر بھی نہیں آتی تھیں بقول ان
کے یہ ان کا بیٹا تھا۔ یہاں وہ صرف آرام کرنے اور
خاطریں کروانے آتی تھیں..... آج وہ چار مختلف قسم
کے کھانے بھی تیار کر کے لائی تھیں۔

☆☆☆

”ٹھیک ہے..... لیکن ہال ذرا ڈھیلے ہائے فوکس
کر چوٹی میں عجیب ہوتی سی لگ رہی ہو.....“ صابرہ
بیگم نے صاحب قمری سی نوب کو تنقیدی نظروں سے
دیکھتے ہوئے کہا۔

”ختم..... سی.....“ نوب بھی۔

”ختم سوخ رہو..... اس طرح اور بڑی لگ رہی
ہو..... رضا خود اس قدر خوب صورت لڑکا ہے..... چتا
نہیں، بٹیکس کتنی پیاری اور خوب صورت ہوں
گی..... اب بیٹا..... ایک تو تمہاری شکل صورت
ویسے بھی واجبی سی ہے اوپر سے تم اور تہریاں
چڑھائے رکھتی ہو..... اللہ خیر کرے درودہ کھلتے میں
تھوڑی سی دیر رہ گئی ہے..... رضا اب تک نہیں آیا.....
میرا تو دل ہول رہا ہے۔“ صابرہ بیگم نے نوب سے
بات کرتے کرتے جو اچانک وال کلاک پر تیزی
سے بھاگتی سوئیں کو دیکھا تو گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

”ای! آپ تو بہت سی گھبرا رہی ہیں.....
آپ تو ایسا کر تیں کہ اڑ پڑتے ساتھ چلی جائیں، یہ
زیادہ بھڑ رجتا.....“ نوب ایک تو اپنی بے عزتی پر
جمل رہی تھی اوپر سے صابرہ بیگم کی بے قراری۔

”ہاں، میں بھی تو یہی چاہ رہی تھی..... لیکن کیا
کروں! رضا تو بہت ہی شرارتی ہے..... کہنے لگا نہیں
آئی آپ لوگ گھر پر ہی رکھیں میں اکیلا ہی چلا جاؤں
گا..... کیونکہ میں نے آپ کی اپنے گھر والوں سے

پچھکاروں اور میرے درمیان سات مستندوں
کا قافلہ..... واہ..... کیا زندگی ہوگی..... نہ سانس نہ
خند..... میری تو وہی چھوٹن ہوگی.....“ کھول مہاں
کھنا، میں مگر سنبھالوں اپنا۔“

”میرے اللہ جی میرے حق میں فیصلہ
کرو۔ پلیز.....“ حنا نے آئینے میں نظر آتے
اپنے عکس پر نظر کر جاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

☆☆☆

نوب..... ایمن اور حنا..... تینوں جب بھی مل
کر بیٹھتیں یہی ظاہر کرتیں جیسے انہیں رضا میں کوئی
دلچسپی نہیں ہے بلکہ ان کے بڑے خاص کر ان کی
مائیں جس طرح رضا کے آگے بچھے، بچھے چار ہے
ہیں تو انہیں یہ سب کچھ سخت برا لگ رہا ہے ورنہ.....
واقفیت وہ تینوں دل ہی دل میں یہ چاہ رہی تھیں کہ
قمران کے نام نکل آئے لیکن قمران کے نام نکل
کا، کون، کون بہتے گی.....؟ کون بازی بچتے
گی.....؟ یہ کون جانتا تھا.....؟

☆☆☆

”دیکھیں اماں میں کچھ آپ سے کہہ رہی ہوں
آپ کو میری حنا کے لیے بات کر رہی ہے اور اگر رضا
کی شادی حنا سے نہیں ہوئی تو کچھ میں کسی اور سے بھی
رضا کا رشتہ بڑے نہیں دوس کی.....“ ناہید نے
خاموش بیٹھی بیچ کے دانے چڑھتی رقیہ بیگم سے آدھے
کھٹے میں کوئی بار حوس مرتبہ یہی بات دہرائی۔

”تو ہے، ناہید تم خود باولی ہو گئی ہو..... مجھے
بھی پاگل کیے دے رہی ہو..... آنے تو دو ان
لوگوں کو..... دیکھتے ہیں اونٹ کس کر وٹ بیٹھا
ہے۔“ رقیہ بیگم نے توقف سے بیچ کو گاؤ گئے پر اس
طرح رکھا کہ دانے نہیں مل جائیں اور پھر ناہید سے
برہمی سے کہا۔

آج انیسواں روزہ تھا..... شام پانچ بجے کی
گھنٹ تھی..... رضا کے گھر والے آرہے تھے.....

اس قدر تعریفیں کی ہیں کہ ان پر ہمت پر پہلی ملاقات میں حرم نہیں آئے گا۔" بچے نے اس قدر محبت اور مصوصیت سے کہا کہ مجھے اس کی بات ماننا ہی پڑی۔ "صابرہ بیگم نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہونہ۔۔۔ شرم۔۔۔ ابھی یہ بات ہم میں سے کوئی کرتا تو ائی۔۔۔ وہ وہ باتیں سناتیں کہ زہر کھانے کو دل چاہنے لگتا۔ لیکن ہماری ائی خیر پھر بھی بہت ابھی ہیں میری ائی۔۔۔ میرے لیے ائی تو اس قدر پریشان ہو رہی ہیں۔ اللہ کرے۔۔۔ میں رضا کی پہلی کو۔۔۔ پسند آ جاؤں۔" نذیب نے دل ہی دل میں اللہ سے فریاد کی۔

☆☆☆

"فرن۔۔۔ فرن آؤ وہ بچہ جو رضا کا انظار کرتے، کرتے خاموشی سے سر جھکا کے انظار کر رہے تھے۔ کال بیل کی آواز پر جیسے چونک اٹھے۔

"لگتا ہے رضا بھائی آ گئے۔" جویریہ تجزی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔

"رضا۔۔۔" مہمن کے کلب قہر قہرائے۔

"میرا بچہ آ گیا۔" صابرہ بیگم نے بے قراری سے آنسو پھولوں کا بھرا چھوہاٹھس ڈش میں دکھایا۔

"اٹھو جا۔۔۔ دیکھو۔۔۔ چاہو وہاں سے میرا رضا کی چمیلی آئی ہے۔" ناہید بیگم نے حضور خدوں سے چلتے ہوئے آئینہ بیگم کی تیز رفتاری کو مات دی۔

وہ گھر جہاں کا اتفاق اور محبت مٹا بی گئی ایک عجیب سی غصا منسی کا نمونہ لگ رہا تھا۔ رقیہ بیگم نے تاسف سے بنی اور بیوؤں کی طرف دیکھا۔

"یا اللہ میرا مہمن اتنا کڑور تھا بے رقیہ بیگم نے اللہ سے سوال کیا۔

تینوں لڑکیاں ایک دوسرے سے نظریں چرائی تھیں۔ کون رضا کے دل کی خبر دے رہی ہے، وہی کے حیلے سے باہر نکلے کا وقت آ گیا تھا۔

"اسلام بیگم۔۔۔" رضا نے پُر جوش انداز میں سلام

کیا اور ہر کسب سے اپنی اپنی جگہ قہر کے ہو گئے۔ عید کا چاند ہو چکا تھا۔ گلی میں چائے چھوٹ رہے تھے۔ ٹی وی پر پر جگمگ نواز چل رہی تھی۔۔۔ اور رضا کھڑا ہوا تھا۔

"ان سے ملے۔۔۔ یہ ہیں میری بیگم۔۔۔ عازرہ۔۔۔ اور یہ میرے دونوں بیٹے۔۔۔ علی اور ہاجیو۔۔۔ علی گریڈ 4 میں پڑھتے ہیں۔۔۔ پلو بیٹوں چاہو وہاں کو سلام کرو۔۔۔ اور عازرہ ان سے ملو۔۔۔ یہ ہیں میری بیگمیں۔۔۔ آپ کبھی ہمیں جان کہ آپ کی زندگی میں نہیں ہیں، دیکھیں اللہ نے ایک ساتھ اتنی ساری خدیں دے دیں آپ کو۔" صابرہ بیگم کو لگا ان کا بارش ٹپل ہو جائے گا۔ ناہید بیگم اور آمنہ بیگم بہت خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ یہ الگ بات ہے کہ باہر نکلے، نکلے وہ ڈانگ ٹپل پر سے سالن کی ڈشیز اٹھا کر باہر بھیج دی تھیں۔

"کیا رضا نے ہم کو دھوکا دیا؟" صابرہ بیگم نے پوچھا۔ "آپ سے پوچھا۔" نہیں۔۔۔ اس نے کہاں دھوکا دیا۔۔۔ وہ تو بار بار کہہ رہا تھا۔ میں اپنی زندگی کے اہم فیصلے کرنے آیا ہوں۔ اس کی زندگی کے اہم فیصلے اس کی پراپرٹیز کے حلقے تھے۔ خوش فہم تو میں تھی۔" صابرہ بیگم کے اندر جتنی ایک ماں نے انہیں سمجھایا۔

"یا اللہ میرے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ تو نے میرے فیصلے کے والوں کی طرح بڑے خاندان کو ٹکھرنے سے بچالیا۔" رقیہ بیگم، عازرہ کو سینے سے لگائے۔۔۔ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں۔

what a surprise! تینوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے جویریہ کو کہتے سنا۔۔۔ اور پھر وہ سب بے ساختہ ہنس پڑیں اور ہنسنی ہی چلی گئیں۔

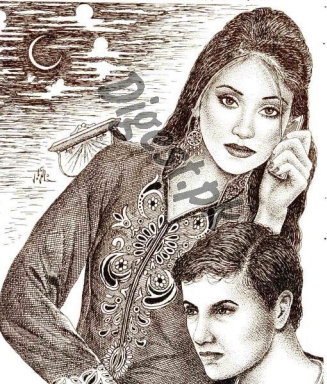
یہ الگ بات تھی کہ یہ چاند رات ان کو کسی دھماکے سے کم نہیں لگ رہی تھی۔



مجھتاؤ گی اور اس وقت تمہارا بچتا دوا بکار ہوگا۔"
 اسی اس طرح کی کھینچا اے اکڑ گئی رہیں۔۔۔
 مگر وہ اسی کی باتوں کو سنتی ہی کب تھی۔۔۔ اگر انسان
 دوسروں کے تجربے سے سبق حاصل کر لے تو چاہیے نہ
 نکال جائے مگر یہاں تو جب تک کوئی خود تجربے کی بجلی میں

جہاں جہاں کرائی ہے عید
 عیدِ انسرد و کس

"ماٹرو۔۔۔ اچھی آواز دیکھو! یہ تم ایک دن بہت



جانے کے لیے تیار ہوتا ہے۔" مائزہ مسکراتی ہوتی بیڑھیاں اترنے لگی۔

مائزہ کے جانے کے بعد فراز کافی دیر تک اس کے رویتے پر غور کرتا رہا۔۔۔۔۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ صرف نام کے لیے اس کی بیوی ہے، اس کا بھنا، سنورا، غیر مردوں کو دکھانے کے لیے ہوتا تھا، کافی دیر تک وہ انہی خفی سوچوں میں گم رہا۔ اگلے، اگلے ہوا کے ساتھ پھوہار چٹنی شروع ہو گئی تھی۔ فراز چست پر بارش میں بیٹھتا رہا۔

"فراز اتم تو کھانا کھاؤ۔۔۔۔۔ تمہاری لاڈلی بیوی تو تیار ہو کر ابھی اٹھی ہے۔" سلیپر بیگم کا لہجہ خاصا ناگوار تھا۔

"آئی مجھے بھوک نہیں ہے۔" فراز کا موڈ سخت آف تھا۔

"جنا۔۔۔۔۔ ارباب کو کچھ نہیں کھانا پڑھا پاتا ہے۔" "تمہاری فی الحال میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں، تھوڑی دیر آرام کروں گا، بھوک لگی تو کچھ کھاؤں گا۔"

بیڈروم میں جاتے ہی وہ بے دم سا ہو کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ ایسی ہی سوچوں کے بیچ اس کی آنکھ لگ گئی جو مائزہ کی آمد پر کھلی۔۔۔۔۔ وہ جدید تراش خراش کے سوٹ میں ملیں خاصی حسین نظر آرہی تھی۔

"آج تو خوب ہادل برے، کچ پارتی کا حشر آگیا۔۔۔۔۔ میں نے تو وہاں خوب انجوائے کیا اور تم یہاں گھر میں چڑے سوتے رہے ہو، خاصے بورنگ ہو۔" مائزہ نے ڈرائنگ ٹیبل کے نشیے میں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مائزہ اتم اپنی ہو جاؤ۔۔۔۔۔ تو میرے لیے کھانا گرم کر کے لے آنا، میں نے کھانا نہیں کھایا ہے۔"

"سو، سو، فراز، میں بہت تھک گئی ہوں امی یا بہن سے کہہ دو وہ کھانا گرم کر کے لا دیں گی۔" یہ کہہ کر وہ کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔ ڈرائنگ روم سے لگی تو وہ کروٹ بد لے بد ستور لیٹا ہوا تھا۔

پس نہیں جانتا اسے بات کچھ میں آتی نہیں اور جب بات کچھ میں آتی ہے تو دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

☆☆☆

"آج موسم بہت خوشگوار ہے، چلو لاٹک ڈرائیج پر چلتے ہیں۔" فراز نے آسمان پر لذتے بادلوں کو دیکھتے ہوئے مائزہ سے کہا۔

"سو، میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی، آج میں آفس سے جلدی اس لیے آگئی ہوں کہ مجھے دات میں ہونے والی پارٹی کے لیے تیاری کرنی ہے۔"

"کون سی پارٹی؟۔۔۔۔۔؟"

"آفس ورکرز کی پارٹی ہے، میرے پاس نے اپنے گھر پر رکھی ہے۔" مائزہ بے پرواہی سے بولی۔

"مت جاؤ ناں پارٹی میں۔۔۔۔۔ تمہاری ڈیوٹی آفس تک ہی ہوتی ہے۔"

"کیوں نہ جاؤں بھلا۔۔۔۔۔! میں اپنے پاس کو ناراض نہیں کر سکتی۔ ویسے بھی مجھے اس طرح کی پارٹیوں میں جانے کا بہت شوق ہے۔"

"پاس کو ناراض نہیں کر سکتیں۔۔۔۔۔ کچھ شو بہرہ ناراض کر سکتی ہو؟"

"یہ تم نے کیسی دقیقہ نوی بازی شروع کر دیں۔۔۔۔۔ شادی سے پہلے ہم نے طے کر لیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ ہماری لو میری ہے، ایک دوسرے کو کچھ کر شادی کی ہے۔ اب دیکھو۔۔۔۔۔ تمہاری بھی تو آفس میں کئی لڑکیوں سے دوستی ہے۔ میں تمہاری ذاتیات میں دخل نہیں دیتی تو تمہیں بھی اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے ٹھٹکی کے اعجاز سے کہا۔

"سو، مائزہ۔۔۔۔۔! فراز نام ہو گیا۔" میرا

دل چاہ رہا تھا کہ اسے اچھے موسم میں ہم لوگ لاٹک ڈرائیج پر چلیں۔ ہائی وے کے کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھائیں اور اچھا سا میڈرک سیں۔۔۔۔۔

"او، تم یہاں چست پر بیٹھ کر خلیائی چلاؤ پکاؤ، میں اپنے روم میں جا رہی ہوں، مجھے پارٹی میں

ماثرہ نے اس کا رخ اپنی طرف پھیرنا چاہا مگر وہ...
تختی سے اپنی پوزیشن پر قائم رہا۔

”جگ میں۔ فراز میں بہت تھک گئی ہوں، ایک تو صبح آؤں۔۔۔۔۔ پھر پارٹی میں صبح سے غم حال کر دیا ہے۔ وہاں پارٹی میں سب سے ملے ملائے میں مصروف رہی، چٹینے کا موقع ہی نہیں ملا۔“ فراز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ماثرہ نے بھی مزید اسے منانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور لائٹ آف کر کے وہ سوئے لیٹ گئی۔ اسے کون سی فراز کی پروا تھی۔ صبح وہ آؤں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا تو اس نے ماثرہ کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

”کیا مصیبت ہے، تم نے مجھے کیوں اٹھا دیا۔“ وہ ایک دم پتلی۔

”کیوں۔۔۔۔۔ آج تمہیں آؤں نہیں جانا۔۔۔۔۔؟ اٹھو تمہیں معلوم ہے ہم دونوں مل کر ناشتا کرتے ہیں۔“

”فراز! پلیز تم ناشتا کر کے آؤں چلے جاؤ۔ میں تھوڑا لیٹ جاؤں گی۔ ویسے بھی رات کو کوئی دیر سے دکانی ہوئی تھی کہ مجھے سونے کا موقع ملا، اور پھر تم نے مجھے بگاڑ دیا۔“ یہ کہہ کر اس نے گلے میں صحت چسپایا۔

اپنے روم سے نکلی مگر فراز ڈانٹک لگیں پر آ بیٹھا۔

”نہجہ! باقی ناشتا لے آؤں۔“ اس نے ملازمہ کو اونٹنی آواز میں پکارا۔

وہ فوراً دھتے کے کواڑ مات لا کر نیکل پر رکھنے لگی۔ فراز نے رات میں کھانا تو کھایا نہیں تھا۔ وہ ٹینشن کو بھلا کر دھتے میں مصروف ہو گیا۔

”آج تم اکیلے ہی ناشتا کر رہے ہو؟ ماثرہ کہاں ہے، کیا وہ آؤں چلی گئی۔۔۔۔۔؟“ وہ ناشتا کر کے ٹیپکین سے ہاتھ صاف کر رہا تھا کہ امی چلی آئیں۔

”ماثرہ سو رہی ہے، کل رات وہ پارٹی سے تھکی ہوئی آئی تھی، دیر سے آؤں چائے گی۔“ اس طرح سے اکیلے تم اسے پارٹی میں کیسے

بھیج دیتے ہو؟ رات کو تم نے کھانا بھی نہیں کھایا اور اپنے کمرے میں بند رہے، فراز میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا اگر میری کو کوئی آزادی دے گا تو وہ بھی تمہاری وقار نہیں رہے گی، میں تو اس کی جاب کے حق میں ہوں ہی نہیں، جاب کے بہانے پورا دن مگر سے غائب رہتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ جھلی بٹانے میں شغیفہ نہیں ہے۔ شادی کو ایک سال سے اوپر کا عرصہ ہو گیا ہے۔ ابھی تک کسی خوشخبری کے آثار نہیں ہیں۔“ اس سے پہلے کہ امی مزید کچھ کہیں وہ آؤں چائے کا بہانہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور امی اٹے جاتا دیکھتی۔ چلا۔

☆☆☆☆

”آج تم بہت ہو گئے۔۔۔۔۔؟ میں امی سے کہہ کر کھانا لگواتی ہوں۔“ آج رات وہ دیر سے مگر پہنچا تھا۔ ماثرہ اپنے کمرے میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

”ابھی تک نا ضرور لگواؤ لیکن پہلے مجھے تم سے پوچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

”ہاں بولو۔۔۔۔۔ کیا ایسی ضروری بات ہے؟“ اس نے ٹی وی کی آواز کم کر کے کہا۔

”ماثرہ دیکھو میرا اور تمہارا پاجا اتنی جلدی نیلی بڑھانے کا نہیں تھا۔ مگر اب میں چاہتا ہوں کہ میرا بھی پیارا سا پیج ہو، جب میں آؤں تو اس کے ساتھ کھیلوں۔۔۔۔۔ اس کی مصوم شرارتوں سے میں بھی لطف اندوز ہوں۔“ وہ بہت پیار سے کہہ رہا تھا۔

”تم کی فضولیات میں پڑنا چاہتے ہو فراز۔ اور میں ابھی اتنی جلدی اس کھینچے میں پڑنے کے حق میں نہیں ہوں، ویسے بھی بچے جلدی پیدا کرنے سے عورت وقت سے پہلے بوڑھی نظر آنے لگی ہے۔“ وہ اس کی بات پر تھک کر یوٹی تھی۔

”تھکنے تمہاری غلط فہمی ہے، تمہاری بہن سارہ کے بھی تو سینے پیچے ہیں، تو کیا وہ بوڑھی ہو گئی۔ اس طرح کی کتنی ہی مثالیں ہیں، شادی کا مقصد اپنی نسل بڑھانا بھی ہوتا ہے، امی ابھی نیکی چاہ رہی ہیں کہ اب

ہماری جلد از جلد اولہ ہو جائے۔"

"واؤ..... اس نے یونہی دینی کے اور...."

"فرزاد! ابھی تو عمر بڑی ہے، بچے بھی ہو جائیں گے، شادی کے شروع کے سال تو ابھراے کرنے کے ہوتے ہیں تاکہ بچے سنبھالنے کے.... سارہ تو یہ توقف ہے، اعتر کرتی شادی ہوگئی، اس نے دنیا میں اپنے شوہر اور بچوں کے علاوہ دیکھا ہی کیا ہے، مجھ سے چھوٹی ہونے کے باوجود مجھ سے بڑی دکھائی دیتی ہے۔" مائرہ غصے سے بولی۔

دوستوں کو بھی انوائٹ کیا ہوگا۔ ہمیں اس پارٹی میں ضرور جانا چاہیے۔ اس بہانے یونہی دینی کی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔ مجھے تو اس قسم کی پارٹیوں میں جانے کا ایسے ہی بہت شوق ہے۔" مائرہ ہنسی۔

"پارٹیوں میں جانے کا شوق ہے تو تم نے کل امی کے ساتھ ریجہ خاں کی نو اسی کے حقیقے میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا۔ امی بتاتی تھیں کہ اس تقریب میں سب لوگ نہیں ہونگے۔"

فرزاد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مائرہ سے بحث کرنا فضول ہے، اس سے پہلے کہ فرزاد کچھ کہتا وہ کمرے سے چلی گئی۔

"اس قسم کی بورنگ تقریبات مجھے بالکل پسند نہیں، خاندان کی تقریبات میں جانا مجھے ذرا سا بھی پسند نہیں ہے۔"

☆ ☆ ☆

اس کی مطلوبہ فی شرٹ فرزاد کو الماری میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہی تھی۔

فرزاد، مائرہ کا حجاب بن کر خاموش ہو گیا۔ وہ اس سے بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ فرزان کے گھر جانا اس کی عادی تھی کیونکہ وہ اس کا بہترین دوست تھا۔ اس کی دوستی فرزاد کے علاوہ مائرہ سے بھی تھی۔ یونہی دینی کے دور سے ان کی دوستی قائم تھی۔

"کیا مصیبت ہے، میں آفس کے لیے نکل رہی ہوں، جلدی بولو، کیا کام ہے۔" اس نے پرس

اتوار والے دن فرزان کے گھر وینے تک اینڈ بیری کی تقریب تھی۔ اسی دن رمضان کا چاند موقع تھا، وہ نئی سنوری مائرہ کو لے کر اس کے جدید طرز سے بنے ہوئے بنگلے میں داخل ہوا۔

"مائرہ! امیری بیگ فی شرٹ نہیں مل رہی۔"

"اوگاڈ! مجھے کیا پتا تم نے اپنی فی شرٹ کہاں

"ہیلو مائرہ! اتم تو شادی کے بعد اور حسین ہوگئی ہو، فرزاد کی تلافی نکل آئی جو تم بھی بیوی مل گئی، ہم تو ہاتھ ملتے رہ گئے۔" فرزان نے مائرہ کو دیکھتے ہی غریب شروع کر دی۔ مائرہ نے اپنی محترمہ سے اس کی حوصلہ افزائی کی پھر وہ فرزاد سے مخاطب ہوا۔

رکھ دی، مائی سے پوچھو، انجیل بتا ہوگا۔ خود خواہیہ نام بر باد کیا۔" مائرہ یہ کہہ کر آفس جانے کے لیے نکل گئی۔ فرزاد نے الماری سے دوسری چٹت اور اس سے صحیح شرٹ نکالی اور غصے میں کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ اس دن کے بعد سے اس نے مائرہ سے گفتگو نہیں کی، وہاں تک محدود کر لی تھی۔ اس بات کو مائرہ نے بھی محسوس کر لیا تھا مگر وہ انہماں بنی ہوئی تھی۔ تھک ہار کر فرزاد نے ہی اس سے بات چیت شروع کر دی۔

"یار فرزاد تم تو گلی ہو، مائی پیاری لڑکی کو لے آؤ۔" اپنے دوستوں کے منہ سے مائرہ کی تعریفیں سننے کا خواہش مند فرزاد اس وقت کوئی خوشی محسوس نہیں کر سکا۔ جبکہ مائرہ بڑی اداس مسکرا رہی تھی۔ وہ اس طرح کی تعریفیں سننے کی عادی تھی۔ اسے دلی تسکین ملتی تھی۔

"سنو۔۔۔ فرزان! آج آفس آیا تھا اپنی وینے تک اینڈ بیری کا کارڈ دے کر گیا ہے۔" اس نے ایک دیدہ زیب کارڈ ڈریسنگ نیکل پر رکھتے ہوئے کہا۔

بہاؤ آت بن کر آئی تھی عید

شروع ہوئی ہے۔ اس قسم کے پروگرام تو لیت نامت تک چلتے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔"

"کچھ نہیں کہیں گے کل روزے کا اعلان ہو گیا ہے۔ مجھے مگر جا کر آرام کرنا ہے، سحری میں اٹھنا ہے۔ ابھی جا کر دو کھاؤں گا۔ جب ہی تو اٹھنے کے قابل ہوں گا ناں۔"

"طبیعت تمہاری خراب ہے میری نہیں، راتم جا کر روزے کی تیاری کرو میں کون سا روزہ رکھتی ہوں، یہ لو کار کی چابی، میں لفٹ لے کر آ جاؤں گی۔" مائزہ کا حلقہ سا جواب سن کر غصے کی ایک شدید لہر فراز کے دماغ میں اٹھی۔ اس نے فراز ان سے اجازت لی اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ تیز رفتاری سے کارڈرائیج کرتے ہوئے وہ مگر پہنچا تھا اور جاتے ہی وہ سرور دی گولی کھا کر دست پر ڈھیر ہو گیا۔ اب اسے کھاؤ کی بی بی ضرورت تھی مگر اس کے کھانے کی طلب..... وہ تو صرف ایسی بی بی کا خواہش مند تھا جو شوہر سے محبت کرتی ہو اس کا بچا، سنورا صرف شوہر کے لیے ہو۔

اسی وقت اس کے بیڈروم کا دروازہ کھلا سامنے اسی کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بے شمار سوالات تھے۔

"آئیں امی۔" وہ انہیں دیکھ کر جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

"فراز تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ مشکل سے تو تم سخت پریشان لگ رہے ہو؟ تم تو فراز ان کے کمرے گئے تھے۔ اتنی جلدی کیسے گئے اور مائزہ کہاں ہے؟"

"امی صبح سحری میں اٹھنا تھا اس لیے میں جلدی آ گیا۔ مائزہ آدھری ہے۔"

"تھیں مائزہ کو اس طرح چھوڑ کر نہیں آتا تھا۔ چند دن پہلے بھی وہ اکیلی کہیں گئی تھی۔ تمہاری ڈھیل میری کچھ سے باہر ہے، وہ تو بالکل بے لگام گھوڑی ہو گئی ہے۔"

"امی میں آپ کی باتوں سے بالکل شفق

فراز ان سے مل کر وہ آگے بڑھے تو انہیں دوسرے کلاس فیلو نے گھیر لیا۔

"واؤ مائزہ اتم تو آفت لگ رہی ہو، کہیں سے نہیں گلتا کہ تم شادی شدہ ہو۔" میکال نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔

"شادی شدہ کہاں سے لگے گی، یونہی کوئی کی شادی کو ابھی عرصہ ہی گزرا ہوا ہے، یہ مشکل سال گزرا ہے۔" دلفی بھی کہاں پیچھے رہنے والوں میں سے تھا۔ وہ مائزہ کی تعریف کر کے اس سے فری ہونے کے چکر میں رہتا تھا۔

"نہیں بھئی میڈم کے چہرے کی تازگی دیکھو، یہ تو پہلے سے چھوٹی نظر آ رہی ہے، شادی کا تو لگتا ہے اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ لگتا ہے کوئی سسرالی ڈنٹے دار باجی بھی نہیں ہیں کیوں بھئی فراز تمہارا کیا خیال ہے؟" مزل نے فراز کا ہاتھ دبا مگر وہ کچھ نہ بولا۔ اسے تو اس وقت مائزہ کے ساتھ چھینچھار کرنے والے اپنے دوست بہت جلدی لگ رہے تھے اور ان سب سے زیادہ اسے مائزہ پر غصہ آتا تھا۔ وہ فراز ان کی بیوی اور اس کے شوہر کو دیکھ کر غوا تین کے پاس جا لے کے بچا۔ اس کے دوستوں سے ہی مذاق میں مٹی ہوئی تھی۔

"آؤ مائزہ..... آؤھر ٹھیک چاہتے ہیں۔"

"فراز اتم جا کر بیٹھو، میں تو یہاں اپنے ماضی کی یادیں تازہ کرنے آئی ہوں، بیٹھنے کے لیے نہیں۔" یہ کہہ کر مائزہ دوبارہ ان سے کپ شپ میں مصروف ہو گئی۔ فراز کا تھوڑی دیر میں ہی آگیا۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے اٹھ کر گھر چلا جائے۔

"مائزہ! ابھرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ دل بھی گھبرا رہا ہے چلو مگر چلتے ہیں۔" اس نے مائزہ کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

"فراز تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، پارٹی ابھی تو

نے مازہ کا نمبر ملایا۔

”ہیلو..... کہاں ہو تم؟“

”میں دہلی کے ساتھ آکس کریم کھادی ہو۔“

اسے اتنا متع کیا کہ پارٹی میں اتنا کچھ کھالیا ہے مگر یہ ہے کہ مجھے ذہن دہی لے آیا ہے۔“

”تم متع نہیں کر سکتی تھیں۔ جلدی مگر آؤ۔“

موبائل آف کر کے اس نے زور سے بیڈ پر چلا۔

”عجب..... بے غیرت عورت ہے، ذرا بھی کسی کی عزت کا خیال نہیں۔“ وہ بیڈ پر آیا۔

ایک کھینے کے طویل انتظار کے بعد مازہ کمرے میں داخل ہوئی۔ آتے ہی وہ اپنی سینڈلز اتارنے لگی۔ ”آج تو میں بہت تھک گئی ہوں۔ دہلی تو جان ہی نہیں چھوڑا تھا۔ بے چارے کو ابھی تک یہی تمہارے لیے کیا ہو رہا ہے؟“

”نور تم اگلا بوجھت سن کر خوش ہو رہی ہو گی، تمہیں تو پورا بھی اپنی عزت کا خیال نہیں ہے۔ جب فرزان تمہیں اپنے ذراغیر کے ساتھ بیچ رہا تھا تو تمہیں دہلی سے لٹ لے کر کیا ضرورت تھی؟“ فرزاز غصے سے چلایا۔

”بھری مرضی..... ویسے بھی میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ میں کسی سے بھی لٹ لے کر آ جاؤں گی۔ اور ہاں مجھ سے دھمکے لگے میں بات کرو، میں اس طرح کی گفتگو کی مادی نہیں ہوں۔“

”آج کے بعد تم میرے ساتھ ہی رہ کر تقریب میں جاؤ گی اور میرے ساتھ ہی واپس آؤ گی۔ مجھے تم پر قطعی اعتبار نہیں رہا۔“ وہ شدید غصے میں تھا۔

”تم مجھ پر شک کر رہے ہو، میں تمہاری خاطر اپنا وہ سب ختم نہیں کر سکتی۔“

”تو ٹھیک ہے میری طرف سے تم آزاد ہو، میں تمہیں طلاق دے کر فارغ کر دیتا ہوں..... پھر چاہے جہاں مرضی جائے۔“ وہ دہاڑا تھا۔

”وہ دہاڑا تھا۔“

”وہ دہاڑا تھا۔“

”وہ دہاڑا تھا۔“

”وہ دہاڑا تھا۔“

”وہ دہاڑا تھا۔“

ہوں۔ مازہ سے شادی کرنا میری بہت بڑی قلعی تھی۔ میں نے اسے بخیر دہلی کی اچھی سا سچی کچھ کر اپنا جیون سا سچی بنایا تھا..... مگر لگتا ہے وہ اس عزت کے قابل نہیں تھی۔ اس نے میرا دہلی سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک سال سے اوپر کا عرصہ ہو گیا ہے۔ حال ہے جو اس نے میری کوئی بات مانی ہو۔ ہر بات میرے حرائق کے خلاف کرتی ہے۔“

”اب بھی کچھ نہیں گزرا..... تم اسے سمجھانے کی کوشش کرو، ہو سکتا ہے وہ سیدھر جائے۔ مجھ سے تو وہ سیدھے منہ بات نہیں کرتی جبکہ میں نے آج تک اسے کسی بات پر براہ راست نہیں ٹوکا۔“ اسی نے مشتعل لہجے میں اسے کھلایا۔

”جی ای ایسا ہی ہوگا..... آپ جا کر آرام کریں۔“ فرزاز نے ماں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ان کے جاتے ہی وہ پھر مختلف سوچوں میں مگر گیا۔

وہ خود چاہتا تھا کہ مازہ اسے اہمیت دے اور ہمیشہ شوہر اس کی عزت کرے۔ وہ نہ جانے کتنی ہی خیالات میں مگر ارباب کہ اچانک اس کے موبائل کی تکی لگی۔ اسکرین پر فرزان کا نام آ رہا تھا۔

”ہیلو..... فرزاز! میں فرزان پر مل رہا ہوں۔ مازہ مگر بچتی کئی؟“ اس کے لہجے میں سختی تھی۔

”نہیں تو.....“

”مازہ کو میں نے اپنے ذراغیر کے ساتھ مگر بھیجا چاہا تھا مگر اس نے ذراغیر کے ساتھ جانے کے بجائے دہلی کے ساتھ جانا پسند کیا۔“

”انہیں کتنی دیر ہو گئی ہے؟“

”آدھے گھنٹے سے اوپر ہو گیا ہے، تم مازہ کو فون کرو..... کوئی مسئلہ ہو گیا ہو۔“

”اوکے، میں فون کر لیتا ہوں۔“ فرزاز کچھ نرم تھا۔

”گفتگو ہائے ہیٹ آف لک.....“ فرزان نے فون بند کر دیا۔ اس سے رابطہ منقطع ہوتے ہی فرزاز

نرم تھا۔

”گفتگو ہائے ہیٹ آف لک.....“ فرزان نے فون بند کر دیا۔ اس سے رابطہ منقطع ہوتے ہی فرزاز

نرم تھا۔

”گفتگو ہائے ہیٹ آف لک.....“ فرزان نے فون بند کر دیا۔ اس سے رابطہ منقطع ہوتے ہی فرزاز

نرم تھا۔

حالات

ایک صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کا طرزِ فکر بڑا سٹارٹکن ہے ایک دن ایک ان چڑھ بوڑھا ان کے پاس جا کر بولا۔ "مصدق ملکیت کے نام میری طرف سے ایک درخواست لکھ دو جس میں بارے حالات کا ذکر ہو۔" جب وہ شخص لکھ چکا تو بوڑھے نے کہا کہ مجھے چڑھ کر سناؤ کہ تم نے آخر کیا لکھا ہے کہ اس پر کچھ اثر ہوگا مگر کیا نہیں اور جب اس نے سنا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رہے ہوئے بولا۔ "یہ تو آج مجھے پتا چلا کہ میرے حالات اس حد تک خراب ہیں۔"

مرسلہ: عجیب دنیا بھل، کراچی

کر خیر نہیں لکھ رہی۔ فراز کہاں ہے؟" ماڑہ کی می سے رات کے اس پہر دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"میں فراز کا گھر چھوڑ کر آئی ہوں، مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، اس عمر میں میرے سر میں خاک ڈالنی تھی۔"

"مئی آپ نے مجھے کس شخص کے بچے بانٹ دیا، آپ کو اندازہ ہے؟" ماڑہ ہچکچایاں لینے لگی۔

"یہ بات تو تم مجھ سے مت کرو۔ فراز سے شادی تم نے اپنی مرضی سے کی تھی، اب کیا بات ہوگی جو تمہیں اس طرح اس کا گھر چھوڑنا پڑا۔" مئی نے۔

علوند لچے میں کہا۔

"بس یونہی ہی..... خواہ خواہ مجھ پر شک کرنے لگا ہے اور مجھے غلطی مردوں سے نصرت ہے۔"

"بھر بھی مجھے بات تو پوری بتاؤ....." ماں کے اصرار پر ماڑہ نے انہیں تمام بات بتا دی۔

"تو یہ تمہارے نزدیک کوئی بات ہی نہیں..... جب تمہارے شوہر کو تمہارا غیر مردوں سے

رہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی..... تم اتنے بیک ورڈ ہو گئے میں سوچ بھی نہیں کتنی تھی۔" وہ بھی دو بدو جواب دے رہی تھی۔

"میں تم جیسی آوارہ عورت کو ابھی فارغ کرتا ہوں۔" اس سے پہلے کہ فراز طلاق کے الفاظ منہ سے نکالیں۔ سلیپر بچم نے کمرے میں آکر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"ای سی آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"فراز تم میرے گھر میں رہ کر یہ سب کچھ نہیں کر سکتے۔ میری دو بیٹیاں کٹواری پیٹھی ہیں، میں کسی بدعتی کو دعوت نہیں دے سکتی۔ تم اس کو لے کر علیحدہ ہو جاؤ۔"

"ای سی علیحدہ گھر میں مجھے کون سا جین لینے دے گی۔ ویسے بھی اس کا مسئلہ آپ نہیں ہیں۔"

"اچھا تم بیٹھو، میں تمہارے لیے پانی لاتی ہوں۔" سلیپر بچم کے جاتے ہی ماڑہ اپنا سامان ایک میں بھر رہی تھی۔

"کیا بات ہے چنا؟ ماماں، چینی میں لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، تم کہاں جا رہی ہو؟" سلیپر بچم پانی لے کر آئیں تو ان کی ٹانگ پر بڑی کھجکھجکی لڑائی

ماڑہ پر پڑی۔

"تو پانی پو....."

"مجھے پانی نہیں چنا، میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ آپ دیکھ اپنے بیٹے کے ساتھ آرام سے۔"

ماڑہ بدتمیزی سے بولی۔

"ہائیم دیکھا ہے، رات کے دو بجتے والے ہیں، جانا ہے تو صبح چلی جانا۔"

"نہیں، مجھے اسی وقت جانا ہے۔" وہ بدستور بدتمیزی سے جواب دے رہی تھی۔

"ای سے جانے دیں، خود ہی اپنا انجام بکھتے گی۔"

☆☆☆

"آؤ اندر آؤ..... اس وقت تمہیں یہاں دیکھ

ملنا پسند نہیں ہے تو اس میں برائی کیا ہے، جنہیں تو خود کو شوہر کی مرضی کے مطابق ڈھال لینا پڑے تھا۔“

”سواری گی! میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتی۔۔۔ میں ایک روشن خیال عورت ہوں، فراز نے میری شخصیت کے ہر پہلو کو جاننے پر مجھے مجھ سے شادی کی تھی اب اگر اسے مجھ میں خامیاں نظر آرہی ہیں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ بس میں اس سے طلاق لے رہی ہوں۔ اس سے اچھے لوگ مل جائیں گے مجھے۔“ مائزہ کے لہجے میں بدستور اکڑ تھی۔

”بہر حال جو کچھ بھی ہو وہ اچھا نہیں ہوا۔ اس میں قصور تمہارا ہے کیونکہ عورت ہی کو جھکنا پڑتا ہے اور تم میں پلک نام کو نہیں ہے۔ مرد اور عورت جب شادی کے بندھن میں بندھتے ہیں تو دونوں کو ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام کرنا ضروری ہو جاتا ہے اگر تم بغیر جواب داری سے سوچو تو جنہیں احساس ہوگا۔ جب فراز کی طبیعت خراب تھی اور اس نے جنہیں گھر جانے کے لیے کہا تھا تو لازم تھا کہ تم ہی

وقت اس کے ساتھ چلی جاتیں تو بلا وجہ۔۔۔ لسانہ ہوتا۔۔۔ اگر خٹفے دماغ سے سوچو تو بات سب سمجھ نہیں سکتی۔۔۔ یہ حسین صورت اور جوانی بیٹے کے والی نہیں۔ وہ مرد جو تم سے جاہت کے ساتھ چار بیٹے جا کر انہیں بتاؤ کہ تم طلاق لے کر ان سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا جو تمہارا ہاتھ ہمیشہ تھامنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔“ می نے اسے حقیقت حال سے آشنا کرانا چاہا۔

”یہ تو آپ کہہ رہی ہیں۔۔۔۔۔ آپ تو بچی چاہیں گی کہ میں ذلیل ہو کر فراز کے پاس واپس لوٹ جاؤں۔ وہ میرے مزاج سے آشنا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ میں ایک ماڈرن اور آزاد خیال لڑکی ہوں۔ اس وقت تو میں اس کی اینڈیل تھی۔ شادی کے بعد اب وہ تنگ نظر ہو گیا۔ بس میں نے کہہ دیا میرا اس کے ساتھ گزارہ ممکن نہیں۔“ مائزہ کسی

صورت ماں کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

”میری بات نہیں مانو گی تو ایک وقت ایسا آئے گا۔ جب جنہیں عداوت اور بچھتاوا ہوگا۔ ابھی تمہارے پاس سوچنے، سمجھنے کا وقت ہے۔ آگے بڑھ کر فراز کو منالو، اس کی خواہش کے مطابق خود کو ڈھال لو، بہر حال میرا کام تمہیں سمجھانا تھا۔ میری باتوں کے بارے میں خٹفے دماغ سے سوچنا اس وقت تمہیں نہیں ہو۔“ می یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی جنہیں اور وہ صبح تک مختلف خیالوں میں کھوئی رہی۔ می کی اس بات پر اس کا دل یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ می اصل میں غریب و غریبہ اس کی پیش قدمی کرنے پر آگے بڑھ کر اسے اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ وہ دیکھی ہو ہیٹھ فراز کی قسمت سے شادی رہتا تھا کہ وہ بولی لے گیا۔ فراز تو ویسے ہی اس کا بہنہ غلام تھا۔ آخر کیسے اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ اسی شخص دلچ میں پوری رات گزر گئی۔

☆☆☆

”کیا کہہ رہی ہو مائزہ۔۔۔۔۔ اتم فراز سے طلاق لے رہی ہو مگر کیوں۔۔۔؟“ اس کے کو بیگ فراز نے تیرائی سے اس کی بات سنتے ہی کہا تھا۔

”کیا کروں، اب میرا اس کے ساتھ گزارہ ممکن نہیں ہے۔“ مائزہ کے لہجے میں اطمینان تھا۔

”فراز تم بھی تو مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ جب میں نے جنہیں بتایا تھا کہ میں انکھیڑ ہوں تو جنہیں شاک پہنچا تھا۔ آخر تمہارے دکھ کا دوا ابھی تو کرتا تھا۔“

”مائزہ وہ تو مذاق تھا، میری حقیقی میری کزن سے ہو چکی ہے۔ چند ماہ میں میری شادی ہو جائے گی۔ بہتر ہے کہ تم فراز سے طلاق نہ لو ورنہ بہت بچھتاؤ گی۔ میرے رویتے سے جنہیں جو غلط سمجھی ہوئی ہے اس کے لیے میں تم سے معذرت چاہتا ہوں۔“ فراز نظریں چراتے ہوئے بولا۔

"ماڑہ اب بھی وقت ہے تم اچھی طرح سوچ لو۔ تم نے شادی کو مذاق سمجھا ہوا ہے۔ ایک سے طلاق لے کر دوسرے سے اتنی آسانی سے شادی ہو جائے گی؟" مہی اسے سمجھا رہی تھیں۔

"ہاں، میں اپنا اچھا برا خود سمجھتی ہوں، اسے میری ضرورت ہوگی تو خود مجھ سے رابطہ کرے گا۔" ماڑہ ٹھٹھے سے ہر گھنٹی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"اے میرے خدا! اس لڑکی کو کبک بدایت دے۔" مہی کے لبوں سے بے ساختہ دعا نکلی۔

دن پر دن گزر رہے تھے فراز نے ماڑہ کی طرف سے چپ سادھ لی مہی۔ ماڑہ خود اندر سے پریشان تھی مگر وہ بڑی خوب صورتی سے اپنی دلی کیفیات چھپائے ہوئے تھی۔ اس کا دل اب آفس میں بھی نہیں لگتا تھا۔

اس روز کچھ، کچھ قدموں سے وہ مگر میں داخل ہوئی تو مہی فروت کاٹنے میں مصروف تھیں۔ "کاکس مہی! میں آپ کی مدد کروں۔" ماڑہ مہی کے برابر میں آکر بیٹھ گئی۔

"میرے دو تھوڑے سے بچے ہیں، میں خود ہی کاٹ لوں گی۔ ویسے بھی تمہیں کون سا ان کاموں سے دلچسپی ہے، آج میں نے سادہ کھانا تیار کر دیا ہے تم فراز کو فون کر دینا وہ بھی آجائے۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ فراز آئے گا وہ مجھ سے خفا ہے، اس کی اجازت کے بغیر مگر سے ملتی تھی، اس کی امی نے مجھے روکا بھی تھا مگر میں نہیں دیکھی۔" ماڑہ کے دل کی اداسی لبوں پر آگئی۔

"تم نے غلط کیا مگر اب بھی کچھ نہیں بگڑا..... شوہر کی ناراضی ختم کرنا بیوی کے ہاتھیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ تم اپنے اندر ٹھیک پیدا کرو۔ غلطی تمہاری ہی ہے فراز سے معافی مانگ لو۔ اب جلدی سے اٹھو اور اسے فون کرو اس سے پہلے کہ وہ تمہارے روتے کی وجہ سے کوئی سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے۔"

"مہی مجھ سے یہ نہیں ہو گا وہ کیا سوچے گا۔" "بیٹا وہ کچھ نہیں سوچے گا، تم اس کی بیوی ہو۔" میاں بیوی میں کھٹ پھٹ تو ہوتی رہتی ہے مجھے تو ڈر اس بات کا ہے کہ تمہاری سر دھری کی وجہ سے وہ کوئی انتہائی قدم نہ اٹھالے۔" مہی کے اصرار پر ماڑہ نے اپنے سٹل فون سے فراز کا نمبر دیا تھا۔

"ہیلو! فراز کیسے ہو؟"

"بہت جلدی خیال آگیا، تمہاری بلا سے میں بھڑاڑ میں جاؤں۔"

"فراز! مجھے تم سے معافی مانگنا تھی۔ غلطی میری تھی مجھے نہیں سمجھ میں تھی کہ میں نے کیا کیا ہے۔"

"اے، کوئی اور بات؟" اس کا لہجہ بدستور خشک تھا۔ "مہی نے آج سارا کی فینلی کو افطار پر بلایا ہے، جڑ بھی ضرور آئے گی۔"

"موسمی، میں نہیں آسکوں گا۔" یہ کہہ کر فراز نے موبائل آف کر دیا۔ "کہا کہ رہا تھا فراز؟" مہی نے موبائل ہاتھ میں لیے کھوٹی، کھوٹی ہی ماڑہ سے پوچھا۔

"وہ آنے سے منع کر رہا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا وہ خود کو کیا سمجھ رہا ہے مجھے اس کی ہرگز ضرورت نہیں۔" وہ ہنسیا پائی اعجاز میں بیٹھی۔ "ماڑہ کیوں سچ رہی ہو، میں خود فراز سے بات کروں گی۔ وہ مصروف ہوگا اس لیے منع کر دیا ہوگا۔"

"آپ کتنی نہیں کہ میری آزاد خیالی مجھے جہاں کر دے گی۔ آپ کی بدعا مجھے لگ گئی۔" وہ رو رہی تھی۔

سہا اُت من کو آئی ہے عید

کام آفس تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ تمہاری مرضی ہے تو کمری جاری رکھو یا چھوڑ دو۔ مجھے تم بیک ورڈ سمجھو یا کچھ اور..... تمہیں اگر میری شرائط قبول ہیں تو تمہیک ہے ورنہ میرا تمہارا گزراہ ممکن نہیں۔"

"اگر مجھے تمہاری ان شرائط کے ساتھ زندگی گزارنا قبول ہو تو پھر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا ناں؟" مائرہ کے لیے مجھ شوشی اتر آئی۔

"مائرہ! یہ تم کہہ رہی ہو، مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"یقین کرو، اس ایک مہینے میں مائرہ بالکل بدل چکی ہے۔ یہ پہلا رمضان ہے جس میں، میں نے روزے رکھے ہیں اور اللہ کی عبادت کی ہے۔ مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ میں زندگی کی کن کن باتوں میں کرنی چاہی تھی۔ وہ مجھے لوگوں کی باتوں، معمولی عبادت کے دعوؤں اور دھوکا کاروں کو سن کر اصل زندگی سمجھ بھی گئی۔ مجھے تو اپنے گناہوں کا احساس اب ہوا ہے۔"

"تصور تو میرا بھی تھا کہ میں شادی سے پہلے کیے گئے اپنے دعوؤں پر قائم نہیں رہ سکا اسی وجہ سے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پہلے میں تم سے کیئر بات کروں گا پھر گھر لے جاؤں گا۔" فراز کا لہجہ اطمینان بھرا تھا۔

"اب تو تمہیں مجھے اپنے گھر ساتھ لے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا ناں؟"

"بالکل بھی نہیں۔" فراز نے خوش دلی سے کہا۔ "چلو تمہیں چاند رات میں شاہجک کرنا بہت پسند ہے ناں تو آج میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔"

"نہیں، آج میں شاہجک پر نہیں جاؤں گی بلکہ گھر چل کر شکرانے کے نو اہل بڑھوں کی۔" مائرہ نے کہا اور اپنا سامان لینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی بھی فراز مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

دعاؤں اور مناجات میں شدت آگئی تھی۔

☆☆☆

رمضان کا چار ماہینہ ناسی پریشانی میں گزرا تھا یہاں تک کہ چاند رات آن پہنچی۔

"مائرہ، مجھے آؤ فراز آیا ہے۔" مہی کی خوشی سے بھرپور آواز اس کی سماعت سے گھرائی تو وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آئی۔ تیزی سے سڑکیاں اترتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"اسلام علیکم! آہستہ سے سلام کرتے ہوئے اس نے فراز کی طرف دیکھا جو نظریں جھکا کر بیٹھا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" مائرہ نے تھے قدموں سے چلتے ہوئے صوفے پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ چند سیکنڈ جب فراز کی طرف سے کوئی رد عمل سامنے نہ آیا تو اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ بڑھا کر فراز کا ہاتھ تھام لیا۔

"سوری فراز، میں شرمندہ ہوں مجھے اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم مجھے معاف کر دو۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ برابر کا قصور وار ہوں۔" وہ لگی ٹھٹھا کر بولا۔ "نورہ اصل میں نے شادی سے پہلے تم سے جو وعدے کیے تھے انہوں کو میں ان پر پورا نہیں اُتر سکا۔ میں اپنے اعداد آتی جرائم نہیں پاتا ہوں کہ تمہاری غیر مردوں سے دو ہفتی برداشت کر سکوں۔ شادی سے پہلے کی بات اور تمہی شادی کے بعد تم مجھے اپنی ملکیت مانتی ہو بلکہ عزت ہو میری۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے کہ اگر تمہیں میری شرائط قبول ہوں تو تم میرے ساتھ زندگی گزار سکتی ہو یہ صورت، دیگر ہم دونوں کے راستے جدا ہوں گے۔" فراز کا لہجہ سچا تھا۔

"کوئی سی شرائط؟" مائرہ اس کے بدلے تھے دیکھ کر حیران ہو گئی۔

"آج کے بعد تمہاری زندگی میں نہیں جاؤ گی اور نہ ہی غیر مردوں سے کسی قسم کی دو ہفتی رکھو گی اور تمہارا

مکمل ناول

اگے عمر کے بعد

گہت سجا



”اور یہ میں ہوں سو برا اقبال.....“ میں نے
آسانی سازی کا پلہ کندھے پر ڈالتے ہوئے اپنا
جانزہ لیا۔

”دنیا کے ادب کا ایک درخشاں ستارہ اور
ایک ڈتے دار سرکاری افسر..... لوگ کہتے ہیں
میں بہت کامیاب عورت ہوں لیکن کیا میں واقعی
کامیاب ہوں.....؟“ ابھی ابھی مجھے لگتا ہے جیسے
میں دنیا کی ناکام ترین عورت ہوں۔ زندگی کے ہر



میدان میں جھنڈے گاڑنے کے باوجود میرے جیسی ناکام عورت کوئی نہیں۔ اور اس ناکام عورت کی زندگی پر بے شمار لوگ رنج کرتے ہیں۔ صبح سے لے کر شام تک کتنی ہی بار یہ جھلے میرے کانوں میں پڑتے ہیں۔

”میم! آپ بہت خوش قسمت ہیں۔“

”اے سوہرا! قابل بہت کچی ہیں۔“

ہاں ان کی نظروں میں واقعی میں خوش قسمت ہوں، کیا نہیں ہے میرے پاس دولت، شہرت، عزت، حسن، دلکشی۔۔۔۔۔ ہاں سبھی کچھ تو ہے بس۔۔۔۔۔

میں نے ایک بار پھر خود کو آئینے میں جانچا۔۔۔۔۔ میں کوئی ایسی حسین و جمیل نہیں ہوں کہ جس کے حسن کی تعریف میں صلی کے صلی سیاہ کر دے یا کیم جین اتنی خوب صورت ضرور ہوں کہ کچھ میں نے مردوں کی نظریں اپنی طرف اٹھتی اور پھر پھرتی محسوس کی ہیں۔۔۔۔۔ حالانکہ میں کوئی جوان لڑکی نہیں۔۔۔۔۔ میری عمر بیس سال ہے۔ یہ الگ بات ہے میں کس حال کی عمر میں بھی کچیس سال سے زیادہ کی نہیں کتنی۔

میں نے ڈریسنگ کچیل سے اپنا جینو براؤن لٹما کر اُس پرے کیا اور ایک آخری نظر آئینے پر اُلٹ کر باہر لگی تو برآمدے میں ماسی خیراں کھڑی تھی۔

”میڈم جی وہ سراج الحق اور عرفان منیر صاحب آئے ہیں۔ وہی جی اخبار والے۔“

میں نے کھائی موڑ کر وقت دیکھا۔۔۔۔۔ میں پہلے ہی لیٹ گئی۔ آج صلی کے تمام اسکولوں کے۔۔۔۔۔

سراہوں کے ساتھ میری میٹنگ تھی۔۔۔۔۔ میٹنگ دس بجے تھی اور اس وقت نو بجے تھے۔۔۔۔۔ میں عموماً آٹھ بجے تک آفس چلی جاتی تھی لیکن کچیلے دو محنتوں میں مستقل کام کی زیادتی نے مجھے تھکا دیا تھا۔ بہت

سارے کام بنانے کے بعد میں رات بید کی گولی کھا کر سوئی تو صبح میری آنکھ دیر سے کھلی تھی۔۔۔۔۔ مجھے

یہاں آنے دو چلنے ہی ہوئے تھے اور ان دو محنتوں

میں بے حد مصروف رہی تھی۔ میرے آفس میں بہت سی فائلیں تھیں جنہیں دیکھنا تھا۔ ملاقاتیوں کی آمد اور انہیں مطمئن کرنا، کسی کی پٹیشن کا مسئلہ تھا، کوئی تنبیہ دینے تھ، کے اجراء کے لیے غور ہو رہا تھا۔ کسی کے فیوچر ادا نہیں ہوئے تھے، کسی کو اپنا گریڈ چاہیے تھا اور کسی کو اپنے علاقے میں ٹرانسفر کر دانا تھا۔۔۔۔۔ دراصل ڈی ای او کی یہ سیٹ کچیلے دو ماہ سے خالی پڑی تھی اور بہت سے کام رکے ہوئے تھے۔ میں اس شہر میں تھی تھی اور چاہتی تھی کہ لوگوں پر میرا اچھا تاثر ہو اور میں انہیں مطمئن کر سکوں۔۔۔۔۔ بظاہر تو سب نے ہی میری پوسٹنگ پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور کار حال اللہ جانتا ہے۔ فیصلہ کی طور پر میری ملاقات چند نڈل اور پر آخری اسکولوں کے کچیلے سے ہو چکی تھی اور مجھے علم ہوا تھا کہ کچھ پر آخری اسکول اسکولوں میں بچوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک نڈل اسکول کی

ہیڈ نے مجھے بتایا کہ اس کے اسکول میں صرف کچیس طالبات ہیں۔ یہ فکر انتہائی پریشان کن تھا۔ سرکاری اسکولوں میں تعلیم فری ہونے کے باوجود لوگوں کا

رجحان ابتدائی کلاسوں میں پرائیویٹ اسکولوں میں زیادہ کیوں ہے۔۔۔۔۔ ایسے اسکول جن میں طالبات کی

تعداد زیادہ نہیں ہے ختم ہو جانے چاہئیں کہ یہ حکومت کے خزانے پر بوجھ ہیں۔ ہاں ہائی اسکولوں میں تعداد

بہت زیادہ تھی۔ جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ والدین بنیادی تعلیم کے لیے پرائیویٹ اسکولوں کے

آخری بات برداشت کر لیتے ہیں لیکن ہائی کلاسز کے نہیں۔ گورنمنٹ لچیز کی کھوائیں بہت تھیں۔۔۔۔۔

جن کی سردی زیادہ تھی وہ کافی زیادہ کھوا لے رہے تھے پھر دوسری سہائیں غل جھٹیں اُس کے باوجود

معیار تعلیم پرائیویٹ اسکولوں کے مقابلے میں بہتر کیوں نہیں تھا۔۔۔۔۔ اسی سبب پر بات کرنے کے لیے

میں نے یہ میٹنگ دیکھی تھی۔ میں جانتی تھی میری

تائیں کچھ کو بری لگیں گی۔۔۔۔۔ لیکن مجھے کرنا بھی ضرور

ہم..... "سراج الحق کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں میں ہلاکی مکاری تھی۔

"جی فرمائیں، میرے لائق کیا خدمت ہے؟" میں نے خیراں کو جوس لانے کے لیے کہا اور بیٹھ گئی۔

"اچھے علی ہم آپ کا اندرونی لینا چاہتے ہیں، اپنے اخبار کے لیے۔ میں دراصل ایک ہفتہ وار اخبار نکالتا ہوں۔"

"لیکن میرا اندرونی کس سطحے میں.....؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا آپ برے آنے والی وی ای او کا اندرونی اپنے اخبار میں بچاتے ہیں؟"

"میری وی ای او سویرا اقبال نہیں ہوتی۔" اس کے بچوں کی بیوی یعنی خیر سکراہٹ تھی مجھے حیرت ہوئی تھی۔

"سویرا اقبال میں ایسی کیا خاص بات ہے؟" میں نے اپنی حیرت چھپائی۔

"خاص بات.....؟" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"آپ کی نئی جگہ نے تو تھلک بجا رکھا ہے جناب۔" اب کے وہ محل کے سامنے آیا تھا۔

"مذاہب پر مضامین لکھے جا رہے ہیں۔" اوہ..... "میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہ شخص انتہائی کانیاں تھا، پتا نہیں اس کی معلومات کا ذریعہ کیا تھا۔

ورنہ میری جی ایم مکان میں کوشش ہوتی تھی کہ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے کہ میں کون ہوں۔ سویرا اقبال نام کی صرف ایک میں ہی تو نہیں سیکڑوں لڑکیاں ہوں گی۔ لیکن اس نے جس یقین سے بات کی تھی گتا تھا کہ یہ شخص پورا ہوم ورک کر کے آیا ہے، سو اب جھڑنے کا کوئی قاعدہ نہیں تھا۔ البتہ دل میں مجھے انتہائی کوفت ہوئی تھی۔

پچھلے شہر میں تقریباً دو سال میرا قیام رہا تھا

تھیں کہ کم کھڑا وہ میں پرانے اسکولوں کے پچھڑا جی ہمت کرتے ہیں تو سرکاری اسکول کے پچھڑا کیوں نہیں کر سکتے اور مجھے یقین تھا کہ میری بات سنی جائے گی..... اور ہم کوئی مل نکال لیں گے۔

"میں تم جی.....؟"

ماہی خیراں نے مجھے پھر پکارا تو میں نے چوہر کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا کہوں جی انہیں.....؟"

"اچھا چلو میں آتی ہوں، تم جوس لے آنا۔" میں نے ایک گہری سانس لی اور سوچا

کھڑے، کھڑے ہی بات کرلوں۔ یہ شخص پچھلے تین دنوں سے آفس آ رہا تھا اور میں مل نہیں پاری تھی حالانکہ میرے آفس کے ٹھکانے نے مجھے جیسے لفظوں میں ڈرانے کی بھی کوشش کی تھی کہ مجھے اخبار والوں کے ساتھ بنا کر رہنی چاہیے کہ انہوں نے کچھ خلاف

جھاپ دیا تو کون تردید کرتا پھرے گا۔ میں چاہت جانتی تھی کہ ٹھکانے کا کھد باب۔ البتہ اس معاملہ کا باب کے تجربے نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

باب کے دو، تین سال کے بعد ہی میں نے جان لیا تھا کہ مجھے لوگوں کے ساتھ جیسے اور کس طرح کا رویہ رکھنا ہے۔ سو میں نے سراج الحق اور عرفان منیر سے اپنی

بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے مطررت کر کے دو تین روز کی سہلت چاہی تھی لیکن یہ آج آفس کے بجائے گھر آگئے تھے اور اگر اس وقت میں نہ جیتی تو یقیناً وہ انسٹ فیس کر دیتے۔ میں خیراں کے ساتھ ڈرائنگ

روم میں آئی تو وہ دونوں کھڑے ہو گئے..... دونوں کی نظروں میں موجود اشتیاق کو بھاپتے ہوئے میں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تشریف رکھیں، پلیز..... میں معذرت خواہ ہوں کہ پہلے ملاقات نہیں کر سکی..... دراصل کام کی

بے تماشیا مصروفیت ہے..... اور....."

"ہم آپ کا زیادہ غم نہیں لیں گے

لیکن کسی کو علم نہیں ہوسکا تھا کہ میں وہی سویرا اقبال ہوں جس کی شاعری کی دھوم ہے۔ میں اس سلسلے میں بہت احتیاط کرتی تھی۔ سراج الحق نے اس طرح چٹائی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو..... دیکھا تازے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ اب وہ میری شاعری کی تعریف میں رطب الطمان تھا..... عرفان ضمیر نے بھی تعریف کرنے کے بعد مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ دیا۔

”سویری، میں مشاعروں میں نہیں جاتی۔“
 ”لیکن یہ مشاعرہ تو ہم آپ کے اعزاز میں کر رہے ہیں۔ آپ کا ہمارے شہر میں آنا ہمارے لیے بڑا اعزاز ہے۔“
 ”میرے لیے بھی یہ اعزاز ہے، عرفان صاحب کہ آپ یہاں تشریف لائے۔ اس عزت افزائی کے لیے میں آپ کی ممنون ہوں..... لیکن میں نے جب اس خار زد زمیں میں قدم رکھا تھا تو اپنے لیے کچھ اصول بھی بنائے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مجھے مشاعرہ نہیں پڑھنا تو میں معذرت خواہ ہوں کہ اپنا اصول تو نہیں مٹتی۔“
 عرفان ضمیر کے چہرے پر مہم جوئی شکل کی تھی۔
 ”اور اعتراف میں.....“
 ”سراج الحق کا لہجہ اب بھی پڑھتین تھا۔“
 ”پچھلے تیرہ سالوں سے میرا کام اور میری کیا نیاں ادبی پرچوں میں چھپ رہی ہیں۔ کیا آپ نے بھی لیکن میرا اعتراف دیکھا پڑھا؟“
 ”نہیں.....“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پہلے اعتراف کا اعزاز میرے اخبار کو ملے۔“

”تمہیں اس نے نفی میں سر ہلایا۔“ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پہلے اعتراف کا اعزاز میرے اخبار کو ملے۔“

”تمہیں اس نے نفی میں سر ہلایا۔“ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پہلے اعتراف کا اعزاز میرے اخبار کو ملے۔“

”تمہیں اس نے نفی میں سر ہلایا۔“ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پہلے اعتراف کا اعزاز میرے اخبار کو ملے۔“

لیکن کسی کو علم نہیں ہوسکا تھا کہ میں وہی سویرا اقبال ہوں جس کی شاعری کی دھوم ہے۔ میں اس سلسلے میں بہت احتیاط کرتی تھی۔ سراج الحق نے اس طرح چٹائی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو..... دیکھا تازے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ اب وہ میری شاعری کی تعریف میں رطب الطمان تھا..... عرفان ضمیر نے بھی تعریف کرنے کے بعد مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ دیا۔

”سویری، میں مشاعروں میں نہیں جاتی۔“
 ”لیکن یہ مشاعرہ تو ہم آپ کے اعزاز میں کر رہے ہیں۔ آپ کا ہمارے شہر میں آنا ہمارے لیے بڑا اعزاز ہے۔“
 ”میرے لیے بھی یہ اعزاز ہے، عرفان صاحب کہ آپ یہاں تشریف لائے۔ اس عزت افزائی کے لیے میں آپ کی ممنون ہوں..... لیکن میں نے جب اس خار زد زمیں میں قدم رکھا تھا تو اپنے لیے کچھ اصول بھی بنائے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مجھے مشاعرہ نہیں پڑھنا تو میں معذرت خواہ ہوں کہ اپنا اصول تو نہیں مٹتی۔“
 عرفان ضمیر کے چہرے پر مہم جوئی شکل کی تھی۔
 ”اور اعتراف میں.....“
 ”سراج الحق کا لہجہ اب بھی پڑھتین تھا۔“
 ”پچھلے تیرہ سالوں سے میرا کام اور میری کیا نیاں ادبی پرچوں میں چھپ رہی ہیں۔ کیا آپ نے بھی لیکن میرا اعتراف دیکھا پڑھا؟“
 ”نہیں.....“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پہلے اعتراف کا اعزاز میرے اخبار کو ملے۔“

”تمہیں اس نے نفی میں سر ہلایا۔“ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پہلے اعتراف کا اعزاز میرے اخبار کو ملے۔“

”تمہیں اس نے نفی میں سر ہلایا۔“ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پہلے اعتراف کا اعزاز میرے اخبار کو ملے۔“

”تمہیں اس نے نفی میں سر ہلایا۔“ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پہلے اعتراف کا اعزاز میرے اخبار کو ملے۔“

نہیں سمجھتی تھی بلکہ اپنے منافقت بھرے رویے کو اپنی مجبوری گردانتی تھی۔ اگر میں یہ رویہ نہ رکھوں تو یہ لوگ تو مجھے کچا کھا جائیں..... اور یہ میں نے بہت پہلے جان لیا تھا..... اور لوگوں کے ہاتھ کی خباثتیں دیکھنا سیکھ لی تھیں۔

”میڈم جی آپ نے آفس نہیں جانا؟“ ماسی خیراں نے مکمل سے خالی گلاس اٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا تو میں نے چوتھے ہوئے کاک پر نظر ڈالی۔ پ نے دس ہو رہے تھے۔ یک دم میرا دل ہر چیز سے اجاڑ ہو گیا..... اور ایسا ہوتا تھا کبھی نہ کبھی۔

”نہیں“ میں ایک گھری سانس لے کر وہاں ہی صوفے پر بیٹھ گئی..... اور چند بیگ سے اپنا فون نکال کر اپنے آفس کے کلرک ساجد خان کو فون کر کے میٹنگ منسل کرنے کے لیے کہا۔

”کی خبریت ہے ہاں.....؟“
”ہاں ساجد کوئی مسئلہ ہے..... مجھے کہیں جانا ہے۔ دو بارہ کب میٹنگ ہوگی پھر تادوں گی۔“
کوئی آیا تو نہیں ہے ابھی تک؟“

”نہیں میڈم! صرف ایک پرائمری اسکول کی ہیڈ مسٹریں ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم سب کو فون کر کے تادو۔“ میں نے فون بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹپک لگائی۔ میں سویرا اقبال جو سما نے ہزارے کی ٹیم ملی تھی۔ میں نے آج تک کسی کو انٹرویو نہیں دیا تھا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب میری پہلی کتاب کو ی آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا..... اس لیے کہ میں پورا راج نہیں بول سکتی تھی اور آدھا جی ہمیشہ بول کرتا ہے۔ یا پورا راج یا پورا جھوٹ۔

میں نے آج تک کسی اخبار یا رسالے کو انٹرویو نہیں دیا تھا اس لیے نہیں کہ خدا خواست میرا ماضی شرمناک تھا اور میرا ابھی مہر بتانے لائی نہیں تھا..... جیسا کہ سراج الحق کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں سے

پتا نہیں اندر دے دینے سے کیوں کھڑی ہیں..... حالانکہ آپ اگر انٹرویو دیں گی تو آپ کی شہرت کو چار چاند لگ جائیں گے۔“ عرفان منیر نے بھی اٹھتے ہوئے کہا تو سراج نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے شاہشاہی۔

”میرا خیال ہے جتنی شہرت اور عزت مجھے ملی ہے وہ میرے لیے کافی ہے اور شہرت حاصل کر کے میں کیا کروں گی، منیر صاحب“
”کوئی تو وجہ ہوگی، کیا نیکی پسند نہیں کرتی؟“
عرفان منیر کی آنکھیں جیسے مجھے اندر تک کھوج آتا چلتی تھیں۔

”نیکی سمجھ لیں۔“
سراج الحق کی آنکھیں، لمبے لمبے بھر کے لیے حشر اڑاتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ خوب سمجھتے ہیں ہم کہ تمہارے پس منظر میں ضرور کچھ کوئی گڑبڑ ہے۔

”دراصل اپنے پسندیدہ لوگوں کے حقائق سب کو ہی جاننے کا تجسس ہوتا ہے..... ان کا ماضی، خاندانی پس منظر سب کچھ.....“

”سچے سراج صاحب! ان کا تجسس دور کر دیں گے۔ فی الحال تو.....“ میں نے کھائی موز کر پھر وقت دیکھا تو وہ دونوں حضرات خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ میں انٹرویو کیوں نہیں دیتی تھی اور میرا پس منظر کیا تھا۔ میں جانتی تھی سراج ہی نہیں کئی دوسرے بھی جانتا چاہتے تھے..... اور یقیناً اعزاز لگاتے ہوں گے کہ میرے ماضی میں ضرور کچھ ایسا ہے جو بتانے لائی نہیں ہے۔

”منافق اور دو نظریے لوگ.....“ میں نے زیر لب..... کہا اور سوائی کا پلہ درست کیا۔

”لیکن کیا تم خود بھی منافق نہیں ہو۔“
میرے اندر سے آواز آئی لیکن میں نے اس آواز پر کان نہیں دھرے تھے۔ میں اپنے آپ کو منافق

فک جھکتا ہے، میرا باطنی دوسروں کے لیے
شرمناک نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے میرے لیے نہ۔

میں میانے ہزارے کے ایک کسان دین محمد کے گھر پیدا ہوئی اور صوبہ اصرار حسین اور استانہ جی کے گھر کی بی بی میرے حوالے میرا مان تو ہو سکتے تھے میری شرمندگی نہیں تو میرا باپ میانے ہزارے کا کسان دین محمد تھا جو غرب تھا نہ امیر بس اچھا گزارہ ہوتا تھا۔ پہنے ماڈرٹے، کھانے، پہنے کو اچھا ملتا تھا۔ مجھ سے بڑی میری چار بہنیں اور ایک بھائی تھا دو بہنیں بڑی تھیں پھر بھائی پھر دو بہنیں میرا باپ ایک خاصوش طبع اپنے کام میں مگن رہنے والا انسان تھا۔ اس نے بہنوں کی پیدائش پر دلایا کیانہ مزید بنے گی خواہ اعلیٰ تھی، یہ اس کا نہیں جنہیں مزید ایک بنے گی خواہ اعلیٰ تھی۔

”میرا دانا پال اُٹکیا ہے۔ ایک بیٹا اور دو بھانجے تو میرے دانو کا بازو بن جائے۔ اس کا جوڑا۔۔۔ کٹا (اُٹکیا) تو درخت بھی چنگ نہی لگوا۔۔۔ سوسو اور دانی کے جوڑے کی خواہش میں حصار پر صفت مانتی اور دیے جلاتی پھرتی تھیں اور دانی کے بازو کے بجائے میں اُٹکی۔۔۔ مجھے یقین ہے مجھے وہ بچے کرمانے حضرت سے منہ پھر لیا ہوگا۔ مزید بچنے کی خواہش میں اوپر تلے تین بیٹیاں تو آچکی تھیں۔ پتا نہیں میرے بعد اماں کے دل میں بچنے کی خواہش مری بھی یا نہیں لیکن میرے بعد مگر کی نظری میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ میں چھ سال کی ہو گئی تھی۔ مگر میں سب سے چھوٹی تھی، سنا ہے چھوٹے بچے سے سب کو بہت پیار ہوتا ہے لیکن مجھے بھی ایسا نہیں لگا تھا کہ میں مگر میں سب کی پیاری ہوں۔ اماں شام کو تھکا کارا کھیتوں سے آتا تو اس کے پاس اپنی اولاد کے لیے کوئی صبت بھری نظر یا دل نہیں ہوتے تھے۔ وہ اکثر گھن یا براہے سے میں بھی چار پائی پر بیٹھ جاتا، میری بڑی بہن شائوا اس کے لیے حق تازہ کر کے لاتی۔ اماں چنگیز میں روٹاں

اور سائن کی کنواری رکھ کر چار پائی پر رکھ دیجیے۔۔۔۔۔
 دھارے ہاں رات کا کھانا سرشام ہی کھا لیا جاتا بلکہ
 دیراتوں میں اکثر گھروں میں کھانا اب بھی سرشام
 ہی کھا لیا جاتا ہے۔ ابابھی کھانا کھا کر اور حقہ پی کر
 چار پائی پر لیٹ جاتا۔ دوسرے نمبر والی، لیکن عاشقو! یہ
 کے پاؤں دباتی اور اہا دانی سے دو چار باتیں کر کے
 سو جاتا۔ میں ابابھی چار پائی کے گرد منڈلاتی رہتی کہ
 ابابھیے گود میں اٹھائے، چار پائی پر پاس بٹھائے اور
 کھانا کھاتے ہوئے میرے منہ میں بھی گواہے دھانپنا
 کر ڈالے۔ یہ نہیں ہے یہی حسرت تھی جو چوبیس سال کی
 عمر میں بھی دل کے اندر کھینچ چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔۔۔۔۔
 شاید شہزاد سے ہی بہت کمرانی سے سوچنے لگی تھی۔
 اب تو ایک طرف اماں نے بھی میری طرف کوئی توجہ
 نہیں دی تھی۔ شاید وہ عاشق ہی مجھے نہلاتی، دھلاتی
 اور کھانا پینا دیتا تھا۔ شاید پیدا ہوتے ہی انہوں
 نے مجھے سنبھال لیا تھا۔ اماں نے صرف دودھ پلانے
 کا کام کیا تھا۔ ورنہ انہیں تو چھپ بھی موقع ملتا ایک
 آدھ دھوکا جڑ دیتیں۔۔۔۔۔ میں گود میں جانے کو چلتی تو
 ٹھیک رہتی۔

”ہل چکے ہو یا میرا۔۔۔۔۔“

ہاتھیں نامراد میں مچی یا بھری آہ سے وہ نامراد
 رہ گئی تھیں کہ وہ وہ بلاوجہ مجھے ایک دو تھپڑ لگا
 دیتیں..... چھ سال کی عمر میں شاید کوئی اتنا حساس
 نہیں ہوتا ہوگا جتنا میں مھی..... تھپڑ کھا کر بھی انجلی کی
 طرف ہلکتی..... آنکھوں میں آنسو بھر کر اس سے انہیں
 بھیجی کہ وہ مجھے بھی گود میں لے کر میرا ہاتھ اور رخسار
 چومیں جیسے دانی کے چوتھنی ہیں بلکہ مجھ سے بڑی چوہ کو
 بھی اماں بھی کبھار چوم تھیں۔ جب وہ سیز جیوں
 سے گری مچی تب اور جب اسے بخار ہوا تھا تب.....
 میں نے دیکھا تھا۔ اماں بار بار اسے چار کر رہی
 تھیں۔ تب میں بھی سیز جیوں سے گر مچی۔ چٹانیں
 جان بوجھ کر گری مچی یا خودی کر گئی تھی شعور میں نہیں

نہیں کر میرے بازو پر لگایا۔ میں ان کی گود میں سکتی رہی۔۔۔۔۔۔ استانی جی نے تاسف بھری نظروں سے اماں کو دیکھا۔

”اگر چار دھبت سے اولاد کو پال نہیں سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو؟“ استانی جی کو بہت قصداً رہا تھا۔

”چار تو بڑی تمیں میری جان کو مجھے کب شوق تھا استانی جی اس کا، میں نے تو اٹھ سے دانی کے لیے بھائی مانگا تھا۔ یہ لپک پڑی۔“ اماں کے دل کی بات زبان پر آ گئی تھی۔

اگرچہ میری عمر صرف چھ سال کی تھی لیکن مجھے اس دن کا واقعہ جیسی جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔ شاید اس لیے کہ استانی جی اکثر اس دن کی بات توہرلی کر جیتیں۔۔۔۔۔۔ جیسی وہ میرے ذہن میں محفوظ رہ گئی۔۔۔۔۔۔ اماں کے گھر کی یہ آخری یاد تھی اس لیے کہ اس روز استانی جی نے مجھے اماں سے مانگ لیا تھا۔ میں نے اکثر سوچا کہ جب اس گھر میں میری کسی کو چاہ نہیں تھی تو پھر اللہ مہاں نے مجھے اس گھر میں کیوں پیدا کیا تھا وہ مجھے کیوں کسی اور گھر میں بھی تو پیدا کر سکتا تھا۔۔۔۔۔۔ استانی جی نے مجھے اماں سے مانگا تھا اس لیے نہیں کہ وہ بے اولاد تھیں۔۔۔۔۔۔ بلکہ اس لیے کہ انہیں مجھ پر ترس آ گیا تھا۔ ورنہ ان کے نہیں بیٹے تو پہلے سے ہی تھے۔

”لے جاؤ جی۔۔۔۔۔۔“ اماں ابھی تک دانی کے بال سہلا رہی تھیں اور انہوں نے اتنی بے پروائی سے کہا تھا جیسے میں کوئی شے تھی، جیستی جاکتی انسان نہیں اور جیسے میری پیدائش پر اماں نے کوئی تکلیف نہیں سہی ہوئی۔ یہ بات بھی استانی جی نے اتنی ہار ہی ڈہرائی تھی۔ سو جاننے میں اسی طرح سو جو ہے، انہی الفاظ کے ساتھ۔

”اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی ذرا، تو فکر نہ کرنا۔“ استانی جی اپنی طرف سے اماں کو تسلی دے رہی تھیں لیکن اماں کو بھلا اس کی پروا کیا ہو سکتی تھی کہ

ہے لیکن کرنے کے بعد اس سے اماں کی طرف دیکھا ضرور تھا کہ وہ مجھے بھی چو کی طرح پیار کریں گی لیکن اماں نے اتنا مجھے ایک بچتر چڑو دیا۔

”تو چھت پر کیا کرنے لگی تھی؟“ ہاں شانوں نے مجھے ضرور گود میں اٹھالیا تھا اور ہودوی سے میری جوت سہلانے لگی تھی۔ میں حلق بھاڑ، چھاڑ کر روئی تھی لیکن اماں اس سے مس نہیں ہوئی تھیں اور آرام سے بیٹھی دانی کے کُرتے پر پھول کا دھتیا رہیں۔۔۔۔۔۔ اور یہ اس سے دو روز بعد کی بات ہے۔۔۔۔۔۔ اماں گھنٹوں میں مٹی کے چولے کے پاس بیٹھی تھیں۔ کھڑیاں بکلی تھیں اور سارے گھر میں دھواں بھرا تھا اور پھر گھنٹی سے پھر میں مارتے، مارتے اماں کی سانس چڑھ رہی تھی اور دھوئیں سے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے کہ دانی روتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

”ارے کیا ہوا میرے لال۔۔۔۔۔۔؟“ اماں نے کیلیے پر ہاتھ رکھا اور دانی رو، رو کرتا نہ لگا کہ چلے اسے کھیلنے لے مارا اور پھر اس کا بھائی کھیل بھی آگیا اور وہ مجھے مارنے لگا۔۔۔۔۔۔ شاید اماں کا ذمہ تازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے ایک آہ بھری۔

”ہائے میرا اٹھو (کھلا) بازو دیکھ۔“ اور جب ہی میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔۔۔۔۔۔ شاید میں پوچھنا چاہتی کہ بھائی کیوں دور رہا ہے۔

”اماں۔۔۔۔۔۔؟“ اور اماں نے چولے سے کھڑی کھینچ کر میرے بازو پر دے ماری۔ کھنٹی کھڑی نے میری ناک جھلک کر جلا دیا، میں چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔ اس وقت جب اماں نے چولے سے کھڑی کھینچی تھی تو استانی جی ہمارے گھر کے اندر داخل ہو رہی تھیں، انہوں نے ہمارے گھر کے اہلی اپنی آغوش میں لے لیا۔

”ہائے غضب زارید، یہ اتنی مصوم بچی کے ساتھ اتنا ظلم۔۔۔۔۔۔؟“

اماں بڑا ہی لیے ترنگے دانی کو گود میں سائے چھٹی رہیں اور استانی جی نے شانوں سے کہہ کر کہا آؤ

لکس کو اپنے اعداد شمارنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔ جس روز استانی جی مجھے لینے آئی تھیں، میری چاروں بنیں اور انکوٹا بھائی قطار بنا کر کھڑے مجھے جاتے ہوئے ہوں دیکھ رہے تھے جیسے کبھی، کبھی محسن میں کھڑے ہو کر کبھی کھوار گزرنے والے جہاز کو دیکھتے تھے، حیرت سے اور خوشی سے..... پتا نہیں ان کی آنکھوں میں حیرت بھری خوشی تھی یا حیرت بھرا دکھ..... لیکن وہ سب اس وقت تک محسن میں کھڑے رہے جب تک میں دروازے سے باہر نہ نکل گئی..... اور ابھی ہم اپنی جگہ میں ہی تھے کہ ماشو دوڑتی ہوئی آئی تھی اس کے ہاتھ میں بچے کی چھوٹی سی گھڑی تھی۔

”استانی جی استانی جی.....“
 استانی جی کہہ کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔

”یہ پانی کے پڑے اماں نے دیے ہیں۔“
 میں نے حیرت سے ماشو کی طرف دیکھا تھا۔ بھلا اماں نے میرے پڑے کیوں سمجھ دیے ہیں لیکن میرے ننھے سے دماغ میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ابھی گھر سے میرا رابطہ ختم ہو رہا ہے۔ استانی جی نے گھڑی پکڑ لی تو ماشو کے پی میں پتا نہیں کیا آئی کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اس پر چڑا کیا اور جیزی سے واپس مز گئی۔ میں جب اس منظر کو سوچتی ہوں تو میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر ماشو کے کھیلے، کھیلے ہونٹوں کا لمس جاگ اٹھتا ہے اور میرا دل جیسے پھٹل کر پانی ہونے لگتا ہے۔ پتا نہیں کیوں..... کبھی، کبھی تو میرا جی چاہتا ہے تجھیں مار مار کر روؤں..... اور ایسے میں خود ہی اپنے ہاتھ کی پشت کو چوم، چوم کر تھک جاتی ہوں۔

استانی جی میا نے ہزارے کے پرانے اسکول میں پڑھائی تھیں اور ان کے شوہر آرمی میں صوبیدار تھے اور چھٹیوں میں ہی گھر آتے تھے۔ استانی جی کا گھر ہمارے گھر سے صرف ایک گلی کے فاصلے پر تھا۔ جس وقت میں استانی جی کی اگلی پکڑے اپنے گھر

وہ مجھے اچھی طرح دیکھیں گی یا بُری طرح..... میں تو تھی ہی بے طلب..... ان چاہی..... انہیں اگر فکر تھی تو صرف یہ کہ برادری والے لکھن یا تھیں نہ لکھن کہ اپنی بیٹی بھاری پڑ گئی تو دوسروں کو دے دی..... پھر ابھی انہوں نے استانی جی سے وعدہ کر لیا کہ وہ میرے ابا سے بات کریں گی اگر ابا نے اجازت دے دی تو پچھلے استانی جی لے جائیں..... ابا نے اماں کی بات سن کر حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

”ارے پانچ بیٹیاں ہیں تو کیا..... ہم انہیں ہائے لگیں.....؟“
 ”یہ دیکھو گیچے ہی تو استانی جی کا گھر ہے، شانو کے ابا..... بہت پیار کرتی ہیں وہ اپنی بانی سے..... ان کے پاس رہے گی تو پڑا لکھ بھی جائے گی..... دیکھتے نہیں ہو سکتا شوق ہے اسے پڑھنے کا کوئلے سے دیواریں کالی کرتی رہتی ہے، دانی کی کتابیں اور کتابیں اٹھائے پھرتی ہے۔“

”سوچ لے، ذرا یہ شریک پائیں کریں گے۔“
 ابا کو بھی اماں، ابلی غرواں سمجھ ہو گئی تھی۔
 ”شریکوں کی پروا کرتی ہے میری جیتی.....“
 اماں فیصلہ کر چکی تھیں تو ابا بھلا کیا کرتے..... اس روز پہلی اور شاید آخری بار ابا نے مجھے اپنے پاس بلا کر غور سے دیکھا۔

”تو استانی جی کے ساتھ ان کے گھر جائے گی؟“
 میں نے سر ہلا دیا۔

”اچھا اگر آؤ مردل شک تو گھر آ جاتا۔“
 میں نے پھر سر ہلا دیا اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ مجھے ہمیشہ کے لیے اس گھر سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ میں اس گھر میں کسی کو مطلوب نہیں تھی۔

ابا کی دو اگلیوں نے پہلی بار غریبی سے میرے رخسار کو چھوا۔ ابا کی اگلیوں کا گھر دراصل آج بھی کبھی، کبھی مجھے اپنے رخسار پر محسوس ہوتا ہے اور میں کتنی ہی دیر اپنے رخسار پر ہاتھ بھرتے ہوئے اس

شاید میں سویرا اقبال کی طرح کامیاب مورت نہ ہوتی لیکن سویرا اقبال سے زیادہ مطمئن ہوتی۔ لیکن استانی جی نے ایسا کچھ نہیں پوچھا تھا اور میں خود سے انہیں نہیں کہہ سکتی تھی کہ مجھے اپنا گھر یاد آرہا ہے۔ مجھے واپس بھگوا دیں، بھلے میں وہاں مطلوب نہیں تھی، اماں، اماں نے میرے ہونے کی دعا نہیں کی تھی، لیکن وہ میرا اپنا گھر تھا اور استانی جی کا گھر میرا نہیں تھا۔ میں آس بھری نظروں سے استانی جی کی طرف دیکھتی رہی کہ شاید اب، شاید اب وہ پوچھیں۔ لیکن انہوں نے کارغیس سے لائین اتار کر اس کی ٹوپی کی پھر اس کا شیشہ اونچا کر کے چمک دیا۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ ان دنوں سہانے ہزارے میں بلی نہیں تھی۔ پتا نہیں اب ہو۔ یا ہو سکتا ہے نہ ہو۔

کمرے میں اندھیرا ہو گیا تو میں بے آواز رہنے لگی اور پھر روتے روتے سو گئی۔ استانی جی نے اگلے دن بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ کیا مجھے گھر واپس جانا ہے، بہن، بھائی تو نہیں یاد آرہے۔ بلکہ انہوں نے بھی نہیں پوچھا۔ انہوں نے بھی شاید مجھے کوئی چیز یاد بھی تھا جیسا کہ وہ دوسروں سے ہر تعارف کرواتے ہوئے کہا کرتی تھیں۔

”اس کی ماں نے تو اسے یوں میری جھولی میں ڈال دیا جیسے اس نے درد نہیں پہنچے تھے۔ جیسے یہ کوئی چیز تھی اور اس نے تو ماہ چھت میں نہیں رکھا اس کا بوجھ نہیں اٹھایا۔“ آخر اماں اور استانی جی میں فرق ہی کیا تھا۔ انہوں نے بھی تو کبھی نہیں پوچھا۔ ”کیا تمہیں اپنے سنگ بٹھانے والی نہیں یاد آتی ہیں؟ وہ اکلوتا بھائی، لاڈلا بھائی۔ اماں۔۔۔۔۔“ استانی جی کی دل تک میرے ہانڈ پر مرہم لگاتی رہی۔ میرا ذمہ ٹھیک ہو گیا۔ حتیٰ کہ چٹلے کا داغ بھی نہیں رہا لیکن دل پر جو آبلے پڑے تھے وہ آج تک خون پرستے ہیں اور وہ اسی طرح تکلیف دیتے ہیں۔

کے دروازے سے لگی تھی تو مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ ایک گلی کا قاصد میرے لیے اتنا طویل ہو جائے گا کہ میں اسے بھی ملے نہیں کر پاؤں گی۔ استانی جی نے گھر لاتے ہی سب سے پہلے میرے ہانڈ کی طرف توجہ دی تھی۔ اور بڑے بچے کو دوائیوں والی دکان پر بھیج کر مرہم منگوا کر میرے ہانڈ پر لگایا تھا جس میں اب بھی جلن ہو رہی تھی۔ جب رات ہوئی تو میں نے سوچا ابھی استانی جی مجھے گھر چھوڑ آئیں گی لیکن استانی جی نے مجھے کمرے میں سونے کے لیے کہا۔ اس کمرے میں تین چار پائیاں تھیں ایک پر استانی جی سو رہی تھیں اور ایک پر انہوں نے مجھے سلا یا تھا۔ جبکہ تیسری چار پائی پر ان کا چھوٹا بیٹا سو رہا تھا جو مجھ سے تھوڑا سا بڑا ہو گا۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سات سال کا ہے اور تھری کلاس میں پڑھتا ہے۔ دونوں بڑے بچے ساتھ والے کمرے میں سو رہے تھے۔ میں چپ چاپ لیٹ گئی تھی لیکن میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں دوڑتی ہوئی اپنے گھر چلی جاؤں اور بچکے سے جا کر عاشو پاشو کی چار پائی پر ان سے چٹ کر سو جاؤں۔ گھر میں اکیلے تو میں بھی نہیں سوئی تھی۔ اپنی چاروں بیٹوں میں سے کسی ایک کے پاس سو جاتی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو بہنے لگے تھے۔ جب استانی جی لائین بچھانے کے لیے آئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

”سو جاؤ گڑیا۔۔۔۔۔ اور پھر ان کی نظر شاید میری بھری ہوئی آنکھوں پر پڑی تھی۔

”کیا ہانڈ میں جلن ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ درد تو نہیں ہو رہا؟“ میں نے ٹہنی میں سر ہلا دیا تھا۔ کاش وہ پوچھتیں کہ اماں، اماں یاد آرہے ہیں یا گھر اور نہیں یاد آرہی ہیں تو میں فوراً کہتی ہوں۔ اور پھر شاید زندگی مختلف ہوتی میں سویرا اقبال کے بجائے صرف اقبال ہوتی۔۔۔۔۔ دین محمد زیندار کی بیٹی۔

اور یہ باری سے میری دوستی کی ابتدا تھی۔
میرے آنسو ٹھہم گئے تھے۔ وہ کچھ دیر مجھ سے
باتیں کرتا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی عمر
سات سال ہے۔

استانی جی انکل کے آنے سے تھوڑی مصروف
ہو گئی تھیں۔ میں برآمدے میں بیٹھی رہتی۔ کئی بار میرا
جی چاہا کہ گھر چلی جاؤں۔ ابانے کہا تھا کہ جی نہ گئے
تو آجانا..... لیکن پتا نہیں کیوں میں وہ ایک گلی پار نہ
کر سکی..... بس منتظر رہی کہ کوئی مجھے لینے
آئے..... لیکن کوئی نہیں آیا..... پتا نہیں میری مصروفی
میں ہی اتنا اور خود ماری تھی کہ میں خود نہیں گئی۔

انکل واپس چلے گئے تو استانی جی نے میرا
یو پیغام سنا۔ یہاں تک کہ سفید شلوار اور کالے بوٹ
پہن کر سب مل جلے وہیں استانی جی کے ساتھ اسکول
گئی تھیں۔ بہت اچھا لگا۔ اپنا آپ بھی اور اسکول جانا
میں..... استانی جی نے مجھے پہلی جماعت میں داخل
کر دیا تھا۔ میرا بڑا جی چاہ رہا تھا کہ میری بہنوں
میں سے کوئی آجائے تو میں انھیں اپنا یو پیغام دکھاؤں
اور شانو، عاشو دونوں ہی اسی روز استانی جی کے گھر
آئی تھیں اور انہوں نے بتایا تھا کہ وہ سب تانی سے
ملنے چلیوٹ گئے ہوئے تھے۔ کیا تھا اگر وہ مجھے بھی
ساتھ لے جاتے میں اپنے ہوش میں کبھی تانی کے گھر
نہیں گئی تھی۔ میرے دل میں جیسے ایک اور ابلہ چڑ گیا
تھا۔ میں نے شانو اور عاشو کو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ بس
چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی تھی۔ شانو نے مجھے
بتایا کہ تانی نے اماں کو بہت ڈانکا ہے کہ انہوں نے
مجھے استانی جی کے ساتھ کیوں جانے دیا۔

”تو گھر چلے گی ہانی؟“ عاشو نے مجھ سے کہا تو
میں استانی جی کی طرف دیکھنے لگی۔

”نہ بھائی بھول جاؤ اسے..... یہ تو اب میری
جینی ہے۔ تمہاری اماں نے اسے مجھ سے دیا ہے۔“
میں نے دیکھنے لگی اور کہہ نہ سکی کہ نہیں میں

مجھے استانی جی کے گھر آئے تیسرا دن تھا۔
جب استانی جی کے شوہر چھٹی پر گھر آئے تھے اور
استانی جی نے میرا بازو پکڑ کر انہیں دکھایا تھا۔

”ایسی خال ماس بھتی لکڑی دے ماری مصوم
بچی کو..... میں تو لے آئی اسے کہ مجھے دے دو.....
میں ایک بچی بھاری نہیں ہے جہاں تمیں پل رہے
ہیں وہاں یہ بھی پل جائے گی۔“

”ہاں اچھا کیا..... ویسے بھی تمہیں بچی کا شوق
تھا۔ پورا ہو جائے گا۔“ مصوبہ انکل کو کوئی اعتراض
نہیں ہوا۔

استانی جی کے شوہر جنہیں میں بعد میں انکل
کہنے لگی تھی۔ دو تین دن کی چھٹی پر گھر آئے تھے اور
ان کے آنے کے بعد استانی دوسرے کمرے میں چلی
گئی تھیں۔ ابراہم اور میں کمرے میں اکیلے تھے۔
رات کو جب استانی جی لائین بجا کر چلی گئیں تو میں
چپکے چپکے رونے لگی۔ تب ابراہم مجھے استانی جی اور
اس کے دونوں بڑے بھائی باری کہتے تھے بچی چار
پانی پر اللہ کر بیٹھ گیا..... باہر برآمدے میں بھی
ہوئی لائین کی مدھم مدھم سی روحنی اندھ کمرے میں
بھی آ رہی تھی۔

”تم کیوں رو رہی ہو گئی؟“ میں نے
جواب نہیں دیا تو وہ اپنی چار پانی سے انھیں گھسری....
چار پانی کے قریب آ گیا۔

”ڈر لگ رہا ہے؟“

میں اور نہ یاد دہونے لگی۔

”ڈر نہیں.....“ اس نے مجھے تسلی دی۔

”میں ہوں ناں ابوہر..... اور تمہیں آیت

الکری آتی ہے؟“

”نہیں.....“ میں نے ٹپکی میں سر ہلایا۔

”مجھے آتی ہے..... اماں کہتی ہیں آیت الکری

پڑھ کر سوئیں تو پھر ڈر نہیں لگتا..... میں پڑھ کر چھوٹ
دیتا ہوں۔“

ہاتھ چڑھا کر بھاگتی ہوئی اپنی گلی میں چلی جاؤں اور اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ لیکن میں بھی ایسا نہیں کر سکی۔ ہاں میری آنکھیں ضرور اپنی گلی کی طرف گھراں ہو جاتیں۔۔۔۔۔ استانی جی کی زندگی میں اور گھر میں بڑی ترتیب تھی۔ ہر کام گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ترتیب سے ہوتا تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر استانی جی ہمیں قرآن پاک پڑھاتیں، بڑے دونوں بھائی خود ہی پڑھ لیتے پھرنا ثناء، ناشتے کے بعد اسکول اسکول سے آکر کھانا اور پھر آرام کرنا شام کو پھر اسکول کی پڑھائی۔۔۔۔۔ لیکن مجھے اماں کے گھر کی۔۔۔۔۔ بہتر تھی یا۔۔۔۔۔ آئی۔۔۔۔۔ جب جی چاہا کھلا۔۔۔۔۔ جب جی چاہا لیٹ گئے۔۔۔۔۔ دوپہر میں چوہ اور فرد گڑیا لے کر بیٹھ جاتیں۔۔۔۔۔ عاشو اور شانوان کے کپڑوں پر سارے رنگ دیکھتے۔۔۔۔۔ میں بھی پاس بیٹھ کر دیکھتی۔۔۔۔۔ کبھی گھن میں سہل کر دیتیں۔۔۔۔۔ ہانگی ڈالتیں، جھپٹ چھپاتی چلیں دوڑے اور ڈھیروں کھیل تھے۔۔۔۔۔ اماں چار پائی کبھی سیدھی کھڑی کر کے گرمیوں کی دوپہروں میں اس پر ازار بند نہیں۔۔۔۔۔ ان کے ہاتھ بڑی تیزی سے پاس کی تیلیوں پر چلتے تھے۔ کوئی تیلیاں لگاتیں، کوئی لگاتیں، ڈیزائن بناتا جاتا۔ ایک پار میں نے تیلیاں کھینچ دی تھیں تو اماں نے مجھے کئی چھڑ لگائے تھے۔ اماں کا پیار تو مجھے یاد نہیں تھا لیکن ان کی ماریں مجھے یاد آتی تھیں۔ مجھے اپنا گھر بھی یاد آتا تھا۔ جس کے گھن کے ایک کونے میں اپلوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا، سوکھنے کے لیے اور ایک کونے میں کھڑیاں ہوتی تھیں جو ابا۔۔۔۔۔ ٹال سے اٹھیں لے کر آتے تھے اور جب کبھی بادل آتے اور بارش شروع ہوتی تو سب ہمیں اور بھائی بھاگ، بھاگ کر یہ کھڑیاں اور اُبلے چھڑ سٹے رکھتے۔۔۔۔۔ استانی جی کے ہاں مٹی کے تیل کا چھوٹا تھا جو برآمدے میں ایک کونے میں پڑا رہتا۔۔۔۔۔ پاس ہی مٹی کے تیل کا گھنٹہ تھا جس میں سے بہو (پپ) سے تیل نکال کر بوتل میں ڈالا جاتا اور کیف رکھ کر

اپنے اماں، ابا کی بیٹی ہوں اور مجھے گھر جانا ہے اور میں کبھی دل کی کوئی بات نہیں کہہ سکتی تھی۔ کبھی اماں سے نہ کہہ سکتی کہ مجھے اپنی گود میں لٹالیں۔۔۔۔۔ کبھی ابا سے نہیں کہا کہ مجھے بھی اٹلی پکڑ کر بازار لے جائیں۔ بس گھر گھر نہیں دیکھا کرتی اور دل میں خواہش اور لفظ بھٹی رہتی۔

شانو، عاشو اور دوسری بہنیں کبھی، کبھی مجھے ملنے آتی تھیں۔ عاشو نے ایک روز مجھ سے کہا تھا۔
"بالی چل گھر، میں نے تیرے لیے کپڑے کی اتنی اچھی کڑیاں بنائی ہے اور اماں کے پراندے سے دھماکے نکال کر اس کے بال بھی بنائے ہیں۔۔۔۔۔ اور آنکھیں بھی۔"

میرا بڑا بھائی چاہا کہ عاشو کے ساتھ گھر چلی جاؤں۔ اماں، ابا سب کو دیکھنے کو بھی چاہ رہا تھا۔ اماں شاید چلے جے پڑی چیز حائے جمی ہوں مجھے اتنے دنوں بعد دلچ کر ضرور مجھے گلے لگا کر ہم بیس کی اور کہیں گی بس اب تو نے نہیں جانا۔۔۔۔۔ میں نے چپکے، چپکے استانی جی کی طرف دیکھا جو میری طرف سے چپکے (مٹھے) ڈال رہی تھیں۔۔۔۔۔ مجھے یہ بھی یاد ہے اور غم بھیرتا تھا۔۔۔۔۔ اور مجھے یاد آتا استانی جی کبھی جس کہ مجھے اماں نے انہیں دے دیا ہے اور اگر میں چلی گئی عاشو کے ساتھ تو استانی جی تو ضرور کہیں گی اماں نے تمہوک کر چاٹ لیا ہے پھر تو اماں کی بہت بے عزتی ہوگی۔ پہلے ہی استانی جی اماں کو قصاب اور غلام کہتی ہیں۔۔۔۔۔ تو میں عاشو کے ساتھ نہیں گئی۔۔۔۔۔ جب میں نیلی فرارک سفید شلوار اور کالے بوٹ جکین کر اسکول جاتی تو مجھے لگتا جیسے میں عاشو مچو سب سے مختلف ہوں۔ جیسے میرے پر لگ گئے ہوں۔

استانی جی مجھے اپنے ساتھ اسکول لے کر جاتی تھیں اور ساتھ ہی واپس لاتی تھیں۔ اپنے گھر والی گلی کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے قدم سست پڑ جاتے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں استانی جی کا

لیکن شاید میرے مگرے آنے کے بعد اماں نے پھر دانی کے لیے جوڑے کی خواہش دل میں پال لی تھی کہ ایک دن بڑے دنوں بعد فردا آئی تو اس نے استانی کی کویتا یا کسان کے گھر بھائی آیا ہے۔

”اماں بہت خوش ہوں گی کہ اب دانی نکلا (اکھلا) نہیں رہا تھا۔“ میں نے سوچا تھا۔ میرا دل اسے دیکھنے کو چاہ رہا تھا اور میں بار بار فردا کو دیکھتی تھی کہ وہ مجھے ساتھ لے جائے گی۔ بھائی دکھانے کے لیے لیکن وہ تو استانی کو تھائے دے کر چلی گئی تھی۔

اسے اور گھر دل میں بھی تھائے ہائے تھے۔ اس روز استانی کی بھائی کی سہارک بار دے گئیں تو مجھے ساتھ لے گئیں۔ اور سب اپنے ہی گھر کو حیرت سے دیکھتی رہی۔ میں نے گھر کے کونے میں رکھے ایلوس کے ڈھکے کو کھینچ کر دیکھا جاتی سیڑھیوں کو ڈھانچا تو میں صدمے کے ساتھ چلی روئیاں پکڑ رہی تھی۔

دونوں گھروں میں زندگی سچی مختلف تھی۔ استانی کی گھر کے ساتھ میں اماں کے پاس کمرے میں آئی تھی۔ وہ چار پائی پر تھی تھیں اور ان کا رنگ چٹا زرد ہو رہا تھا۔ عاشا ان کی چار پائی پر بیٹھی ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ دوسری چار پائی پر فردا نے کوگود میں لیے بیٹھی تھی۔ اماں نے ہمیں دیکھ کر غصے کی کوشش کی۔

”اڑے مارے کئی رہو ذریعہ۔“ استانی جی نے کہا تھا لیکن اماں پھر بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے وہم سا ہوا تھا کہ میری طرف دیکھتے ہوئے اماں کی آنکھوں میں تھی جی اور انہوں نے۔

پتا اعتبار تھا آگے کے تھے اور پھر چلے کر لے تھے۔ میں دوڑ کر اماں سے لپٹ جانا چاہتی تھی۔ ان کی گود میں سما جانا چاہتی تھی لیکن اپنی جگہ سناٹ کھڑی رہی۔ اس روز استانی جی نے مجھے گلابی جالی کا پھولا پھولا سا فراک پہنا دیا تھا جو صوبیدار اگل شہر سے میرے لیے لائے تھے۔ میں نے سفید جرابیں اور سفید ہی شووز پہن رکھے تھے۔ شاید استانی جی مجھے یہ

چو لے میں۔ صحن میں ایک طرف مٹی کا چولہا بھی تھا لیکن استانی جی اس چولے پر صرف پانی گرم کرتی تھیں۔ اماں کے گھر کی بے ترتیبی میں بھی کتنا صحن اور خوب صورتی تھی۔ گرمیوں میں جب شام کے وقت اماں تھک کر روئیاں لگاتی تھیں تو میں پاس کھڑی انہیں دیکھا کرتی تھی ہرے صحن میں گرم گرم روٹی کی سوندھی، سوندھی خوشبو پھیل جاتی تھی۔ اماں کے گھر جب بھوک لگتی تھی شانو، عاشا پتھری میں پی پی روٹی پر چار رکھ کر کھا لیتی تھیں لیکن استانی جی کے گھر میں کسی کو بے وقت کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ انصار اور ابصار بھائی تو ہر وقت پڑھتے رہتے تھے۔ مجھے زیادہ بات نہیں کرتے تھے لیکن ہادی میرے ساتھ کھیتا تھا۔ اس نے اپنے سارے کھلونے مجھے دکھائے تھے۔ وہ عمر میں تو مجھ سے ایک سال ہی بڑا تھا لیکن پڑھائی کے لحاظ سے دو سال آگے تھا۔ میں سبق بھی یاد کر لیتی، بھیل بھی لیتی اور پھر بھی جیسے سارا دن میں فارغ ہوں استانی جی کے گھر کے برآمدوں اور کمروں میں گھومتی پھرتی۔ کئی بار دروازہ کھول کر دیکھتی۔ بس ایک کٹی کا قسط

اور..... شروع میں شانو، عاشا فردا، مٹی کی آجائی تھیں، تھوڑی دیر کے لیے لیکن غائب ہو جاتے کیوں نہیں آتی تھیں..... دانی کو بھی میں بھی کبھی اسکول سے آتے جاتے کٹی میں دیکھ لیتی تھی لیکن اماں، ابا نہیں ملتے تھے۔ حالانکہ عاشا شانو جب بھی آتیں ضرور پوچھتی تھیں کہ مجھے گھر تو نہیں جانا اور اگر کبھی استانی جی سن لیں تو ضرور ہار کر دانتیں کساب میں ان کی بنی ہوں..... حالانکہ انہوں نے مجھے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں انہیں استانی جی نہ کہوں ہادی اور انصار، ابصار کی طرح ہی کہوں۔ نہ ہی مجھے یہ کہا کہ صوبیدار اگل کو ایلو کو۔ یوں میں ہمیشہ ہی انہیں استانی جی اور اگل کہتی رہی۔ میں جیسی سے دوسری میں آگئی۔ بہنوں کا آنا کم ہوتے، ہوتے ختم ہو گیا

اسکا سا نام جو دانیال سے ملتا جلتا ہو۔" اماں کی آنکھیں یک دم لودھنے لگی تھیں، میں نے نظریں ان کے چہرے سے ہٹا لیں۔

میرا نام اماں نے اقبال رکھا تھا۔ اب سوچتی ہوں شاید اماں نے پہلے سے ہی دانیال کے ساتھ ملا کر سوچ رکھا ہوگا لیکن جب میں آگئی تو اماں نے میرا ہی نام اقبال رکھ دیا..... لیکن جب استانی نے مجھے اسکول داخل کروایا تھا اور میونسپل سکسٹی سے میرا پیدائش کا شکوٹ نکلوایا تھا تو اس میں میرا نام سوریا اقبال لکھا ہوا تھا۔ سو میرا پورا نام سوریا اقبال تھا۔ ضرور سوریا نام کا ساتھ شانویا عاشو نے میرے نام کے ساتھ لگا دیا اور ابا سے کہا ہوگا کہ یہی نام لکھو اس۔ خود ان کے بھی تو درد، وہ نام تھے۔ عاشو کا ہر شے کے ساتھ رکھنا نہ نہیں، چو کا پردین اختر اور خود کا فرید زورین..... اس روز استانی ہی ابا کے آگے تک رہی تھیں۔ ابا منہ ہاتھ دھو کر باہر برآمدے میں ہی چار پائی پر بیٹھ گئے تھے۔ فرد میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئی۔

"ابا رکھیں کون آیا ہے۔"

ایا کی آنکھیں کچھ دیر کبیرے چہرے پر ٹپک گئی تھیں۔

"کیا ابا میری شکل بھول گئے ہیں؟"

"اور آ بالی....." ابا حیرت کے سمندر سے باہر آئے تھے۔ "تو ٹھیک ہے ناں..... خوش ہے ناں....."

میں نے سر ہلا دیا تھا۔

"بی تو نہیں گھبرا تا..... گھبرائے تو گھر والیں

آ جانا۔" ابا نے اسی روز والی بات ڈہرائی تھی اور

میرے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ چنانچہ کیوں مجھے بھردہم

ہوا تھا جیسے ابا کی آنکھیں چرخم ہوں اور ان کا ہاتھ لڑ

رہا ہو۔ میرا بی چاہا تھا کہ میں کہوں ہاں میرا بی گھبرا تا

ہے، ابا مجھے گھر آتا ہے، مجھے نہیں جانا..... لیکن

میں بیٹھ کی طرح کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ کاش میں رو

ہی پڑتی، ابا سے لپٹ جاتی لیکن..... میں تو یہ بھی

نئے کپڑے اس لیے پہنا کر لے گئی تھیں کہ اماں کو لگے کہ میں اس گھر کے مقابلے میں اس گھر میں زیادہ اچھی طرح اور زیادہ خوش ہوں..... اچھی طرح تو کتنی لیکن میں زیادہ خوش نہیں تھی اور یہ بات صرف میں جانتی تھی اور میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ میں کبھی وہ بات نہ کہہ پاتی تھی جو میرے دل میں ہوتی تھی۔ میری بہنیں مجھے حیرت اور رشک سے دیکھتی تھیں اور مجھے اپنا آپ اس گھر میں بہت اچھی، اچھی سا لگتا تھا..... فرو نے مجھے بھائی رکھانے کے لیے بلایا تھا۔ وہ بہت چھوٹا سا تھا اور آنکھیں نیچے سو رہا تھا۔ میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر فوراً اٹھالیا تھا۔ فرو نے کہا تھا۔

"ہائے ہائی تو اتنا بالکل دشمنی کڑی لگ رہی ہے۔" میں چپ چاپ لگا ہوں جھکائے بھائی کو دیکھتی رہی تھی۔ جیسے مجھے یوں نہیں آتا تھا اور مجھے واقعی یوں نہیں آتا تھا جب استانی جی جا رہی تھیں تو میرا جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا..... میں نے کئی بار الفاظ ترحیب دیے کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر کچھ نہ کہہ سکی۔ اور بے بسی سے فرو کو کہنے لگی۔

"تموڑی دیر اور رک جائیں استانی جی دنا نو

کے ابا آتے ہوں گے وہ کبھی بالی سے مل لیں گے۔

یاد کرتے ہیں۔" اماں لالچت رہے کہہ رہی تھیں۔

مجھے اماں کی بات کا یقین نہیں آتا تھا اگر ابا مجھے

یاد کرتے تو ایک لگی کا مصلحتا طویل تو نہیں تھا کہ

استانی جی کے گھر تک نہ آسکتے۔ اماں اب، ہو لے،

ہو لے کچھ کہہ رہی تھیں میں پھر منے کو دیکھنے لگی۔

"اماں بہت بیمار ہو گئی تھیں بالی..... بس مرتے

مرتے بیٹی ہیں۔" فرو نے مجھے بتایا تھا میں نے مڑ کر

اماں کو دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھیں یا شاید

فرو..... فرو کو ہی دیکھ رہی ہوں گی۔

"نام کیا رکھا ہے؟" اب استانی بی نے پوچھا تھا۔

"ابھی تو کچھ نہیں رکھا..... آپ بتائیں ناں

میں کر سکتی تھی۔ وہ کو کوئی بات اماں سے منوانی ہوتی تھی تو چیخ، چیخ کر روتی تھی۔ زمین پر لیٹ کر اماں چلائی، بچل، بچل کر روتی..... کاش جب استانی جی مجھے لینے آئی تھیں تو میں بھی زمین پر لیٹ جاتی۔ بچل، بچل کر پاؤں دگڑ، دگڑ کر روتی اور ابا اماں استانی جی کو منع کر دیتے لیکن انہیں اس روز ایسا کر سکتی تھی نہ اب اور استانی جی کے ساتھ ان کے گھر آگئی تھی۔

اس روز میں نے باری سے بھی بات نہیں کی تھی اور چپکے سے اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی تھی۔ حالانکہ باری نے کہا بھی تھا کہ لوڈ کھینچتے ہیں لیکن میں سوئی بن گئی تھی مجھے بہت رونا آ رہا تھا اور پھر جب میں نے دوسری پاس کر لی تھی تو انصار بھائی بھی ساتھ میں پاس کر کے آٹھویں میں آ گئے تھے اور صوبیدار اٹکل چاہتے تھے کہ اب وہ شہر کے کسی اچھے اسکول میں پڑھے۔ چنانچہ استانی جی کھاریاں جانے کی تیاریاں کرنے لگی تھیں اور میں نے باری سے پوچھا تھا۔ ”اب تم سب لوگ شہر میں رہو گے؟“

جب باری نے مجھے بتایا تھا۔

”ہاں..... اور تم بھی تو ہمارے ساتھ جاؤ گی..... تمہاری اماں نے مجھے میری ہی کو بڑا دے دیا ہے۔“

اور میرا دل جیسے ڈوب گیا تھا۔ میری اماں، اماں، شانو، جاشو، وچو، فرودانی اور چھوٹا بھال جانے سے ایک دن پہلے استانی جی مجھے سب سے ملوانے کے لیے لے گئی تھیں۔ اس روز بھی انہوں نے مجھے عید والی نئی فراک پہنائی تھی۔

”ہم لوگ کھاریاں جا رہے ہیں تاکہ بچوں کو اچھے اسکولوں میں پڑھا سکیں۔ یوں تو آپ نے ہالی

تو یہ آپ کی بیٹی ہے۔“ اماں، استانی جی سے بات کرتے ہوئے مجھ کو دیکھ رہی تھیں۔

”پھر بھی بیٹی تو آپ کی ہی ہے ہاں ذرا بہن، میں نے سوچا پچھلوں یہ نہ کہیں کہ ہماری بیٹی کو لے کر غائب ہو گئے۔“ استانی جی مسکرائیں۔

”غوثی، جی، عید، بھر عید تو اپنے گاؤں میں کریں گے ہاں آپ لوگ؟“ اماں کی آواز میں جیسے حسرت سی تھی۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں..... عید، بھر عید تو اپنے گاؤں میں ہی کرنی ہوتی ہے۔“

میں ابھر کر گئی جیادھر کی.....

استانی جی کی بیٹی جی شاماں کی..... استانی جی کو مجھ سے بھڑکی تھی، وہاں سے درمیان صرف ترس اور ہمدردی کا رشتہ تھا۔

اور اماں کو میری طلب نہیں تھی، میں بے طلب تھی ان کی جھولی میں آگئی تھی..... مجھے محبت کی طلب تھی۔ اس کا تب مجھے اور اک نہیں تھا اور جب اور اک ہوا تو میرے اندر تاسور ہو گئے تھے کہ میں

بن چاہی تھی۔ ایک اور بیٹے کی آرزو میں اماں نے مجھے ختم دیا۔ میں جو پانچویں بیٹی تھی اور مجھ سے پہلے چار اور بھی تھیں۔ اس لیے اماں مجھے استانی جی کو دے کر بھول گئیں۔ کھاریاں آکر استانی جی نے مجھے

اور باری کو ایک ہی اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ میں کلاس تھری میں تھی تو وہ فائنچ میں..... یہاں پڑھانی تھوڑی مختلف اور مشکل تھی لیکن استانی جی نے میرے اور باری کے لیے ٹیوٹر رکھا تھا۔

انصار بھائی اور انصار بھائی بھی اکیڈمی جاتے تھے۔ میں ذہن تھی بلکہ اسکول کی ٹیچرز نے ایک بار استانی جی سے ہر شے بینک پر کہا تھا کہ آپ کی بیٹی سیکس ہے..... اور استانی نے فوراً رد کر دی تھی۔

”نہیں مہم، اللہ اس کے ماں، باپ کو زندہ رکھے۔ یہ میری بیٹی نہیں ہے بلکہ ہمارے گاؤں میں

میرے بہت اچھے جاننے والے کی بیٹی ہے۔ پانچ بیٹیاں تھیں ان کی سو یہ ایک میں نے لے لی۔" گھر کی تعریف پر جو میرے اندر خوشی کے چراغ جلے تھے وہ یک دم بجھ گئے۔

یہ وہ جملہ تھا جو وہ اکثر بولا کرتی تھیں۔ جب تک میں ان کے پاس رہی اس جملے نے سیکڑوں بار مجھے ڈھکی کیا..... جب بھی کوئی کہتا آپ کی بیٹی بہت خوب صورت ہے، بہت پیاری ہے، ذہین ہے، جواب میں وہ اسی طرح کی یا اس سے ملتی جلتی بات کہتی تھیں۔ یوں میں اماں، اماں کو بھلا پانی نہ استانی جی کو اپنا سکی۔ میں جیسے خلا میں تھی ہوئی تھی مگر میں نہ ان سے کہہ نہ کہ پانی حالانکہ میرا ہی چاہتا تھا کہ ان سے کہوں مجھے میرے گھر واپس چھوڑ آئیں پر میرے اندر لفظ نئے اور بگڑے اور پھر کہیں کھو جاتے تھے۔ میں اس گھر کی فردہ ہوتے ہوئے بھی اس گھر کی فردہ نہیں تھی۔ اور جس گھر کی فردہ تھی انہوں نے مجھے اپنے گھر سے بے دخل کر دیا تھا..... کھار باں سے چلنے جہلم سے راول پنڈی ہمارا قیام کی شہزادی میں رہا لیکن ہم پھر بھی میانے ہزارے سے گئے حالانکہ استانی جی نے اماں سے کہا تھا کہ "میرا بڑا مقصد تھا کہ میں جی میں ہی جتنی ہے۔ ابھی شہزاد میں ہی مقید ہیں....."

اور ہر مقید سے پہلے میں جیسے آس لگا کر بیٹھ جاتی تھی کہ اب استانی جی کہیں کی کہ چاری کر لو۔ مقید کرنے کا ڈس جاتا ہے..... لیکن ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا..... کبھی..... انصار کے امتحان نزدیک ہوتے، کبھی ابھار کے، کبھی صوبیدار انگل کی پھٹی اتنی مختصر ہوتی کہ جانہ پاتے اور میرے اندر جو دکھوں کا ٹھنڈوں کا ڈھیر لگا تھا ان میں ایک اور دکھ کا اضافہ ہو جاتا۔ پھر ان دکھوں نے لنگھوں کا پیرا میں جاکن لیا..... میں پھٹی میں تھی جب ہماری اردو کی ٹیچر مس رہائی نے ہمیں اپنے والدین پر مضمون لکھنے کے لیے دیا..... مس رہائی ایک کہانی لگا تھیں۔ ان کی

کہانیاں مختلف ادبی پڑچوں میں چھپا کرتی تھیں۔ لیکن مجھے اس کاظم بہت بعد میں ہوا تھا کہ وہ راسخ ہیں۔ ان کی عادت تھی۔ وہ لڑکیوں کو آؤٹ آف کورس چھڑیں بھی لکھنے کو دیا کرتی تھیں تاکہ ان کی رائٹنگ پاور بھڑک ہو جائے تو اس روز جب میں لکھنے بیٹھی تو میری آنکھوں کے سامنے اماں اور اماں آجھے تھے۔ میں نے لکھا..... میری اماں کو نہ میری طلب تھی نہ چاہ..... مجھے نہیں علم کہ میری اماں کی جب پہلی نظر مجھ پر پڑی ہوگی تو اس نظر میں میرے لیے کیا تھا؟ محبت یا نفرت..... میرا خیال ہے نفرت..... ناراضی..... غصہ..... میرے اندر جسے لفظ جیسے پھل، پھل کر مٹنے لگے..... اگلے روز مس رہائی نے میری کاپی دیکھی اور پھر اپنے پاس ہی پھیل کر رکھ لی تھی۔ یہانی گھبراہٹوں کی کانیاں انہوں نے واپس کر دی تھیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے کاپی مانگی.....

انہوں نے بغور مجھے دیکھا۔
 "تمہارا مضمون کافی لمبا ہے..... بڑیک میں آفس میں آتا۔"

اس روز میرے اور مس رہائی کے درمیان ایک ایسے تعلق کی بنیاد پڑی تھی جو آج تک نہیں ٹوٹا..... اس روز انہوں نے میری اگلی تمام کر میری رہنمائی کا فریضہ سنبھال لیا تھا۔
 "یہ تم نے خود لکھا ہے یا تمہیں سے لکھ لیا ہے؟"
 "میں نے خود لکھا ہے۔"

میری آنکھوں میں میانے ہزارے سے آنے کے بعد پہلی بار آنسو آئے تھے۔
 "میرے پاس اپنے والدین پر لکھنے کے لیے یہی کچھ تھا۔" اس روز استانی جی والی ڈیوٹی میں نے سنبھالی تھی اور مس رہائی کو وہی بتایا تھا جو استانی جی دوسروں کو بتاتی تھیں۔
 "تمہاری تحریر بہت خوب صورت ہے، میرا

دل کہتا ہے تم ایک دن بہت بڑی رائٹر بنو گی۔“ وہ مسکرائی تھیں۔

پھر انہوں نے مجھے بچوں کی کہانیاں پڑھنے کو دیں۔ وہ اخبار میں سے بچوں کا صفحہ میرے لیے لے کر آتی تھیں۔ انہوں نے مجھے کہانی لکھنے پر اکسایا۔۔۔۔۔ اور چھٹی جماعت میں ہی میں نے بچوں کے لیے کہانی لکھی اور مس ردبانی کو دی جو انہوں نے بچوں کے ایک میگزین میں چھپوا دی۔ یوں یہ سلسلہ چل پڑا۔۔۔۔۔ پھر میں نے ساتویں میں قلم لکھی۔۔۔۔۔ بائی وائر۔

مس ردبانی نے اس کی تصحیح کر کے چھپوا دیا۔ پھر میں نے اردو میں بھی لکھیں مثنوی شروع کر دیں۔ مس ردبانی نے ہر ہفتہ مجھے گائیڈ کیا۔ میٹرک تک یہ راز صرف میرے اور مس ردبانی کے درمیان رہا۔ میں نے باری کو بھی اس کے حقائق نہیں بتائے۔ جس کے ساتھ میں اب اکثر باتیں حیر کرنے کی بھی لیکن اب بھی زیادہ وہ ہی یوں تھا، میں تو صرف مثنوی لکھتی تھی۔۔۔۔۔ میں جب ناکھ میں آئی تو وہ میٹرک کر کے کالج میں داخل ہو چکا تھا۔ یوں اسکول کا ساتھ چھوٹ چکا تھا۔ اس نے میٹرک تک اسی اسکول میں پڑھا تھا جس میں ابھی میں پڑھ رہی تھی۔۔۔۔۔ میں نے میٹرک میں کیلی گزٹل کی۔۔۔۔۔ وہ کوئی خاص فائنل نہیں تھی اور اس کے ایک دو مصرعے بے وزن تھے لیکن ایک بار پھر مس ردبانی میری راہبر بن گئی تھیں۔

انہوں نے میری غزلوں کی اصلاح کی اور وہ ادبی پڑچوں میں ان کے قوسطے سے چھپنے لگیں تو جب میں میٹرک میں گئی تو میں نے باری کو بھی اس راز میں شریک کر لیا تھا۔۔۔۔۔ باری کو یقین نہیں آتا تھا۔

”یہ تم نہیں ہو سکتیں دیرا۔۔۔۔۔“ یہاں اس گھر میں مجھے بانی کے بھائے سب سے پہلے باری نے ہی دیرا کہنا شروع کیا تھا اور ہر سب ہی دیرا کہنے لگے تھے۔ ”یہ میں ہوں لیکن تم استانی ہی کوست بتانا۔۔۔۔۔“ ”اچھا اس جیسا ایک مصرعہ کہو۔ میرا مطلب

ہے مصرعہ طرح میں دیتا ہوں۔

ابھی ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ”ہوا“ ”جہانوں میں توہم بھر گزرتا مشکل ہے ابھی ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہوا جو شاعر جگمگ نہیں نکلتی وہ نوٹ جاتی ہے سنسبل کے ہاتھ بڑھاتا اگر جھکاتا ہوا“

”گریٹ۔۔۔۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔۔۔۔۔ ٹیچرز تمہارے حقائق صحیح کہتی تھیں کہ تم سیکس ہو۔“ اس روز اس نے میری اب تک کی چھٹی ہر چیز دیکھی اور پڑھی تھی۔۔۔۔۔ اور مجھے بے اعزاز دہرا تھا۔

اس روز کچن کا رخ کرنا آپ بخود استعتر لگا تھا اور مجھے مس ردبانی کی بات صحیح تھی مثنوی کہ اللہ اپنی مصلحتوں کو سمجھ جاتا ہے۔ اگر میں وہاں ہی ہوتی مہمان خانہ کے میں جانی اماں کے گھر تو شاید اس وقت میری زندگی کا رنگ مختلف ہوتا۔۔۔۔۔ اور مجھے لگا ہے کہ میں نے بچے دکھ کے کانٹے کی جھین بکھم گئی ہے۔۔۔۔۔ اور میں نے سوچا جب بھی ہم میمانے ہزارے جائیں گے تو اماں دابا اور بانی سب مجھے دیکھ کر کس قدر حیران ہوں گے اور جب میں انہیں بتاؤں گی کہ میرا کھانا اخباروں اور رسالوں میں چھپتا ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا لیکن تب مجھے علم نہیں تھا کہ میں اب میمانے ہزارے بھی نہیں جاؤں گی۔

جس روز اخبار بھائی کی پاسنگ آؤٹ پڑی تھی اس روز کا کول سے واپسی پر استانی بی اور صوبیدار انکل میمانے ہزارے چلے گئے تھے۔ وہاں اپنا آبائی گھر اور زمین بیچ کر آئے تو سیا لکھٹ میں اپنا گھر لے لیا اور باقی کی رقم بینک میں محفوظ کر دی۔ ان دنوں ہم سیا لکھٹ میں رہ رہے تھے اور یہاں رہتے ہمیں پانچ سال ہو رہے تھے۔ اس لیے مستقل رہائش کے لیے بھی سیا لکھٹ کو ہی منتخب کیا گیا تھا۔ یوں بھی ابراہار، ابصار اور میں ہم تینوں ہی یہاں کے اسکول اور کالجز میں پڑھ رہے تھے۔ ابصار کا ارادہ بھی آری میں

ایک بار پھر سردیوں میں مارا تھا۔ میرے ماتھے پر گونز بن گیا تھا لیکن مجھے درد کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ درد اس سے کہیں زیادہ تھا جو میرے اندر تھا۔

”مت کرو، ایسا دیرا۔“ اس نے پریشان ہو کر
مجھے دیکھا۔

پھر وہ میرے پاس ہی میز صوفوں پر بیٹھ گیا۔
 ”کیا ہوا ہے، کیوں کر رہی ہو ایسا.....“ وہ بڑا
 مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔“ اس نے میرے ہاتھ
 قلم لیے۔

میری عمر سولہ سال تھی اور جو درد میرے دل میں اترتا وہ مجھ سے سہا نہیں جا رہا تھا۔ میں لاشعوری طور پر اس درد کو کم کرنے کے لیے جو اندر موجود کچھ نکالتا..... خود کو تکلیف دے رہی تھی لیکن اندر درد تو ایسا ہی تھا اور باہر کی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس زمانہ باری نے جس طرح میرے درد کو اور میری تکلیف کو محسوس کیا تھا اس سے میرے اور باری کے درمیان ایک نئے رشتے کی بنیاد چلی تھی۔ محبت کے رشتے کی..... لیکن جب میں اس بات سے بے خبر تھی کہ میرے اور باری کے درمیان یہ کیسا بندھن بندھا ہے۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں لیکن میرے قلم نے اس رات آنسو بہائے تھے اور جب میں نے اپنی تحقیقات مس رباتی کو دکھائی تھیں تو مس رباتی نے حیرت اور غوثی سے مجھے لگے لگا کہا تھا۔

”تم ایک دن بڑا نام کماؤ گی سوچو۔“ اور ایسا ہی ہوا تھا۔ انیس سال کی عمر میں میرا پہلا مجموعہ نکاح نامہ شایع ہو گیا۔ جب منظر عام پر آیا تھا تو اسے جو چرچائی گئی تھی اس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ یہ سب کس رہائی کی کوکھشور سے ہوا تھا۔ مجھے تو کچھ غم نہیں تھا۔ میں نے تو بس اپنا سارا کلام اکٹھا کر کے انہیں دے دیا تھا۔ مس رہائی جانتی تھی کہ کتاب کی تقریب روضہ نمائی ہو اور میں بھی اس میں شرکت کروں لیکن میں نے منع

جانے کا تھا۔ البتہ ایرار نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا تھا کہ وہ کیا کرے گا۔ وہ الف و انس، ہی کر رہا تھا۔

"تو اب میں ابھی میانے ہزارے نہیں جا سکتوں کی اور ابھی اپنے ماں، باپ کا گھر دوبارہ نہیں دیکھ سکتوں کی۔۔۔" سب کے دھندلے دھندلے سے چہرے میری آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔

میرے اندر سات سال سے جو آس کا دیا بل رہا تھا وہ ایک دم بھڑک کر بچھ گیا تھا۔ میری آنکھوں میں وحول اڑ رہی تھی اور اندر جیسے گہرا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔

میں اس وقت اوپر پھٹ پڑ جانے والی سڑکیوں پر ٹپٹپی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی مجھے استانی نے بتایا تھا کہ انہوں نے میانے ہزارے والا گھر اور زمین سچ دی ہے اور انہوں نے بتایا تھا میرے گھر میں سب بھلے چٹکے ہیں۔۔۔ اور یہ کہ شانو اور عاشو دونوں کی شادیاں ہوئی ہیں۔ میں چڑیا کے بھوکے چلاتے ہوئے کی طرح منہ اٹھائے ان کی طرف دیکھ رہی تھی کہ ابھی وہ بتائیں گی کہ اہاں مجھے یاد کرنی ہے۔۔۔

اب اس ہیں، میرا وہ دانی اور میرے ابھی بھوکے یاد کرتے ہیں لیکن چڑیا کے بچے چڑچڑکھٹے بیٹھے رہے اور چڑیا ان کو کچھ نہیں دانت دانتی کے اخیر چلی گئی۔ استانی جی البتہ اسے ہاتھ دکان دیکھنے چلی گئیں۔ صوبہ دار انکل ڈیوٹی پر تھے اور ایرار چاہیں کہاں تھا۔ میرے فلم کی شدت اتنی تھی کہ میں ہولے ہولے سڑکیوں کی دیوار کے ساتھ سر مارنے لگی۔

جب ایرار گھر میں داخل ہوا تھا۔

”کتنی دلچسپ کہانی ہے اور..... جب ای وغیرہ کہہ رہی تھیں تو دروازہ بند کر لیا کرو۔“

دو مجھے دور سے ہی دیکھتا اور بولا ہوا قریب آیا تھا اور پھر مجھے دیوار کے ساتھ سر مارتے ہوئے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" اس نے مجھے روکا۔۔۔۔۔ میری آنکھوں میں وحشت تھی۔ میں نے

حالات کم، کم ہو پاتی تھی۔ ہاں فون پر رابطہ رہتا تھا..... ایک روز انہوں نے مجھے مشاعرے کا دعوت نامہ بھجوایا..... لیکن ہماری نے مجھے منع کر دیا۔

”تم مشاعرے میں نہیں جاؤ گی ویرا..... وہاں لوگ تمہارے سامنے واہ، واہ کریں گے اور تمہاری عدم موجودگی میں تمہاری ذات پر تبصرہ کریں گے..... یہ لوگ خواتین شاعرات کے ساتھ فخر نہیں ہوتے..... عزت نہیں کرتے اور پھر خواہ خواہ اس کیڈل بن جاتے ہیں۔“

”تم چاہتے ہو میں نہ کہوں.....؟“ میں نے پوچھا۔
”نہیں..... میں ایسا نہیں چاہتا..... تم کہو۔“
تمہارے اندر نکتہ ہے اسے خارج مت کرو لیکن مشاعرے وغیرہ میں شرکت نہیں کرو۔“

”فکرم ہے.....“ میں نے دعوت نامہ بھاڑ دیا۔
اور پھر میں نے بھی کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔ آخر نکتہ لگانے والوں نے اندازے لگائے۔ سو براہِ اقبال کسی کسزور یونیورسٹی سے تعلق رکھتی ہے، وہ بہ صورت ہے۔ فائدہ میری تحریریں دل پر تبصرہ کرتے ہوئے میری ذات کے متعلق کچھ نہ کچھ جملے لکھ دیتے تھے۔ کسی نے لکھا۔ میرا ایک گراؤں مفلوک ہے، شاید اس لیے میں نے آج تک انٹرویو نہیں دیا۔

کسی نے میرے ماضی کو شرمناک کہا۔ کسی نے کہا کہ سو براہِ اقبال فرضی کردار ہے، پہلے پردہ کوئی اور ہے لیکن مجھے ایک بڑی شاعرہ قرار دیتے والوں کی بھی کمی نہیں تھی..... جو میری ذات کو الگ کر کے میری تحریر دیکھتے تھے.....

میری کتاب کو آدم جی ادبی انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ کئی دوسری ٹیکسٹوں نے بھی ایچ آر ڈاؤن۔

میرے سب ایچ آر ڈاؤن ربانی نے ہی وصول کیے تھے۔ ایکس سال کی عمر میں میری دوسری کتاب جہر بھی آگئی تھی۔ پہلی کتاب کے ان دو سالوں میں کئی ایڈیشنز آچکے تھے اور میرے اعداد و جمع بے گلی ہی

کر دیا۔ میں بہت خوف زدہ تھی۔ ابھی تک استانی جی اور صوبیدار انگل نہیں جانتے تھے کہ میں نہ صرف شاعری کر رہی ہوں بلکہ میری ایک کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ ان کا رد عمل کیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے انہیں یہ سب اچھا نہ لگے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا جب باری نے استانی جی اور انگل کو بتایا تو سب نے حیرت بھری خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”ارے دیکھتے تو پہلی ہی پتا تھا کہ میری بیٹی بہت چھٹس ہے۔“ یہ استانی جی تھیں۔ میں چپ بھی تھی۔
”ارے واہ..... ہماری بہن تو بھی رستم لگی۔“

انصار بھائی بھی ان دنوں چھٹی پر آئے تھے۔ ان کی شادی کی تیار پاں ہو رہی تھیں۔ انصار بھائی کی بھی عطلی ہو گئی تھی۔ انصار بھائی کی شادی کسی کزن کی بیٹی سے ہو رہی تھی..... شادی میں سگی بہنوں کی طرح ہی مجھے ٹپک ملے..... استانی جی نے ہر فنکشن کے لیے بہترین لباس تیار کر دیا..... بلکہ شروعات سے لے کر اب تک انہوں نے اچھا کھلایا، اچھا بنایا۔

بہترین اداروں میں تعلیم دلوائی پھر بھی میرے اندر کبھی عطلی تھی اور کبھی پیاس تھی..... میرے اندر ہر وقت کن من ہوتی رہتی تھی۔ میں کیا چاہتی تھی، کچھ بھی تو مجھے کچھ نہیں آتا تھا..... میں نے کسی خوشی کو خوشی کی طرح محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر بھی محبت کی ایک کوئیل میرے اندر پھوٹ چکی تھی۔

باری کی محبت کی کوئیل لیکن مجھے اس کا کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ یہ محبت ہے۔ باری پیر انیال رکھتا تھا۔ ہم گھنٹوں باتیں کرتے تھے لیکن نہ کبھی اس نے اور نہ میں نے اس سے کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ ہماری گفتگو اب زیادہ تر میرے حکام اور میری کہانوں پر ہوتی تھی جو قاتر سے چھپ رہی تھیں۔ فائدہ میری کتاب پر تبصرہ کر رہے تھے۔ اکثر مضامین مجھے مس رہاں بھجوا دیا کرتی تھیں۔ چونکہ مجھے اب اسکول چھوڑے چار سال ہو چکے تھے اور میری

ہے۔ اس گاؤں میں میرے اماں، ابا، بہنیں اور بھائی ہیں۔ اس گاؤں سے تو خون کے رشتے بڑے ہیں باری۔“ میں نے سوچا تھا لیکن کب نہیں تھا۔
”اس گھر میں تمہیں اتنی محبت ملی۔ امی، ابو نے ہمیشہ تمہیں بچی سمجھا ہے۔ بھی تم میں اور ہم میں فرق نہیں کیا۔“

”محبت.....؟“ میں نے خالی، خالی نظروں سے باری کی طرف دیکھا اور فحش میں سر جھکا دیا۔
”نہیں..... محبت نہیں، ترس، ہمدردی.....“ جانے کب کا دلاوا دیا بہن کا تھا۔

”کیا صرف ترس اور ہمدردی میں کوئی اس طرح کرتا ہے..... اتنا.....؟“ باری کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”ہی تمہارا کتنا خیال کرتی ہیں..... اور ابو وہ.....“

”ہاں..... یہ سچ ہے، استانی جی نے میرا ہمیشہ خیال رکھا..... لیکن انہوں نے مجھ سے محبت نہیں کی..... انہوں نے مجھے اپنی بیٹی کی طرح رکھا..... کھلایا، پلایا لیکن بچی سمجھا نہیں..... مجھ پر ان کے احسانوں کا بوجھ ہے..... انہوں نے ہمیشہ سب سے پہلے کہا کہ میری اماں کی پانچ بیٹیاں تھیں اور مجھ پانچویں کو اماں بلا وجہ ماری تھیں۔ اس لیے وہ مجھے اپنے ساتھ لے آئیں۔“ میری آنکھوں سے پٹ پٹ آنسو بہنے لگے۔

”استانی جی کہتی ہیں، میں جب پیدا ہوئی تو میری اماں کو میری ضرورت نہ تھی۔ انہیں تو دانی کے لیے بھائی چاہیے تھا۔ اور استانی جی کو بھی میری ضرورت نہیں تھی..... وہ صرف مجھے اماں کی ناراضی اور غصے سے بچانے کے لیے اپنے ساتھ لے آئی تھیں اور پھر..... نیکی کمانے لگیں۔ میں کہیں بھی کسی کو بھی مطلوب نہیں تھی نہ ہوں باری۔“
”تم..... تم مجھے مطلوب ہو رہا.....“ باری نے

حقی ایک بار باری نے کہا تھا۔

”دورا..... تمہارا دل چاہتا ہے، میانے ہزارے جانے کو تو میں تمہیں لے چکا ہوں۔ سب سے آؤ گی تو یہ پہلی ختم ہو جائے گی۔“
میرے اندر سے ہاں، ہاں کی آواز آرہی تھی لیکن لب خاموش تھے..... میرے اندر ہاں اور نہ کی جنگ شروع ہو گئی تھی پھر ان کی اس جنگ میں طلب اور محبت پار گئی۔ انا اور خودواری جیت گئی۔ انہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میری طلب نہیں..... بہنوں کی شادیوں پر اماں نے مجھ کو منہ بھی نہیں پوچھا۔ کیا تھا اگر وہ مجھے چاہتیں..... کتنا شوق ہوتا ہے تاں بہنوں کی شادیوں میں شریک ہونے کا لیکن دل کے اندر جیسے بہت سارے دے دے جل کر بجھ گئے تھے۔

”نہیں..... میرا نہیں جی چاہتا۔“ میں نے سارے آنسو اپنے اندر اتار لے لیے تھے۔ میں نے اپنا اید کیا اور چھ سراسر کیا پلنگ سرور میں لیٹ گیا۔ استکان دیا اور پہلے اٹس۔ اٹس کی پتھر کی ہوئی پھر ایک ٹل اسکول میں ہیڈ مسٹر میں کی ریت کی۔ استانی جی کے گھر میں سب ہی خوش تھے۔ میری گاہیاہوں پر..... باری بھی اب ابھی پست پر تھا..... اور گھر میں اس کی شادی کی پانچ برس ہو چکے تھے لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ اس روز باری میری فلم مراجعت پر تھرہ کر رہا تھا۔

”تمہاری اس فلم میں تڑپ ہے اپنے اصل کی طرف واپس پلٹ جانے کی۔“

”ہاں شاید۔“
”شاید نہیں بیٹیا۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”مراجعہ میں ہی نہیں کی اور چیزیں بھی ہیں“ تمہاری ایسی جن میں مائے ہزارے سے بچنے کا دکھ ہے۔ واپس جانے کی تڑپ ہے، تم صرف نو سال کی تھیں اب لیکن تم میانے ہزارے کو نہیں بھولی ہو۔“
”میانے ہزارے“ صرف ایک گاؤں نہیں

محبت کی غلطی، جھٹکی کرک بھی شامل ہوگئی تھی۔ مستحق کے خواب تھے اور امیدوں کے جھگڑے۔
 "شادی کے بعد میں تمہیں میانے ہزارے لے چلوں گا۔"
 "کی۔۔۔۔۔" میرے اندر چہ انساں ہو گیا تھا۔
 "سب۔۔۔۔۔؟"

"تمہیں بہت جلدی ہے۔" وہ شرارت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔
 میں دل کی بات کسی سے نہیں کہتی تھی اندر ہی اندر دفن کر لیتی تھی لیکن اب باری سے ہر بات کہنے لگی تھی۔

"چند دنوں کے لیے کراچی جا رہا ہوں، وہاں آکر لے کر آئے ہیں کرک۔۔۔۔۔ ویسے امی سے بات ہوگئی ہے، انہیں اعتراض نہیں ہے۔"
 اور باری کراچی چلا گیا۔۔۔۔۔ باہر میرے ٹرانسفر کے آؤں گا۔۔۔۔۔ ایک قریبی قصبے میں ایک پرائمری اسکول کو مل سکول کا درجہ دیا گیا تھا اور مجھے وہاں بھیجا جا رہا تھا۔ اس اسکول کی ہیڈ بنا کر۔۔۔۔۔ میں نے باری کو فون کیا۔

"کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے کی ریز انٹی دے دو اور بچوں بھی میں بلا ضرورت خواہم کی جاہ کو پسند نہیں کرتا۔۔۔۔۔ ہاں اگر تم کرنا چاہو تو منع بھی نہیں کروں گا۔"

"فیک ہے۔" مجھے باری کی بات سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا مجھے استانی بی کو بتانا چاہیے کہ میں جاہ پھونڈنا چاہتی ہوں۔ اس روز میں بریک میں کھڑا گئی تھی۔ استانی بی کے پاس ان کی کوئی پرانی کو لیک آئی ہوئی تھیں۔

"ارے ہاں، تم نے پھر باری کے لیے لڑکی پسند کر لی۔ اگر نہیں کی تو ایک لڑکی ہے، میری نظر میں۔" میں نے اپنے کمرے کی طرف جاتے، جاتے سنا اور غیر ارادی طور پر اپنے کمرے کے

بے اختیار میرے ہاتھ تنہا لیے تھے۔
 "نہیں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت کرتا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔۔۔۔۔ ہر رات سونے سے پہلے میں اللہ سے دعا کرتا ہوں۔۔۔۔۔ اللہ مجھے سو را کو دے دے۔ اسے میرا رشتی بنا دے۔۔۔۔۔ میں، میں تمہیں چاہوں گا دیر۔۔۔۔۔ اتنا کہ تم میری بھتیجی سے اتنا جاؤ گی جتنک جاؤ گی۔"

"بھتیجیوں سے کبھی کوئی اتنا یا ہے باری؟"
 میری آواز میں لرزش تھی۔ میں نے آہستہ سے اپنے ہاتھ جھڑائے۔

"ہاں، بھتیجیوں سے کبھی کوئی نہیں اتنا یا دیر۔۔۔۔۔" ٹیلی ہار وہ اظہار کر رہا تھا اور میرے اندر کا خلا جیسے بھرا رہا تھا اور دل کی پیاسی زمین سراب ہو رہی تھی۔ وہ شاعر یا ادیب نہیں تھا لیکن اس کے پاس اظہار کے اسے خوب صورت لفظ ہوں گے۔
 مجھے یقین نہیں تھا۔

ایک بار اس نے اپنے جذباتوں کا اظہار کر رکھا تھا کہ اب تو آتے جاتے اس کی آنکھیں بند ہے لڑکی نہیں جب بھی وہ اور میں اکٹھے ہوتے، میری شاعری پر بات کرتے، کرتے وہ موضوع ہے ہٹ جاتا۔
 "دیر! تمہیں پتا ہے تم کتنی خوب صورت ہو۔۔۔۔۔ لیکن تمہارا من ایک دم فوراً کوئی ٹھہر میں دل میں نہیں کھتا، ہو لے، ہو لے سر چڑھ کر پوچھتا ہے۔ پہلے یہ قاتل آنکھیں کھل کرتی ہیں پھر یہ پگھل کے بھالے دل میں کھپ جاتے ہیں اور پھر یہ دلکش ہونٹ اپنی رحمت نیاں۔۔۔۔۔"

"بھتیجی تو ادیب یا شاعر ہونا چاہیے تھا باری۔" میں ہنسی۔

"میری بھتیجی شاعر ہوگی۔۔۔۔۔ کیا یہ کافی نہیں ہے۔" اس کی نظر میں ہر اطراف کرتیں۔ ان دنوں میں اتنی خوش تھی جتنی بھی نہیں تھی۔۔۔۔۔ اور ان دنوں میری شاعری میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ اب اس میں

”خفک ہے مہم، میں جانے کے لیے تیار ہوں۔“ مجھے اب اپنے گھر میں مزید احسانوں کا طوق نہیں ڈالنا تھا۔ مجھے ہاری سے شادی نہیں کرنا تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا لیکن یہاں رہ کر میں ہاری کی محبتوں سے دامن نہیں چھڑا سکتی تھی۔ اس کی محبت مجھے کمزور نہ کرتی اور میں ایک اور احسان کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانے کے لیے مجبور نہ ہوجاتی۔ میری گردن پہلے ہی احسانوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔

کچھ نہیں ہو سکتا تو اجاب چھوڑ دو کیا ضرورت ہے۔"

”آپ پریشان نہ ہوں، استانی جی میں اب بھی نہیں ہوں..... وہاں اسکول کے ساتھ ہی ہیٹ کی رہائش کے لیے کوارٹر بنا ہوا ہے۔“

”جیسا کہ پہلے بھی دیکھا تھا۔ میرا دل نہیں مانتا۔“ وہ ہنوز پریشان تھیں۔ ”خدا خواستہ کچھ ہو گیا تو میں تمہارے والدین کو کیا جواب دوں گی۔“

”میرے والدین؟“

”میرے والدین۔“

”کونسا؟“

”وہ آپ سے کچھ نہیں کہیں گے کیونکہ
 برسوں پہلے وہ مجھ سے دستبردار ہو گئے تھے۔“
 میری آنکھوں میں کلرک چمکنے لگے تھے۔ میں نے سوچا تھا
 میں ابھی بتائے چلی جاؤں لیکن وہ میرے سر پرست
 تھے..... مجھے ہر حال ابھینا تھا چاہے تھا۔
 باری کو پتا چلا تو وہ اسکول سے ہٹا کر بھاگ

دروازے کے پاس ہی رک گئی۔
 ”لو کی تو کمر میں ہی تھی، میں خواہ مخواہ
 دھڑکتی پھر رہی تھی۔“

استانی جی نہیں۔
 ”کون تمہاری بھانجی؟“

”اے فیصلہ اپنی سویرا سنا، اللہ انجی سکھو، سلیقہ مند، ذہین، پورا مگر سنجیدہ ہوا ہے اس نے..... پہلے کنی بار تو بن میں آیا تھا۔ ابصار نے تو جی چھا بھی تھا میں نے لیکن اس نے کہا وہ سویرا کو کنی لیکن سمجھتا ہے۔ ایک ساتھ ملی کر بڑے ہوئے ہیں تو میں نے سوچا باری بھی ابصار کی طرح۔ لیکن پھر باری نے خود مجھے کہا کہ وہ سویرا سے شادی کرنا چاہتا ہے تو.....“

استانی جی کی کو ایک بوجھ دی تھی۔
 "نہیں بھلا انھیں کیا اعتراض ہوتا تھا۔
 ہے واپس سے جو آئے گی وہ نہ جانے کبھی ہو۔
 اپنی دیکھی بھالی ہے۔ اور پھر لاکھوں میں ایک
 استانی جی نے جواب دیا تھا۔

”تم نے بھی ایک ہاتھ اٹھادیا تو کوڑھ لگی کہ یہ
 بنا دیا ہے۔ چلو جہاں اسنے احسان کیے ہیں اس
 وہاں بہو بنا کر آئیے۔ اور..... احسان کنی..... ورنہ
 پاری کے لیے بیڑے، بیڑے جاگھائوں“..... اور شیر
 باقی رات سنے بغیر اسے کرے شیر آگئی۔

”احسان.....“ میرے لبوں سے نکلا۔
میرے اندر چند لمحوں پہلے جو گھستان آباد ہوا تھا وہ
ایک دم اجڑ گیا تھا۔ جیسے آسمانی بجلی گر پڑی ہو یا اندر
دھول اڑ رہی تھی اور آنکھوں میں وحشت تھی، جتنی تو
دیر تک میں بونہی ساکت بیٹھی رہی۔

”میں نے مزید احسان نہیں.....“ بڑی دیر پہلے
میرے لبوں سے نکلا تھا اور میں جو پرامن ایک گھنٹہ
فراسکو کو کوئی کی خاطر ڈی ای او سے بحث کرے
آؤں..... نہیں ہون کر کے کہہ رہی تھی۔

چلا آیا۔

”یہ کیا حماقت ہے دیر!.....؟“

”حماقت..... نہیں تو.....“ میری آنکھوں کے

خالی پن نے باری کو چونکا دیا۔

”کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں.....“ میں نے نظریں چرائی تھیں۔

”میں جھک گئی ہوں.....“ میری جلتی ہوئی

آنکھوں میں جھپکن چکی۔

”عزیز احسانوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ ان

احسانوں کے بوجھ سے میری گردن جھک کر ٹھوڑی

سے آگئی ہے، اب نوٹ جانے گی۔ میں نے استانی

جی کا گھر چھوڑ دیا ہے۔ مجھ پر ان کے احسانوں کا

بوجھ ہے۔ میری گردن اس بوجھ سے ہمیشہ جھکی رہے

گی..... لیکن مجھ پر ان کی محبت کا بوجھ نہیں ہے۔

احسانوں کا بدلہ اتارا جاسکتا ہے تاں باری لیکن محبت

کا نہیں..... اور میرا رونا، روناں ان کا احسان مند

ہے..... میں ساری زندگی ان کی خدمت کر کے بھی

ان احسانوں کا بدلہ نہیں چکا سکتی کہ انہوں نے مجھ

بے مایہ، حقیر کو میانے ہزارے کے کپے پہنے ہوئے

اٹھا کر کیا سے کیا یاد دیا..... میں جو کچھ ہوں ان کی ہجرت

سے ہوں..... لیکن مجھے اپنے دل پر احتیاد نہیں

ہے..... میں وہاں رہ کر اپنے دل کو..... لوٹ نہیں

سکوں گی..... تم نے مجھے کیوں چاہا..... باری.....

کیوں محبت کی؟“

وہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا..... بڑی دیر بعد

اس نے سر اٹھایا..... ”میں تم سے محبت کرتا ہوں

سویرا..... اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ”اور

تم..... کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں.....؟“ میں

نے سر جھکا لیا۔

”میں ہوش سنبھالنے کے بعد سے محبت ہی کے

لئے تڑپ رہی ہوں۔ اہاں دہا کی محبت کے لیے.....

استانی کی اور اگل کی محبت کے لیے..... اور پھر اللہ نے

میں مانگے ہی میری جھولی میں محبت ڈال دی۔ ایسی

محبت جس کی میں نے طلب نہیں کی تھی..... اور اس

محبت نے میرے اندر رنگ نکھیر دیے، روشنیاں

پھیلادیں لیکن..... میں نے ایک گہری سانس لے کر

جھکا ہوا سر اٹھایا۔ وہ بے چینی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”بولو ناں..... بولتی کیوں نہیں ہو..... کیا تمہیں

مجھ سے محبت نہیں ہے۔“

مجھے اس سے محبت تھی..... ہے..... اور ہمیشہ

رہے گی لیکن میرے اندر جو ایک پہاڑ سا اٹھ آیا

تھا..... انا کا پہاڑ باہر..... پتا نہیں کیا..... اس نے

میرے لب ہی پر لے رکھے۔ میں محبت کو محبت کی طرح

قبول کرنے چاہتی تھی احسان کی طرح نہیں۔

”آپ مجھ سے محبت کر دیر..... میں جانتا

ہوں تم میرے بھروسے نہیں ہو سکتی۔“

”کتنے سارے سال بھی تو محبت کے بغیر

گزر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم رو لو گی لیکن میں نہیں.....“ وہ

روا بنا ہوا رہا۔

”سنو ہم دونوں کہیں الگ رہ لیں گے جہاں

تمہیں یہ نہ لگے کہ تمہیں جاہت سے اس گھر میں

نہیں لایا جا رہا بلکہ احسان کر کے۔“

”تم مجھے ایسا سمجھتے ہو باری؟“ مجھے آنسوؤں ہوا

تھا۔ ”استانی جی کے احسانوں کا بدلہ میں ان کا چٹا

چھین کر دوں۔“

اور وہ چاہ گیا..... مجھے پتا تھا کہ وہ پھر آئے گا۔ وہ

روز بعد وہ پھر آ گیا..... اور وہ آتا رہتا حتیٰ کہ میں ہار

جاتی..... میں اس کے سامنے کروڑ چڑنے لگی تھی۔

”اچھا ایسا کرو میانے ہزارے چلی جاؤ.....

میں وہاں سے تمہیں پوری جاہت کے ساتھ ہوا کر لے

آتا ہوں۔“ اس روز جب وہ آیا تھا تو اس نے کہا تھا۔

لیکن میں کیوں جاتی میانے ہزارے وہاں کسی

کو میری چاہ نہیں تھی..... اہاں نے خود مجھے دے دیا

کبھی کہیں کسی کو اعز و یوں نہیں دیا، کبھی کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔۔۔۔۔ جہاں کہیں میں جاتی وہاں میں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ میں ہی سویرا اقبال ہوں۔۔۔۔۔ جس کا نام ادب میں مسٹر رکھا جاتا ہے۔۔۔۔۔ کئی بار میرے سامنے چند کریمیری کو لپک، میری شاعری کی تعریف کرتی رہیں لیکن میں لب بے ہنسی رہی۔۔۔۔۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی مجھے جانے اور مجھے کھوجنا ہوا یہاں تک پہنچے۔۔۔۔۔ میں اعز و یوں نہیں دیتی تھی کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو میرے دیراباؤنس کا پتا چلے اس لیے نہیں کہ میرے حوالے میرے لیے شرمناک تھے۔۔۔۔۔ بلکہ اس لیے کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو پتا چلے کہ میں کسی کو مطلوب نہیں تھی اور اتنے سالوں بعد نہ جانے کہاں غلطی ہوئی تھی مجھ سے کہ سراج الحق اور عرفان منیر کھوجتے ہوئے آگئے تھے۔۔۔۔۔ میں نے سوچا اور۔۔۔۔۔

"اوہ۔۔۔۔۔ میرے خدا!!" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر قمام لیا۔

☆☆☆

یہ آج سے چاروں پہلے کی بات تھی۔ آفس میں وہ کون تھی۔۔۔۔۔ مجھے نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ کوئی اسکول ٹیچر تھی کسی کام کے سلسلے میں آئی تھی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"ارے آپ سویرا ہوں۔۔۔۔۔ ہم نے سیالکوٹ میں ایک ہی اسکول میں پڑھا ہے۔۔۔۔۔ آپ نے ان دنوں کھانا شروع کیا تھا۔۔۔۔۔ میں دسویں جماعت میں تھی اور آپ نویں میں۔۔۔۔۔ مس ربانی ہماری کلاس میں اتنی تو بہت تعریف کرتی تھیں آپ کی۔۔۔۔۔ اب جہاں کہیں بھی آپ کی کوئی تحریر چھپتی ہے، میں ضرور پڑھتی ہوں، میں سب کو بتاتی ہوں یہ اتنی مشہور شاعرہ میری اسکول ٹیچر ہے۔"

وہ بلیئر رکے بول رہی تھی اور اسے یقین سے بات کر رہی تھی کہ میرے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں

تھا اور پھر کبھی پلٹ کر پوچھا تک نہیں کہ میں زندہ بھی ہوں یا نہیں۔۔۔۔۔ جب سے میں نے جاب کی تھی کئی بار سوچا تھا کہ کسی روز دین پر بیٹھوں اور چپکے سے میانے ہزارے میں دین گھر زمیندار کے گھر کا دروازہ کھول کر اس بڑے سے کچے گھر میں کھینچ جاؤں اور جہاں چار پانی پر بیٹھے تھے چنے لہا مجھے دیکھ کر حقد چنا بھول جائیں اور چولہے کے پاس بیٹھی کھیتی لکڑیوں کو پھونکیں مارتی اماں کی آنکھوں میں حیرت اتر آئے اور میری بیٹنیں اور بھائی قطار بنا کر حیرت سے مجھے دیکھیں۔۔۔۔۔ لیکن میں بھلا کیوں جاتی۔۔۔۔۔ انہیں کب میری طلب یا چاہت تھی اور میرے اندر جو اتنا کا پھانز ایک روز آپوں آپ کھڑا ہو گیا تھا وہ ہر روز پہلے سے بڑا ہوتا جاتا تھا۔ ہر روز میں سونے سے پہلے میانے ہزارے جانے کا ارادہ کرتی اور ہر روز صبح اٹھتے پر میری اتنا مجھے بکوکے مارتی اور میں خود سے کہتی۔ نہیں مجھے نہیں جانا۔ سو میں نے سوچا وہ آتا رہتا تو ایک روز میں اس کی محبت کے سامنے کمزور پڑ جاتی یا اپنی محبت کے سامنے سو میں نے دو ماہ کی چھٹی لی اور مس ربانی مجھے پاس لا اور چلی آئی۔ مس ربانی جو پڑھا تو صحت کے بعد لا اور سیٹل ہو گئی تھیں پھر میری محبت میں، میری استاد تھیں۔۔۔۔۔ اور جنہوں نے ابھی تک میری انگی پکڑی ہوئی تھی پھر ان کی ہی خوشش سے میں نے کسی اور جگہ ٹرانسفر کروا لیا۔ مس ربانی نے مجھے بھجایا۔

"محبت سے مدد سوز کر دکھ پاؤ گی۔ وہ لوگ جنہیں تم چھوڑ آئی ہو، انہوں نے ہی تمہیں اس مقام تک پہنچایا ہے۔۔۔۔۔ صرف ترس و ہمدردی میں کوئی ویسا نہیں کرتا سویرا۔۔۔۔۔ کچھ لگاؤ تو ہو گا ناں انہیں۔" مجھے سمجھانے کے باوجود میرے گل کو غلط سمجھنے کے باوجود انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ میرے میگزین، میری ڈاک، میری رہائشی سب انہی کے ایڈریس پر آتی تھی اور پھر وہ مجھے اکٹھی بھجوا دیتیں۔ میں نے

تھا..... میں اس سے یہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی کہ نہیں
میں وہ سویرا اقبال نہیں ہوں..... وہ مجھے ہائے نہیں
بھی پہنچاتی تھی اور..... اس نے میری کتابوں کے
سطحے میں ہونے والی ایک دو تقریبات میں بھی
شرکت کی تھی۔

”میں تو صرف آپ کی خاطر وہاں گئی تھی لیکن
پھر وہاں پتا چلا کہ آپ نہیں آئیں اسکی تقریبات
میں۔ مگر ہائی تیار ہی تھیں کہ آپ کے والدین پسند
نہیں کرتے۔ دراصل میرے شہر صوفائی ہیں تو
ہمیں اسکی تقریبات کے کا رڈ مل جاتے ہیں۔“
”تو یہ بات ان محترمہ سے ہی ایک آؤٹ ہوئی
تھی۔ اوہ مائی گاڈ.....“

مجھے یاد آیا جب آفس آئی تھی تو کسی نے بتایا تھا
کہ سسر عرفان آئی ہیں، تو..... وہ سسر عرفان.....

”میں یہ سنی آپ کا فون ہے۔“

مائی خیراں نے دروازے سے جھانکا تو میں
چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آفس سے آیا ہے جی سجاد صاحب کا.....“

سجاد سے بات کر کے میں مائی خیراں کو ایک
کپ چائے بنانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آکر
جسم و جان میں اتنی تکلیف لگائی تھی جیسے دنوں کے کانٹے
کھل گئے ہوں۔ کسی ملی جین نہیں..... وہ بہت.....

بچکل تھا میں نے اچھا کیا تھا یا برا..... میں آج یہ فیصلہ
نہیں کر پاری تھی۔ اندر دیر تک پیاس کا مہرہ آگ آیا
تھا۔ اس پیاسی زمین پر باری کی محبت کے جو چند
قطرے پڑے تھے۔ ان کی خشک ہمیشہ ہی رگ و
پے میں سکون لاتا رہتی تھی لیکن آج..... میں نے
اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو رگزا..... یہ میں نے کیا کیا
تھا میں باری کی محبت سے بھی بھاگ آئی تھی۔ باری
جو کہتا تھا کہ وہ مجھ سے اتنی محبت کرے گا کہ برسوں کی
پیاس بجھ جائے گی لیکن میں نے اس کی محبت کا مان
بھی توڑ دیا تھا یہ اور استانی جی..... کتنا خیال رکھا

انہوں نے میرا..... انصار بھائی اور انصار بھائی بھی
کبھی خالی ہاتھ نہیں آئے ہمیشہ کچھ نہ کچھ میرے لیے
لاتے پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ جیسے انہوں
نے مجھ سے محبت نہیں کی۔

”اور کیا میں احسان فراموش ہوں.....؟“

میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور خیراں کی لائی گرم
جائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا۔

”نہیں.....“ میں نے ایک بار پھر خود کو یاد

کرایا..... میں احسان فراموش نہیں ہوں، بس میں محبت

کو محبت کی طرح دل میں زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ اسے

احسان نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے تو میں نے باری

سے اپنی کئی کئی کہ بھوسے میری محبت مت چھین لیکن

وہ میری بات سمجھتی نہیں، پھر اقبال اور میں نے محبت کو

احسان میں ڈھونڈنے سے بچا لیا تھا لیکن پھر بھی میرا دل

کیوں خالی، خالی رہا ہے حالانکہ یہ باری کی محبت

سے لیا ہے مجھ پر ہے۔ پھر بھی..... پھر بھی..... کیا

میرے اندر نہیں بچھتاوے کی فصل آگ چلی ہے۔“

میری آنکھیں پلٹے لیکن اور میں اپنی سوچوں سے گھبرا

کر رہی تھی خیراں کے پاس چلی آئی اور کوکنک میں

اس کی سیپ کرنے لگی لیکن دھیان تھا کہ بار بار پھر

باطنی کی طرف چلا جاتا..... پورا دن میں بے گل اور

بے چین رہی اور رات میں مجھے سکون کی کوئی لہجی

پڑی۔ کبھی کبھی مجھے گونجی فینڈ کی گولیوں کا سہارا لینا

پڑتا تھا۔ جب باری یاد آتا، جب اپنی بے قدری کا

خیال آتا اور جب بھائی ستانی تو فینڈ کی ایک چھوٹی سی

گولی میری بے چینیوں کو دور کرتی تھی۔ اگلی صبح

میں اگلی تو کسی حد تک فریش تھی۔ ناشتے کی ٹیبل پر

میں نے عادت کے مطابق اخبار کھولا، ڈوٹی اخبار

کے ساتھ ایک مقامی اخبار بھی تھا۔ چار سکوں پر

مشتمل اس اخبار کے پہلے صفحے پر ہی ایک خبر نے

مجھے چونکا دیا۔

”ہمارے شہر میں مشہور شاعرہ سویرا اقبال کی

دیر بعد سزا افضل جو ہائی اسکول نمبر ۱ کی ہیڈ ماسٹریس
تھیں۔۔۔ آئیں۔۔۔ انہیں رخصت کر کے میں جو نجی
مڑی ایک دم دروازہ کھول کر کسی نے کہا۔
”سے آئی کم ان بیم“

یہ آواز۔۔۔ میں ایک جھٹکے سے مڑی اور پھر
وہیں ساکت کھڑی ہو گئی۔ میرے دہم دنگان میں
بھی نہیں تھا کہ وہ باری ہوگا۔

”باری تم۔۔۔؟“ یہ مشکل میرے لبوں سے
اٹھا تھا۔

”جہیں توقع تو نہیں ہوئی کہ میں بھی جہیں
وہیں جا ہوا تم تک آج پہنچوں گا۔“

”باری آؤ شہر۔۔۔“ میں نے تھوک نچتے ہوئے
سے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میز کا چکر کاٹ کر میز
کے چپے پہن کر پری پری ہو گئی۔ لیکن وہ اسی طرح کھڑا
رہا۔ میں نے نظریں اٹھائیں وہ بھی اسی دیکھ رہا تھا
مجھے لگا جیسے میرا دل ابھی بیٹنے کی چار دیواری تو ذکر

آہ۔۔۔“ عرفان میرے ذی ای او کی حیثیت سے
میری تقرری کی خبر چھاپی تھی اور میری شاعری اور
دوسری تحریروں کے اور ادب میں میرے مقام کے
حوالے سے چھوٹا سا نوٹ لکھا تھا۔

مجھے از حد کوفت ہوئی لیکن ظاہر ہے اب میں
کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ بہتر تھا کہ میں یہاں سے جلد از
جلد جاؤں کہ روانے کی کوشش کروں۔ میں نے سرسری
سی نظر اخبار پر ڈال کر اخبار پے پروائی سے ایک
طرف دیکھ دیا مجھے یہ اطمینان تھا کہ یہ ایک مقامی
اخبار ہے اور اس شہر میں بھلا کتنے لوگ ہوں گے
جنہیں ادب سے کوئی تعلق ہوگا اور جو سوہنہ اقبال کو
جانتے ہوں گے۔۔۔ باری، استانی جی سب
سیا لکھتے ہیں تھے اور بھلا یہ اخبار کہاں سیا لکھتے جاتا
ہوگا۔۔۔ میں نے پُر سکون ہو کر ناشتا کیا اور آفس
آگئی۔۔۔ میرا دروازہ تھا کہ میں آج شہر کے اسکولوں کا
وزٹ کروں گی لیکن میرے آفس جانے کے کچھ ہی



گلیپیسی

ہر قسم کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

Rs. 250/-

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

گلیپیسی

یونانی کریم

042-7666264

Cell: 0333-6263553, Website: www.devapk.com

باہر آ کرے گا۔

”بیٹھ جاؤ پلےز.....“ میں نے اپنے شک
ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

وہ ہولے ہولے چلا ہوا میری ٹیکل کے
سامنے آیا اور دونوں ہاتھ ٹیکل پر نکالتے ہوئے میری
طرف دیکھا۔

”سب..... سب کیسے ہیں..... استانی جی،
اگل، انصار بھائی؟“

”جسمیں کیا سویرا اقبال..... تم تو سب کو چھوڑ
آئی تھیں۔ سو جسمیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون
کیسا ہے؟ اس کی آواز دھیمی لیکن مضبوط تھی۔

”اگر ان میں سے کسی کو کچھ ہو جائے تو کیا مجھے
کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیا واقعی.....؟“ میں نے اپنے
آپ سے پوچھا اور میرا دل زور سے کانپا..... ”اللہ نہ
کرے کسی کو کچھ ہو.....“ میں نے زبردست کہا۔

”تم خود کو کیا سمجھتی ہو سویرا اقبال.....؟“ ناراضی
اس کی خوب صورت آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔

”میں بھی سوچا کہ جن لوگوں کو تم بلا حضور چھوڑ آئی ہو، وہ
تمہارے لیے کتنا ترستے ہوں گے، کیسے گزارتے ہوں
گے ان کے شب و روز، کیسے تم کے ساتھ گھر میں
خودا کی بکھر دیں۔“ بھی سوچا تم..... ”سب کی یاد
نہیں کیا ہوگا انہوں نے..... لیکن تم.....“

”میں.....؟“ میں نے نظریں نہیں اٹھائیں
لیکن میں جانتی تھی کہ اس کے ہونٹوں پر طرہ
مسکراہٹ ہوگی۔

اور کیا میں نے یاد نہیں کیا انہیں صبح شام.....
دن و رات جب کوئی عید، تہوار آتا تو مجھے یاد آتا تھا
کہ کیسے انصار بھائی اور انصار بھائی مجھے چوڑیاں
پہنانے لے جاتے تھے، کیسے استانی جی میرے
کپڑے تیار کرواتی تھیں، سویدار اگل، انصار
بھائی، مکی سے مشورہ کیا جاتا تھا..... میرے آنسو
میرے اندر گرتے تھے اور میں نے ان بیٹے سالوں

میں کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہیں۔

”یوں تو تم بڑی حساس بنتی ہو۔“ اس نے میر
پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا اور حضور اس آواز کے جھکا۔

”لیکن تم نے شاید ہی کبھی سوچا ہو کہ وہ لوگ
تمہارے لیے کتنا ترستے ہوں گے، کتنا یاد کرتے
ہوں گے تمہیں۔ ان کی راتوں کا آغا اور دن کا

اختتام تمہاری باتوں پر ہوتا ہے، سویرا اقبال..... امی
ہر صبح تمہارے کمرے کی صفائی کرواتی ہیں، تمہاری
کتابیں اور تمہاری چیزیں یوں بھڑا پونچھ کر رکھتی
ہیں جیسے بس تم آئے ہی والی ہو..... ابو بے وصیائی
میں دن میں کئی بار تمہیں پکار بیٹھتے ہیں..... امی، ابو کا
خیال ہے کہ ان کی محبت تمہیں واپس لے آئے گی
لیکن.....“ وہ غور سے انداز میں بٹھا۔

”ابو کونسا بچہ کتنے کمرے نے ان کی محبت کو محبت
کے سبب جانا..... تمہارے خیال میں تو وہ ترس اور ہمدردی
کتنی زبردست کمانے کی خواہش تھی، وہ روتی ہیں،
میں سچ کرتا ہوں تو وہ کہتی ہیں، مگر میں مر رہی بھی رکھو تو
اس سے محبت ہو جاتی ہے، جسمیں تو وہ جینی بنا کر لائی
تھیں اور جینی کی طرح ہی چاہا..... لیکن انہیں کیا
پتا.....؟“ اس کا بوجھ بڑھ چکا تھا۔

”ان کی انکلیج کل جینی کو محبت اور ترس کا فرق
ہی نہیں پتا..... معاف کرنا سویرا اقبال، تم ساری
زندگی محبت کی طالب رہیں لیکن محبت کو بچکان
نہیں پائیں، جسمیں بتا ہی نہیں کہ محبت کیا ہوتی ہے،
تمہارے پاس وہ نظری نہیں ہے، تمہارے سارے
لفظ اور جذبے ٹھوکتے ہیں۔“

”لیکن.....“ میں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔
”ہاں..... تم تو یہ بھی نہیں جان پائیں کہ میں
تمہارے بغیر..... اور تم نے میری محبت پر بھی اعتبار
نہیں کیا۔“ اس کی آواز آہستہ ہو گئی اور آنکھیں جیسے
کسی اندرونی تپش سے سلگنے لگیں۔

”تم ساری عمر خود ترسی میں جلا رہیں اور اپنے

اسنے برسوں کے بعد ملے ہو تو یوں تھا ہو کر مت جاؤ
چلیز کچھ دیر تو بیٹھو..... سنو، میں بھی بہت تڑپا ہوں،
بہت روئی ہوں اور چلیز میرا یقین کرو باری، تمہاری
محبت..... ایک تمہاری ہی محبت پر تو اعتبار تھا مجھے.....
اور اسے ہی تو زندہ رکھنا چاہتی تھی بیٹھ..... اس
نے بے حد شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”اسے زندہ رکھنا چاہتی تھیں؟ میری محبت کو
اور مجھے ہی مار دیا۔“
”نہیں.....“

میری آنکھیں پھر سمندر بن گئیں۔
”تم بہت احمق ہو دیر۔“ اس کے سنے ہوئے
نقشہ دیکھتے ہوئے تھے۔ لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو
بارشیں جاری تھیں۔

چلیز باری کچھ دیر تو بیٹھ جاؤ، مجھے بتاؤ
اب اس کے متعلق کیا ہے متعلق..... اسٹائی ٹی اور انفل
کے متعلق..... اچھا چلو یہ ساتھ ہی میرا گھر ہے وہاں چل
کر آرام سے بات کرتے ہیں۔“ میں نے بھی
نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے سر ہلادیا۔ میں
نے جلدی سے میز پر ڈالا پانچ بیگ اٹھایا تو اس نے
بنوڑ دیکھا اور دواش روم کی طرف اشارہ کیا۔
”جاؤ مندھو کر آؤ۔“

”ہاں۔“ اب میں ان روئی آنکھوں اور ہچکے
چہرے کے ساتھ باہر جاتی تو دیکھنے والے جانے کیا؟
کیا گمان کرتے..... میں فوراً دواش روم کی طرف
چلی گئی اور جب اچھی طرح چہرہ دھو کر اور تازہ لپ
اسٹک لگا کر باہر آئی تو وہ بے حد سنجیدہ سا بیٹھا تھا
میرے آتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا..... اور کچھ دیر
بعد وہ میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔
”اسکے رہتے ڈر نہیں لگتا تمہیں.....؟ تم تو
بہت ڈر پک ہوئی تھیں۔“

اسے شاید بہت پہلے کی بات یاد آئی تھی۔
”پہلے ہاسٹل میں رہتی تھی مگر جب اس سیٹ پر

ارد گرد موجود چھتوں کو پہچان ہی نہیں پائیں۔ میں کیا تھا
مہانے ہزارے..... میں نے دیکھی تمہاری اماں اور
تمہارے اماں کی تڑپ..... تمہیں ایک نظر دیکھنے کو ترپتے
ہیں وہ..... میں نے بتایا انہیں کہ تم کیا سمجھتی ہو کہ.....
تمہاری اماں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔“
”میرا اندر خالی ہو گیا ہے چنا..... ایک بار پانی
کو لے آؤ اسے پینے سے لگا لوں تو۔“

”بس کرو باری.....“ میرے لبوں سے یہ
مشکل نکلا تھا۔ آنسوؤں نے میرے حلق میں گولا سا
بنادیا تھا۔

”کب سے ڈھونڈتا ہر دہاں تمہیں، کتنی بار
میں ربانی کے دروازے تک بھی پہنچا..... لیکن تمہارا
پتا نہیں چل سکا..... آج آفس میں اگر اخبار پر نظر نہ
پڑتی تو..... مجھے ایک سال ہو گیا ہے اس شہر میں آئے
لیکن میں نے بھی مقامی اخبار نہیں پڑھا۔
خیر.....“ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”پالنے والے ماں، باپ سے نہ ہی کتنی غم
دینے والی ماں سے ایک بار ضرور ملنے چلی جانا سوچو
اقبال، جس کی نظری ہر دم دروازے کی طرف ہی تھی
رہتی ہیں۔“ وہ جانے کے لیے نڑا۔

”باری.....“ میرے حلق سے سچ کی طرح
نکلا تھا اور پھر میرے اندر سے سمندر اٹل پڑے،
برسوں سے جمجھکھٹیر پھسل رہے تھے، میں پتا نہیں
کیسے اٹھی تھی، کیسے میز کے چپے سے نکل کر باری تک
آئی تھی اور اس کا بازو تھامے چک رہی تھی اور وہ
ساکت کھڑا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی میں اس کا
بازو تھامے بیٹھتی رہی پھر اس کے ساکت وجود میں
گنجائش ہوئی اس نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ کر
ہولے سے سہلایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”مت رو دیر مجھے تکلیف ہوتی ہے۔“ اس نے
آہستہ سے اپنا بازو چھڑایا اور جانے کے لیے چلا۔
”نہیں..... نہیں باری اس طرح مت جاؤ،

”ہاں دیرا تم۔۔۔ تمہارے اندر جو یہ ادیب و شاعر چھپا بیٹھا تھا ناں۔۔۔ اس نے تمہیں حساس بنادیا تھا ورنہ ہر گھر کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں، اکثر والدین اس طرح اپنی اولاد سے اپنی کمزوریاں اظہار نہیں کرتے۔۔۔ لفظوں میں پیار کر کے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انہیں اولاد سے محبت نہیں ہے، تمہارے ابا صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کر کے گھر آتے تو اسے کھجے ہوئے ہوتے ہوں گے کہ بچوں سے لڑا کرنے، پیار کرنے کے لیے ان کے پاس نہ وقت ہوتا ہوگا، نہ ہمت اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ۔۔۔ وہ تم سے محبت نہیں کرتے تھے اور اسی تمہارے ہاتھ کے جھوٹے اکثر کبھی تمہیں پیدا کرنے سے ناپسندیدہ ہونے کی محبت ہوتی ہے اور یہ پالنے کی محبت بھی تو قائم ہوتی ہے۔“

”لیکن کبھی باری، محبت کو اظہار کی ضرورت تو ہوتی ہے، ہمیشہ نہ کسی بھی، کبھی تو۔۔۔“ میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ”اگر تم مجھ سے محبت کا اظہار نہ کرتے تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔“

”خیر مجھے تو پتا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔“ اس نے بے پروائی سے کہا تو میں مجھوب سی ہو گئی۔ ”تم نے سب کا بتایا باری اپنے بیوی بچوں کا نہیں بتایا، کیا یہاں ساتھ ہی رہتے ہیں یا استانی جی کے پاس۔۔۔؟“

”اول تو یہ کہ تم نے پوچھا ہی نہیں اور دوم یہ کہ بیوی ہی نہیں ہے تو بچے کہاں سے آئیں گے۔“

”تو۔۔۔ تو کیا تم نے شادی نہیں کی ابھی تک۔۔۔؟“ وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور مجھے لگا جیسے میرے دل کی جلیقی زین پر کھین سے خشکی پھوڑ پڑنے لگی ہو یا بھی بکھوڑ پہلے بھٹک رہا تھا جیسے پیاس سے میرے حلق میں کانٹے آگئے ہوں لیکن اب یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے خشکے

آئی تو۔۔۔ میں اسے مختصر لفظوں میں بیٹے سالوں کی ساری دردناک ساری غمی۔۔۔ اس نے بھی مجھے بتایا کہ وہ کتنی بار میاں بزارا گیا اور یہ کہ اماں چاہتی تھیں کہ میں بڑھ جاؤں، میرا شوق و کچھ کر ہی انہوں نے دل پر پتھر رکھا تھا وہ مجھے سنے اس لیے نہیں آئی تھیں کہ لیکن ان کا دل بے ایمان نہ ہو جائے اور وہ مجبور ہو کر مجھے استانی جی کے گھر سے لے جائیں۔

”میں نے ہر وہ بات ان سے کہہ دی دیرا جو تم نہیں کہہ سکتی تھیں۔“ اب اس کی آنکھوں میں نرمی تھی۔۔۔ اور وہی محبت بھری حدت جو ہمیشہ ہوتی تھی۔

”تمہارے ابا حیران ہو کر میری باتیں سنتے تھے کہ اتنی چھوٹی عمر میں تم اس طرح سوچتی تھیں۔ انہیں اگر تمہارے خیالات کا علم ہو جاتا تو وہ ضرور تمہیں گود میں بٹھا کر اپنے ہاتھ سے نوا لے بنا کر کھاتے، انہوں نے کہا انہوں نے کبھی بچوں کی پیداوار نہیں کی یا ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ اللہ نے چاہا تھا تو وہ ہر گز ناں شکر ادا کرنے کے لیے۔۔۔ اور وہ سنتے بھی تھے وہ تم سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں، لیکن تم ان سے دور ہو۔“

میری آنکھوں سے ہلکے پھلکے آنسو بہنے لگے۔ ”اور اسی کتنی ہیں کہ انہوں نے تمہیں بھی اس لیے ای کہنے کے لیے نہیں کہا کہ لیکن تمہیں اچھا نہ لگے کیونکہ تم چھ سال کی تھیں تب اور تمہیں پتا تھا کہ تمہاری اماں اور ابا کون ہیں اور استانی جی تمہاری اسی نہیں ہیں حالانکہ ان کا کتنا دل چاہتا تھا کہ تم انہیں بھی ای کہو۔۔۔“

”باری میں بہت بے وقوف ہوں۔“

”ہاں۔۔۔ اس کے لبوں پر نہ غم سی مسکراہٹ کو میں نے مسودا ہوتے نہیں دیکھا لیکن مجھے لگا جیسے وہ مسکرا رہا ہو۔ لیکن جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ عجیب و غریب لپے بیٹھا تھا۔

کچے بڑے سے دھڑکنے میں رہنے والی تمہاری اماں کو تمہاری طلب نہ ہو سکتی یہ بھی مت سوچنا کہ انہیں تم سے محبت نہیں تھی..... یہ محبت تو خود بخود ماں اور اولاد کے درمیان وجود پاتی ہے، بڑھتی ہے اور نکاح و درخت بن جاتی ہے۔ ”وہ ہولے، ہولے دھکے لگے میں ایک بار پھر کھڑا ہوا اور مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے میرے ارد گرد پھول برس رہے ہوں۔ جیسے پتے صحراؤں سے میں کا ایک ہرے بھرے گھٹانوں میں آگئی ہوں، میرے پاؤں تلے نرم ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس ہو اور میرے چاروں طرف ٹھنڈی خوشبو اور خوشبو بھرتی ہوں۔ اس درود میں باری کے ساتھ ساتھ کھٹائی میں آئی اور استانی بی کے گنگے لگ کر بے پروا ہو کر سو رہا تھا۔ میں نے ان سے معافی مانگی تھی۔ اور پہلی بار انہیں ای کہہ کر بلایا تھا۔ استانی کی مجال ہو رہی تھی اور صوبیدہ اراکھل خاموش ہو کر ہمیں دیکھتے تھے۔ اور پھر اگلے دن میں باری کے ساتھ میانے بزارے آئی تھی۔ نو سال کی عمر میں میانے بزارے سے گھر کر آج پھر وہاں تھی۔ اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے کھڑے میری بہت جواب دے گئی تھی لیکن باری نے مجھے سہارا دیا اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں اندر قدم رکھنے کا حوصلہ نہ کر پاتی لیکن وہ تھا میرے ساتھ اور میں نے اس کے ساتھ جیسے بچکروں سالوں کے بعد اس بڑے سے کچے گھن میں قدم رکھا تھا جہاں میں نے کبھی ہی بار بار کے ساتھ داخلگی و باقی تھی اور پھر پتھر کا گرہ پڑتی تھی۔ اندر وہی مظلوم جو میری آنکھوں کی چلیوں میں ٹھہر سا گیا تھا۔ ابا سلیب اور سیاہ ذبیوں والا ٹیکس اوڈر سے نیم دراز تھے اور پاس ہی حقہ چڑا تھا اور ان کی چار پائی کی پانچھی ہی تو جمال ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ ہاں وہ جمال ہی تو تھا جسے میں نے صرف چند دن کا دیکھا تھا۔ اور اماں چو لھے سے جلتے انگارے نکال کر ایک چترے پر

بٹھے پانی کا گلاس میرے لمبوں سے لگا دیا ہو۔
 ”ہاں اگر ہو سکے تو ایک بار اپنی انا کو بھول کر میانے بزارے کا پتھر ضرور لگا لینا۔“ چترے پر گہری سنجیدگی لیے وہ حزا تو میں نے بے اختیار کھڑے ہوتے ہوئے اسے بلایا۔
 ”لیکن باری تم نے تو کہا تھا کہ تم مجھے اپنے ساتھ میانے بزارے لے کر جاؤ گے تو کیا بھول گئے؟“
 ”نہیں، میں تو نہیں بھولا لیکن شاید تم بھول گئی تھیں۔“ وہ یک دم واپس مڑ کر میرے مقابل کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے حاشا چمک تھی اور ہونٹوں پر مدھی مسکراہٹ۔
 ”میں نے کچھ اور بھی کہا تھا دیر..... لیکن جنہیں یاد نہیں۔“
 ”مجھے یاد ہے۔“ میری ٹھہریں جھک گئیں اور پلکیں لرزنے لگیں یوں جیسے میں کوئی نیند بگڑاؤ کی گئی۔
 ”تو جنہیں یہ تو نہیں لگے گا کہ میں تم سے شادی تم پر احسان کرنے کے لیے کر رہا ہوں؟“
 میری لرزتی چکوں پر موتی آنکھ گھبرا پتا نہیں آج کہاں سے اتنا پانی چترے کے اندر سا گیا تھا۔
 ”محبت احسان نہیں ہوتی دیر..... اس نے اپنی آنکھوں کی پردوں سے میری چکوں کے موتی چن لیے۔
 ”اور محبت کو بھی احسان مت سمجھنا۔“ اس نے صحیحہ کی۔
 ”اور یاد رکھنا..... میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اتنی کہ ان سارے بچے سالوں میں اللہ سے میں نے اس ایک دعا کے سوا اور کوئی دعا نہیں مانگی کہ تم مجھے مل جاؤ۔ اور میری محبت کا یقین کر لو۔“
 ”تمہاری محبت کا یقین مجھے ہمیشہ رہا باری، میں کبھی بے یقین نہیں ہوتی۔“ مجھے لگا میرے ہاتھوں کے ساتھ میری آواز بھی کانپ رہی تھی۔
 ”اور کبھی بے یقین مت ہونا دیر۔“ اس نے میرے لرزتے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔
 ”دیکھو دیر! ہو سکتا ہے میانے بزارے کے اس

ڈالے ابا کے حقے کے لیے لاری تھیں۔

”اماں.....!“ میں باری کا ہاتھ چھڑا کر ان کی طرف بھاگی..... پتراء اماں کے ہاتھ سے پھوٹ کر گر گیا..... وہ تھیری طرح میری طرف آئی تھیں..... دوسرے ہی لمحے ہم ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں۔

”ہالی..... ہالی یہ تو ہے ہاں..... میری بچی.....“ وہ ہار، ہار میرا منہ چومیں، دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ لے کر مجھے دیکھیں..... آج ان کی آنکھوں میں بھی مسند سا گھٹے تھے۔ ابا ہار، ہار مجھ سے کہنے سے آنکھیں پونچھتے تھے اور جہاں جہاں سا مجھے دیکھتا تھا۔ اماں کے بازوؤں سے نکل کر میں ابا سے لپٹ گئی۔

”ابا..... ابا.....“ میری نگلی بندھ گئی۔

”چپ کر نہ رو جھلی نہ ہو تو.....“ ابا ہو لے، ہو لے میرے سر پر ہاتھ بھرے اور کہتے تھے۔

شام تک میری چاروں بھینس بھی اپنے اپنے بچوں کے ساتھ آگئی تھیں۔ اور آنکھوں میں خوشگوار حیرت لیے ہوئے مجھے بھرے میں لیے بھینس تھیں۔

دانی، دانی میں تھا اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ۔

”دانی اب پتا نہیں کیا ہے؟“ میں نے چو سے ہو لے سے پوچھا تھا۔ لیکن جواب اماں نے دیا تھا۔

”مکرو جوان ہے، تھیری شادی پر بلاؤں گی اسے یوں بھی سال بعد چھٹی پر آتا ہے۔ تب ہی شادی کی تاریخ رکھوں گی۔“ اماں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”میری شادی.....؟“ میں نے دھڑکتے دل سے باری کی طرف دیکھا جو سامنے ہی چار پانی پر جہاں کے ساتھ بیٹھا تھا اور گا بے، گا بے مجھے بھی دیکھ لیتا تھا..... اس نے راستے میں کہا تھا۔

”وہرا! میرے امی، ابو بہت جلد بہت چاہ

سے پوری عزت و احترام کے ساتھ تمہیں تمہارے اماں، ابا سے مانگتے آئیں گے۔“ باری نے مجھے کتنا مان دیا تھا۔

”ہاں تمہاری شادی.....“ اماں بچے جھوم گئی تھیں۔

”استانی جی تاریخ لینے آئیں گی بہت جلد.....“

باری نے کہا ہے اور ان کا ہی تو سب سے زیادہ حق ہے تم پر..... اور باری بہت اچھا ہے..... ہے ناں؟“

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔

میری چلیں جھک گئیں..... دوسرا روں پر سرٹی

دوڑ گئی۔

”ہم نے آج تک تیرے لیے کچھ نہیں کیا ناں

ہالی، تیرے لیے باری خود نہیں ہے کہ دھوم دھام سے

تھیری شادی کریں۔“ تھیرا بھائی دانی میں ہے

ہاں..... اچھا کہتا ہے، تیرے لیے بھی زیور بنا کر

رکھا ہے میں نے..... ہم سے تمہارے معاملے میں جو

کوتاہی ہوئی ہے، معاف کرو چا لیکن میں نے تو

صرف تمہارا بھلا چاہا تھا۔“

”اماں..... اماں.....“ میں ایک بار پھر ان سے لپٹ گئی۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیے اماں..... کچھ بھی

نہیں..... بس آپ کی محبت مجھے مل گئی ہے

ہاں.....“ میری آواز میں کمی کھل گئی تھی اور اماں کی

آنکھیں برس رہی تھیں..... اور مجھے یوں لگ رہا تھا

جیسے ایک عمر کی آبلہ پانی کے بعد رخصتوں کو سر ہم مل گیا

ہو..... اور میرا خالی دل بھیتوں سے لبریز ہو گیا

ہو..... میں نے اماں کے کندھے پر سر رکھے، رکھے

باری کی طرف دیکھا۔ جو آنکھوں میں بھیتوں کا جہاں

بنائے مجھے ہی دیکھ رہا تھا..... اور میں بھی سویرا

اقبال..... جو ہمیشہ خود کو کمتر اور مظلوم سمجھتی رہی۔

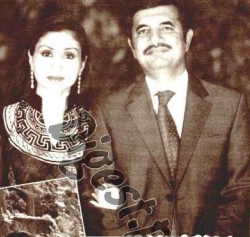
لیکن آج میرے ارد گرد کتنے رنگ تھے اور روشنیاں

تھیں، چمکتی تھیں۔

تھیں، چمکتی تھیں۔

تھیں، چمکتی تھیں۔

تھیں، چمکتی تھیں۔



فنا جیتے ہیں عشقِ حقیقی سے

ہم ٹی وی کی ہیڈ آف اسکرپٹس

اور جن کو ٹی وی کی سٹوڈیو کی کوششیں تھیں

شہناز پیرس

سب سے پہلے تو ہماری طرف سے آپ سب کو بہت بہت عید مبارک ہو..... اور بھی بڑا عیدی کے بھلا اس شگھی عید کا کیا حرح..... سو پاکیزہ کے اس جگہ جے عید نمبر میں آپ کی عیدی بھی آپ کے

فیورٹ سلسلے قسان نہیں حقیقت ہے یہ کی صورت میں موجود ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس افسانے کی مصوم اور ٹولہ کی بیرونی اپنی دل کش اور بھولی بھالی سی باتوں کے ساتھ یقیناً آپ کے دل میں اتر جائے گی تو آئیں آج ہم آپ کو ”ہم ٹی وی“ کے لیے چلتے ہیں جہاں خواتین کے اس پسندیدہ چینل کی ہیڈ آف اسکرپٹ اور سلسلہ صدیقی صاحب کی بڑی بیو موئل شہیدہ جن کے غائب کردہ اسکرپٹ ڈراموں کی فصل میں، آپ کے دلوں پر چھائے رہتے ہیں، آپ کی منتظر ہیں۔ ہم چاہ رہے تھے کہ شہیدہ صاحب سے بھی اسی نشست میں باتیں ہو جائیں مگر ان کی دھجروں مصروفیات کے باعث صرف موئل شہیدہ کی گفتگو سے ہی افسانہ مکمل کیا مگر اس میں شہیدہ صاحب بھی ان کے ساتھ ساتھ قارئین کو غفر آئیں گے۔ آف دامن شلوار سوٹ میں ملیوں اپنی بہت فریٹش لک کے ساتھ وہ ہمیں جن کی اس حق دہر میں ایک بہت خوب صورت سی خط لک کا احساس دلا رہی تھیں۔ قارئین ان کے مصوم سے چہرے پر غمخیز ملامت کو کب کوئی شاعر ہی بیان کر سکتا ہے یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس پر مستزاد ان کا نرم اور صبر کی اندازہ گفتگو ان کی شخصیت میں مزید حسن بھجوتے ہیں۔ ایمان سے ہماری اس تعریف میں ڈرا بھی مبالغہ نہیں۔۔۔ آپ بھی ان سے مل کر تو دیکھیں ہماری رائے سے سو فیصد متفق ہو جائیں گے۔

❖ موئل ہم آپ کے افسانے کا آغاز آپ کے بچپن سے کریں گے۔ اس خوب صورت اور بے فکر دور میں ڈرامیں بھی تو لے کر چلیں۔ ہم نے خطی داغ کوک کا سپ لیتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو موئل کی خوب صورت آنکھوں میں جیسے یادوں کے بے شمار جگنو چمک اٹھے۔

موئل شہیدہ..... ”میرے ابو گورنمنٹ آفیسر تھے۔ ہم تین بہن بھائی ہیں جن میں سب سے بڑی

میں ہوں لیکن بھی میرا اپنے بہن اور بھائی پر ذرا بھی رعب نہیں جیسا کہ بڑی بہنوں کا ہوتا ہے۔ شاید اس لیے بھی رعب نہیں تھا کہ ایک تو ہم لوگوں میں بس دو، دو سال کا ہی فرق تھا اور دوسرے یہ کہ طوینا میں کچھ زیادہ ہی نرم مزاج اور اپنے آپ میں کم رہنے والی لڑکی تھی۔ کسی پر رعب ڈالنا آتا ہی نہیں تھا۔ سب سے زیادہ سکون مجھے اپنے بیڑوم میں ملتا تھا جہاں میرا پسندیدہ میوزک اور میری بے شمار ٹیکس میری ساتھی ہوتی تھیں۔ مجھے کتابیں پڑھنے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔ اسی لیے میں اپنے کمرے میں زیادہ پائی جاتی تھی۔

موئل ایک نئے کورنگل بحر جیسے کچھ اور بیچے ہوئے دن چھٹی قریات کے ساتھ ان کی آنکھوں میں چمکاتے۔ وہ وہیں بھی مجھے بھی نہیں بھولتے۔ جب ہم رنڈر ڈسٹر کرنا چلی سے حیدر آباد جایا کرتے تھے جہاں میرا، پورا دو صیال مقیم تھا۔ عید، بقر عید یا کوئی بھی تہوار یا چھٹی پڑ جاتی تو ہم لوگ حیدر آباد چلے جاتے۔ میں اپنی مچھلیوں کی بے حد لالائی تھی۔ ان فیکٹ ایک طرح سے انہوں نے مجھے پالا بھی ہے، ہم جب حیدر آباد پہنچتے تو ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ زبردست کھانے بچے ایک خوشگوار سا بنگلہ ہر سو غمر جاتا وہاں کی شا میں بھی بہت حسین ہوتی تھیں۔ خطی، خطی ہی ہواؤں میں ہم سب بچے باہر بھی ہوتی چار پائوں پر چڑھ کر خوب ہلاکھا کرتے رہتے۔ نیزہ کے خالی ڈبوں سے ڈھونگ کا کام لیا جاتا۔ اتنا انجوائے کرتے تھے ہم لوگ کہ وہاں آنے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔ ”موئل جیسے ان دنوں میں بالکل ہی ٹھوگی تھیں۔

❖ ابو موئل آپ نے تو ہمیں ان افسانوں اور ناولوں کی یاد دلا دی ہے جن میں سارے کزن چھٹیوں میں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں بھر ایک پیاری سی کزن کو اپنا کوئی تا یا زاد یا خالہ زاد..... ہ موئل کی

حرے دار یاد میں آپ سے ضرور شیئر کرنا چاہوں گی۔ جب میں اعر میں تھی تو فاضل انجیر کی تین بہت خوب صورت لڑکیاں کالج کی کونسل ممبر ہوا کرتی تھیں۔ یعنی سارے کالج کی supervision وہ کرتی تھیں اور آپ کو بتا ہے وہ کون تھیں.....؟“ مول نے اپنی چلتی آنکھوں سے ہمیں دیکھا تو ہم کچھ گئے کہ وہ کوئی خاص نام لیں گی اور ایسا ہی ہوا ہمارے جس کو ختم کرتے ہوئے انہوں نے بتایا۔

”ان تینوں میں ایک حنا بیات تھیں (بہت مشہور ٹی وی آرٹسٹ) اور دوسری ویم اکرم کی بیوی (ہالا مرحومہ) تھیں۔ تیسری کا نام یاد نہیں۔ ہمارا گروپ ان تینوں کو ان کے حسن اور اسٹارٹس کی وجہ سے بہت admire کرتا تھا۔ بہت ہی پیاری لگا کرتی تھیں وہ لوگ ہمیں لیکن جو نیز ہونے کی وجہ سے ہم بس دور سے ہی انہیں دیکھا کرتے تھے۔ بہت عرصے کے بعد جب ہمیں ٹی وی اسٹیشن پر حنا بیات سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں وہ وقت یاد دلایا تو وہ بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں کہ کبھی مجھے تمہاری شکل کافی دیکھی بھالی سی محسوس ہو رہی تھی“ مول کے اس قصے کو انجوائے کرتے ہوئے اس بار ہم نے تھوڑا سا ان کے دل میں جھانکنے کی بھی کوشش کی۔

مول اپنی زندگی کے اس فوجی دور میں کبھی کوئی اپنے دل کے قریب محسوس ہوا؟
مول شنیہ..... نہیں..... انہوں نے فوراً ہی انکار کر دیا..... ”اصل میں اپنی زندگی میں دو چیزیں میں نے بہت کلیر رکھی تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں اسٹیج میرج کروں گی، دوسرے یہ کہ محبت وغیرہ کے چکر میں کبھی نہیں چڑوں گی کیونکہ مجھے اپنے ابو امی کی مرضی سے ہی شادی کرنی تھی۔“ مول کے جواب نے ہمیں مطمئن نہیں کیا۔

لیکن مول ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک پیاری سی لڑکی کسی کے دل کو نہ بھائے یا اسے کوئی کبھی اچھا ہی نہیں گئے؟ ہماري بات پر مول نے ہنسنے ہوئے ہمیں دیکھا۔

مول شنیہ..... ”یقیناً یہ عمار کی ہوتی ہے کہ کوئی اچھا لگ سکتا ہے۔ مجھے بھی کبھی اچھا لگ جاتا تھا لیکن بس بات صرف اچھے لگنے تک ہی محدود رہ جاتی تھی۔ مجھے اپنے ماں، باپ کو let down نہیں کرنا تھا اور یہ فیملنگ اتنی اسٹراٹج تھی جو میرے سارے احساسات پر حاوی ہو گئی تھی۔“ مول نے ایک لمحہ روک کر شرارتی سے لہجے میں مزید تفصیل بتائی۔ ”تو بے چاروں وغیرہ دست در دست پر چڑھ کر لڑکے پر چڑیاں وغیرہ دیکھا کرتے تھے اور ہم ان کی یہ جھجھکیاں اور جھڑپیں کرتے تھے لیکن ہمیں بھی بہت اٹی تھی اور ان کی اہمیت بھی محسوس ہوتی تھی۔“ مول نے اپنے مزے سے کہا کہ ہم بے اختیار اس دے اور مول نے مسکراتے ہوئے اپنے افسانے کو آگے بڑھایا۔

”کالج ختم کرنے کے بعد ماسٹرز میں ایڈمیشن لینے کے لیے درمیان میں ساتھ آٹھ ماہ کا گپ تھا۔ اس دوران میں نے ایک پرائنٹنگ میگزین فرو لائن میں جاب کی، جہاں مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملا..... بچوں کے رسالہ fun line میں بھی اسسٹنٹ ایڈیٹر رہی۔ اور پھر ماسٹرز کرنے کے بعد.....“ انہوں نے جملہ چوراہی نہیں کیا تھا کہ ہم نے ایکساٹڈ ہو کر ان کی بات کاٹ دی۔

”اچھا تو اب ہمارے افسانے میں وہ موڑ آرہا ہے جس کا قارئین یقیناً کافی دیر سے انتظار کر رہے ہوں گے۔“ مول نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”مول آپ ماشاء اللہ سلطانہ صدیقی صاحبہ کی بہو ہیں، جن کا چھٹل ”ہم ٹی وی“ خوانین

بہت اچھی دوست بھی ہیں۔ بیٹوں کی بہ نسبت وہ بہوؤں کی بات زیادہ سختی ہیں۔
 • کیا شادی کے بعد آپ جو انکٹ فیملی مسلم کے تحت، سلطانہ صدیقی صاحبہ کے ساتھ ہی رہی تھیں۔

مولیٰ شنید..... "جی ہاں، ویسے بھی شنید اپنی امی کے سب سے بڑے بیٹے ہونے کے ناتے بہت زیادہ گھوڑا ہیں۔ آنٹی خود بھی کہتی ہیں کہ شنید میرے سب سے زیادہ قریب ہے، ہر جگہ میں نے اسے اپنے ساتھ ساتھ رکھا۔ ہر بات اس سے share کی ہے اور اس نے بھی اپنی فیملی کو باپ کی کئی خاص خصوصیات دے دی ہے بلکہ ایک باپ کی جگہ پر اس کے جیسے اپنے آپ کو رکھا ہے۔"

• آپ کے شوہر اپنی ماں سے بہت زیادہ غریب ہیں۔ عام غریبوں کی طرح آپ مجلس تو نہیں ہوتیں.....؟ ہم نے بہت بے ساختہ ان سے پوچھا تو جاتو وقت انہوں نے جواب دیا۔

مولیٰ شنید..... "نہیں، میں نے اس بات کو بہت جلدی accept کر لیا اور اسے اپنی زندگی کا انٹو نہیں بنایا۔ ویسے بھی سلطانہ آنٹی اتنی مہربان شخصیت ہیں، ان کی محبت کا جواب فیملی سے کیسے دیا جاسکتا ہے۔" مولیٰ کی بات بہت گہرائی لیے ہوئی تھی۔ یہ زندگی کا بہت بڑا کچ ہے کہ بڑا کیا شادی کے بعد شوہروں سے وابستہ ان کے پیارے رشتوں کی محبت صرف اپنے نام کروانا چاہتی ہیں۔ ان کی زندگی بھی بے سکون نہیں گزرتی..... یہ سوچتے ہوئے ہم بھر مولیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے جو تھری تھیں۔

"شادی کے دو ماہ بعد ہی سلطانہ آنٹی نے گھر کی چابیاں اور پیسے میرے ہاتھ میں تھما دیے کہ لو اب یہ گھر تم ہی سنبھالو، میرے دونوں بچوں کو اس وقت باہر پڑھ رہے تھے۔ بس میں شنید اور سلطانہ آنٹی ہی تھے سو میں نے بھی ان کی اور شنید کی خواہش کے

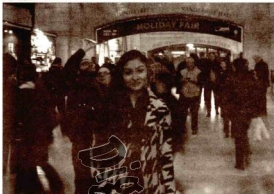
دھیرہ کی پریکٹس شروع ہو گئی تھی۔ شنید صرف تین بھائی ہیں ان کی کوئی بہن نہیں لیکن ان کی ساری کزنز نے بھر پار participate کر کے اس شادی کو یادگار بنادیا۔ بری کی ساری شاہجہ سلطانہ آنٹی نے میرے ساتھ کی اور ہر چیز میں میری پسند کا خیال رکھا..... ان کی دوست بہت بڑی ڈیڈ انڈر ہیں، سو آنٹی نے انہیں سے بری تیار کروائی تھی۔ خاص طور پر میری شادی کا جوڑا اتنا خوب صورت تھا کہ سب ہی تعریف کر رہے تھے۔"

• یقیناً ایک تو دلہن پہاری اوپر سے اتنا حسین و زیب تک ڈریس و صوم تو کچھ لگی ہوگی، اچھا یہ بتائیں منہ دکھائی میں کیا ملا اور اپنی مون کے لیے کہاں لگیں؟

مولیٰ شنید..... "اپنی مون کے لیے ہم لوگ جیس اور سوخڑ لینڈ گئے تھے اور منہ دکھائی میں انہوں نے ڈائمنڈ کی رنگ دی تھی۔" جتنی یادیں جھگڑا بہت بن کر ان کی آنکھوں میں چمک اٹھی تھیں۔

• "اچھا شوہر کی حیثیت سے آپ نے شنید کو کیا پایا.....؟ اور آپ کی ساس.....؟ خود بھی ایک سلیمہ بنی ہیں ان کے ساتھ آپ کی سلیمن شپ کیسی ہے؟" اب ہم ذرا ان شخص کی طرف آرہے تھے جو اپنی مون پر یہ فخر ہونے کے بعد شروع ہوتے ہیں یعنی Realities of life۔

مولیٰ شنید..... "شنید بہت اچھے شوہر ہیں..... کافی خیال رکھتے ہیں اور میرے خیال میں اس کا کریڈٹ سلطانہ آنٹی کو جاتا ہے۔ as a single parent انہوں نے اپنے بیٹوں کی تربیت بہت اچھی کی ہے۔ بیٹوں کا خیال کیسے رکھنا چاہیے..... شوہر اگر بیوی کو محبت، عزت اور کارائیڈنس دے گا بھی زندگی خوشگوار گزر سکتی ہے۔ یہ سب خیالات ان کے بیٹوں نے اپنی ماں سے ہی لیے ہیں۔ سلطانہ آنٹی میری ساس ہی نہیں، میری



احرام میں اپنے آپ کو مکر داری میں مصروف کر لیا۔
 ”واہ مول آپ تو واقعی ایک انسان بنی ہوئی

اور بہت بات ہوئیں، اچھا یہ تاجیں کہ دیکھ رہی تھی شادی کے بعد نئے رشتوں کے ساتھ ساتھ ان کو لے کر چلنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوتی؟“
 مول شفیقہ..... ”میں ان کا شکر ہے کہ ٹھیک دیکھ رہی ہیں، بیٹھانی والا رشتہ نہیں ہے، ہمارے درمیان، ہم تین بہنیں آپس میں دوست ہیں۔ میرے بعد مومنہ دیکھ رہی ہیں اور پھر سب سے چھوٹی ملکہ ہیں۔ جو خوش بخت شجاعت صاحبہ کی بیٹی ہیں اور کبھی فورنیا میں ہوتی ہیں اور آرکیٹیکٹ ہیں۔ مومنہ نے MBA کیا ہوا ہے۔ ان کے شوہر کو کوئی ایڈوکیٹ تھا مومنہ کے چاہ کرنے پر اس لیے اس نے جلد ہی پروڈکشن کا کام سنبھال لیا تھا۔ ویسے وہ دونوں lums میں ساتھ پڑھتے تھے اس لیے ان کی شادی کو پسند کی شادی کہہ سکتے ہیں۔“ مول کی اس بات پر ہم نے شرارت سے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔

عرسے سے آپ بھی کیل فورنیا شفٹ ہو گئی ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟“
 مول شنید..... مول نے گہری سانس لے کر ہماری طرف دیکھا۔

”اس کی وجہ ہمارے بچوں کی انجکشن ہے۔ اپنے بچوں کی خاطر میں نے اتنا بڑا فیصلہ کیا۔“ مول کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنی خوشی سے امریکا نہیں گئی ہیں بلکہ ایک ماں نے صرف اپنے بچوں کے حلق سوچا ہے۔

✽ یہاں تو ماشاء اللہ آپ اپنے اے بیڈ آف اسکرپٹ بے حد بڑی سستی ہیں لیکن جب واپس کیل فورنیا جاتی ہیں تو پورے محسوس نہیں ہوتی؟“
 ہمارے پوچھنے پر چھ بوریٹ ان کی آنکھوں میں تھک آئی۔

مول شنید..... ہاں بہت بوریٹ محسوس ہوتی ہے، مجھے اپنے کام سے بے حد پیار ہے اور وہاں زیادہ کچھ کرنے کو نہیں ہوتا۔ بس اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ویسے بھی امریکا میں پاکستان کی طرح محروقی کی وہ آرام دہ زندگی نہیں ہے۔ ہر کام خود ہی کرنا پڑتا ہے، میں تو وہاں پر کھانے بھی بنا سکتی ہوں۔“

✽ اچھا تو کیسے..... غلف ڈشز بنانا سیکھیں؟ ہم نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

مول شنید..... ”شان مسالے زندہ باد۔۔۔۔۔“
 انہوں نے کچھ اتنی بے ساختگی سے کہا کہ کمرام دونوں کے قہقہوں سے گونج اٹھا۔

”اس کے علاوہ وہاں ڈرائیونگ کے بغیر بھی گزارہ نہیں..... لیکن لائسنس بڑی مشکل سے ملتا ہے، مجھے تقریباً آٹھ ماہ لگے لائسنس ملے میں۔ یہاں کی اور وہاں کی زندگی میں بہت فرق ہے، اگر میں اپنے دیوار اور دیواری کے ساتھ نہ رہی ہوتی تو حریف بوریٹ ہوتی۔“ مول کی اس بات پر ہم نے

سنبھالا ہوا ہے۔
 ✽ ”یعنی آپ دونوں بھی یہیں سلطانہ صدیقی صاحبہ کی محنت میں ان کا بھرپور ساتھ دے رہی ہیں؟“

مول شنید..... ”جی بالکل.....! ہم سب ورکنگ ویمن ہیں، بہت مصروف زندگی ہے ہماری..... میری دیواری ملک امریکا میں بہترین جاب کر رہی ہیں اور میں سونہ اور سلطانہ آئی یہاں بڑی رہتے ہیں، ہمارے پاس عام محروقی کی طرح چھوٹی، چھوٹی باتوں کو مسئلہ بنا کر بٹلے بٹلے کا نام ہی نہیں ہے۔“

✽ تو کیا آپ سب لوگ جوائنٹ فمل سسٹم کے تحت ایک ہی گھر میں رہتے ہیں؟“ ہم نے مول کی باتوں سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا۔ واقعی ان گھروں میں جھڑے اور رنجش زیادہ ہوتی ہیں جہاں پر عورتیں اپنا دامان صرف گھریلو سیاست یا ایک دوسرے کی کاٹ میں ضائع کرتی ہیں۔
 مول شنید..... ”آپ یہ کہہ سکتی ہیں، ہم ساتھ

بھی ہیں اور بہادری اپنی لائف اور پرائیویسی بھی ہے۔ ہمارے گھر کے تین پورشنز ہیں، جسے سلطانہ آئی واقعی ہیں فرسٹ فلور پر ہم لوگ اور چھکے چھت ہوتی ہیں، رات کو ہم سب اپنا کھانا لے کر سلطانہ آئی کے پورشن میں آ جاتے ہیں اور پھر ہم سب مل کر ڈنر کرتے ہیں۔“ مول کے چہرے پر بے انتہا طمانیت تھی یہ سب بتاتے ہوئے..... رشتوں میں محبت اور بھگت ہو تو گھروں اور دلوں میں کتنا سکون رہتا ہے اور ایسا ہی ماحول خود ہماری کھلی میں بھی ہے انہوں کی یاد کو دل سے جھٹکتے ہوئے ہم پھر مول کی طرف متوجہ ہوئے۔

✽ واقعی مول، اللہ تعالیٰ نے سلطانہ صدیقی صاحبہ کو ان کی محنت اور ٹیک نیچے کا صلہ ”ہم فی دی“ کی کامیابی کے علاوہ ان کے ساتھ اچھے بچوں کی صورت میں بھی دیا ہے۔ اچھا یہ بتائیں مول کچھ

مول شنید..... "ہاں دس چدرہ دنوں کو سب کچھ نیا، نیا اور کافی رو میٹنگ لگتا ہے اور پھر ہم واپس اسی روٹین میں چلے جاتے ہیں۔" مول نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

مول شنید..... "میاں جی آپ کی ساگرہ یاد رکھتے ہیں، تجھے اور کارڈ ملتے ہیں آپ کو؟"

مول شنید..... "عام بیویوں کی طرح مجھے تو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں، بس مجھے chill رہنا پسند ہے، البتہ اندر سڑی پر اگر میں امریکا میں ہوں تو شنید کی طرف سے پھول آتے ہیں اور اگر یہاں ہوں تو ہم دوسرے چلے جاتے ہیں۔"

مول شنید..... "اچھا مول امریکا کی اور یہاں کی عید میں تو آپ کو بہت فرق محسوس ہوتا ہوگا؟"

مول شنید..... "ایسا ویسا فرق..... پاکستان کی عید میں جتنی خوشی ہو رہی ہے، امریکا میں اتنی ہی ہو رہی ہے۔ وہاں پر عید کی صبح نماز کے لیے غور میں بھی مسجد جاتی ہیں، وہاں سے واپس آ کر بچے اسکول اور جاب پر جانے والے اپنے کام پر چلے جاتے ہیں، شام کو کھانے پر چلے گئے اور بس جناب عید فتح..... ویسے میں پاکستان میں بھی عید پر اپنے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کرتی، البتہ غنی کے لیے عید کی تیاری میں کوئی کمی نہیں آنے دیتی۔"

مول شنید..... "یعنی عام خواتین کی طرح عید پر نئے کپڑے شوز فیشن وغیرہ وغیرہ کچھ بھی نہیں.....؟ ہم نے ناقابل یقین نظروں سے دیکھا۔"

مول شنید..... "آپ یقین کریں میں خاص طور پر عید کا ڈریس بھی نہیں سلوائی اور نہ ہی بیچنگ چوڑیوں یا دوسری چیزوں کے لیے پریشان ہوتی ہوں۔ بس وارڈ روپ میں رکھا ہوا کوئی بھی اچھا سا سوٹ لیکن نئی ہوں۔"

مول شنید..... "جی، یہ تو اچھی بات ہے ویسے آپ کو اپنی کوئی سی عادت بری لگتی ہے؟" ہمارے سوال پر

جبرانی سے انہیں دیکھا۔

مول شنید..... "یہ تو آپ لوگوں کی آپس میں محبت کی ایک اور بڑی مثال سامنے آتی ہے ورنہ آج کل کے زمانے میں ایسا کم ہی ہوتا ہے؟" ہماری جبرانی پر مول نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

مول شنید..... "میں اور میرے بچوں نے ان لوگوں کے ساتھ بہت آرام، خوشی اور سکون کے ساتھ رہ رہے ہیں، ملکہ اور میرے درمیان آپس میں بہت اخلاقی رشتہ ہے بلکہ میں کبھی ایک دوسرے سے بہت ڈھارس ہے ہمیں..... اگر کبھی اس کی طبیعت خراب ہوتی ہے اس کا بہت خیال کرتی ہوں اور اسی طرح وہ بھی کرتی ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ساتھ رہنے کے لیے دل بڑا رکھنے کی ضرورت ہے چھوٹی، چھوٹی باتوں کو اٹھو کر کے positivity کے ساتھ رہنے والوں کے دل کبھی ایک دوسرے سے خراب نہیں ہوتے، اب دیکھیے ناں میں یہاں پاکستان آگئی ہوں لیکن میرے بچے وہیں ان لوگوں کے پاس ہیں، اسی طرح میں بھی ہمیشہ ان کے کام آنے کو تیار رہتی ہوں..... ویسے میرے بچے انشاء اللہ آج رات یہاں ہی رہے ہیں۔" مول کے لہجے میں ہنس کی محسوسات آتی۔

مول شنید..... "آپ وہاں ہوتی ہیں اور آپ کے بچہ جی یہاں پاکستان میں..... تو کیسا لگتا ہے، یاد تو آتی ہوگی؟" ہمارے جبر و دھم کے اس سوال پر وہ ایک لمحے کو خاموشی ہوئی تھیں۔

مول شنید..... "ہاں بہت یاد آتے ہیں ظاہر ہی بات ہے کہ ان کی کمی دل ہر لمحہ محسوس کرتا ہے، دل تو یاد دہاؤں ہوتا ہے تو جرم چلی جاتی ہوں یا پھر ملکہ کے ساتھ کبھی شاپنگ وغیرہ....."

مول شنید..... "اور پھر جب کافی محنتوں کے بعد ملاقات ہوتی ہے تو نئے پن کا احساس بھی جاکتا ہوگا؟" ہم نے انہیں پچھرتے ہوئے پوچھا۔

دو فیس دیں۔

مول شنید..... "جی ہاؤں۔۔۔۔۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں بہت رعب و دبدبے والی ہوںی جبکہ میں کافی نرم مزاج اور soft spoken ہوں ویسے میرا اسکرپٹ کا شعبہ کچھ ایسا ہے کہ کبھی، کبھی رائٹرز سے بہت صاف گوئی سے کہنا پڑتا ہے کہ اسکرپٹ پسند نہیں آیا۔" ہم ان کے سچے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے فیس دیے۔

✧ لیکن مول اس وقت بھی آپ کا لہجہ بہت شیریں ہوتا ہوگا یقیناً رائٹرز مانگتے نہیں کرتے ہوں گے۔ اچھا چلیں یہ باتیں آپ کو کبھی کسی رشتے سے دکھ پہنچا.....؟ مول نے کچھ سوچتے ہوئے ہماری طرف دیکھا۔

مول شنید..... "ہاں، مجھے دوستی کے رشتے نے دکھ دیا ہے۔" ان کے اس جملے میں مجھے شکوکے محسوس کرتے ہوئے ہم نے ذرا ایک مسکراتا ہوا سوال ان کے رد پر کر دیا۔

✧ ذرا یہ تو بتائیں کہ چھوٹی موٹی کھٹ پھٹ کے بعد مٹانے میں کون کون کھل کر رہا ہے آپ ہاشم صاحب.....؟

مول شنید..... "زیادہ تر مٹانے کا کام میں ہی کرتی ہوں، ویسے وہ کبھی کبھی یہ کام کر لیتے ہیں..... ویسے شنید جب گھر پر ہوں تو ان کی خواہش ہوتی ہے ان کی پہلی بس ان کے ارد گرد رہی رہے۔ اس معاملے میں بہت sensitive ہیں وہ۔" ہماری ہیر و پن کا افسانہ اب آخری مراحل میں داخل ہو رہا تھا۔

✧ مول آپ کی ہنسی مسکراتی زندگی میں کوئی ایسی یاد جو آپ کو کبھی ادا اس کر دیتی ہو؟ مول شنید..... "ہاں، ایک بہت تکلیف دہ یاد ہے، جسے بھولنا بہت مشکل ہے۔" دکھ جیسے ان کی آنکھوں میں جھلک آیا تھا۔

"میں نے اپنے ابو کو دس سال کی عمر سے جنگ کرتے ہوئے دیکھا ہے..... وہ بہت بہادر تھے، اتنے طویل عرصے میں کئی بار انہوں نے اس مرض کو شکست دی لیکن یہ سوڈی مرض دوبارہ پھر ہو جاتا تھا..... میں نے ان کو بیڈ پر لیٹے ہوئے دیکھا ہے جس تکلیف سے وہ گزرتے تھے اس کی اذیت اپنے دل پر محسوس کی ہے۔ شیدہ ترین ٹینشن میں گزرتے تھے وہ دس سال، میری پہلی جیسے علی کی مٹی تھی۔ اسی تو اس وقت سے کچھ ایسی ٹونٹیں کہ ابو کی موت کے بعد سے اب کچھ نہیں سنبھل سکتی ہیں۔"

✧ کچھ دیر کے لیے ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے..... علی ہونے کے ناتے مول کا دکھ ہمیں بھی اپنے دل پر اثر چھوڑا محسوس ہو رہا تھا۔ بہر حال ہمارا

گناہ بھی اب ان کا نام پڑ رہا تھا۔

✧ مول اپنے اس خوب صورت افسانے کے انچڑ پر ہم چاہیں گے کہ آپ پوری دنیا میں پڑھ جانے والے ہمارے پاکیزہ ڈائجسٹ کے قارئین کو بہت پیارا سا کوئی پیغام دیں۔

مول شنید..... "میں سب خواتین کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ دنیا میں ہر رشتہ خوب صورت ہو سکتا ہے اگر اسے positivity کے ساتھ لیا جائے اس کی ایک کلاسک مثال میری ساس سلطانہ صدیقی ہیں جنہوں نے اپنی جتنی بیویوں کو اپنے گھر اور اپنے دل میں اپنی محبت سے دیکھ لیا جیسے کوئی ماں اپنی بچیوں کو کرتی ہے۔"

ہمیں مول کی اس بات سے مکمل اتفاق ہے..... سلطانہ صدیقی کے اس انچڑ میں خاندان میں ہر سو بکھری ہنچیں، سکون اور آہنس میں اتنی چمکلت ہم سب سے کہہ رہی ہے کہ اگر دلوں میں وسعت اور حسن خلق ہو تو خوشیاں سوا دلت کا بلب بن کر ہر گھر میں جھلکا سکتی ہیں۔ (بلاشبہ)

ملائشیاء میں توڑ کٹا کٹا!

عظمیٰ آفاق سعید



”جیتا، چاگل ہوگئی ہو لڑکیوں کو کوئی اسیلے
گھومنے پھرنے جانے کی اجازت دیتا ہے بھلا،
میرے سامنے تو کہہ دیا ہے۔ پاپا سے تو کہنا بھی
مست۔“ میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”ای مائی! اسکول کی طرف سے ملائشیا کا
فرپ آیا ہے۔ آپ بچھیوں میں مجھے جانے دیں گی
ناں؟“ اچھ اسکول سے واپس آتے ہی چیختے ہوئے
بولی۔

”بھئی ساری کلاس چار ہی ہے، منچر ذ بھی ساتھ ہوں گی، میں کوئی اکیلی جہاز میں بیٹھ کر تھوڑی چار ہی ہوں۔“ اب وہ روہاسی ہو گئی تھی۔

”پلو اگر ہم ایسا کریں کہ چھٹیوں میں چوری فیملی ملائیکا کا پروگرام بنالے پھر تو میری بیٹی خوش ہو جائے گی یا نہیں نے اسے مناتے ہوئے کہا۔

”بس، بس رہنے دیں ایسا پائے ہی ہوتے ہیں۔ وہ کبھی نہیں جائیں گے، وہ اپنا آفس... چھوڑ نہیں سکتے اور آفس ظاہر ہے ملائیکا گھومنے جانے سے تو رہا۔۔۔“ اچھے غیر یقینی تاثر سمائے مجھے دیکھ رہی تھی یا شاید مجھے دیکھ کر اندازہ لگا رہی تھی کہ میں سیریس ہوں بھی یا نہیں۔ مگر میں نے اسے مطمئن کیا کہ میں ضرور تمہارے پاپا کو کھانے کی کوشش کروں گی کہ ہم اس وفد چھٹیوں پر ضرور ملائیکا چھیں اور آخر کار میں اس کوشش میں کامیاب ہوئی تھی۔ اس کے لیے کیا کیا پاپا دینے پڑے۔ اس پر ایک ایک سفر نامہ سوری اور وقت کے لیے چھوڑ دیے ہیں۔ (بلکہ اسے آپ میرا ریسرچ ورک بھی کہہ سکتے ہیں) تو طے یہ ہوا کہ ہماری فیملی اور دیو دھاب کی فیملی چھ دنوں کے لیے ملائیکا جائیں گے۔

بچوں میں تو خوشی کی سہرا دوڑ گئی تھی۔ سارے بچے ایسے بھاگ، بھاگ کر تیار یوں میں حصہ لے رہے تھے کہ اگر ایسی تیاریاں اپنے سالانہ امتحانات میں کر لیں تو ناپ کریں۔

(دیور) نایاب اور (دیورانی) صائر گھومنے پھرنے میں کافی ماہر ہیں، انہیں شوقین نہیں کہہ رہی کہ وہ تو اکثر لوگ ہوتے ہیں جو باہر جا کر پریشان ہوتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ ہاں تو انہیں ہمارے خاندان کا ادب بطور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی فیملی جس میں ان کے چار بچے نہیں، اشعر، منال اور ارم شامل تھے اور ہمارے سفر کے ساتھی تھے۔

جب دہلی میں رہائش پزیر نندامبر کو پتا چلا کہ ہم لوگ ملائیکا جا رہے ہیں تو اس کی بیٹی ریحاب بھئی ہم ڈولی کہتے ہیں وہ بھی دہلی سے ہمیں جوائن کرنے آگئی۔۔۔ اور یوں ہمارے چھوٹے سے گروپ میں ایک شوخ و چٹیل مگر بے حد بھدار لڑکی آگئی۔۔۔ جو آگے جا کر گانڈھی جایت ہوئی۔

”پلو بھئی اب تو ڈولی آگئی ہے، اب سفر کا مزہ دو بالا ہو جائے گا۔“ میں نے ڈولی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔۔۔ یہ لڑکی سب کی لاڈلی ہے۔۔۔ بلکہ ہماری امی کی بھی ہے۔

”امی! امی! تو جا چکی ہوں تو میں نے سوچا کہ آپ لوگوں کے ساتھ کوئی نور گانڈھی بھی تو جانا چاہیے۔ ڈولی کی ماہر تو گانڈھی کی طرح ہاتھ لہرا لہرا کر ہمیں سمجھا رہی تھی اور وہاں کے خاص مقامات کے بارے میں بتا رہی تھی۔

مگر سب لوگ اس کی باتوں کو بڑے اشتیاق سے سن رہے تھے کہ دیکھیں بھی وہ ڈیو تو ہے ہی۔

اور آخر کار۔۔۔ وہ دن بھی آئی گیا جب ہمیں بذریعہ سری لکھن از لاکھن ملائیکا کے شہر کو لا پور پہنچنا تھا۔ شام پانچ بجے کی تلاوت بھی مگر ہمارے بچے صبح کے ناشتے کے بعد سے تیار ہو کر ملک ملک کر ٹھوم رہے تھے۔ اچھے صلب کی خوشی دیدنی تھی کیونکہ ان کے دل کی مراد جو چوری ہو رہی تھی۔ ایمان، علی اور کیسوٹی بھی بہت خوش تھے۔ ان بچوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مسجد میں اعلان کروادیں کہ حضرات، ایک ضروری اعلان سماعت فرمائیں آفاق میاں اپنے خاندان کے ساتھ ملائیکا جا رہے ہیں۔ سب مبارک باد دینے ان کے گھر پہنچیں شہر، ہر بچے اپنی اوقات سے زیادہ تیار تھا۔ مگر سے نکلے کا نام ہو رہا تھا اور آفاق ابھی تک آفس سے واپس نہیں آئے تھے۔

”امی، کیا پاپا کو پتا نہیں ہے کہ ہم آج ہی جا رہے ہیں؟“ ایمان کافی دیر۔۔۔ انتظار کرنے

روپے کی چیز سو روپے کی ملتی ہے۔" اچھے جب ایک میگزین خرید کر لائی تو میں نے اسے لوٹتے ہوئے کہا۔
"چلے وقت نانی نے ہم سب کو پیسے دیے ہیں
کر اپنی پسند کی جو چیز اچھی لگے اسے خرید لیا۔" اچھے
مجھے یاد دلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"جینا، جتنی اسپینے سے تم لوگ پیسے خرچ
کر رہے ہو مجھے نہیں لگتا کہ وہاں پہنچے تک نہیں گے۔"
ناپاب کی فلیک کے ساتھ ہمارے بچے اور ہم لوگ
بہت انجوائے کرتے ہیں۔ ایک تو ان کے بچے اور
ہمارے بچے تقریباً ہم عمر ہیں اور دوسرا وہ بچوں کے
آگے کی کمی بھی نہیں ملنے دیتے۔ اگر کوئی بچہ کسی چیز
کی خاطر کہتا ہے تو وہ ضرور پوری ہوگی۔ بچوں کو اس
سے زیادہ اور کیا چاہیے جبکہ میری اور آفاق کی بھی یہ
عادت ہے کہ جگہ اور حالات کے حساب سے کام کیا
جائے۔ یہی ہم اپنے بچوں کو سمجھاتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی جہاز پر جانے کی انڈنسنٹ
اونکی اور ہمارا چارہا خاندان جہاز پر سوار ہونے کے لیے
روانہ ہوا۔ جہاز کے دروازے پر ہی دواڑ ہوئیں ہاتھ
جوڑے کھڑی گئیں اور آئی پوزٹ لے کر کھڑی گئیں۔
"اے شاہی اندر ہمیں آئی پوزٹ ملے گا؟" ایمان
صاحب میرے کان میں منٹائے۔

"بھئی ملے گا تو لے لے گا۔" میں بھی
غوشی غوشی بولی۔

"اپنا پانا والا ٹیکل کروں گا۔ ویسے بھی ایک
جگہ سے ٹوٹ گیا ہے۔" ایمان اب آگے کے
پروگرام بتا رہا تھا۔

"جو مرضی آئے وہ کرنا، ابھی سیٹ پر تو بیٹھ
جاؤ۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

چونکہ ہم سری لنکن ایئر لائنز سے سفر کر رہے تھے
اسی لیے سارا عملہ سری لنکن تھا۔ کالی، کالی ایئر ہوسٹس
اور کالے، کالے اسٹوڈنٹس اور کالے کی پھر پھر غصہ کی
تھی۔ لال ساز یوں میں جوڑا ہاتھ ملے ہلا کی کشش

کے بعد چکر بولا۔
"اگر وہ نہیں آئے، تو ہم ان کو چھوڑ کر چلے
جائیں گے۔" علی تو بالکل معاف کرنے کے موڈ میں
نہیں تھا۔

"جینا، آ رہے ہیں یا راستے میں ہیں، بس تم
لوگ ریڈی کر رہو۔ جیسے ہی پہنچیں گے ہم نکل جائیں
گے۔" میں نے بچوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ حالانکہ
مجھے بھی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ آفاق ہر چیز کو بہت
لائٹ لیتے ہیں۔ یہ ان کی پرانی عادت ہے۔ ایک
دفعہ ہم لوگ اسلام آباد جا رہے تھے۔ یہ اپنے آفس
سے آتے، آتے لیٹ ہو گئے حالانکہ میں کہہ رہی
تھی کہ وہ ہو گئی لیکن وہی سکون اور رولیشن۔ جب ہم
کاؤنٹر تک پہنچے تو کاؤنٹر بند ہو چکا تھا۔

"آپ نے تو آخر انہوں کو بھی پیسے چھوڑ
دیا۔۔۔!" کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا عملہ ہمیں ایسے گھور رہا تھا
جیسے ہم کسی اور بارے کی تھوڑی ہوں۔

آج بھی نہیں تاریخ نہ پڑائی جائے۔
سوچ کر ہول رہی تھی کہ آخر کار آفاق آگے۔
کہ آپ کو پتا ہے کہ یہ وہ آخر میں ہی آتا ہے۔ یہی
طرح ہمارے میاں نے کسی اور کی طرح آخری دن
کہ ہم سب کو انتظار کی اذیت سے تھکاتے دلائی۔

ہمارا حیرہ لوگوں کا قافلہ جبکہ انٹرپورٹ کے
ایئرکریٹن کے مراحل سے فارغ ہو کر لاؤنج میں
آ بیٹھا تو جب میرے دل کو تسلی ہوئی کہ واقعی ہم لوگ
گھومنے جا رہے ہیں۔

بچے پورے لاؤنج میں مزاحمت کر رہے تھے۔
کوئی کسی اسٹال پر ہماگ رہا تھا تو کوئی کانی پی رہا
تھا۔ آفاق کسی سے نیلی فون پر ایسے مصروف دکھائی
دے رہے تھے جیسے ان کے جانے سے سائے آفس کا
نظام و درہم برہم ہو جائے گا۔

"جینا..... یہاں سے میگزین خریدنے کی کیا
ضرورت تھی؟ پتا ہے ہاں کہ انٹرپورٹ کے اندر ایک

لے لے کر ان کی غلوں کی پیرائیں لگ رہی تھیں۔
مگورے، مگورے تو لے توڑی وہ بعد ان کالے
کالے ہاتھوں سے ملے تو اللہ کی قدرت پر سبحان اللہ
کہنے کو دل چاہا۔ سارا عمل انتخابی مستعدی سے اپنے
کاموں میں مشغول تھا۔ کوئی کسی مسافر کو سیٹ
بٹارہا تھا تو کوئی کسی کا جیک اوپ کے خانے میں رکھ رہا
تھا۔ کوئی کسی کو پانی لا کر دے رہا تھا تو کسی کو کھل دے
رہا تھا۔

مجھے پچھلے سال ہی آئی اے سے کہیں جانے کا اتفاق ہوا۔ شدید گرمی تھی تو شاید میں نے بیٹھنے ہی جانی مانگ لیا۔

جانی۔ "اگر ہو شمس نے غصے بھری مسکراہٹ سے مجھے جواب دیا تھا۔"

شاید میں دوبارہ مانگی تو وہ مجھے ڈانٹ بھی دیتی۔ کہ زمین پر پانی کی بلبلو ہے اور تم آسمان پر آتے ہی پانی مانگ رہی ہو۔ مجھے پرانی باتیں یاد آ رہی تھیں اور ہنسی بھی آ رہی تھی۔ جب سب سے موہاں سوچ آف کرنے کے لیے کہا گیا تو میں نے فوراً اسی کو فون کر کے خدا حافظ کہا۔ دوسری طرف سے اماں دعا نہیں دینے اور سب کا خیال رکھنے بچوں کو اپنے پاس رکھنے اور جانے کیا دنیا بھیتوں کی چاری کھول رہی تھیں..... اور یہ ان کی ہمیشہ کی عادت ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال جس طرح خود رکھا کرتی ہیں اسی طرح رکھنے کے لیے مجھ سے بھی کہتی ہیں.....!

”آئی..... اچھا، اچھا میں سمجھ گئی، بس آپ دعا کیجئے گا کہ فریپ بہت حسے کا گزروے۔ اب میں وہاں پہنچ کر فون کروں گی،“ خدا حافظ۔“ میں نے خود ہی فون بند کیا جبکہ دوسری طرف سے اب بھی وہ مجھ پر کچھ چڑھا کر چمک چمک رہی تھیں بلکہ ان کی دعاؤں کے حصار میں چورے جہاز کے مسافر ہوں گے۔

ہماری اماں ایسی ہی ہیں مجھتی، جاں نثار۔ شاہد۔
ساری مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

طاری کراچی سے پلاٹ تین گھنٹے کی قحی پھر
تین گھنٹے کا سری لکا کے شہر کو لیبو میں stay تھا۔ جبکہ
ہم سب ملے جلنے والوں کو بتا کر آئے تھے کہ ہم سری
لکا بھی گھومیں گے اور وہاں کی بھی سیر کریں گے۔

”مکتبہ جہت یونانی ہو تم عقلی؟“ آفاق چہار
میں بیٹھ کر مجھ سے کہہ رہے تھے..... یوں بھی انہیں
ڈانٹنے کے بہانے ڈھونڈنے پڑتے ہیں..... ہمارے
پاس مذاق کی بات کب سیریس ہو جاتی ہے، مجھے بھی پتا
ہی نہیں چل..... میرے لٹے سے شروع ہو۔

”کیا مہرٹ بولی دیا میں نے؟“ میں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جب لوگ کہیں جاتے ہیں..... تو اسے
نہاواہہ کہتے جاتے ہیں جتنے کہہ رہے ہیں۔ تو
کہا نہیں جاتا کہ وہ کیسے ہے۔“

”جو تم سب سے بول کر آئی ہو کہ ہم دو تینا
ملک کھوئے جارہے ہیں۔۔۔۔۔ یہ کوئی اچھی بات
ہے۔۔۔۔۔ بعد میں اگر کسی نے لطاف ادا دیا تو سب
سے زیادہ تم ہی برا مانو گی، ہے ناں؟“

”کس سے بول کر آئی ہوں۔ آپ کی بہنوں سے اور اس میں جھوٹ کیا ہے۔ ابھی یہ جہاز کہاں اترے گا؟ سری لنکا میں ہیں۔“ میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو۔“ وہ مسکرائے۔ (یاسکرانا چلا۔۔۔۔۔ کے
بات گھر سے شروع ہو رہی تھی)

سری لنکا کی سیر

کولمبو کا انٹرپورٹ جہاں ہمیں تین گھنٹے رکنا تھا انٹرپورٹ کم شاؤنگ سینٹر زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ نیو نی پارلز، کپڑوں کی دکانیں، سری لنکا کی روایتی چیزیں، گھٹ شاہیں، لوکل کپڑوں کی دکانوں کے ساتھ براڈ وے کپڑوں کی بھی بے تحاشا دکانیں یہاں پر موجود تھیں۔ گوتم بدھ کا بڑا سا اسٹوپا لاؤنج میں رکھا ہوا تھا۔ جس کے آگے دیے اور پھول کے قہال بھی موجود تھے۔ ساتھ ہی ایک بورڈ لگا تھا کہ یہ ہمارے خدا ہیں ان کی طرف چنے کر کے تصویر نہ بنائیں۔ تو ہم نے ان کے قانون کے احرام میں ان کے برابر کھڑے ہو کر چند تصویریں لیں۔

سری لنکا میں پانی بہت پائے جاتے ہیں۔ شاید یہاں کا تو ہی جانور بھی پیو ہو۔ یہاں کے لوگ بھی اسی طریقے کے پیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ باقی میں شیشی نہیں ہوتی سری لنکا میں ہوتی ہے۔

چونکہ ہمارے پاس وقت بہت تھا اور مقابلہ بھی سخت نہیں تھا اس لیے انٹرپورٹ کے چپے، چپے کو ایسے اذہر کر دے تھے جیسے میٹرک کے امتحانات میں جوابات کو کرتے تھے۔

انٹرپورٹ پر تھوڑے، تھوڑے وقفے سے تلاش آ رہی تھیں۔ انٹرپورٹ کراؤڈ دیکھنے کو رہا تھا۔ جو آج کل پاکستان میں بالکل بھی نظر نہیں آتا۔ یہ صرف اور صرف امن..... دوسری لنکا جیسا ملک جہاں تھوڑے عرصے پہلے تک ہائل ٹیکنالوجی کے گروپ سرگرم تھے اور انہوں نے پورے ملک کا امن و امان خراب کر رکھا تھا۔ سب لوگ سری لنکا کے نام سے ہی گھبراتے تھے..... مگر صرف گورنمنٹ کے درست فیصلے اور سری لنکا لوگوں کا اپنی گورنمنٹ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا عہد اس ملک کو بدست گردی جیسے سووی مرض سے نجات دلا گیا۔

کاش ہمارا ملک، جس کو نہ جانے کس کی نظر لگ

کو بھی برا نہیں کہنا چاہیے مگر جب کسی ملک کی کوئی چیز کھائی نہ ہو۔ اس کے واسطے سے بھی زبان ناواقف ہو تو جیسا ان حالات میں کھانا لگنا چاہیے ویسا ہی لگے۔ ہمارے بچے تو اوقات سے باہر ہو جاتے ہیں۔ کھانا کچھ نہیں آتا تو بریلیوری ڈرنک ہی پینے میں لگ گئے۔ کوئی جوس مانگ رہا تھا تو کوئی کافی تھوڑی دیر برداشت کرنے کے بعد جب میں نے اپنے بچوں کو انھیں دکھائیں تب سیدھے ہوئے۔

”میری یلہ والی ڈرنک رو گئی امی۔“ چھوٹی کیسوی کافی دیر بعد ہوئی۔

”کوئی بات نہیں رہنے دو۔“ میں نے اسے چپ کراتے ہوئے کہا۔

جہاز میں پاپ اپنی فیملی کے ساتھ جبکہ میں آفاق کے ساتھ ٹیگٹی ٹی تاکر سب لوگ اپنی، اپنی فیملی کے ساتھ انجوائے کر رہیں، کوئی کسی کی وجہ سے تکلف میں نہ پڑے۔ مگر بچوں نے اپنی لیم انگ ہائی تھی اور وہ ہم بڑوں سے کافی دور تھے۔

”ہم بھی تو گھومنے جا رہے ہیں۔ ہمیں بھی تھوڑی آزادی دے دیں۔“ جب میں نے لیم انگ علی کو قریب چیلنے کے لیے کہا تو دونوں صاحبزادے کسی اقلاتوں کی طرح مجھے ہی سمجھنے لگے۔

تین گھنٹے کی خلافت کے بعد جہاز کولمبو اتر۔ دروازے پر وہی انٹرپورٹس دو بارہ ہاتھ جوڑے کھڑی کچھ کھڑی تھیں۔

”ای، ای، ای..... آئی مجھے سے معافی مانگ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے ڈرنک نہیں دی تھی ناں۔ اس وجہ سے!“ کیسوی مجھے بتا رہی تھی۔

غور کرنے پر پتا چلا کہ وہ سب کو ”آئی ہوان“ کہہ رہی تھی جس کا حقیقی مطلب ان کی زبان میں ”اسلام علیکم“ ہی ہوگا۔

جیسے ہم پہلے پانچویں آئی پلاؤ فیروزہ بھڑے تھے۔

گئی ہے۔ اس دہشت گردی، بد انتظامی، کرپشن اور لوٹ کھسوٹ جیسی جلاؤں سے نجات حاصل کر لے۔ اللہ اس کو سلامت رکھے اور اس کا برا چاہنے والوں کو اندھے گڑھے میں گرا دے، آمین۔

مجھے ہر جگہ اپنا ملک پاکستان شدت سے یاد آ رہا تھا۔ میں جس چیز کو بھی دیکھ رہی تھی تو بار بار یہی سوچ رہی تھی کہ یہ تو ہمارے ملک میں بھی ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے۔

مثال کے طور پر کولمبو انٹرپرائٹ کے کارڈ ورک کے ایک کارڈ کو ڈیکوریت کرنے کے لیے انہوں نے سائیکل چار کچی تھی کیونکہ اس ملک کے زیادہ تر لوگ اسی سوار کا پرفر کرتے ہیں۔ کسی کارڈ پر ضمیمہ لکھا ہوا تھا۔

پوری دنیا کے دیکھنے والے مسافروں کو اس ملک کی سوار یاں اس ملک کی ثقافت دیکھنے کو بھی مل رہی تھی۔ کسی کارڈ پر وصول وارم لگ رہے تھے تو کہیں ڈی پر عورت اور مرد کا قومی لباس نظر آ رہا تھا۔ ”کیا یہ سب ہمارے ہاں نہیں ہو سکتا؟“ میں نے آفاق سے کہا جو میرے ساتھ ہی کھڑے تھے۔

”بس ساری بات نیت کی ہے۔“ آفاق بھی ساری چیزوں کو دیکھ کر تعجب سے دہرایا۔ ”مجھے مختلف کارڈز پر کڑے ہو کر تصویریں اور مودی وغیرہ بنانے میں مصروف تھے۔ جبکہ تاپاب اور صابر چائے کا آرڈر دے کر ہمیں اشارے کر رہے تھے۔“

”یہاں کی چائے تو پوری دنیا میں معروف ہے۔ چائے پی جائے تاکہ فرق تو پتا چلے کہ گھری چائے سری لنکا کی چائے سے جتنی یا نہیں۔“ صابر ہمیں مطلع کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”جگہ ہوگی میں اپنا اپنا آرڈر دے میں بڑی تھے۔“ ”چناؤ آرام سے۔۔۔ ابھی چار گھنٹے کی ٹائم اور ہے طبیعت خراب ہو جائے۔“ ”تھوڑی کم چیزیں لو۔“ جب میں نے بچوں کو زیادہ چیزیں آرڈر

کرتے ہوئے دیکھا تو پریشان ہو کر انہیں نوکا۔ انٹرپرائٹ پر صرف امریکن ڈالر چل رہے تھے۔ تقریباً پاکستانی پانچ ہزار کی چارکپ چائے پی تو کافی تکلیف ہوئی بلکہ چائے پینے سے پہلے تو مسرور ہو کر ہاتھ ملانے کے بعد کافی زیادہ ہو گیا۔

”اب یہ کیک، جوس، برگر وغیرہ سب کھانا نہیں چھوڑو گے تو بتاؤں گی۔“ میں نے کہا جانے والی نظروں سے ایمان اور علی کو دیکھا۔

”بچے حیران و پریشان مجھے دیکھ رہے تھے کہ تھوڑی دیر پہلے تک قومی ٹیس رہی تھیں اب ناگن کیوں بن گئیں۔ اب انہیں کیا بتانی کہ پانچ ہزار تو تمہاری مال چاہے جس میں سواڑہ کئی ہائی دس، پندرہ تم لوگ ڈاکو جانا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔“

کافی دیر بعد نہ جاگ کرنے کے بعد بچے صحن سے ابھر کر رہے تھے۔ ”بچے تو بچے بڑے بھی صحن صحن سے کھاتے تھے۔ مجھے بھی زیادہ دیر بیٹھنے سے طبیعت خراب محسوس ہو رہی تھی۔ ابیہ اور یہاں بھی کسی کاسٹیک شاپ سے اپنا میک اپ کروا آئی تھیں۔“

”چنا پانچ ہو گئی ہو، کیوں اب اسٹک لگا کر آگئیں۔“ میں نے ابیہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”بھئی ان آئی نے فری کپل میں سے اچلائی کیا ہے کہ اچھا لگے تو لو نہیں تو مت لو۔ فری میں لکوا کر آئی ہوں، یہاں تو ہال بھی بخرا کر آئی ہے۔“ ابیہ اطمینان دلاتی ہوئی بولی۔

اب جو میں نے یہاں کو دیکھا تو اس کے ہال کرل بھی ہوئے تھے۔

”چاچی ہم پر فخر بھی لگا کر آئے ہیں، سو گھنٹیں تو۔“ ”یہاں قابل بنتے ہوئے بولی۔“

”اب مت جانا۔! لوگ سمجھیں گے کہ فقیر یہاں ہیں، لینا دینا کچھ ہے نہیں۔ بس چیزیں لکوائے آئیں۔“ میں نے دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

ہم بچوں کو جمع کر کے جہاز سے اترے آفاق کو تو بعض دفعہ اچھی پریشانی میں دیکھا کہ نوٹس تیرہ لوگ پورے کرنے میں دو گئی اور کے بچوں کا بھی ہاتھ پکڑ لیا۔ اب جو ننگے تو چندہ ہو گئے۔ ہر جگہ آفاق اور نایاب بچوں کی گھر میں تھے کہ کہیں کوئی بچہ مسمت ہو جائے۔

کوالا لپور کا انٹرپورٹ بھی ایک بھول بھلیاں ہے۔ کوئی شریف اور سیدہ حاسادہ آدمی تو تقریباً ایک ہفتے بعد انٹرپورٹ سے باہر نکل پائے گا۔ اب ہم لوگوں کو عادت ہے کہ یہاں انٹرپورٹ سے نکلے تو سارا آگے چلے تو سامان بیٹھوں پر چکر پہ چکر کاٹ رہا ہوتا ہے۔ پتا، اپنا سامان اٹھایا۔ اللہ اللہ خیر صاف ہو گیا سفر مگر.....! جناب ہم بات کر رہے ہیں

دو گھنٹے کے بعد کوالا لپور کی جہاں جہاز سے اترنے کے بعد آفاق سے باہر آکر انٹرپورٹ کے اندر ہی ایک نرینی چل رہی تھی۔ جو مسافروں کو اس مطلوب مقام پر لے جا رہی تھی۔ جہاں پر مختلف جہت پر کئی فلائس کا سامان آرہا تھا۔ کیونکہ ایک وقت پر کئی فلائس ایک ساتھ لینڈ ہوئی تھیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے کہ ہمارے دو دن نایاب اور زندگی جینی ڈولی پہلے بھی آچکے تھے اور ہم سارے لوگ ان کے پیچھے پیچھے دو دن وار بھاگ رہے تھے دو دن جہاز سے اتر کر جب میں نے ٹرین دیکھی تو سوچا۔ ”پانگوں نے جہاز اور ٹرین ساتھ ہی چلا دی شاید یہاں کی گورنمنٹ نے یہ سوچا ہو کہ غریب ٹرین سے سفر کر لیں اور مفت میں انٹرپورٹ بھی دیکھ لیں۔“

انٹرپورٹ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اور باہر نکلنے کا درد از دہا میں ل نہیں رہا تھا۔ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کہاں سے آئے ہیں؟ اور کہاں جا رہے ہیں۔ جب ایک سی کاؤنٹر تین دفعہ نظر آیا تب کچھ میں آیا کہ کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔

”اچھا آج کے دن اگر انٹرپورٹ سے باہر نکل

اللہ کا شکر ہے کہ تھوڑی سی دیر بعد غلام کا نام ہو گیا۔ کیونکہ اگر اس سے زیادہ دیر ہوتی تو واقعی میری طبیعت خراب ہو جاتی۔

چار گھنٹے کی حریف فلائٹ تھی اور پھر میں ٹوئینٹھ کے شہر کوالا لپور پہنچا تھا۔ غلام کا کافی آرام وہ رہی کیونکہ رات کا وقت تھا اور پوری غلام کی لائسنس بھی آف تھیں۔ تقریباً سارے ہی مسافر سوئے ہی رہے۔

میری بہ طبیعت خراب ہوتی ہے تو میں کچھ نہیں کھا سکتی۔ فوراً سو رہا تو میں نے فوراً صبح کر دیا بلکہ اس کی خوشبو سے بھی مجھے تکی محسوس ہو رہی تھی۔ سارا راستہ تقریباً سوئے ہوئے ہی گزرا، بچے بھی تین گھنٹے کی بھام دوڑی سے نڈھال ہو چکے تھے تو وہ سب بھی سو گئے۔

ہم پہنچے کوالا لپور میں!

رات کے وقت جب چار گھنٹے کی حدود میں دو گھنٹے ہوتا ہے تو یہ ملک زمین پر بالکل ستاروں کی طرح بھگ رہا ہوتا ہے۔ اوپر سے ایسا لگتا ہے جیسے سونے اور بیروں کے جزائر رات الٹیں سے لگے ہوئے ہوں۔ پورا شہر روشنیوں سے جگمگ رہ رہا تھا۔

چونکہ جہاز اب کوالا لپور انٹرپورٹ پر اترنے والا تھا۔ میں نے سوئے ہوئے بچوں کو بگایا۔ لیکن بچے اسے تھک چکے تھے کوئی اٹھنے کے موڑ میں نہیں تھا۔ ”بچا تھو نے کا وقت تو اب آیا ہے۔ تم لوگ سفر میں ہی تھک گئے۔“ میں نے علی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ جو بالکل فٹ سو رہا تھا۔

”اگر تھک گئے ہو تو واپس گھر چلے ہیں۔“ آفاق نے بچوں کو چراتے ہوئے کہا۔

بس یہ ہی وارکاری ضرب ثابت ہوا۔ سارے بچے دھڑ دھڑاٹھ بیٹھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی جہاز نے کوالا لپور انٹرپورٹ پر لینڈ کیا۔

لوگوں سے مل کر بہت جذباتی ہو رہے تھے۔

”بس بھائی، وطن سے دور بیٹھے ہیں۔ پروسی ہیں۔ وطن کی یاد ہر وقت ستاتی ہے کیا کریں ملک کے حالات دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔“
ندیم بھائی نان اسٹاپ پول رہے تھے اور کبھی کبھار رہے تھے۔

”باہر رہنے والا جب اپنے لی وہی سیٹ پر ملک کے حالات جانتا ہے کہ پھر وہ بندے سرگئے، ہڑتال ہو رہی ہے۔ نوکری پہ جانے والا ملے دنگ سے کر گیا وغیرہ، وغیرہ تو وہ یہ سوچتا ہے کہ اللہ کا شکر ہے میں ملک میں نہیں ہوں۔“

”تمہارے بارے میں کچھ بتائیں، بھئی! ہم تو یہاں کے بارے میں جاننے آئے ہیں۔“
گفتگو کے کافی عرصہ بعد نے علی تو نایاب نے باتوں کا رخ مٹھارتے ہوئے کہا۔

”کیا میں فیض فیصد ملانی لوگ ہیں۔ تمیں فیصد ملانی قوم جبکہ پانچ فیصد اڑبھین لوگ ہیں۔ پاکستانی تو صرف ہیں یا بھگوس ہزار کی تعداد میں ہیں۔ ملائیشیا میں سارے پاکستانی کاروبار سے وابستہ ہیں کوئی بھی ورکنگ کلاس سے تعلق نہیں رکھتا۔ زیادہ پاکستانی کمپیوٹر یا پھر کپڑوں کے کاروبار سے منسلک ہیں۔ یہاں لوگوں کو حیرت ہوتی ہے جب وہ سنتے ہیں کہ پاکستان میں لائٹ جاتی ہے یا ہڑتال پر پورا شہر تو کیا پورا ملک بند کر دیا جاتا ہے۔ یہاں یہ ان باتوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی بھی پاکستانی جواز کشیا میں مقیم ہے وہ بارہ ملک میں رہائش اختیار کرنے کو تیار نہیں۔ معاشی حالات سے تو شاید وہ پھر بھی سمجھتا کر لیں لیکن امن وامان کے حوالے سے ان کے دلوں میں کافی تحفظات ہیں۔ ملک کے روز بروز بگڑتے ہوئے حالات پر دیا ر غیر میں مقیم پاکستانی کافی پریشان ہیں اور شاید یہاں سے بھی۔“
ندیم بھائی بھی شاید کافی دنوں بعد کسی جان

جائیں تو نصیحت سمجھا۔ ”میں نے اچھے سے کہا جو پریشانی سے بے نیاز اپنے آئی فون سے تصویریں لینے میں مگن تھی۔“

”ای پریشان نہ ہوں..... ان ملائی لوگوں کی شکلیں ایک ہی جیسی ہوتی ہیں اس وجہ سے کنفیوژن ہو رہی ہے۔“ اچھے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

خیر کافی تک درد اور غور، پسینہ ایک کرنے کے بعد ان پورٹ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

”آج تو کافی محوم لیا ہم نے۔ باقی پروگرام کل دیکھیں گے۔“ ایمان مجھ سے ملے سے کہہ رہا تھا۔
واقعی ان پورٹ پر چلتے، چلتے سب ہی اڑ حال سے ہو گئے تھے۔

”ارے لڑکے آہستہ بولو تمہارے ابا ابھی سن لیں گے ہاں تو غصہ ہوں گے۔“ میں نے ایمان کو ڈانٹا جو کافی مارچ پارٹ کے بعد تھک چکا تھا۔
ان پورٹ کے باہری آفاق اور نایاب کے مشترکہ دوست ندیم بھائی ہمیں پک کر کہنے کے لیے کھڑے تھے۔ ان کی بڑی سی گاڑی میں ہم سب دوگ مع سامان پہ آسانی آگئے یہ صاحب خوش قسمت سال سے یہاں مقیم ہیں۔ ان کا کمپیوٹر اور ہوٹل کا بزنس تھا۔ ہم سب ان کے ہی ہوٹل چارے تھے۔

جیسے، جیسے راستے ملے ہو رہا تھا کو الپہور مجھے بالکل اسلام آباد جیسا لگ رہا تھا۔ ہر طرف ہریالی، اوپنی، اوپنی عمارتیں اونچے، نیچے راستے اور بے انتہا صفائی۔

”اور بھائی کیسے مژدہ رہے ہیں روز و شب؟“
آفاق، ندیم بھائی سے مخاطب ہو رہے تھے۔

آفاق بھی پورے ایک دن کے بعد کسی ہم وطن سے مل رہے تھے۔ ہم سب نہیں کا دکھار ہونا شروع ہو چکے تھے۔ یہاں دور بیٹھے ندیم بھائی بھی وطن کے

ان سے مخاطب ہو رہے تھے۔

اب کچھ میری جان میں جان آرہی تھی۔

ان پورٹ سے ان کے ہونٹ کا راستہ تقریباً دو گھنٹے طویل تھا۔ مگر باتوں میں وقت کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا۔

ہونٹ پختہ پختہ، پختہ صبح کے دس بج چکے تھے۔ ہم سب لوگ بچوں سمیت اتنا تھک چکے تھے کہ جو سوئے تو شام کو ہی اٹھے۔

تیار ہونے کے بعد فیصلہ ہوا کہ نوٹن ناؤر دیکھنے کے لیے چلا جائے۔

نوٹن ناؤر کی شان

ملائیشیا کی بھجان

ناؤر ہونٹ کے نوٹن ناؤر سے نزویک تھا۔ اسی جہاز سے ہونٹ کا ایک دیگر جو ملائی ہی تھا۔ ہونٹ کے لوگ ملائی کو ملائی کہتے ہیں حالانکہ وہ یوروپاش سے تو بالکل دو جہ ملائی نہیں سمجھتے چھوٹے چھوٹے قند کاٹھ کے گھٹے گھٹے سے مزین اور تھیں رشتے میں بنگالیوں کے سوتیلے بہن بھائی سمجھتے ہیں سو چلا اس وجہ سے رنگ روپ ان کا صاف ہے اور رنگ بھی نکلا چٹا

خبر بات ہو رہی تھی نوٹن ناؤر کی سیر کی۔

"اب، آپ لوگ نوٹن ناؤر جا چکے ہیں تو میلو دگلی۔"

ملائی دیگر لفظ اردو بول کر اپنے آپ کو شاید بہت قابل تصور کر رہا تھا۔

"ہاں، ہاں! جب ہم جا چکے ہوں گے تو میلو د میں جائیں۔" یہاں ہمارے میاں آفاق اس کا دل رکھنے کے لیے غلط ہی اردو میں اس سے ایڈریس سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اؤ ہو یہ ہمارا ہے پھر تو ہم پہنچ گئے نوٹن ناؤر۔" صاحبہ نے اپنے گھر سے باہر نکلتے ہی جب یہ منظر دیکھا تو بے اختیار بول پڑی۔

کسی طرح ہم نے اس سے یہ سمجھنے کی کوشش کی

پہچان والے ہم وطن سے ملے تھے ہاں اسٹاپ ہی بولے جا رہے تھے۔ وہ اپنے سارے گزروے ہوئے..... روز و شب بیان کر رہے تھے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ یہاں آفاق میاں بھی اپنے دوست سے مل کر کافی خوش تھے۔

"کرنسی کی کیا پوزیشن ہے یہاں پر؟" ہمارے میاں اب اپنے مطلب کی باتوں پر آ رہے تھے۔

"یہاں کی کرنسی رنگت کھاتی ہے۔ ایک رنگت پاکستانی 33 روپے بنتے ہیں۔"

"تو کافی ہو گئے۔" میں کچھ پریشان ہو کر آفاق کو دیکھ رہی تھی۔

"ارے اس پر گورنمنٹ کا ٹیکس بھی جائد ہو گا اگر آپ نے کوئی چیز خریدی تو۔" ندیم بھائی اور ذرا رہے تھے۔

"اب ہم پاکستان کیا گفٹ لے کر جائیں گے۔ ایک گھر نہیں تقریباً چارہ جس فیملی کو ہیں جن کے لیے اچھے گفٹ لے کر جانے ہیں۔" میں ملتی تھی دل میں سوچ رہی تھی۔

"مگر ہمیں شاپنگ کرنی ہے تو اس کے بدلے کہاں جانا چاہیے؟" میں نے بحث کرنے کا علم بھانٹا ہے پوچھ ہی لیا۔

"اگر آپ کو شاپنگ کرنی ہے تو یہاں سے مت کیجیے گا بھائی....." ندیم بھائی کافی مطمئن انداز میں جواب دے رہے تھے۔

"تو کیا خالی ہاتھ جاتے ہوئے واپس جائیں۔ تاکہ لوگ ہماری شکلیں دیکھیں اور ہاتھیں کریں کہ بڑی گلی تمہیں گھونٹنے ڈھڑے بھائی ہوئی آگئیں۔" دماغ پتا نہیں کیا، کیا سوچ رہا تھا۔

"شاپنگ آپ لوگ لٹکاؤی سے کیجیے گا۔ وہ ذرا بی فری دون بے جا رہے ہیں ہاں وہاں؟" ندیم بھائی نے کہا۔

ہاں، ہاں جا رہے ہیں ہم! اس دفعہ تاہیاب



میں عید کیسے مناؤں؟

[illegible]

”یہ بھی سیر علی ہے بھی۔ گھوڑے آئے ہیں، گھوڑے ہیں۔“ یہ نایاب صاحب تھے نرالی مشعل کے تھے۔

راستے میں کئی تاریخی عمارتیں آ رہی تھیں، جن کو ہم لوگ دک، دک کر دیکھ گئی رہے تھے جیسے کونشن سینٹر، ہوٹل اور پارک وغیرہ شامل تھے..... مگر جلدی تھی تو ان نادر دیکھنے کی۔ جیسے آفکار ٹوئن ڈاور کا مین کیمنٹ آئی گیا۔ سب بچوں نے سرایت دوڑ لگائی وہ جلد از جلد اس تاریخی عمارت کو اپنے گیمروں اور موبائل فون میں محفوظ کر لیتا جاتے تھے۔

یہ نادر و مستحکم و مرغوب چیز تھی کہ پرچا ہوا ہے۔ ہر طرف ہریالی۔ چوہے، بھول اور سجاوٹ فنی اور کافی خوب صورت یہاں پر موجود تھے۔ کئی جوان جوڑے چارو کے سامنے لیٹ کر قصور پر غور فرما رہے تھے چونکہ اگر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں تو اپنی بلندی کی وجہ سے گھبراہٹ کا پورا پورا شعلہ لے پاتا۔ کئی منزلہ چھ عمارت میں چلی منزلوں پر شاہجہان سینٹر تھ جوئے تھا۔ جن میں مشہور راجہ انڈرزی و کانٹیکسٹ موجود تھا۔ بچوں کے ٹن لینڈ کے علاوہ کھانے پینے کی بھی کئی کافیاں تھیں۔ چونکہ انگریزوں کی ڈاکو یہاں کافی آفر تھی تو ایک وائن شاہ پر چارو ڈاکو کے کاؤنٹر آفر کارڈ نظر آیا کہ ”چارو ڈاکو کے بیچ فری وائن“۔ مختلف کانٹیکسٹ پر ڈاکو اور کارڈز اٹھائے و دیگر مسٹر سیلو و دیگر کھد کھد بھی تھیں۔ جن کو ہم ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال رہے تھے۔

”آپ انڈیا سے ہیں؟“ اپنے پیچھے سے ایک فیئر مائوس آواز سن کر میں پلٹ کر دوسری طرف ایک خاتون ٹھاب میں کھڑی تھیں۔

”جی نہیں، ہم پاکستان سے ہیں۔“ میں نے
سکڑا کر انہیں جواب دیا۔

”اچھا، اچھا میں کھڑکھڑا کر رہی ہوں۔ آپ کو
 بچوں کے ساتھ کھڑکھڑنے کے لیے آتی ہوں۔ آپ کو

ہندی بولتے سنا تو گئی آپ بھی اڑیا سے ہی آئے ہیں۔“ وہ تارہی تھیں۔

”ہم پاکستان سے ہیں اور ہماری قومی زبان میں ہندی کے لفظ بھی موجود ہیں۔ اس کے لیے آپ کو ایسا لگا ہوگا۔ کتنے بچے ہیں آپ کے؟“ میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے پوچھ لیا۔ اور وہ مسکراتے ہوئے کہہ دی تھیں۔

”الہمد للہ پانچ بچے ہیں۔ الہمد للہ سب شادی شدہ ہیں۔ الہمد للہ میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ الہمد للہ میرے شوہر کا پچھلے سال انتقال ہو چکا ہے۔ الہمد للہ ہمارے اسی میں الہمد للہ قسم ہوئے ہیں۔ اب میں الہمد للہ کی راہ لگتی ہوں۔“ وہ ہانسا ہانسا بول رہی تھیں۔

اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ بعض لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون سی بات کس طرح کہنی ہے انہیں الہمد للہ کہنے کی اپنی عادت تھی کہ انہیں یہ تک نہیں پتا چل رہا تھا کہ کس بات کے ساتھ الہمد للہ لگانا کس کے ساتھ نہیں۔

”جی الہمد للہ مجھے میرے میاں ملا رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو پھر میں گے۔“ میں بہانے سے وہاں سے ہٹی۔

صائمہ سارے بچوں کو سمجھانے کی ڈیوٹی بھرا رہی تھی۔

”اب تم بیٹھو“ میں بچوں کو دیکھتی ہوں۔“ میں نے صائمہ کو بیٹھنے کا کہا اور جو چھوٹے بچے کینڈا میں بیلی کا پلڑا اور چھوٹی بیڑی والی گاڑیوں پر بیٹھے تھے ان کو گھٹنے میں لگ گئی۔

نونن دودھ کے پاپ تک جانے کا کٹ ہے۔

لٹ کے ذریعے اس کے پاپ تک لے کر جایا جاتا ہے۔ مگر ہم لوگ ذرا لیت بیٹھے اور آخری لٹ بھی جا چکی تھی۔ پتے منہ بنانے لگے کہ اتنا دور آئے تھے اور اوپر تک بھی نہیں جاسکے۔

”بھئی اوپر سے بھی جی تو نظر آتا نا۔“

میں اچھے، نیہاں وغیرہ کو سمجھاتے ہوئے بولی۔
”گھٹے تو نہیں ناں۔ اب جا کر کیا بتائیں گے کہ نونن دودھ کو ہاتھ لگا کر آگئے۔“ ایمان اب ناراض ہو رہا تھا۔

”بھئی کہہ دینا کہ گھٹے تھے پاپ تک کسی کو کیا معلوم۔“ میں نے ایمان اور علی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ایسے نہیں ہوتا اسی، سب سمجھ جاتے ہیں کہ جھوٹ ہے پانچ۔ اگر کسی نے پوچھا کہ تصویر دکھاؤ پھر؟“ علی ہانگل ماننے کے سوز میں نہیں تھا۔

”تو اپنی جہاز والی تصویر دکھاؤ جتنا جوتم نے جہاز میں بیٹھ کر بچے کی سمجھنی تھی۔“ آفاق بھی بچوں کی ناراضی سے مطمئن ہو رہے تھے۔

خیر بچوں کو سمجھا کر اور پھر آنے کا وعدہ کر کے دوبارہ ہٹلی کے لیے روانہ ہوئے۔ مگر بعد میں اوپر تک بچوں کو لے کر گئے تھے۔ اوپر جانے میں ایک بچہ لٹ میں زخمی سے رہ گیا تھا۔ یہ الگ کہانی ہے۔ مگر ماشاء اللہ..... ایمان بہت بھگدار بچہ ہے۔ وہ دوسری لٹ سے..... ہم سے پہلے اوپر پہنچ گیا تھا..... جبکہ ہم لٹ میں اتر کر نیچے چلے گئے تھے.....!

خیر..... اس طرح تو ہوتا ہے..... اس طرح کے کاموں میں اور سفر کرنے سے انسان بہت سی ایسی باتیں سیکھتا ہے جو گھر میں بیٹھ کر بھی تو جانتی ہیں مگر سیکھ نہیں جاسکتیں..... اسی لیے تو لوگ کہتے ہیں کہ گڑگڑ گھوٹنے پھرنے والے لوگ زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔

اپنے گھر کے آگن میں ہریالی مجھے ہمیشہ سے ہی اچھی لگ کر رہی ہے۔ اسلام آباد اور لاہور کی ہریالی مجھے بے حد پسند ہے مگر کراچی کی شاہراہوں پر سوکھے سوکھے اور اجڑے ہوئے درخت دیکھ کر مجھے ہمیشہ دکھ سا ہوتا ہے کہ ہریالی آنکھوں میں تراوت سی پیدا کرتی ہے اور فضا کی ہریالی..... مجھے بے حد بھالی..... اور دل چاہا کہ قوی اسٹبل میں یہ بل پاس کروادوں جس نے اپنے، اپنے علاقے کو سرسبز و شاداب نہیں کیا۔

مردم روہ جاتے۔

وہیے چٹ نہیں ملائی لوگ پر انھوں کے ساتھ
آٹلیٹ کیوں نہیں کھاتے؟ ہم نے تو صبح کے ناشتے
میں ملائی لوگوں کو دال چاول اور پٹنی کھاتے ہوئے
بھی دیکھا۔ یعنی نہ یہ دیکھنا کہ صبح ہے یا شام جب
آنکھ ملے یا بھوک لگی تو دال چاول شروع۔ ایک اور
بات ملائی لوگوں کے بارے میں چٹ چلی کہ یہ لوگ
ایک دن میں پانچ دفعہ کھانا کھاتے ہیں۔ ویسے اچھا
ہی ہے کیونکہ اگر پانچ دفعہ کھانا کھانے کے بعد اسے
سے قدر اور صحتیں ہیں۔ اگر اللہ نہ کرے دو تین دفعہ
کھاتے تو دور بین لے کر دیکھنا پڑتا کہ کہاں گئے۔

چونکہ شروع دن میں ہی عدم بھائی سے سارا
پان فاصل کر لیا تھا کہ کہاں، کہاں جائیں گے۔ اسی
لیے آج کا دن سن وے لیون کا تھا۔ یہ ایک دائر
پارک ہے جو یہاں کے خوب صورت دائر پارکس
میں سے ایک ہے۔ ایک بہت بڑی جگہ ہے۔ یہاں
دائر پارک جس کے اندر ایک زو، ایک شاؤنک سینٹر
دائیرہ بنایا ہوا ہے۔

چونکہ ہوٹل سے سن وے لیون تک کا فاصلہ
تقریباً ایک گھنٹے کا تھا تو فیصلہ یہ ہوا کہ جیسی کر لیتے
ہیں۔ جو ہوٹل کے ہی نزویک سے مل جائے گی۔ تو
جناب ہم حیرہ لوگوں کا قافلہ روڈ کے کنارے کھڑا
ہو گیا اور جیسے ہی کسی ٹیکسی کو دیکھا سارے بیچ ہاتھ
دینے کو دوڑے۔ مگر یہ کیا جیسی ہم لوگوں کو دیکھ کر
رک ہی نہیں دی تھی۔

”صانعہ شاہ جیسی والوں کو ہم پہنہ نہیں
آ رہے۔“ جب چار پانچ خالی ٹیکسیاں ایسے ہی ہمیں
دیکھ کر لٹل گئیں تو میں نے اپنی دیوہانی صانعہ سے کہا
جو خود بھی اسی صورت حال سے خاصی لطف اندوز
ہو رہی تھی۔

”کیا ہم روہ کیوں جیسی؟“ صانعہ مجھے آنکھ مار کر
کہہ رہی تھی۔

”کیا مطلب؟ شرم کرو صانعہ اب کیا ایسے
جیسی روہ کی پڑے گی۔ جیسے انٹرین قہلوں میں ہیرہ کی
روہ کی ہے۔ جب ہیرہ سے کوئی گاڑی نہیں رکتی۔“
اب میرے اور صانعہ کے قبضے آسمانوں سے ہاتھیں
کر رہے تھے۔

”ای نہیں نہیں۔۔۔ جیسی رک گئی ہے؟ کہیں
آپ لوگوں کے خوفناک قبضوں کی وجہ سے یہ جیسی
والا بھی بھاگ نہ جائے۔“ اجیہ ہمیں چپ کراتے
ہوئے کہہ رہی تھی۔

”کیسے رک گئی جیسی اجیہ؟“ اب صانعہ، اجیہ
سے مخاطب تھی۔

”بھئیہ بھئیہ کو چھوڑا گیا چاہتی۔ جب یہ جیسی
رکتی ہے۔“ اجیہ رازدارانہ لہجے میں بول رہی تھی۔

”بھئیہ بھئیہ کو چھوڑا گیا چاہتی۔ جب یہ جیسی
رکتی ہے۔“ اجیہ رازدارانہ لہجے میں بول رہی تھی۔
پانچ یا زیادہ سے زیادہ چھ لوگ بیٹھ سکتے ہیں۔ ہم حیرہ
لوگ ایک جیسی میں بیٹھنے کے پکر میں تھے۔ اگر زیادہ
لوگ بیٹھ جائیں گے تو آگے جا کر۔۔۔ جیسی والے کا
چالان ہو جائے گا۔ تو طے یہ ہوا کہ وہ ٹیکسیاں کرنی
جائیں۔ اس فیصلے میں بھی یعنی جیسی روکنا بچے
چھوڑا وغیرہ میں ایک گھٹنا لگ گیا۔ خبر کرتے، کرتے
آخر کار ہم لوگ سن وے لیون پہنچ ہی گئے۔

حاشیہ کے تقریبی مقامات و دھیرہ میں صرف سانس
لینے کا گھٹ نہیں ہے ورنہ ایک جگہ پر اگر تین چیزیں
نی ہوتی ہیں تو تینوں جگہ کا الگ، الگ گھٹ ہے۔

جیسے کہ ہم پہلے والا فلائف پارک گئے کہ پہلے
بچوں کو ڈرائیو دکھا دیں پھر دائر سٹانڈز میں جائیں
گے۔ تو جانے سے پہلے بی، بیو، بونا کا گھٹ لینا
پڑا۔ وہاں پر انہوں نے ایک ٹرین چلائی ہوئی ہے
اور سارے جانور ایک چھوٹے سے مصنوعی سے جنگل
میں کھلے چھوڑے ہوئے ہیں۔ ٹرین میں بیٹھ کر آپ
ان کے پاس سے گزر سکتے ہیں۔ جانور بھی اس ٹرین
کے اسٹے عادی تھے کہ وہ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہے

نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور دائر پارک کی طرف بڑھے۔ اس دائر پارک میں تقریباً آجی دائر سلاخڈز تھیں۔ جن میں کچھ چھوٹے بچوں کی تھیں۔ دنیا کی سب سے بڑی دائر سلاخڈز بھی تھی۔ گیارہ منٹر اوچائی اس پانی کے چھوٹے پرکائی سبز صیباں چڑھ کر جانا پڑتا تھا۔ پھر پانچ، پانچ آدمی ایک ٹیوب میں بیٹھ کر نیچے جھپٹتے ہوئے آتے تھے۔ نیچے تک آنے میں شاید چند سیکنڈ یا ایک منٹ ہی لگتا ہوگا مگر جو ڈر خوف اس پانی کی سلاخڈز میں تھا وہ ناقابل بیان تھا۔ بس ایسا لگتا تھا کہ اب یہ ٹیوب ابھی اور ہم باہر گرے اور پتا نہیں ہے کب تک کی کتنی پائیں گے یا نہیں۔ ٹیوب کے نیچے تیز پانی بہہ رہا ہوتا ہے جو اسے جھپٹنے میں مدد دیتا ہے اور کھسکے یہ سب کو پانی کے پول پر جا کر چھبک دیتا ہے۔ میں اور صاحبزادے کو ایک دو سلاخڈز لینے کے بعد ہی کوئے میں بیٹھ گئے دل اور دماغ قابو میں ہی نہیں رہا تھا غرض شاہش ہے ہمارے خاندان کے بچوں کو کہ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری سلاخڈز میں ایسے جا رہے تھے جیسے ایک گاڑی کے بعد دوسری میں بیٹھ رہے ہوں۔

تین سال سے چھوٹے بچوں کو لے جانا منع تھا اور ہمارے ساتھ تین چھوٹے بچے تھے پھر بھی کوئی نہ کوئی بچوں کو سنبھالنے کے لیے آجاتا تھا کہ ہم انہیں دیکھتے ہیں آپ لوگ جائیں۔

ایک بالکل نیا تجربہ اور غور اور حیرت کا سامنا ہم لوگ کر رہے تھے۔ اعتراف یہی کہ آؤ بے تھا شاید نظر آرہا تھا۔ کوئی سن باجھ لے رہا تھا تو کوئی تو لپے سے اپنے آپ کو خشک کر رہا تھا۔ کوئی کٹی میں بھاگ رہی تھیں تو کوئی نہا رہی تھیں۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ اگر ساحلوں پر ایسی خواتین ریت اوڑھ کر ہی لیٹ جایا کریں تو مٹی سے باہر ان کے چہرے کیسے دکھائی دیں گے؟

تھے۔ حالانکہ ہم سب لوگوں سمیت ٹرین میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ جو زیادہ تر نورسٹ ہی تھے چانوروں سے زیادہ ایکساٹڈ تھے۔ ایسے، ایسے صحت مند چہیتے تھے کہ کسی اکھاڑے کے پہلوان محسوس ہو رہے تھے۔ اپنے بے تحاشا وزن کے سبب ان سے چلائک نہیں جا رہا تھا۔ ہرن تھے تو ان کی۔۔۔ پتھراشا اقسام اور تعداد۔ زندگی میں پہلی دفعہ ہمارے بچے دانتوں والے ہاتھی دیکھ رہے تھے۔

”ایہ یہ کون سا جانور ہے؟“ علی مصمصیت سے پوچھ رہا تھا۔

”جامل..... یہ ہاتھی ہے۔“ میں نے اسے آہستہ سے کہا تاکہ دوسرے بچے نہ سن لیں۔

”لیکن اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے؟“ اور یہ اسنے سارے کیسے ہیں؟ ہمارے زو میں تو ایک ہوتا ہے۔“ علی کافی حیران ہو رہا تھا۔

طرح طرح کے ٹاپ اور پیش قیمت برتنوں کی بے شمار اقسام اس داخلہ پارک میں موجود تھیں۔ ڈیڑھ سو قسم کے چمڑے اور جانور اس پارک میں اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ چھوٹے قد والے گھوڑے (ہم تو انہیں پونی کہتے ہیں) وہ بھی کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رہے تھے۔ چھوٹی جینی کیسوی تو پونی سے اپنا قد عار دی گئی۔

”ایہ یہ گھوڑا میرے برابر ہے۔ اسے گھر لے کر چلیں۔“ کیسوی گھوڑے کی لگام پکڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”ہاں بیٹا، گھوڑا، ہاتھی، طوطے سب ہی کچھ لے چلتے ہیں۔ اچھا ہے گھر میں ہی زون بن جائے گا۔ کھائی الگ ہو جائے گی۔“ میں نے بچوں کی بات میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

”اب لٹکا جائے کب تک یہ طوطے، بکرے دیکھتے رہیں گے۔“ ایمان بول رہے تھے بولا۔

اصل میں تو ان کو دائر پارک جانا تھا۔ خیر سب



بہنوں کی محفل

مددِ صبر

ہو عز از جان بہنو! اسلام بے شک رحمتِ اللہ و رحمتہ کا دیا

ہو محمد و خلائق اس دولت کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر

بہنوں نے دنیا میں اتنی کاجول پالا کیا۔

بہو چاری بہنو! آپ سب کوئی عید مبارک۔۔۔ اس ماہ اہم عید الشہر کی منار ہے جس اور عید آمد آزدی بھی۔۔۔ دلی دعا ہے کہ ہمارے ملک کے سماجی اور معاشرتی حالات ٹھیک ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی حالات بھی اچھے ہو جائیں۔۔۔ ہمارے صرف سیاست دان برے نہیں ہیں، صرف صنعت کار ہی برے نہیں ہیں بلکہ ایک عام شخص بھی اپنی جگہ جہاں وہ کام کر رہا ہے، مگر وہ چوری کر رہا ہے، باخلاقیت کر رہا ہے تو وہ بھی اس برائی میں برابر کا شریک ہے۔ ہم اور ان کو تو یہ سب بتانا چاہتے ہیں مگر خود نہیں کہتے۔ ہم جب تک اپنے بھٹے کا کام لیا عمارتی سے نہیں کریں گے تو ہمارے ملک حالات کو کھتر سوا رہیں گے۔ دنیا کی ہر قوم آگے کی جانب بڑھ رہی ہیں انہوں نے انعام داری سے کام کرنا سیکھ لیا ہے، یہ ہم جو آگے جاتے کے بجائے پیچھے کی طرف جا رہے ہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے وہ تمام اوصاف بھلا دیے ہیں جو مسلمانوں کی آن بان اور شان ہوا کرتے تھے۔ ابھی بہت دیر نہیں ہوئی ہے، آئیں ہم بھی اپنے ملک کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی اچھا کر لیں۔۔۔ کہ ہم جہاں جہاں ہیں وہاں انعام داری اور سچائی کے ساتھ ساتھ کیا کچھ کر سکتے ہیں، کیا کیا ہیں۔

بہو کرشنہ! یہ موصوفات معصوم خزانہ اور کرنی کا انترچ ہمارے ہر شخص کے لیے ہے۔ ہمیں نے بے حد پسند کیا۔ ابھی تک ہمارے پاس اسے منظور نہیں آئے۔ جتنے کہ غلط فہم تو آچے ہیں، ہر آئینہ کے سامنے جا کر دیکھ کر دیکھ کر آپ نے اپنی رائے سے آگاہ کیا۔ بلاشبہ خزانہ اور کرنی بھی مایہ ناز و مافخر ہے۔

اس بات۔۔۔ ہمیں ہم کی زندگیوں میں بھی کچھ کا عذر دینی چاہیے آپ کو پسند آئے گا۔۔۔ جس میں انہوں نے سادگی سے دیکھ کر مانتے ہوئے۔ اور کچھ بہت خوبصورت بنیادیں ہیں جو عین صحت کے ساتھ دیے ہیں۔ اور وضو نہ کرنا۔۔۔ اس طرح کا انسان بڑی خوبی سے بچتا رہتا ہے۔ (زمین و آسمان)

بہو عزیز! کار بھی کرنا اچھے ملک رہا ہے کہ جسے میں نے ایک خواب ساز دیکھا ہے۔ لیکن اسی نہیں آ رہا کہ میں نے کہا دینے کو کرنا تھی ہوں۔ یہ میری زندگی کا راز ہے کہ میں نے ابھی تک رہا تھا جیسے وہاں پہلی مرتبہ تھی ہوں۔ ایسا وقت جو صرف اپنے حساب سے اپنے لیے گزرتا ہے۔ لہذا میں جانتے اور قرآن پاک پڑھنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں تھا۔ میں نے عقلی سے کہا۔۔۔ مجھے تو گنگ رہا ہے کہ کوئی ایسی ہی جانب گنگ گئی ہے۔ لہذا چاہو کہ وہاں سے کھانی کی کڑھکھ۔ اس کے سوا کچھ دل چاہ رہا ہے اور نہ کچھ کرنے کو دماغ راضی ہے۔ ہاں اللہ عاری ان فوٹی چھوٹی نمازوں کو گول کر لے۔ وہ اسی۔۔۔ انشاء اللہ اللہ ضرور کرے گا۔ ورنہ وہاں تھی نہیں۔ ان دنوں تو بہت اچھا تھی کے بہانہ ہیں۔۔۔ کچھ اچھوتی کچھ اچھا تھی دینی چاہتے ہیں چاہتی تھی کچھ اچھا تھی طرح منظور تھا کہ میں، میرے شوہر اور عقلی کی عقل پہلے دینی پہلے۔ وہاں پاؤں گاہے۔۔۔ یہاں ہمارے بہنو ان عقلی کی قدر اور قدر دانی۔ امیر اور مسرت تھے (اشامادہ) انہوں نے وہاں نہیں سمجھا، ایک ٹھوڑی قیمت میں سمجھ لیا اور کون سی جگہ بھی خود کو کھانی اور ہونے کی وجہ سے ہادی، کبھی عین غلط فہمی میری دولت۔ تو ابھی تک میری کبھی۔۔۔ غرض ان پاؤں گاہوں میں دینی، شادی، بھلاں اور دینی کچھ سمجھا لیا اور ہم جوں جوں سمجھتے، سمجھنے کے بعد پہلے دینے شریف پہلے۔ اس طرح ہمارا ہونے سوا ان کچھ سمجھ لیا کہ سامنے تھا کہ ہم سب بہ آسانی بر ملا میں سمجھ لیا جاتے تھے۔ دینا اللہ جانے کے بھی کی بار مبالغہ ہے۔ یہ ہمارے پیارے کی عقل کے ہجر سے اور چہرے کے درمیان جنت کا ایک حصہ ہے۔ جس پر ان دنوں ہجر کھینچ، نیچے

[illegible]

دینے سے اگلی منزل تک تھا۔ سوچے سے ہم ایک روز کو بیٹھے۔ اور بفضلِ خدا یہاں ہماری رہائش مکنا اور ہمیں میں
 تھی۔ جس کا میں گیت حرمِ شریف کے حنائے حجاز سے۔ ان دنوں حرمِ شریف میں قبر بنی کام ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے نقشِ تہ دل سا
 (۱) قبر مکمل ہونے کے بعد اس میں ایک مٹی کا سائیں گے، ہر رمضان سے چھ دن پہلے بیٹھتے تھے۔ رات بھر دعا تھا کہ ہر روز
 بے زور دعا تھا۔ اور رمضان کا چاند کچھ کتبے صواب چڑھا گیا۔ بعضی قبلی مرنے سے پہلے کے، طواف بھی کیے اور آپ سب لوگ
 میری دعاؤں میں شامل رہے۔ بخاری بہنوئی باحقو آپ جانتی ہی ہیں کہ مجھے چاروں بہنوں کے نام ان کے شعروں کے
 نام کے ساتھ یاد ہیں۔ آپ سب کے لیے خوب سی بھر کر دعا کی ہیں۔ بے شمار غرائیں سے ملاقات بھی ہوئی جس
 میں مسز جیسا رمضان بھی شامل ہیں جو کہ اپنی سب کچھ ستر خانہ لگوئے ہیں، ابھی کی اسکول کی سولیہاں ہر جگہ ملتی رہیں۔ غصہ
 ہر جگہ میرے ساتھ رہی۔ مگر ایک مرتبہ طواف کرتے ہوئے ایک ایسا بھی موقع ہوا کہ جب ایک عربی خاتون نے میرا ہاتھ حرام
 کیا اور بڑی تیزی سے طواف کرتے شروع کیا، وہ شاید گناہ بھی نہیں بھلاؤ اور میں دعا بھی کی چھ دن ہی تھیں۔ ان کو کبھی یہ یاد رہا ہے
 اس وجہ سے آج اس کا کہ وہاں طواف میں نے انھیں پائی دے دعا تھا کہ گری اور دل کی وجہ سے وہ بھی پیسے میں ہوری تھیں۔ اور
 عربی میں شعر کے کے بٹلے ادا کرنے کے بعد انہوں نے بڑی محبت سے دوستانہ انداز میں اپنی باتوں کی اٹھیاں میری اٹھیاں
 میں داخل دینی اب غصہ نہیں اور وہ بھی غمی اور میں بڑی سرعت کے ساتھ ان کے ساتھ طواف کر رہی تھی۔ سب ساتواں چکر
 انجام کے قریب تھا تو غصہ بھاگنے کے انداز میں میرے پاس آئی اور کہا آپ کا طواف مکمل ہو گیا ہے اور صاف کہ یہ مکمل تو کیا
 بارہ چکر کرنا میں نے ابھی دوست کو گھر جی میں بتایا۔ مگر وہ کہہ گئیں اور کچھ کچھ حباب اشارے کی زبان

کا م آئی۔ سووی عرب قیام کے دوران یہ احساس ہوا کہ ان کی تکیا میں بھی عربی کے سوا کوئی زبان نہیں سمجھتا چاہتی۔ ہاں ایک بات جو بہت زیادہ گھٹے محسوس ہوتی ہے۔ وہ سوہاگ کا استعمال تھا۔ خواتین طواف کرتے ہوئے اپنی سووی خود ہاتھ میں لیں۔ اپنے شوہر سے تصویریں بھیج کر بھیج دیں، انھوں نے باتیں بھی سوہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سوہاگ کی اسکرین سے دعا کی جڑتے ہوئے بھی لوگ نظر آئے۔ تصویروں کی مڈانگ میں پاکستان کی لڑکیاں بھی آگے آگے تھیں اور دوسرے سماج کی بھی جو بھیا چھا نہیں لگا کر یہاں لوگ اندر کو راخی کرنے آئے ہیں دعا کیے، مانگ رہے ہیں وہاں یہ سب بھی چل رہا تھا اس عمرے کی تفصیل تو انتہا ماضی بعد میں لکھوں گی اس وقت تو بھی جانا تھا کہ میں نے پہلی مرتبہ ہاں کا رمضان بھی دیکھا اور ہم یہ جان لیں کہ روزہ افطار کر دینے کی تکیا خلیفہ ہے تو ہر شخص روزہ سے دعاؤں کی خواہش میں مل جاتا ہے۔

اس دن بھی میں نے بھی احساس ہوا کہ ہماری کون کونساں اور غلی نکاس طبقہ ہمارے مقابلے میں زیادہ آتی ہے۔ ہمارے تمام صوبوں میں سے صوبہ پنجاب سے آنے والے سب سے زیادہ تھے۔ ہر مسلمان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ماضی کا گھر ضرور دیکھے۔ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ عمرے کی نیت کر لیں۔ وہاں جانے کی دستہ ہادی ہمارے پروردگار کی ہے۔ جی ہاں۔ اور اب انہیں اپنی عمر گریوں پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار دہرا مانگنی پڑتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور ان کے بعد صرف تین باتیں کر کر چاہ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی ہر شاخوں کو مدد کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

آیت کریمہ یہ ہے۔

لا اله الا انت سبحانك انى كنت من الظالمين

ترجمہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر چیز پر عجب اور کر دہی سے ناز ہے، میں تمہارے دلوں میں سے ہوں (تو!) یہ حضرت یونس کی مشہور دعا ہے کہ وہ انہوں نے پہلی کے پتہ میں اللہ سے دعا کی کہ وہ انہیں نکالتے ہیں۔ اس کے پڑھنے کے ساتھ کھڑت سے ہیں اور آپ اپنی مصفحات، شاعرات اور قاریوں پر کینہ، جھل کی سرکشاں پر ایک نظر ڈالیں کہ کیا دیکھ رہے ہیں۔

مصنفات، شاعرات اور قاریوں پر کینہ، جھل کی سرکشاں پر ایک نظر ڈالیں کہ کیا دیکھ رہے ہیں۔

ہمارے ہادی پیاری مصنف اور شاعرہ مختلف تعلیم کی سطح پر تکیا میں ملنے لگی ہیں ان میں میڈیسن میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی ہے۔ (ماشا اللہ) جو سوا کونسل اور (ماشا اللہ) قاضی (جی)

ہمارے ہادی پیاری مصنف اور شاعرہ مختلف تعلیم کی سطح پر تکیا میں ملنے لگی ہیں۔ عام عورت عقیدے کے انسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ان کے چودہ افسانے شامل ہیں، جس کا نام سے ہی ظاہر ہے کہ ان کے یہ تمام افسانے آج کے معاشرے کی کہانیاں ہیں جس کا سرکاری کردار عام عورت ہے۔ اور یہ تمام افسانے لکھی کہانیاں ہیں جو ہمارے اطراف موجود ہیں۔ عقلیت کی دوسری کتاب محبت دانگیاں میری دانل ہے۔ جس میں عورت کے وہ تمام دکھ نظر آتے ہیں جو بظاہر کسی کو نظر بھی نہیں آتے۔ خوب صورت سحر نگاری کے ساتھ کہ وہ کی جھلکی کا خوب صورت منج بھی دیا گیا ہے۔ خوب صورت سہ ہوتی اور صرف 300 روپے قیمت ہے۔ کا لکھی اچھا استعمال کیا گیا ہے۔ سگوانے کا پکا نظم یک بہت فریڈ ہینڈلر اور دلاؤ کر لگی۔

ہمارے ہادی پیاری مصنفہ نسیم منیر طوی اونی کا انہوں کا مجموعہ بہت جلد آنے والا ہے۔ (جھلکی مہارک ہار)

ہمارے ہادی پیاری مصنفہ فاطمہ حسنین نے انہوں میں محبوب لڑی لڑی نورم کی طرف سے عزیز نگاری ایما و بشری رحمن کے ہاتھوں وصول کیا، دوسری نغز ان کے حوالے سے یہ ہے کہ تائید کے اعزاز میں شاعرہ افتخار ساجد اور دایاں برومانی نے ایک شاعرہ مطاوعے کا اہتمام کیا کہ لکھی کی یہ شاعرہ اور مصنف بہت سی خوشگوار یادیں لے کر لاہور سے کراچی واپس آگئی ہیں۔ (ہادی جانب سے مہارک ہار)

ہمارے ہادی پیاری مصنفہ فاطمہ حسنین نے انہوں میں محبوب لڑی لڑی نورم کی طرف سے عزیز نگاری ایما و بشری رحمن کے ہاتھوں وصول کیا، دوسری نغز ان کے حوالے سے یہ ہے کہ تائید کے اعزاز میں شاعرہ افتخار ساجد اور دایاں برومانی نے ایک شاعرہ مطاوعے کا اہتمام کیا کہ لکھی کی یہ شاعرہ اور مصنف بہت سی خوشگوار یادیں لے کر لاہور سے کراچی واپس آگئی ہیں۔ (ہادی جانب سے مہارک ہار)

دور تک کے صحرائیں چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہر موضوع کو اپنے اعداد و شمار کا شعلہ کی پھول کھلانے میں جبریت ہی خوب صورت اور مکمل کی ہیں۔ کتاب کی قیمت 300 روپے ہے۔ کتاب منظرانے کے لیے پراگم تاہم عقلی کھنڈن والا اور سے اس نمبر پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ 042-36367329/0333-4261878۔

✽ پاکیزہ کی بھاری معتمد رفاقت جاوید، اسلام آباد پروجیکٹ شاکر کی قریبی دوست رہی ہیں۔ رفاقت نے پروجیکٹ شاکر کے ہارے میں دو کتابیں بھی لکھی ہیں، پہلی عیبیا میں نے دیکھا اور دوسری یادیں پھول میں کرکھتی ہیں۔ دوسری کتاب کی تقریب پڑھائی انعامیہ میں نے ہندو اسلام آباد کلب میں ہوئی۔ معروف اور مقبول شاعرہ پروجیکٹ شاکر کی یادوں کے حوالے سے رفاقت کی یہ کتاب کچھ تحقیق کے کاموں میں بھی کام آئے گی۔ (ماشاظہ)

✽ پاکیزہ کی مستقل قاری فرزانہ شعیب، سوات مرنے کی سعادت حاصل کر کے آگئی ہیں۔ (مبارک باد)

✽ پاکیزہ کی مستقل قاری کول، مہاراج نے نیچنگ کالاج مالے لایا ہے۔ (مبارک باد)

✽ پاکیزہ کی مستقل قاری، ڈاکٹر زریں زہیر کوٹھاری، کراچی اپنے نئے مکان میں شفٹ ہو گئی ہیں۔ (ماشاظہ مبارک باد)

✽ ہماری بھاری معتمد، محسن فضل حاشی، حیات آباد میں اپنی نئی گلی میں شفٹ ہو گئی ہیں۔ (مبارک باد)

✽ پاکیزہ کی مستقل قاری شیریں ظفر ملتان کی بیٹی علیہ ظفر نے قرآن پاک مکمل کر لیا ہے اور اس سال ان کی دواں بیٹیوں نے روزے بھی رکھے۔ (مبارک باد)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

✽ پاکیزہ کی مستقل قاری شیریں، کراچی ہلڈ پریشر اور ذیابیطس میں مبتلا ہیں۔

✽ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی کی ہاتھوں میں سخت تکلیف ہے۔

✽ پاکیزہ کی مستقل قاری فوزیہ شکر اذیشاوری صحت کے لیے خصوصی دعا کی درخواست ہے۔

✽ مستقل قاری تہرہ فاروقیہ ظہور، راک کی طبیعت کافی نامناسب ہے۔

✽ پاکیزہ کی قاری خدری ملی مدال پڑھتی تھیں حال ہی میں۔

✽ شاعرہ اور مستقل قاری نگارہ عین غنی، لب، ملا کوئی طبیعت ان دنوں بھر پور خراب ہو گئی ہے۔

✽ ہماری بھاری معتمد رفاقت جاوید، اسلام آباد میں ہوں سرج طالت پر ہیں۔

✽ ہماری بھاری شاعرہ شگفتہ شفیق، کراچی کی طبیعت قدرے نامناسب ہے۔

✽ شاعرہ فریدہ و خانم، لاہور کی بھائی مولہ باجک سے تگم کر رہی ہو گئی ہے۔



بھو ذکیہ العجب، کراچی سے۔ ”باب بیانی کی ترک و فاجہ کی سیر کے ساتھ جاسوسی اعداد میں قاری کو انکی قسط کا اظہار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کیونکہ فرما کا کائنات اقلیت بہت پسند آیا۔ کیا کچھ نہیں تھا اس جہالت میں۔ اولین دن۔ شام شہر بارہاں میں کہانی آگے بڑھی ہے۔ اس کے مرکزی کردار کو بہت اچھی طرح چٹنی کیا گیا ہے۔ ورنہ کیا ست دان اس طرح کے کہانیاں ہوتے ہیں۔ لکھے اس ناول میں دو عالم ہیں بہت اچھا لگا لگا۔ ابھی ہوئی کہانی کو سمجھو گے لکھا دیا ہے۔ ناول فرما کی پہلی تاریخ بہت اچھا تھا۔ فرما کا ترک کی خبر بھی جتنی خوش کر گئی۔ اس کا قاری تنظیم خیر طوی اور سائرہ قیصر کی خبریں میں سوسائٹس۔ کارز میں نہیں، اپنی کی دہائیاں ابھی گئی۔ دیکھ کارز ابھی بہت اچھے گئے۔ ذہنت نے فرما کا سے ملاقات کر دہی، شہر ہے اس انداز کو چہ ماہ کیوں گئے، حیرت ہوئی۔ بہر حال اچھا تھا۔ نیلوفر حمای سے ملاقات چھتر کو کر پڑ رہی۔ نیلوفر کی باتیں تو ہمیشہ اچھی لگتی ہیں۔ اسٹیل نیلوفر کو کھڑے۔ ہاں نیلوفر کو کتاب کی بھی مبارک باد۔ خدری اور سولہ خدری سے ساتھ نیلوفر کی تصویر بہت اچھی لگی۔ خدری اور حیدر ہوئی چاہے تھیں۔ شائستہ زریں کا سرو سے ہمارے مدافن کے حوالے سے بہتر ہیں تھا۔ جلتنگ کے اس ماہ خاکے زیادہ تھے اس لیے منظرانے کا سوا بھی زیادہ دل گیا۔ اپنے تھے۔ مدینے کے ستر کو پڑی شکل میں کب لاری ہو۔ امید ہے کراچی

دعاؤں میں پاد رکھا ہوگا۔" (اتھرنے کا شہر یہ آپ سب بخش اچھا کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ آخری طور پر بھی شامل تھیں)

بھ سمنز نہت اشتقاقی، کراچی سے۔ "سرورنی اچھا تھا مگر رمضان کے حوالے سے اگر اس کے سر پر دیا جائیگا تو حرج اچھا ہو جائیگا۔ تینوں اول ٹیک سی چار ہے ہیں۔ نیلوفر مای کو بہت موی کے ساتھ فریج حسین بھی کیا گیا ہے۔ اس کو کہتے ہیں کوزہ میں دریا بند کر دیا۔ وہ آئے بزم میں فرزانہ کا اعتراف اچھا لگا۔ اگر ان کا کوئی افسانہ بھی شائع کریں تو ہمارے لئے قدر کی کمی ان کے اعادہ فریج سے آگاہ ہو جائیگا۔ شائد زوریں کا سرورے ہیئت بہت اچھا لگتا ہے اور آخر شہادت کا پانچ سلسلہ علم صرف اپنی بہتر ہیں۔ بے حد سادگی کے ساتھ وہ موضوع کو لے کر نقل دیتی ہیں جس سے قدر کی کمی کی معلومات میں بھی یقین اضافہ ہوگا۔ روحانی طور سے رمضان کے حوالے سے ہیں اس لیے بعد پندرہ آئے۔" (اتھرنے کا شہر یہ)

بھ فیروزہ تنگم، کراچی سے۔ "جون کے پاکیزہ کا فن خاص آپ کے روحانی طور سے تھے۔ جو اس ماہ کی ضرورت تھے۔ آخر شہادت علم کے بارے میں بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ شہر ہے اس ماہ تا عمل پر دیکھیں کتنی تھی۔ دودھ برہاء دیکھ کر دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔ لذت اب احتیاط کی جانب نظر آ رہا ہے۔ دھت سراج نے بہت اچھا لکھا۔ صبر و سید کے ہاں اچھا بہت نظر آ رہا ہے۔ مگر وہ مگر ہیں کھانا بھی جانتی ہیں۔ ان کا ناول بھی اچھا لگا رہا ہے۔ انیسویں میں ٹیکہ فریج اور فرزانہ جیل روانے میں ٹیکہ فریج فرزانہ کے سادگی سے دیے ہوئے جملات بہت اچھے لگے۔" (آپ یہ دیکھئے کہ ایک مگر کی جیل خانے والی استاد نے اپنے جملات میں ایک فنکار بھی مگر کی جیل کا استعمال نہیں کیا اور سچا سچ میں رہنا لے دیے مگر آخری نظر نہیں دیا تھا۔)

بھ سائرہ رؤف، کراچی سے۔ "میں اور میری دونوں دھت سراج دھت اور آخر رؤف پاکیزہ دھت کی سے پڑھتے ہیں۔ دھت میں نے پاکیزہ پڑھنا شروع کیا تھا تو صرف پلٹ کر اور ان کی تعلیم کے چکر چھوڑ دیا کرتی تھی مگر جب میری باپنی نے مجھے بتایا کہ اس میں سب سے خاص تو بہنوں کی مکمل ہوا کرتی ہے۔ مگر وہ چارہ اور جب میں نے یہ مکمل پڑھنی شروع کی تو مجھے ایک عجیب قسم کا لطف محسوس ہوا۔ پاکیزہ کی کہانیاں کوئی نہ کوئی انسانی حقیقت ضرور دیتی ہیں۔ میں اپنی دھتوں کو لکھی کہانیاں لازمی پڑھتی ہوں کہ میں سمجھتی ہوں کہ پاکیزہ ہماری دلچسپی کی بھی حقیقت بھی کر رہا ہے۔ ہاں دھت سراج کو میرا اسلام ضرور دیکھئے۔" (اس سائرہ مکمل میں طوطی آ رہی ہے۔ ان کی دھتوں کو کتنی تم نہیں گے کہ وہ بھی ان کی آواز سے نہیں آگاہ کریں۔ پاکیزہ کی پندرہ کی کے لیے منظور ہوں۔ ہاں دھت سراج بھی آپ کو سلام کہتی ہیں اور اپنے ناول کی پندرہ کی کے لیے شہر یہ بھی)

بھ سمنز شیریں سلیم، لاہور سے۔ "فرزانہ کا سرورنی کا اعتراف اچھا لگا۔ نیلوفر مای کی شہر یہ کا احوال بھی پندرہ آیا۔ اپنے پندرہ کو ہیئت مزہ دیتی ہے۔ بہنوں کی مکمل کے ساتھ مجھے اب بھی تم سے لگ رہے ہیں۔ صبر و سید کا ناول شان سے آگے بڑھ رہا ہے۔ امانت بھی ٹھیک انداز میں سن کر ہونے کو ہے۔ روحانی طور سے سامع بھی تھے اس لیے سب ہی مستفید ہوئے ہوں گے۔ سب افسانے اچھے تھے اور تمام مکمل حرج کے۔" (پندرہ کی کا شہر یہ)

بھ گفتہ فیش، کراچی سے۔ "جون کا شمار اچھا لگا رہا ہے فرست کلاس آخر شہادت کے علم صرف اپنی بہت اچھا لکھا ہے۔ تینوں ناول اچھے رہے۔ شائد زوریں کا سرورے پندرہ آیا۔ افسانوں میں سمنز فرزانہ اور فریج جیل، اسما قادری اور فرزانہ فریج نے لڑا دھت کر لیا۔ پہنچ کی مکمل لا جواب کا دار زب بے حد شمار تھے۔" (اور تمہارا اتھرنے کا شمار ہے)

بھ سمنز افسی عمران ملاہور سے۔ "شدید کرکشی میں پاکیزہ نے غلط سے موسم کی طرح سکون پہنچایا کیونکہ اسے چن کر کہا گیا لگتا ہے جیسے کسی اپنے سے ملاقات ہو رہی ہو۔ گریوں کی پھنساں شروع ہو چکی ہیں اور کتنی کھٹکھی کی کو فست پچھ رہی ہیں تو چھینوں کا نام سن کر میرا دل بھوں کی طرح بار بار ہورہا ہے کہ چلو دے پڑے تو اپنے گھر کو مکمل وقت دے سکوں گی۔ آخری یقین کریں اس لوڈ شیڈنگ کے تو چھینوں کا حرج بھی خراب کیا ہوا ہے نہ کہیں جانے کو دل کرتا ہے اور بدل کرنا ہے کہ کوئی آئے۔ دیکھئے ایک بات تا نہیں کر کیا پاکیزہ کی پوری محم اور تمام پاکیزہ پڑھنے والے اس لوڈ شیڈنگ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے جس نے تمام انسانوں کو نفسیاتی پریشانی کا رکھ رہا ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے باخبر مانا کہ میں اپنے ارد گرد لپٹا کھائی کا خول تو زنا چاہے مگر جہاں تک مجھے لگتا ہے کہ آج کے دور میں ملنا مانا جو کم ہوا ہے اس کی اصل وجہ بنگالی ہے کیونکہ گھروں کا بجلیت وہی ہوتا

ہے اور پہلی روز بروز ہی چارہ پی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی آپ کے گھر آئے تو خاطر داری میں ہی اترتا بیٹھ جاتا ہے کہ آپ کو باقی مہینہ سکون سے گزارنا مشکل نظر آتا ہے (ٹھیک کہہ دی ہیں آپ) کہ اسے ۱۲ ماہ سے دن گئے۔ آٹھ دن رکال کی کہانی تھی۔ خدا نے جو اسرا تو قیامت کے دن ضرور کرتی ہے مگر انسان کو اس کی لطیفوں کا احساس اس دنیا میں کروا دیا جاتا ہے۔ باقی تمام مسئلے بھی اس دن گئے۔ بہنوں کی غلطی تو پاکیزہ کی جان ہے۔ جس میں مختلف بہنوں کے خطوط چڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ان سے آدمی ملاقات ہوگئی ہے اور آپ نے بھی کہا کہ اگر کہیں کی بھینسوں میں بھانے پھریاں ملیں اور فیشن کی طرف متوجہ ہوں۔ انہیں گھر داری کی شخصیت چاہیے کہ اصل دیر بیکار ہے جو کہ ہمارے سرسری میں کام آتا ہے۔ "اگر تم اس کے لیے ماحول لوگو کہیں کو وہی طور پر چکر کراؤ تو ہاں کافی کام ہے۔ مجھے پتہ چلے کہ بہت ضرور آتا ہے جہاں بیٹیاں ہاں کو چارہ پی ہوتی ہیں)

بھو شخروادی کا نکات پوچھ کر سچی ہے۔ "رضعت آئی کا دل امانت بیٹھ کی طرح اسرافگ ہے۔ لوح و دایست رضعت آئی۔ آپ جو مصطفیٰ اور مشکل تبصرہ نگار، شاعرات و تجربہ کی مصروفیات کا ذکر کرتی ہیں بہت حراوے جاتا ہے وہ نہ سونا ڈانگسوں میں ہم جس قادی سکون یا معنوں کے بارے میں تصورانی خاک کھاتے ہیں اس سے مختلف جب چاہتا ہے کہ وہ محترم مائی داری کے عہد سے پورا فخر ہیلائے ہم بڑے بڑے جتنے ہیں وہ ایک جزئین سے قطعی اور محنتی چیز تو بہت عجیب سامعین ہوتا ہے۔ پاکیزہ کے لیے اچھا دل نیک خواہشات اور بیست و شش "لا فاداش)

بھو ستریم تاجی لاہور سے۔ "آپ کے خط کا جواب بہنوں کی غلطی میں جو حوصلہ و خوشی کی لہر سارے جسم میں برقی رو کی طرح دوڑ کر ان دنوں دل کو چھارے کر گئی۔ اس ماہ کا رسالہ بھی حسب معمول شائع ہوا ہے۔ اور یہ واقعی لا جواب ہے۔ انسان معاشرتی معائن ہے۔ اگر ہمیں محنتوں اور مشقوں کی رفاقت نہ ملے تو ہم غم بانی کے چوڑے کی طرح سر جھاک کر ٹھہر جاتے ہیں۔ سچی محبت اور دوستی سے بڑھ کر کبھی دولت کوئی نہیں ہے۔ امانت اور سلامتی اس کی بھلائی سے دانا لگ رہی ہے۔ باقی انسانے کچھ اچھے لگے کچھ خاص معلوم نہیں ہوئے۔ میرا حسب اچھا لگا۔ "میں بھوک اور محنت دنیا کے لیے خصوصی صحت کی دعا میں ہیں۔ روحانی طور سے تو ایمان کو اور تازہ اور مضبوط کر رہے ہیں۔ خط کے وہ ماحول ان کی بات نہیں کرتا ہے تو بڑے کوئی اور اچھا مسئلہ شروع کر دیں تو بھلا ہے (آپ بھی اپنی توجہ چاہیں کہ کیا شروع کریں) بھلائی میں غنا کی بہت پختہ آیا۔ آئی غلطی اتفاق کے اور آپ کے اعتراض کا بہت شہت سے انکار ہے۔ چنانچہ جلدی یہ فرمائش ہوئی کریں اور تمام تبصرہ نگار بہنوں کے لیے دل سے دعا کیے اور مانگے کہ میں نیز شفقت نے میری دعا کا پتہ کاش وہ ہم سب کے دل میں جو بکڑ لے اور بہت سی باتوں کے نصیب خوشی سے جھکا جائیں۔ اس قدر حق کی تلاش خیر کے دل سے بڑھ کر جو ہم ہوتا ہو محسوس ہوتا کہ بڑی مشکلات کے بعد جاپانی ہوں لیکن رہتے کہ یہ کی شکر اور جہاں کہ وہ صحت و استحکام دیتا ہے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش دماغ اپنے طور کے ساتھ حراوہ ادا کرنے کی ہے جو دوسراں کی لگی کی وجہ سے ہوئی نہیں کر سکتی لیکن مجھے اپنے اندر ہوا کرتا ہے وہ جہاں کی غیبت پر ہوا ہم را یقین ہے کہ میری یہ حسرت ایک تباہ کن ضرر ہے۔ وہی کوئی ذرا میری بارستہ کل ہی آئے گا۔ آمین۔ "لا فاداش ضرر نہ لگے گا۔ آپ میرے کہنے کی بات نہ کروائے کی دے داری باری تعالیٰ کی ہوگی اور آپ خود جہاں رہ جائیں گے کہ وہ بھلائی ہم دیکھ رہے ہیں۔ "شمارہ قدرے جلد ملا۔ اس عہد سے سوچا کہ آپ کو فواد گھر کرائے کا اہتمام کرواں۔ ایک بات وہ ہے کہ میرا نام ہے ناخن، پینچر کا کچھ کاغذ، رنجیت سیرا کی پمپ انفریجین ٹیپ اب ہی آپ نے فریک دیا کافی سٹوکا ہوا ہے۔ پینچر کہانی کو جلد واضح کریں۔ میرا امید کو پاکیزہ میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ گھٹت میرا طرہ حراوہ کیا جوں کے شمارے کو چڑھ کر ایسا لگتا تھا

استقلال پیر حلال

قادر مین پنا پاکیزہ کو ہم نہایت دکھ کے ساتھ اطلاع دے رہے ہیں کہ ادارے کے دیرینہ ساتھی معروف مصور شاہد حسین طویل علالت کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ تمام قارئین سے سوز و غماخ کے لیے التماس ہے۔

جیسے میرے سر پر حد ہے ہوں اسی لئے بھی بھرتی ہے۔ اُم ایمان وہی دین ہے اس کے بعد پھر تک کی طرف بڑھے جسے چہرہ ک
شکراست ہوتا ہے روز جاتی ہے۔ پاکیزہ و انزی میں اس بار بھی اپنی شاعری نے دیکھی بہت دل نوا پہلے کیا کہنہ ہوا ہے۔ ”گمنا
اگر آپ کی شاعری نگہ جاتی تو دوسرے کو کون کے دل ٹوٹ جاتے۔ ہماری خود ہاندگوش ہے کہ گمنا اپنے اسامات تخریش
تجسوس اپنے آپ کی ایک نظم کج کر کے گمنا دیں گے)

بھہ مشکل ملک احوال شاہد ہے۔“ مجھے اس شادیاں آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔ وہ شوق تو مشترک ہیں ڈاٹھست
چہرہ اور کوکب کرتے۔ گاؤں میں تو دونوں وغیرہ نہیں ہوتے مگر گھر میں حضور ہے جو ضرور ہوتے ہیں جن میں کھانا پکانے کا اپنا حور
ہے۔ میں آپ کی فریڈ جانا ہوں گی اس فریڈ کو میرے کی طرح جنت جنت کرکوں گی۔ اگر میری فریڈ شپ تو حضور کر لی تو
میں فیصلہ اپنا تحارف کجیوں گی۔ (میں ضرور) پھر تک میں بڑے لوگ بہت اچھا لگا بلکہ معاشرے میں ہونے والی حقیقت کی
عکاسی کرنا نظر آیا۔ میں اکثر گفتگوئی ہوں میں حسب معمول کا نکات مہر الخیم ہر شے عینہ، براہین نظر آئیں۔ سخیوں کو دل سے
چہرہ ہے لک میرا سہیرہ شمال ہی نہیں تھا۔ شرابے ہو یہ لکھک، ایک بہت اچھی کاش، اس سے بہت سوں کا بھلا ہوا ہے۔
جراک اللہ۔ جب بات ہو بڑے، بڑے کھلیریں کی جیسے ہماری مطالعہ جی لکھے دہائی کی رشتہ سراج تو جانے کیوں نظم بھی ان
کی حقیقت میں رک سا جاتا ہے کیونکہ وہاں کو اس قدر خوب صورتی سے استعمال کر لی ہیں۔ یہوں کی شکل سے آگے بڑھے تو
پاکیزہ و انزی سے لطف اندوز ہوتے۔ وہ آتی تھی آقا ق سید آپ کے کیا کہتے۔ مگر آپ جی خوش قسمت کہ میرا بھی آتی انہم
کی جینی ہیں۔“ (گمنا میرا اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ آپ بھی محبت کرنے والی اور عارفہ دل ہماری نہیں ہوں)

بھہ نور افغانی سچ، مختار پور سے۔ ”یقین کریں اپنا نام نہ کہہ کر بہت خوش ہوئی کہ اپنی لکھی سے مستحضر ہوں میں مجھے بھی
پارو کھا پاک آپ کو بہت ساری محبت دے آئیں۔ ہائی آپ کے کدو جاتی حضور ہے چہرہ کو دل بہت ہے آپ کے کان ہاتھوں کو
چہرہ لوں جن سے آپ ہمارے لیے اتنی مفید باتیں کہتی ہیں اگر کھولیں گے تو کیا نہیں کہنے آگے نکلی جائیں۔ جو ہر دوں
برس ہائی آئیں۔ مٹی کے پاکیزہ ساگرہ خبر میں شہد فواز کے جواہر لے مارا، دیار بہت ہنسایا۔ صورت بھی بیکاری گی۔ ہائی
سب گریہ رہی بھی بہت اچھی اور سخی آموہیں۔ امانت ہر شام شریک بہت شوق سے چڑھتی ہوں اور صوبہ کے لیے پار
سے دعا کرتی ہوں اللہ پاک آپ کی بات کو مستور کر دے۔“ (آپ کی دعاؤں کے لیے جراک اللہ)

بھہ اُم دعا، آزاد کشمیر سے۔ ”مستم سے ابھی کاغذ تم لکھا ہوا تھا کہ بڑی جی، مانے جھوٹی میرے کو بگاڑا جس کو میں نے
آدمے مجھنے کے بعد بڑی مشکل سے ملا تھا۔ یہ سراج علی ماؤں کی حالت آپ سوچ سکتی ہیں کہ ہر ماہ چہرہ لکھت ہم ماؤں کے
لے کہ قدر بھاری کام ہے۔ کتنے ماؤں نے، کتنے مٹی خدایہ ایسی جن کی خرابی میں لیکن کوئی جانکر کچھ نہ بچے، ماشا اللہ میں
نے کچھ ترسائیں میں آند کیا ہے مگر اب تو یہ بھی باتیں کہ کیا پڑھا تھا۔ آپ نے بڑا اچھا بھلا یہ لکھا کہ ان گریہوں میں کجیوں کو گھر
کا کام کھانا پکانا، سلائی کرکھائی کی ابتدائی تربیت دینی چاہیے۔ میں نے تو جو بندہ مجھے ملے اسے ضرور مشورہ دیا۔ میری دو دھیاں
ابھی باختر سب ساڑھے تین سال اور چھ ماہ کی ہیں، اگر نہ ضرور ان پر آدھا کر دوں کو مشورہ دیتی لیکن گھر میں کام کرنے کے لیے دو
تین لڑکیاں آتی ہیں بہت بھلا اور تعلیمی پاک صفت کا کام دو صفت میں کرتا اور ماشا اللہ پڑھائی میں بھی تیز ہیں ان کو جوڑوں کا ورد
ہے تو ان کی مدد کرنے آجاتی ہیں۔ میں نے ان کو کھانا کرائی سلائی مشین دلا دیا اور ہمارے گھر لے آؤں دنا ایک کتاب مجھے خوش قسمتی
سے ملے ہوئے اسی سے سلائی بچھوایا، کچھیں ان کی توجہ دلائی جا چھا مشورہ صحت ہمارے ہے۔ انہم آپ پاکیزہ سہری دال اور پتے ان کی
مختلف ترکیبیں تو کھیں یا نہیں یہ مہاں نامی گھر کی ایک لکھی اور ایک بھی چیز سے کوپ کیوں جاتے ہیں۔ مٹی خرابان ہے کہ
ان دو چیزوں کو مختلف مختلف طریقوں سے پکاؤ۔ جواب دیتی ہوں کوئی پراہندہ سہری دال اور پتے کیسے کھا سکتا ہے؟ بہر حال
مہاں بھری کے باب تک ملکی پچھلک صفت کے چھڑے نہ ہوں کھانا انہم ہوتا ہے نہ کھن کی سانس آتی ہے۔ اللہ نے رشتہ ہی اتنا
بڑا دیا ہے اس طرح بھی کون کی کر آپ کی کیا مصلحت کج میں دو ستوں کی مصلحت ہے۔ لیکن سے بھی عارضی ہو سکتی ہے مگر جو بے تعلقی
دہتی میں ہے وہ کہ اور دہتی میں نہیں۔ سب دہتی اپنی جگہ بڑے اور محترم۔“ (انہم دعا اس مصلحت میں خوش آمد ہے تمہارے

مرزا مستقیم پوچھا : ”آج میں نے کربلا کے کھڑے جانے ہیں، کاش میں آپ کو کھلاکتی جو آپ میرے اطراف میں کہیں دیکھیں۔“ (آپ نے کھڑا ہوا میرے کھالے۔ میں بھاری بھر کم تر ضرور نظر آتی ہوں مگر خوش خوراک پر کڑھیں ہوں۔ جی رہا ہے۔) مرزا نے کہا : ”مگر کربلا میں بھی ضرور دیکھیں۔“

[illegible]

یہ غزالہ دینی بھروسہ رکھتی تھی۔ "آپ کی صحت کبھی ہے؟ خدا رسول، عقلی، ذہنی سب کیسے ہیں؟ اب کوہنری طرف سے ایسا دس مہینہ مبارک۔ رمضان ایسا کھرا ہے۔ کسی بچن کو اگر آپ بچان کے بعد چھٹا اور دواں کم کرنے کا کوئی نسخہ معلوم ہے تو ضرور بتائیں، انکار دے گا۔ اطباء سے جو بچن، بیہوش کی عقل میں شریک ہوتی ہیں ان کو خصوصاً سلام۔ بہت شوق ہے اطباء جانے کا۔ افریقہ سانچاں اور جیبری کی کامیاب ساری شاہجہان کرنے کا جو کچھ انجلی دوست کی تلاش میں ہیں۔ ہم حاضر ہیں، ہمیں۔" (انجلی کا شمار انہماک سے غلی ہوئی ہے اور وہ بھی آپ بچان سے۔ اپنا اور اپنی بیٹی کا خوب خیال رکھو۔۔۔ اطباء بعد میں جانا۔۔۔ چلتے آتے آپ کو اور اپنی بیٹی کو بھی)

کچھ غصہ نہ کیلائی، سچ جنگ ہے۔" پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں۔۔۔ ایک دفتر آپ سے فون پر بات ہوئی تو اس سے مجھے توڑا سا حوصلہ کراپ، ہر کسی کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ چنانچہ انہی میں ملکی آپ کی بد قسم میں شریک ہو رہی ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ ماہی نہیں کریں گی۔ پاکیزہ بہت اچھا رسالہ ہے۔ ہر کسی سے ہٹ کر اس کی جتنی بھی تحریف کی جائے کم

ہے۔ یہ ہمارے گھر میں ایک فرد کی ہی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ میری امی بہت خوشی سے بڑھتی ہیں اور میری مائی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور پاکیزہ کامیابی دے۔ اور آپ دونوں پر بھی اچھی، اچھی باتیں پھیلائی رہیں۔" (اس مکمل میں خوش آمدید۔۔۔ آپ ہر ماہ اس مکمل میں شرکت کریں، مجھے دلی خوشی ہوگی)

یہ پاکیزہ استقبال، تحفہ ہوا اور۔۔۔ "پہلے میں پاکیزہ گل کے نام سے کھیتی تھی لیکن ایک اور لیکن بھی میری ہم نام ہے۔ اکثر غلطی ہو جاتی ہے اس لیے میں اس طرح پاکیزہ استقبال کے نام سے گھڑی ہوں۔ آپ امی ہم چالیس سال سے خاموشی کا قادی ہیں کیا ہمارا نام بھی اتنی کھلی ہوئی، کھلا دیکھیں مائی سوچنا چاہئے۔" (آپ پاکیزہ شہنشاہی سے جواب آپ کا نام شاعر ضرور سوچنا چاہئے گا)

یہ روشنائی عبدالقیوم پانویری، کراچی سے۔ "آپ جیسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں مگر چاہئے والے زیادہ زیادہ ہوتے ہیں، اپنی خوش اسلوبی سے پاکیزہ کو چلا دینی، رانڈز کو مباح دینا اور ہر کسی کے پیادہ کا اتنی محبت و عقیدت سے جواب دینا بلاشبہ آپ کی ہر طرح کی سب سے بڑھے بلاشبہ دشمن آپ سے دلی محبت ہے کیونکہ میں کتاب اور رسم سے بہت محبت رکھتی ہوں، آپ نے میرے اس خوش گوراستہ پر داخل بہت دور کی مگر اس پر حال ہے۔ سب سے پہلے اس دہے کریم کا شعر کہ آپ کو چاہیے ہے شطیاب کیا۔ پھر آپ کا شعر ہے کہ ہمارے دل میں میرا انسان شائع کیا اور بہت زیادہ، شعر ہے کہ مجھ ناچ کو ہاڈر شخصیات میں تھی رانڈز کے ساتھ ہمارا کہ۔ کس بات کے لیے آپ کا شعر ہے ہمارا کہ۔ ہمارا شعر ناچو، مائی کچھ 28 جن کو آپ نے انسان سے پہنچنے کا چاہا اور مائی امی استاد سرین کے کچھ کے ذریعے۔ اور میں نے ان کی کہیں انہوں نے کسی اور کا انسان نہ کہ میرا کہا ہو گا۔ مگر یہ بھی کچھ قاضی میں ماہنامہ پاکیزہ میں لکھنا تو بہت ہی خوشی ہوئی، دلی اور دل انکار کے بعد ہمارا چھپا انسان پاکیزہ میں چھپا۔ پاکیزہ سے میں نے کھنڈ ضرور لکھنا تو کچھ قصیدے ہی سے ہی بے خوشی جان کر مشکل ہے، مگر صبر و سہمیدگی سحر رانڈز کی قور کی قور کو پسند کرنے کا ذکر خود صرف ایک ہی چاہیے کہ اسے بھی جلد میری قور میں لکھی کیونکہ میں اور بھی قور پر لکھنا چاہتی ہوں۔" (پیاری رشتہ ہے آپ اپنے ہر فرد اور ہر انسان کے آخروں میں اپنے مکمل اندر میں ضرور لکھیں تاکہ آپ کا انسان کا اثر اب دیر دیر رہے)

یہ نجم کنول، گاؤں پایا ٹھری سے۔ "اسمیرا آپ امی دیر دیر میرا غلطی شائع ہوا۔ آپ امی شاعری شائع کریں قور میں۔ آخر کیوں آپ امی۔ جب میں نے پاکیزہ دیکھا تو میں ٹھری گئی۔ پھر جب موصول ہوا مجھ پر ہمارا خانا چاہا دیکھا پھر دل نے سوچا کہ آپ امی کو میری جگہ تو دے۔" (گواہیں آپ کی بے حد قدر ہے، بڑی عزت ہے آپ کی۔ ایشا طاہر جو بیٹوں کی مکمل کے محبت کا کوئی شعر ہوا اسے دیکھ کر ہر گواہیں شاعر ہوا۔ جس کے لیے آپ امی دیکھنی فی تصور کے ساتھ اپنی شاعری کا شعر احوال صحیح کئی ہیں کہ بہت جلد۔ اب انہیں دے دیا جائے گا۔ وائٹ وائٹس پارٹیم میرے جسم کو شطرنج کی ذات کا بیٹھنے کا دل لکھوں گا تو ہر سیرت ملاحظہ ہوا اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو کچھ شام میری زبان پر جاری رہا دے اور انکی جگہ سے مجھے رانڈز دے ہر پاکیزہ کا وہی ہوتا ہے۔ پارٹ ہوا لیکن تو مجھ سے اور میری آل اولاد سے ہمیشہ ہمیشہ راضی رہتا۔ ہر گواہیں اور ہر کتا بھی کو سواٹ کرنا اور دونوں جہانوں میں میرے خیر ملاحظہ ہوا اور میرے بیٹوں کی بڑھاپی کرنا کہ تو سب سے بڑھ کر ہم کرنے والا ہے۔ بے شک میرا پارٹ ہر جگہ پر قائم ہے اور میرا پارٹ برکت اور بلندی والا ہے۔

پاکیزہ پاکیزہ پاکیزہ

دعا کو
آپ کی امی امی
انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتہ

دیر ماہنامہ پاکیزہ 63.c III فیفٹی فٹین، لاہور۔ مین کو رنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500



پاکستان روزنامہ کی فکری منت مہینہ

نگاہیں چومتا چاہیں روئے کی عبادت کو
شاعر: زینت مہداحمد، میرپور

مرحبا مرحبا

سید الانبیاء، مرحبا مرحبا
لب پہ ہے یہ صدا، مرحبا مرحبا
برساتِ روشنی کی گھرنے کی
ہم تجھ الیاء، مرحبا مرحبا
جس کی شکل پڑی، دل نے یہی کہا
مردِ مصلحتی، مرحبا مرحبا
تو دل کی مٹی، زندگی کو مری
اک سوال کیا، مرحبا مرحبا
وہاں خلق کون، وہاں تو ہی ہے
یہ ہے ایمان، مرحبا مرحبا
زندگی اس کی رقبہ، قمر بنی کئی
جس کو تو مل گیا، مرحبا مرحبا

کلام: سیدہ جیاس، تلمہ سنگ

عید کا دن

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی خدمت میں عید
سے ایک دن قبل آپ کی بیٹیاں حاضر ہوئیں اور
بولیں: ”بابا جان کل عید کے دن ہم کون سے کپڑے
پہنیں گے؟“

آپؓ نے فرمایا: ”مجی کپڑے جو تم نے پہن
رکھے ہیں انہیں آج دھو لو اور گل بھر مٹی پہن لیتا۔“
موصوم بچیوں نے خند کرتے ہوئے کہا:
”ابھی بابا جان آپ ہمیں نئے کپڑے عطا دیں۔“
آپؓ نے فرمایا: ”میری بیٹاری بچیوں عید کا

حمدا باری تعالیٰ

اس در کا در بان بنادے یا اللہ
مجھ کو بھی سلطان بنادے یا اللہ
ان آنکھوں سے میرے نام کی بارش ہو
چتر ہوں انسان بنادے یا اللہ
سہا دل، نونی سکھی، چڑھتا دریا
ہر مشکل آسان بنادے یا اللہ
میں جب چاہوں جہانک کر تجھ کو دیکھوں
دل کو روشن دان بنادے یا اللہ
میرا بچہ سادہ کاغذ جیسا ہے
اک حرفِ ایمان بنادے یا اللہ

شاعر: شیریں

مرسلہ: محمد صفر کرچی

نعت رسول مقبول ﷺ

مرا دل بس تڑپا ہے مدینے کی زیارت کو
نگاہیں چومتا چاہیں روئے کی عبادت کو
در حقیقت پہ جاؤں فقط اتنی تمنا ہے
ترستی ہے سماعت بلاوے کی بشارت کو
میں فروز، تجھی دست لاچار ہوں یارب
کھنکی بیڑھاوے اور ایمان کی حرارت کو
جہیں میری، خاکِ عرب اور پھر مٹا جاتیں
ہمکنای ہی چلا جائے دل کیجے کی زیارت کو
ترے دوشے آ کے تجھ سے اپنے دے دالم ہاتھوں
طے ٹھٹک جگر کو جھن آجائے بصارت کو
مرا دل بس تڑپا ہے مدینے کی زیارت کو

سائل کو صدق بھی دیتی ہیں اور جس طرح وہ آپ کو دعا دیتا ہے اسی طرح آپ بھی دعا دیتی ہیں۔"

فرمایا: "اگر میں اسے دعا نہ دوں اور فقط صدق دوں تو اس کا احسان مجھ پر زیادہ رہے اس لیے کہ دعا صدق سے کہیں بہتر ہے۔ اس لیے دعا دیتی ہوں کہ میرا صدق خالص رہے کسی احسان کے مقابلے میں نہ ہو۔"

از: پھر سے موتی جلد نمبر چہارم صفحہ نمبر 290

مرسلہ: امینہ خدیجہ، سلطانوالی

ضیقت

پناہ گیری
پناہ ہے
پھر سے درخت بھی
جو صوبہ کے
تو ساری نہیں
اور بھوک لگے
تو پھل دور

شاعرہ: سعدیہ ہاشم، سرگودھا

افسوس

ایک بزرگ شدہ شوہر کا انتقال ہو گیا۔ انشورنس کمپنی کا نمائندہ جسے کی رقم کا چیک لے کر ان کی بیگم کے پاس پہنچا مگر چیک دینے سے پہلے اس نے تعزیت ضروری بھیجی اور بولا: "مجھے افسوس ہے کہ آپ کے شوہر....."

"بس، بس رہنے دیں۔" بیگم بات کاٹ کر بولی۔ "جب بھی کسی عورت کو مالی فائدہ پہنچنے والا ہو مردوں کو افسوس ہونے لگتا ہے۔"

مرسلہ: منظور شہزادی، گوجرانوالہ

عید کے اور

خوشیاں منانے سے
فرصت ملے تو

دن اللہ کی عبادت کا دن ہے اور اس رب کا شکر بجالانے کا دن ہے۔ عید کے دن نئے کپڑے پہننا ضروری تو نہیں۔"

"بابا جان آپ کا کہنا درست ہے لیکن ہماری سہیلیاں اور دوسری لڑکیاں ہمیں ملنے دیں گی کہ اسیر المؤمنین کی بیٹیاں ہیں اور کپڑے دی پرانے بہن رکھے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے بیٹیاں رو پڑیں۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دل بھر آیا۔ آپ نے اسی وقت وزیر مال کو بلا دیا اور فرمایا:

"مجھے میری ایک ماہی بخوادے دو۔"

وزیر مال نے عرض کیا: "حضور کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ ایک ماہرینہ زندہ رہیں گے؟" آپ نے فوراً کہا: "اللہ تعالیٰ ہمیں جزا دے بے شک تم نے بہت عمدہ بات کی ہے۔" وہ چلا گیا تو آپ نے اپنی بیٹیوں سے فرمایا: "بیاری بیٹیاں اللہ اور اس کے رسول کی رضا پر اپنی خواہشات کو قربان کر دو کیونکہ کوئی شخص اس وقت تک جنت کا حق نہیں بن سکتا جب تک وہ کوئی قربانی نہ دے۔"

مرسلہ: خواجہ ابوالکلام

عید کا روز

دعا کا سنتا ہوں لے کر اسے شہارے آگن میں گواہ رہا فتوں کا، بھجوں کا بن کر ہلال عید تمام روز و شب بچہ نمی فروزاں رہیں ہر دم ہر شب، شب برسات ہو ہر روز، روز عید مرسلہ: غفر اللہ چوہدری، ڈیرہ انوالا

دعا اور صدقہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فقیر کو مال بھی دیتی تھیں اور دعا بھی۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس جب کوئی سائل آتا اور دعائیں دیتا تو... ام المؤمنین بھی اس فقیر کو دعائیں دیتی اور بعد میں کچھ خیرات دیتی۔ کسی نے کہا: "اے ام المؤمنین آپ

قتل سب سراپا۔۔۔ پھر اس نے بھی پوچھا۔ ”اور تمہاری
بیوی کی بھی ہے؟“
پہلے دوست نے کہا۔ ”ارے یار! میری بیوی
کو چھوڑو، چلو تمہاری بیوی کو تلاش کرتے ہیں۔“
مرسلہ: مستاز غلام، کراچی

یہ سوچتا ضرور
کہ
بہت مصروف ہونے کے باوجود
تمہاری یاد کا کلو لٹو
کسی کے ساتھ رہا ہے

از: شانیہ پرویز، مگر جرنال

عیدی

اجلی اُجلی دھوپ کی چادر
عید کے دن بھی کیوں نکلی ہے
دکھی کالی آنکھیں کیونکر
میرے دل میں پھیلی ہے
نڈ کوئی سرنی میرے لب پر
تیرے کان کا جس آنکھوں میں
تو آنکھوں میں سگنا چڑی
خوشیاں جیوں میں
میرے گھر کے دروازے پر
تک دینے آ جاؤ ناں
پوری کر کے ساری رکھیں
میری عیدی دے جاؤ ناں

شاعرہ: عطیہ زاہرہ، لاہور

ایک ساس کی کھٹی باتیں

ہلا داماد وہ اچھا ہے جو بچی کے اشارے پر
تا ہے۔۔۔ بہو وہ اچھی جس کو ہم اپنی اگلیوں پر چھاتے
رہیں۔

ہلا داماد میری بچی کا ہے دام غلام ہو اور میرا بیٹا
صرف میرے ہی قدموں کو اپنی جنت جانے۔

مرسلہ: مجرود بک، مگر جرنال

پچھتاوے

دل کے اندر دو در تک
ایک سنا سنا رہا ہے
کچھ جھنجھکیاں بھی پاویں ہیں
کچھ سوئی سوئی راتیں ہیں

صرف پڑھکر۔۔۔ یہ کھیں

ہاں اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے شوہر آپ کو
اپنی نگاہ دے کر بھول جائیں۔
ہاں آپ اپنے شوہر کو ترکی پر ترکی جواب دے
کر انہیں ناک آؤٹ کر دیں۔
ہاں عید اور دیگر تہواروں پر آپ صرف اپنے
بچے میں جائیں اور سسرال والے آپ کے گھر آئیں
تو انہیں منہ نہ لگائیں۔

ہاں عید پر آپ ہجرہ سوئیاں بنائیں جسے ہر
آنے والا واہ، واہ کر کے کھائے۔
ہاں آپ کے تمام تر بھوٹے قصے سن کر آپ
کے دوست احباب واہ، واہ کریں۔

ہاں آپ جس کا دل چاہے مذاق اڑائیں اور
کوئی آپ سے مذاق بھی کرے تو اسی وقت اسے
ٹوک دیں۔۔۔ تو فوراً سے پہلے خود کو تنگی کاٹ کر دیکھ
لیں کہ کہیں آپ یہ اتنا غراب تو نہیں دیکھ رہی
ہیں۔۔۔ ہاں جلدی سے ماحول بھی بچھ لیں۔

از: کوثر خالد، مگر جرنال

چھٹا بار

دو دوستوں کی ملاقات برسوں بعد ایک میلے
میں اس حال میں ہوئی کہ دونوں اپنی، اپنی بیویوں کو
ہجوم میں تلاش کر رہے تھے ایک نے دوسرے سے
پوچھا۔ ”تمہاری بیوی کا حلیہ کیسا ہے؟“
اس نے کہا۔ ”میری بیوی بے حد خوب صورت
ہے، مگر اپنی رگھت، کانچ بھی نیلی آنکھیں، دراز قد اور

تمہارے لیے اتنی پیاری چیز خریدی ہے، جب اسے تم دیکھو گے تو تمہارا سر فخر سے بلند ہو جائے گا کہ تمہاری بیوی نے میرے سونچے پر کیسی دریا دلی دکھا دی۔"

شوہر نے غصہ ہو کر کہا۔ "اے واقعی..... ذرا مجھے دکھاؤ تو کسی کرم نے میرے لیے بھی کچھ خریدا ہے۔ پلیز جلدی سے دکھاؤ ناں میرا عید گنٹ۔"

بیوی مسکرا کر بولی۔ "پانچ منٹ رکو، میرا سر میں ابھی پکین کر آتی ہوں اپنا خوب صورت عید کا جوڑا۔" مرسلہ: گل شاہین، ڈی آئی سی خان

پکھم دم دم خاکے ہیں
پکھم بولے سرے دھڑے ہیں
انگوں میں جھپکے جھپکے
پکھم ہے ہے لہے ہیں
کاٹل دل میں کچھ بھی نہیں
صرف درد کے کھوٹے سکے ہیں
اس بوسیدہ سے دل میں اب
بچپن تو سے ہی بستے ہیں

کلام: عالیہ فیاض، کراچی

غزل

وقت کی روانی ہے
بخت کی سمرانی ہے
درد کو چھپاتا تھا
چپ کی چادر تانی ہے
گھر اک بنتا رہتا تھا
اب چار سو دیرانی ہے
دل میں درد کی دولت ہے
حیرتی سمرانی ہے
حیرتی جیت کی خاطر ہمارا
ہم نے پار بنائی ہے
اب تجھے بھلا ہی نہیں گئے
دل نے بھی غنائی ہے
مجنن دل میں حیرتی یادیں
اور رات کی رانی ہے
حیرتی طرف سے اور الحرام
آنکھوں میں حیرانی ہے
تم سے موت تلک کا رشتہ
زندگی تو آتی جانی ہے

شاعرہ: اُم شام، جھڑ سندھ

عید گنٹ

بیوی نے شوہر سے کہا۔ "اس عید پر میں نے

غزل

موسم نے کیا رنگ طعنائے، دھڑے دھڑے بولے بولے
سجھتے تھے ہوا اڑانے، دھڑے دھڑے بولے بولے
خفاہوں میں شہ سرفی تھی آج بھی گلی عام ہوا
کلی کے گھاتے جانے، دھڑے دھڑے بولے بولے
لوگ جو دم کی دہائی تھے دوک کے خیال خواب ہونے
دقت کہاں سے ان کو آئے، دھڑے دھڑے بولے بولے
ان کی خاطر پھول پتے تھے دل کے وہاں جانے سے
اک راک کر کے سب مچھانے، دھڑے دھڑے بولے بولے
ہر طرف تھی سکھ کی بھلائی، ہر کو تھا دھڑے بولے بولے
غضب کو کھا گئی ہانے، دھڑے دھڑے بولے بولے
شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

سیر سوا سیر

ساجد نے کہا۔ "اوپر بانٹیک کیوں جیز کر دیتی
اے؟"
فواد بولا۔ "بڑیک لیل ہو سکے ہیں اس توں
پہلے کا یکسٹنٹ ہو جائے گھر پہنچ جاتے ہیں۔"
جب ساجد آنکھیں بند کر کے بولا۔ "شاہا بھی
شاہا فرما کر رکھ۔"

مرسلہ: سیدہ جیا عباس، تلمہ گلک



جنگ

عبدالحمید

غیر اہم

بھتی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ چھوٹی مسمانی کے بلاؤز کا مسئلہ چاہی مل کر دیتی ہیں۔ بڑی اماں کو اسٹپ والی سینڈل بڑی بھائی میا کر دیتی ہیں۔ میک اپ ہائی کر دیتی ہیں کہ آخر کی سال بیوٹی پارلر میں کام کر چکی ہیں اور پیچنگ جیولری تو چھوٹی بھائی راہب سب کو میا کر دیتی ہیں۔ ان کے بھائی کی دکان پر پیچنگ جیولری پائس ہونے کے لیے آتی ہے اور ان کا مکان رضیہ ہاؤس کے انٹرنل چنل میں ہی ہے اور ان کے بچے والے اپنی انٹرنل مین راہب کا واقعی ہے حد خیال رکھتے ہیں۔ جس سے رضیہ ہاؤس کی خواتین تک خوش رہتی ہیں۔ یہ سب واقعی دوسری بات ہے کہ راہب بھائی اپنی زندگی کو ایسے بھڑے ذریعہ کو لکھنے کا نام دے کر چنا دیتی ہیں کہ انتہائی وحشت ہوتی ہے۔ جیسے ایک ساگرہ کی تقریب میں ان کی زندگی میں ساپ کے منہ والی مالا میں ماہک کر ایسا خاصی نامیسی لگ رہی ہیں اور اکثر لوگ ان کے پاس سے اس وجہ سے بھی ہٹ رہے تھے کہ کہیں ڈس نہ لیں۔ رضیہ ہاؤس کی خواتین جب ایک ساتھ کہیں جاتی ہیں تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اپنی محبت سے تقریب میں انٹری دیتی ہیں کہ مارے رنگ کے لوگ حق دین رہ جاتے ہیں۔ ہیں دیکھنے کی چیز ہمیں بار بار دیکھ۔ جوں جوں مہنگائی کی مار بڑھتی جا رہی ہے، اچھے، اچھے سفید پوش تاپ تول کر پکارتے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے تقریبات میں کھانے کی کمی ہو جاتی ہے۔ پہلے سو آدمیوں کے کھانے میں سو سو کھانا کھالیتے تھے (یہ باور دینی کا حساب کتاب ہے) اب سو آدمیوں کے کھانے میں پچاس کھا سکتے ہیں۔ (کہ اس دور کے لوگ کھانے کا زیاں کرتے ہیں) اکثر تقاریب میں کھانا کم پڑ جاتا ہے تو بعض مہمان جو کہ گھر آتے

عید ملن پارنیاں ہوں و شادی کی تقریبات ہوں، کامیابیوں اور کامیابیوں کی دھڑکیں ہوں پاسنگ اور چہلم کے کھانے۔ ایسی تقریبات میں جانے کے لیے لوگ مختلف تیاریاں کرتے ہیں۔ کوئی کپڑوں کے کھینچوں میں پڑتا ہے تو کوئی میک اپ کے لوازمات میں الجھتا ہے تو کوئی جیولری کے لیے بے قرار رہتا ہے کہ خوب زیورات لا کر شرکت ہو، بے شک اپنی شکل پر اچھا نہ لگے مگر اس کی مالیت کے اندازوں سے دوسروں کی فحشیں اتر جاتی ہیں۔ رضیہ ہاؤس جہاں چھ بھائی اپنی فیملی کے ساتھ ایک ساتھ رہتے ہیں وہاں اس قسم کی تیاریاں قانونی ہوتی ہیں۔ خاص تیاریاں ہوتی ہیں کہ تمام لوگ چہلم، کھینچے پہلے ہی گھر میں کھانا وغیرہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ڈائری فیکٹری سے لے کر۔ یہ سب اس لیے کی ہے کہ آپریشن سے پہلے مکی حیات ڈاکٹر نہیں دیکھتے ہیں۔ بڑی چاہی تو فقط ہاتھ دے کر دیکھنے کا چاہی تھی دماغ ہال کر جیتی ہیں کہ عین صاف ہو کر ہٹا ہو جائے۔ تاپا کی فیملی تو جواب تک لینے سے پرہیز نہیں کرتی کہ اس سے طبیعت بھی رہتی ہے اور دل کھانے پر جلدی آمادہ ہو جاتا ہے۔ ماشاء اللہ گھر میں چار بڑی کونہز اور چھ بانچک ہیں کہیں سے دو آدمیوں کا بلاوا بھی آجائے تو رضیہ ہاؤس میں رہنے والے تمام نہیں ہی بڑی خوشی سے جاتے ہیں۔ کئی بلائے والوں کو ہارٹ ایک تک ہو چکا ہے۔ رضیہ ہاؤس میں رہنے والوں کی یہ غریبی بہت بڑی ہے کہ بے شک ان میں آپن میں خانہ جنگیاں روزانہ چلتی ہوں۔ ایک دوسرے کا تپا فحش کر کے سرخیں قدر بڑھاتی ہوں اور اتحاد، یقین اور عظیم پارہ پارہ ہو کر گھر کہیں جاتے وقت ان کی یک

11/2/20

”تمہارے پورشن سے ملی نے آ کر ہماری قلمی کا دورہ لی گئی۔“

”تم نے اسٹیک کی تھیں ساری خاک ہمارے
برآمدے میں آگری۔ یہ بھی کوئی بات ہے آئندہ ایسا
ہو ان تہ.....“

”یہ مغرب کے وقت واضح مشین لگا کر کر دیا
 ہاں میرے سر میں درد۔“

”اے، یہ تمہارے مہمان ہمارے دلی کال
ہل کیوں بھایا کرتے ہیں؟“ جیسی باتیں بھی سر
اٹھائیں۔ اس معاملے کی حقیقت کی کوئی تو معلوم
ہوا کہ بڑی آپا کی اپنے چھتیرے فون پر کھٹ چٹ
کرتی تھی۔ لہذا اس کی اپنی دن شاپ پر جب کٹ گئی
تھی۔ پھر سے بھیا کا موبائل گن پراکٹ پر چین لایا گیا
تھا۔ مگر پراکٹ کا اٹھایا جانے کا سیزن چل رہا تھا۔ چنگی
کی کوئی ٹھیک سی تھی۔ پر خود مہمان کا نام ہی شامل
نہیں کیا گیا تھا۔ باقی کا ایک جہد کہیں کر گیا تھا جو
کر ہی نہیں دے رہا تھا۔

”بس آج کوئی نہیں جائے گا۔“ اماں نے جیسے
 طمان کر دیا۔

”تمہیک ہے، دل بھی نہیں چاہ رہا۔“ ساری
 عاصیاں یک زبان بولیں۔

”سوچ لو، دھیم کے بچے کھانے اور گھر کے بچے کھانوں میں خاصا فرق ہوتا ہے۔“ جھوٹے بھائی نے بے دلی سے کہا۔

”آج گھر میں سرفی پکی ہے اور برائی بھی۔ کیا کریں گے جا کر خواہ مخواہ کاغذ بھی ضائع ہو گا۔“ اماں

”تھک ہے، کوئی نہیں چارہ۔“ چاچی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ تب خوب سیر ہو کر کھانا کھایا گیا پھر چھین لیا گئیں۔ بھابی سب کے لیے ملائی والی جانے والا نہیں جانے بھی خوب شوق سے لگی تھی۔ آپا نے روٹ چاٹ پٹائی تو وہ بھی ان کی خوشی کے لیے سب

[illegible]

نے ہنس، ہنس کر کھائی، چاہتی نے مسالا چھینل سے کھوہے کا حلوا بنانا دیکھا تھا وہ بھی اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے ٹوبہ سارا حلوا بنا لائیں۔ پختہم پختہم میں وہ بھی خوب سارا کھالیا گیا اس اثنا میں چڑوس سے خوب سارے شاہی گلوے آگئے وہ بھی کھالے گئے۔

”ابھی آج بہت کھالیا۔“ ہانسی کی گولیاں اماں نے خود بھی کھائی اور بالکل خوشک سب میں تقسیم بھی کیں۔

”بہت گرائی سی محسوس ہو رہی ہے۔“ چاروں بھابھیاں، بھائی اور چچی کا روبرو چچ میں ٹھٹھکیں۔ آپا کے منگھیر کا سوری کا فون آگیا تو ان کا ناراض سا چہرہ دوس قورج کی طرح پھٹنے لگا۔ اس اثنا میں ابامیاں کا پرس بھی مل گیا ان کا جو حال تھا وہ بھی چا تا رہا۔

”تمہیں صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ ہمارے ہاں ہر تقریب میں سب سے پہلے آتے ہیں ابھی تو رات کے گیارہ بجے ہیں بارش تو رات بارہ بجے کے بعد آئے گی چلو حرکت کر آتے ہیں۔“ کہا میاں نے حقل مندی کی بات کی۔

”مگر سب نے کھانا کھالیا ہے۔ اگر وہی پہلے گئے تو کوئی بھی کچھ بھی نہیں کھا سکتا ایسے میں جانے کا فائدہ۔“ انہں نے کہا۔

”کوئی بات نہیں نہ تو تم دوسرے دن مگر حرکت تو ہو جائے گی۔“ اٹنی کرنے کے بعد بھائی کی طبیعت میں بھی ہلکی ہوئی تو آکر وہ اماں سے ہوئیں۔

”بھٹے تو تمہیں صاحب کی پیغم بہت اچھی تھی ہیں، بے حد مہذب سی خاتون ہیں اتنی آسنگی سے ملاحت سے بولتی ہیں کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ واقعی لوگ سچ کہتے ہیں کہ گھنڈوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بے حد مہذب ہوتے ہیں۔ ان کے لہجوں میں ملاحت سی گھلی ہوئی ہے۔“ آپا نے اپنا فرار وہ سب کو دکھاتے ہوئے کہا اگر جانا ہوا تو یہ ممکن لوں گی۔

”چلو بس منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ آج زندگی میں پہلی سی تقریب میں یہ سوچ کر جا رہے ہیں کہ وہاں کچھ بھی نہیں کھالیا جائے گا۔“ بڑے سے بھیا نے خواتین

کے گروپ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو سونف چھالے سے شغل کر رہی تھیں۔

آدھے گھنٹے بعد جب تقریب میں پہنچے تو مہمانوں کی آمد جاری تھی۔ سوہی بننے کے پتھر میں کھانے میں تاخیر پتاخیر ہو رہی تھی۔ آپا لوگ، بھابھیاں اور چاہتی سب مہمانوں سے ملنے کے لیے اس جگہ سے چل دیں کہ اپنے لباس اور زیب رات کی بھی داؤ پائیں۔

کچھ دیر بعد مائیک پر کھانے کے لیے استدعا کی گئی سب مہمان آہستہ روی سے اٹھنے لگے بلکہ قطار در قطار۔ دفعہ باؤس کے کینوں کے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔ پہلے آپ لیجیے، پہلے آپ لیجیے کی صدا میں کانوں میں جرب سی دھشت گونجی تھیں۔ مہمانوں کو یہ دعا کچھ کر دھیر باؤس کے دھننے والوں کے قدم بھی از خود کھانے کی ٹیبلوں کی طرف پڑنے لگے۔ پہلے آپ..... پہلے آپ کی تحریک اس قدر جاری تھی۔ پہلے آپ لے لیں ماحول سے دعا تو کر لیں اور بھابھیاں کے لوگوں سے بھی یہ پہلے لے لیں گے۔ اس سے اپنی زبان بھی اپنی نہ گئی۔

ذرا سا ساہن، تھوڑا سا سلاوا، چائے کے پیچچ چاواں اور ادھان کا کھولنے کے خواہشیں حضرات، واپس اپنی جگہوں پر بیٹھ رہے تھے۔ بروست کے کوفے، بریانی کی ڈشز، کہاؤں کے قحال بھرے کے بھرے رکھے تھے۔ نہ دھگما، نہ پریشانی نہ ہی لوٹ مار کا ساں۔

”واہ کتنی اچھی جھڑی ہے سب لوگ کتنی تیز سے کھانا کھا رہے ہیں۔“ ابامیاں نے حیرت سے کہا۔

”ہمارے خاندان میں تو شاہی بیاہ کی تھاریب میں نظر پر چھینے کا ساں ہوتا ہے مگر اس تقریب میں سارے کے سارے مہمان اس قدر مہذب ہیں کہ اپنی بیٹیوں میں بھی کسی نے کوئی چوٹی کھڑی نہیں کی۔“

”اوسے یہ بات نہیں ہے۔“ چھوٹی بھائی، چاہتی اور آپا نے چاروں طرف کا ایک رادھ لگانے کے بعد کہا۔

”بات بکھار ہے؟“ لکچ میں راز داری مارتی تھی۔ ”کیا بات ہے؟“ چٹمب نے یکہ زبان پوچھا۔

ناک تلے چنے چوائے تھے میرا دل ہی جانتا ہے۔ بھئی
میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے بھائی بھادڑوں، اپنی بہنوں،
بھانجیوں کو دل کھول کر مہدی اور تحائف دوں اور انہیں
حلق تک کھلاؤں۔ اپنے گھر میں بار بار مدین کروں۔
اپنے سینے والوں کے لاڈ اٹھاؤں مگر ساس صاحبہ میں
کہاں برداشت بار بار مجھ سے کتنی رہیں۔ دہن اپنی
تغذوں کو بھی فون کر دو۔ اپنی سسرال کے لوگوں کو بھی
بالو۔ اچھا لگے گا بھئی ضروری تو نہیں جو لوگ انہیں
اچھے لگتے ہوں وہ مجھے بھی اچھے لگیں۔ وہ ہمارے سینے
والوں کو دیکھ کر کون سا خوش ہوتی ہیں جو ہم ان کے سینے
والوں کو دیکھ کر خوش ہوں۔ پچھلے سال میں نے اپنی
بہنوں اور بھانجیوں کو ایک، ایک سوٹ کے ساتھ ایک
ایک چٹنٹ دیا تھا کہ لڑکا تو بڑی بی اپنا چٹائی ساید
کرت کر اس قدر روئی تھیں کہ اللہ کی پتا اور جو مہاں
جانی کے کان بھرے تھے وہ اس کے علاوہ تھے اور مہاں
جانی کی طبیعت بھی عجیب ہے۔ شادی سے قبل میرے
سوا انہیں دنیا بھر میں کچھ نظر نہیں آتا تھا اور شادی کے
بعد میں انہیں نظر نہیں آتی۔ کانوں کے اس قدر کچے
ہیں کہ اپنی بیوی سے زیادہ اپنی ماں سے محبت کرتے
ہیں اور بیوی کے روکنے پر بھی نہیں رکھتے۔ اب بھی
دیکھو کچلی مید کا چھڑا ابھی تک چل رہا ہے۔ ہماری
لڑائیاں تو فی وی سوپ کی طرح چلتی ہیں بات اتنی سی
تھی کہ گزشتہ سال چارندیں رمضان میں رہنے کے
لیے آئی تھیں اور میں نے انہیں نہیں بھائی تھی۔ ویسے
تو بڑی سادگی کے سبق دیتے ہیں اگر میں نے سادگی
اپنی تو انہیں ناگوار گزرا۔ اب اس سال رمضان میں
میری کنٹین میرے گھر آئیں تو مجھ سے کہنے لگے۔ تم تو
فوزیمنسول منار ہی ہو۔ چاری بھائی آپ کو کیا ہاؤں ہا
تلا جب خرچ دیتے ہیں اگر بنو سے پر ہاتھ نہ ماروں تو
میری زندگی تو خس و خاشاک سے بھی بدتر ہو جائے۔
ارے میں بھی باتوں میں کہاں سے کہاں چلی گئی۔ آپ
کوئی عید مبارک۔

آپ کی رعایت!

”یا تو یہ سب لوگ ہماری طرح اپنے گھروں
سے کھانا کھا کر آتے ہیں یا.....؟“
”یہ سب کے سب بے حد چار ہیں۔“
”کیا کہہ رہی ہیں، ایک ہزار مہمان ایک ساتھ
چارہوں سے کیسے ہو سکتا ہے۔“
”کیوں نہیں ہو سکتا؟“

”بعض مرتبہ مجھ پر بھی تو آتا ہے کہ
ہم آتے ہیں۔“ بھائی نے جس کراہٹ کو کچھ کر کہا۔
”ہم تو غیر لوگ ہیں رشتے داروں کی مجبوریاں تو
زیادہ ہو جاتی ہیں دل نہ چاہتے ہوئے بھی ملنا پڑتا ہے
جس کا منہ ڈرنے کا دل چاہے اسے منہ لگا دینا پڑتا ہے۔“
”مگر کیا بیماری ہے؟“ اماں نے کھیر کا پیالہ
صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”آج کل سب بیمار ہو رہی ہیں تمام مہتر پتلی رنج
کر کہہ رہے ہیں کہ ان دنوں برقع اور ہینڈ بگل رہا ہے۔“
”نیک کہہ رہے ہیں آپ لوگ ورنہ اتنا اچھا
کھانا کھا اور بھگدڑ نہ ہو۔“ یقین نہیں آتا۔ ”بھائی جان نے
تجربہ کر ڈالا اور وجہ ہاؤس کے تمام کھن اپنے سر میں
ہلانے لگے جیسے ان کی بات سونی ضرور سہت ہو۔

دیوانی کے نام سے کارڈ

”کو کہ عید کا کارڈ بھیجے گا نہیں تم کو کیا ہے اب
موبائل پر ہی ایس ایم ایس بھیجے جاتے ہیں مگر مجھے
معلوم ہے کہ تمہارا موبائل اب تمہارے سینے والے
استعمال کرتے ہیں کتنی ہی دفعہ تم کو فون کیا مگر تمہاری
بجائے کی آواز سن کر حیرت اور رنج دونوں ہی ہوئے۔ تم
نے تو کہا تھا کہ ڈاکو نے چھینا تھا وہ اچھی کج کہا تھا تم نے۔
اب تمہاری بات کا مطلب کچھ کر رہی آتی ہے۔ میں نے
یہ عید کا کارڈ اس وجہ سے بھی بھیجا ہے کہ تمہیں یاد دلا دوں
کہ اس سال اپنی دلتے داروں کو انہی طرح سے یاد
رکھنا۔ میری طبیعت پچھلے کئی مہینوں سے خراب چل رہی
ہے۔ اس لیے تم کم از کم اس عید پہلہ اتنا تو خیال کرنا کہ
ساس صاحبہ کو اپنے ہاں رکھنا پچھلے سال تو تم نے انہیں
میرے ہاں ٹھہرا دیا تھا۔ بڑی بی نے کیسے، کیسے میری

☆ لاریب ماہ زریب..... چو نایاں

اندھیری رات میں رہے تو کتنا اچھا تھا
ہم اپنی ذات میں رہے تو کتنا اچھا تھا
دکھوں نے ہانٹ لیا ہے تمہارے بعد ہمیں
تمہارے ہاتھ میں رہے تو کتنا اچھا تھا
☆ نالہ آرا..... داس الخیمہ

عمر کاٹ دی لیکن بچپنا نہیں جاتا
ہم دیے جاتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر
گفتگوں کی بجلی ہیں رقص ہونے لگا ہے
دور جھگڑاتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر
☆ کوثر خالد..... جہاں خواں

جہاں طرف دوتے ہیں ہمیشہ جنگ کے ملتے ہیں
مصری سرخوں ہو کر بھرا کرتی ہے جانا
☆ سحر کوثر..... قصور

پہنچے ہیں کچھ گلاب چٹانوں میں پرورش
آتی ہے چھروں سے بھی خوشبو بھی کبھی
☆ جنہیں نیاز..... سلمان

ہم اس کے قطرے ہیں کہ کبھرے ہوئے موتی
دھوکا نظر آئے تو ہمیں رول کے دیکھو
☆ فرحانہ ناز ملک..... ذی بی خان

نہ کوئی مہد بھائے نہ ہم نواہی کرے
اسے کہو کہ تسلی سے بے وفا کی کرے
☆ اقصیٰ احمد..... کراچی

کسے ممکن ہے بھول جاؤں تجھے
کوئی قصہ نہیں سلسلہ ہو تم
☆ مہرین نیا..... کراچی

روح میں کوئی فم ہے پوشیدہ
زندگی ہے وہ داس نہیں
☆ حسین منہاج..... پشاور

میں کہیں جہر میں چپ چاپ مرنے جاؤں کھلیب
اس کی گلیوں میں پڑی خاک بنائے مجھ کو



میں اکثر گنگناتی ہوں

معصومی زیدی

☆ مسز اقصیٰ عمران..... لاہور

کچھ ستارے اس کی پلکوں پر بھی روشن ہوں گے
کچھ مجھے بھی ٹولائے گا اس کا تم مہد کے دن
☆ کوثر خورشید..... بکے

ہر لہجے جو کی خواہش رہی ہے میں نہ رہوں
نگر میں ہوں کہ مرا شوق نواہی بجا
☆ پروین افضل شاہین..... جہاں کمر

ہوں نہ مجھاگو غریب کے دل میں
حسرتیں بے لباس رہتی ہیں
☆ علی شاہین..... رحیم یار خان

لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس
سورج کی شپ چٹکے بھی بے باک ہو گئے
☆ تابندہ قیصر..... پاک پتن

رنگ اڑ جاتا ہے پھولوں سے ستاروں سے ضیا
آپ کا دل کے چھڑنا بھی غضب ہوتا ہے
☆ عقیلیٰ مہرین..... ذی بی خان

کلر دنیا سے منقطع ہو کر
آؤ ہارش میں رقص کرتے ہیں

ہمارا کمال..... فیصل آباد

چھوڑنے میں نہیں جاتی اسے دروازے تک
لوٹ آتی ہوں کہ کون اسے جاتا دیکھے

ہمارا کمال..... فیصل آباد

نظر سے نکل کر ڈالو نہ ہو تکلیف دونوں کو
تجھے سب سے اٹھانے کی ہمیں گردن جھکانے کی

ہمارا ذریعہ ارمان..... جہلم

عمر سو گئے چوں کی طرح بکھرے رہے ہم
دقوں بعد کسی نے سینا بھی تو جلانے کے لیے

ہمارا شراہ..... کراچی

ذہن نے اس خیال سے تسلی ہی تو زدی
کیا مگں کہ اس کا نام لوں جو بے حساب دے

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

چتر ہے مگر برف کے گالوں کی طرح ہے
وہ شخص اندھیروں میں اچالے کی طرح ہے

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

الہیا ہوا ایسا کہ کبھی نکل نہ وہ پاسے
سلجھا ہوا ایسا کہ مثالوں کی طرح ہے

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

جب یاد تری آ جاتی ہے مہر میں کتنی ہوں
سب کہتے ہیں کہ سوتی ہے چھٹیکے، چھٹیکے ہوں

ہمارا سزگیت فقار..... کوہاٹ

جاتے سے اس کا پلٹ کر دیکھنا
وہ ایک لمحہ ہمیں زندگی سے پیارا ہے

ہمارا سزگیت فقار..... جہلم

ایک لمی کے کچھ جھن کی خاطر ساری مڑلاتے ہیں
دور گئیں جالنے والے دل میں کیوں بس جاتے ہیں

ہمارا سزگیت فقار..... حیدرآباد

مرتا بھلا کیا اس کا جو اپنے لیے ہے
جیتا وہی ہے مرتا ہے جو میر کے لیے

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

تیرے جانے سے جو ایک دھول اٹھی تھی غم کی
ہم نے اس دھول کو آنکھوں میں بٹا رکھا ہے

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

اڑا رکھو بھی نہیں رخصتی میں تنہا میری
وہ بازی مار لیتا ہے ہمیشہ خوش بھائی سے

ہمارا سزگیت فقار..... پشاور

اسے دوست بھی تھا بھائی میں جب یاد تری آ جاتی ہے
جس نے پہ نظر ہم بھائی ہے تصویر تیری بن جاتی ہے

ہمارا سزگیت فقار..... پشاور

نہیں تھے سے شکایت کہ دکھ دیا تو نے
ہمیں تو شوق تھا آنکھوں کو ڈرا بھگوانے کا

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

تم میری آنکھوں کے تیرے نہ بھلا پاؤ گے
اپنی کی بات کو کھو گے تو یاد آؤں گا

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

ہم نے آنکھوں کی طرح دکھ بھی اکٹھے دیکھے
مسکراتے کو پلٹو گے تو یاد آؤں گا

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

اس کی دعا کے باوجود اس کو نہ پائے بدگماں
کتنے یقیں چھڑ گئے ، کتنے گماں گزر گئے

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

اب بھی طے ہوا کہ ہم تھے سے قریب تر نہیں
آج ترے تکلفات دل پر گراں گزر گئے

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

شام تک صبح کی نظروں سے اڑ جاتے ہیں
اسے بھگوانے پہ بھگوانے ہیں کہ مر جاتے ہیں

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

کار فرماؤ دھواں کس لیے موقوف ہوا
تیرے کوپے میں ترے باجروں کے ہوتے

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

جڑ سزا اور ہو شاید کوئی مقصود ان کا
جا کے زنداں میں جو رہے ہیں گھروں کے ہوتے

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

کھو کر اسے پانے کی دہی دل میں تھنا
اس پیار کی بازی میں کبھی مات نہیں ہے

ہمارا سزگیت فقار..... کراچی

اس نے بھی نیل آج پلٹ کر نہیں دیکھا
شاید میرے اعصاب میں وہ بات نہیں ہے

سوس کے ساتھ پیش کریں۔

نصف تول، بہارہ کبوتر

دم بخت برہانی

اشیا کے گوشت مرغی، ایک کلو۔ چاول، تین پیالی، نمک، حسب ذائقہ۔ اورک، بہن پیاہوا، تین کھانے کے کچے۔ پیاز، دو عدد درمیانی۔ ہرا دھنیا، ایک کھٹی۔ پودینہ، آدھی کھٹی۔ بری مرچیں، دس سے بارہ عدد۔ سفید زیرہ، دو کھانے کے کچے۔ لیوں کا رس، تین سے چار کھانے کے کچے۔ دہی، ڈیڑھ پیالی۔ تیل، آدھی پیالی۔

اشیا کے گوشت کا بھی طرح دھو کر پھلتی میں رکھا کر خشک کر لیں۔ دہی میں ہرا دھنیا، پودینہ اور بری مرچیں ملا کر پھنڈ کر لیں اور اس پھرسے گوشت کو زیرہ پیٹ کر کٹے ترقیع میں رکھ دیں پھر تین میں تیل ڈال کر درمیانی آگ پر گرم کریں اور اس میں باریک کٹی ہوئی پیاز کو سنہری فراتی کر لیں پھر اس میں زیرہ اور اورک، بہن ڈال کر فراتی کریں اور ایک سے دو منٹ کے بعد اس میں میر پیٹ کیا ہوا گوشت ڈال دیں۔ شروع میں تیز آگ پر پکا میں پھر پانچ سے سات منٹ کے بعد آگ اور میانی کر کے آہی دیر پکا لیں کہ تیل غلیظ ہو جائے۔ اس دوران چاولوں کو نمک ملے پانی میں ایک کئی ابال لیں۔ چوتھے سے اتارتے ہوئے ان میں لیوں کا رس شامل کر دیں اور چھان لیں۔ اب الگ پختی میں تھوڑا تیل لگا کر اس میں آدھے چاول پھیلا کر ڈالیں پھر اس پر گوشت رکھ کر آخر میں چاول ڈال دیں اور ڈھک کر ابلی آگ پر بارہ سے پندرہ منٹ دم پر رکھ دیں۔

چھین نیاز، دھتان

چکن اور سبزی کے کباب

چکاری بہنو! آج کل بچے صرف اور صرف چکن اور گوشت سے بنی ڈشیں کھانا یا دودھ پسند کرتے

خوش ذائقہ پاکیزہ دیشیں



چکن ونگز

اشیا کے چکن ونگز، دس سے بارہ عدد۔ نمک، ایک کپ۔ چلی سوس، تین کھانے کے کچے۔ سوس، تین کھانے کے کچے۔ اسٹیک سوس، دو کھانے کے کچے۔ مسٹرڈ پیسٹ، ایک کھانے کا کچے۔ نمک حسب ضرورت (کیونکہ ان سب سوس میں کمی نمک ہوتا ہے)۔ کالی مرچ، حسب ذائقہ۔ انڈا، دو عدد۔ کارن فلاور، آدھی پیالی۔ میڈہ، ایک پیالی۔ تیل، تلنے کے لیے۔

ٹرکیک کے پتھر دھو کر خشک کر لیں پھر ایک کپ سر کے میں بھٹو کر دو گھنٹے کے لیے رکھ لیں۔ اب ایک پاؤل میں مندرجہ بالا تمام اشیا اچھی طرح یکجان کر لیں اور ونگز کو اس میں میر پیٹ کر کے حربہ دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ تلنے کے وقت پر کڑا ہی میں تیل اچھا گرم کر کے آگ تھوڑی کم کر لیں اب ایک، ایک ونگ کو آمیزے سے نکال کر ڈیپ فراتی کریں یہاں تک کہ برافون ہو جائیں پھر خانگی کاغذ پر اتار لیں اور حسب ذائقہ بری پانی یا چلی کا رنگ

آپ کا باورچی خانہ ماحول حسن بنی

خوش ذائقوں سے لطف اندوز ہوتے والی پیاری، پیاری صحت مند بہنوں کے لیے لیکن سے سی کیجئے بھی حاضر ہیں۔ اپنی جلد کی خوب صورتی کو نگہ کرنے کے لیے منگی کریموں کے بجائے قدرتی اجزاء استعمال کریں اور سونے سے آراہنہ کیونکہ فصل معمولات انجام دینے کے بعد صرف اپنی ذات برتو جو ہیں۔

چیتا بچے کو کھانا نہیں بھیجے اور اس کے
گودے میں آدھا کھانوں اور ایک چھوٹا شہد طاہر
چمچ سے آگے لائی اور باقیوں پر شیش اور چند روٹت بعد
سادے پانی سے دھو بیچے۔ جلد بھی صاف ستھری اور
نکھڑی ہو جانے لگی۔

کھرا کہ مجھے نسبت تھا نہیں اور انکو دیکھیں اور اس سے کہتے اور کرتے سے جلدی مٹائی کیجیے۔ اس کے ہونے سے چہرے پر مسکائی کیجیے۔ فک ہونے پر چہرہ خوشی کھڑے کے وہ گھرے انھوں پر رکھ کر سکون سے بندہ منت لیٹ جائیں۔ تازی کا احساس ہوگا۔

لیوں کے اس کے تو بے شمار انکا آپ کو ناز ہو
ہوں گے۔ اس کے دس کا شروپ جتا کر خلیں اور
چنگیوں کو چرے، ہاتھوں، کہیں دس اور گتوں پر نہیں اور
ہاتھوں کی پشت پر نہیں۔ لیکن میں دیگر کام کرتے
ہوئے بے عمل جاری رکھتی ہیں۔ لیوں کا دس ہالوں
کے لیے کنڈہ ضرر ہے۔ چائے کی استعمال شدہ چینی کو
ایک دھوا اور ہال دہی اب اسے چھان کر اس میں
لیوں کا دس چھوڑ کر پیسہ کرنے کے بعد ہال اس
محلوں سے دھوئیں۔ جبک دار ہو جائیں گے۔

لڑائی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اس کا گورا بھترین
 ٹانگ ہے حملہ کے لیے۔ کھائیں اور لگائیں بھی۔
 پھر شاداب اور کھلا ہوگا۔ آدھا لڑکات کر
 مگر دن اور پانچ برس میں پھر اسے دھم کر فریج
 میں رکھ لیں اگلے دن پھر اسی لڑائی کا استعمال کریں
 جب تک کہ ختم نہ ہو جائے۔

ہیں مگر عقل مند مائیں، بھینس انہیں قلف طریقوں سے ہنر ہاں کھلا سکتی ہیں۔

اشیا کے ہونے کیس چکن، آدھا کلو، آلو، گاجر، کرم کل، شلہ مرچ، مٹر، لوکی، پانک یا کوئی اور سی بھی سبزی مثلاً اردو، فلجم، ٹٹو سے وغیرہ اس طرح کی اہلی ہوئی کس سبزیوں، تھیں کپ۔ چنے کی دال، آدھی چالی۔ ٹک، حسب ضرورت۔ لال مرچ، حسب ذائقہ۔ انیس ہوئی کالی مرچ، اچینو، مٹو، حسب ذائقہ۔ بریج کر کر، ایک کپ۔ اظہ، ایک سے دو عدد۔ پیاز، باریک کٹی ہوئی آدھا کپ۔

ترکیب پھر مرنے کے ساتھ چنے کی وال اور لوکی کو اہل لیں ورنہ دیر سے گھیں گی۔ اہلی ہوئی ہنریاں، وال اور بوٹوں کو خوب پار یک چیں لیں۔ تھ سے کرکتی چیں تو کاٹنے کی مدد سے ہو جائے گا۔

پس اس میں نمک، مرچ، اچھنڈو، موٹو اور فی ہری جیوا
کھس کر کے گول، گول نکالیں، بنا لیں اور اٹھایا
کر اس کے آئینے میں ڈبو کر پھر بریڈ کر کریں
لٹ پلٹ کر فرانک چین میں کھنکھن کر لیں۔
آج درمیانی رکھیں ایک طرف سے کبرے کو لٹان
جو جائیں تو پھر پلٹ دیں۔ یہ کتاب آپ کے
سرخ خانہ کی رونق بخا جائے گی۔ انہیں سینڈویچ
میں بھی استعمال کریں اس طرح ناپسندیدہ ہنری بھی
بچے آسانی سے کھائیں گے۔ اسے حلیہ ڈالنے دار
نانا آپ کا کمال ہے۔ اٹھ سے میں ڈبو کر کریمز
کے فریج بھی کے جانتے ہیں۔

2024

انٹرویو کا حوالہ

اشیا کے لئے، چھوڑ دو۔ مٹی، چھو کھانے کے
لئے۔ چھٹی، ڈیڑھ پاؤ یا حسب ذائقہ بالائی، ایک
پائی۔ بادام، ایک پائی۔ پستہ، مغز، چار، چار

گج۔ سبز الائچی، چار عدد۔ کیوڑا ایک کھانے کا گج۔
 ترکیب: انھیں کو اچھی طرح پیسٹ لیں۔
 بالائی بھی پیسٹ لیں، پھر پتلی کو اڑھن اور بالائی میں مٹا
 کر اچھی طرح کس کریں کہ پتلی اس میں مل جائے اب
 کھلے منہ کی پتلی میں بھی گرم کریں اور اس میں الائچیاں
 ڈال کر مل لیں۔ پیسٹ ہوا آمیزہ کترے ہوئے آدھے
 بادام، پتہ گرمی بھی اس میں ڈال دیں۔ آج کل بھی
 اور گج چلاتے رہیں۔ جب شیرہ گاڑا ہو کر جذب
 ہو جائے، پانی خشک ہو جائے، بالائی کا دودھ خشک
 ہو جائے اور مٹوا بھی چھوڑ دے تو کیوڑا ڈال کر اچھا لیں
 چند منٹ کے لیے ڈھانک کر رکھ دیں آخر میں ڈش میں
 نکال کر بقیہ بادام اور پتے اوپر چھڑک دیں۔ اب عید پر
 پیش کریں اور دوا وصول کریں۔
 اقرالکٹوم، سمو پال

منٹ پکا کریں۔ ہلکا سا دودھ کا حریہ چھیننا بھی ڈال
 سکتی ہیں۔ حریہ اور سویاں تیار ہیں خیال رہے کہ
 بالکل نرم لہذا سانس نہ بن جائے۔

خین عباس کراچی

آم اور پنیر کا کریمی ٹیک

اشیا: ایلے ہوئے جو، آدھا کپ۔ مارجرین، تین
 کھانے کے گج۔ شہد، تین کھانے کے گج۔ آم، دو عدد بکے
 ہوئے۔ پنیر صواب۔ دہی، دو تہائی (پانچ سے تھوڑا کم)
 کپ۔ لیوں کا چھلکا، ایک عدد باریک کترا ہوا۔ سیب کا
 رس، تین کھانے کے گج۔ جلائن پاؤڈر، چار چائے کے
 گج۔ آم اور پنیر کے سلائس، سہاگے کے لیے۔

ترکیب: ایلے کو 400°F پر گرم کر لیں۔ جو،
 مارجرین اور شہد کو اچھی طرح کس کر کے ٹیک کے سانچے
 میں ڈال کر پکائیے اور پنیر تیار ہوا سے چند منٹ بیک
 کریں یہاں تک کہ بالکل ختم ہو جائے پھر اسے لودن سے
 نکال کر ختم کر لیں۔ آم کی مکھلی نکال کر گوے کو اچھی
 طرح میس کر لیں۔ آم کا گودا پنیر، دہی اور لیوں کے چھلکے
 فوڈ پروسیسر میں ڈال کر خوب پرویس کر لیں۔ سیب کے
 رس کو گرم کریں جب سلاٹے لگے تو جلائن پاؤڈر ڈال کر اچھی
 طرح مل کریں پھر اسے پنیر کے آمیزے کے ساتھ ڈال
 دیں۔ پنیر کے اس آمیزے کو تیار شدہ جو کے ٹیک پر
 سانچے میں ڈال کر دیکھ کر غریبیں رکھ دیں جب بالکل سرد
 ہو جائے تو پیسٹ میں نکال لیں۔ لیوں کے ٹکڑے اور آم
 کے سلائس سے سجاکر پیش کریں۔

ضروری نوٹ: اگر لودن نہ ہو تو ایک پٹے تیلے
 میں چھڑ ڈال کر بجلی آج پڑے میں منٹ پتیا گرم کریں پھر
 اس میں ٹیک کا سانچا رکھ کر حریہ میں منٹ بجلی آج پڑے
 رکھیں اگر پھر نہ ہو تو اس میں کوئی اور آئینہ رکھ کر اس
 پر سانچا رکھ لیں اور ٹیک تیار کر لیں۔ گرم تیلے کو مٹانے
 کے لیے پڑے سے بکڑیں اور سانچا بھی احتیاط سے نکالیں
 بازہ پٹنے کا ڈر رہتا ہے۔

عشرہ حبیبہ، کراچی

مزیدار سوپاں

یوں تو سبز مغز پستہ اور دودھ سوپاں مشہور ہیں
 مگر آج ہم حریہ اور آسان ترین سوپوں کی ترکیب
 بتاتے ہیں کہ اس منٹ میں بنا کر سرور کر سکتی ہیں۔
 اشیا: باریک سوپاں، آدھا کپ۔ پتلی، آدھا
 کلو سے دو کلو بھی کم کر لیں۔ میٹھا جو پتہ، بو، کوٹ لیں۔
 دودھ، ایک پاؤ۔ کھویا، بالائی، عقاقند یا کوئی اور گج
 میں دستیاب مٹائی، ایک پیالی۔ ناریل پاؤڈر، دو
 کھانے کے گج۔ زرد رنگ، ایک چائے کا گج۔ گھی،
 تھوڑا سا۔ سبز الائچی اور لوگ، دو، تین عدد۔

ترکیب: گھی میں لوگ اور الائچی کو کڑا کر
 سوپاں بھون لیں، رنگ گھرا نہ ہو۔ اب اس میں
 زرد رنگ، دودھ، بالائی کھویا یا مٹائی جو بھی
 ہو عقاقند، رس لگے، گلاب جاسن، برنی وہ تو ذکر
 ڈالیں ساتھ ہی پتلی بھی ڈالیں اور چلائی رہیں آج
 دھبی رکھیں۔ ذرا سا چپک کریں اگر سوپاں ابھی نرم
 نہ ہوئی ہوں تو میٹھا ڈال کر بالکل بجلی آج پڑے

راز کی قدر

ایک بار حضرت محمد گھر تشریف لائے تو روٹی کا ٹکڑا گرا ہوا دیکھا۔ آپؐ نے اٹھا کر صاف کیا اور کھا لیا پھر فرمایا۔ ”اے عائشہ! حضرت دار چتر کی عزت کرو۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کا رزق بھیجنے لیتا ہے تو واپس نہیں کرتا۔“ (ابن ماجہ)

مرسلہ: لا ریب، ما زریب، چو نیاں

وجہ تسمیہ

جو آج اپنی ہی شکم پہ ہم کو چار آیا
یہ بھولین تھا انہیں ہم پہ اعتبار آیا
وہ بولیں آج مجھے مارکتے لے چلے
یہ بات سن کر مجھے خوف سے بخار آیا

شاعر: مرزا حامد عباس

مرسلہ: بخار اور بلوچ بلوچ

منتظر ہوں

یہی منظر میں ہمیشہ ایک ہی منظر غم کرتی ہوں
دور پہنچے پہ کھڑی ہوت، لا حاصل کیا انتظار

مرسلہ: سائبر جہاد کش، کوہاٹ

رحم دلی

دو چوہنوں میں سے ایک چوہنی نے اچھی سے
کہا۔ ”کیوں بھی، ہم سے کتنی لڑو گے؟“ اچھی ابھی
جواب دینے ہی والا تھا کہ دوسری چوہنی بولی۔
”موتے دو بے چارہ اکیلا ہے اور ہم دو ہیں۔“

اس طرح تو ہوتا ہے

امیر کا بیٹا۔ ”چچا آج بہت گرمی ہے۔“
چچا۔ ”ہم آج ہی اسے سی گوا لیتے ہیں۔“
غریب کا بیٹا۔ ”ابا، آج کچی گرمی ہے۔“
ابا۔ ”بھل جیری شلہ کروادوں۔“

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

☆☆☆

سندیسے



پاکیزہ
بہنیں



چھوٹی سی بات

زندگی ایک ایسا میل ہے جس میں آپ بہت
بہنیں کٹے پڑا ہر نہیں ہو سکتے اور یہ بھی نہیں ہو سکتے کہ
ہم نہیں بھیجتے۔

مرسلہ: ممتاز اختر، کراچی

ہماری عید

ہماری عید ہے ہم ہر طرح مناہیں گے
ہمارا شیخ کے فتوے پہ اعتبار نہیں
ہمارے ڈپٹی کمشنر نے چاند دیکھا ہے
ہمیں یقین ہے وہ غیر ذتے دار نہیں

مرسلہ: شہلا نواز، لاہور

بد ترین لوگ

فرمان نبویؐ ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا
آئے گا کہ ان کا مقصد چیت ہوگا، دولت ان کی
عزت ہوگی۔ عورت ان کا قبلہ ہوگی روپیہ ان کا دین
ہوگا اور وہ لوگ بدترین ہوں گے آخرت میں ان کا
کوئی حصہ نہیں ہوگا۔



ادارہ

روحانی مشورے

ساری عمر کے روزے نہ رکھے۔"

دعائے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اردو ترجمہ

یہ دعا آپ ہر نماز کے بعد پڑھ سکتے ہیں۔
عربی میں بھی اور اردو میں بھی۔ آج ہم آپ کو اردو ترجمہ بتا رہے ہیں تاکہ بعد میں جب آپ عربی پڑھیں تو آپ کو پڑھتے ہوئے لطف بھی آئے (ہم) جب عربی میں دعا مانگتے ہیں تو اس کا مطلب و معنی ہمیں معلوم ہونی چاہیے۔

ترجمہ ہے کہ اللہ کی ذات سب سے بڑی ہے۔ اللہ کی ذات سب سے بڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت میری جان پر اور میرے ذمہ پر، اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت میرے گھر والوں پر اور میرے مال پر، اللہ کے نام کی برکت ہر اس چیز پر جو میرے پروردگار نے مجھ کو عطا کی، اللہ تعالیٰ کے نام سے جو سب ناموں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام سے جو رب ہے زمین و آسمان کا، اللہ تعالیٰ کے نام سے جس کی برکت سے کوئی بیماری نقصان نہیں پہنچا سکتی، اللہ تعالیٰ ہی کے نام کی برکت سے میں نے شروع کیا اور اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر میں نے بھروسہ کیا۔ اللہ ہی میرا پروردگار ہے، میں کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراتا، ٹھہرائی ماں اللہ! میں تیرے خیر کے واسطے سے تجھ سے مانگتا رہا کرتا ہوں۔ وہ بھلائی جو تیرے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ تیری پناہ عزت والی ہے اور تیری ٹا بڑی ہے اور محبوب نہیں کوئی سوائے تیرے..... مجھ کو اپنی پناہ میں لے لے، ہر برائی سے اور شیطانِ مردود سے۔ اے اللہ میں تیری پناہ لیتا

امضان کی آخری رات میں بخشش

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "رمضان کی آخری رات میں امت محمدیہ کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔" عرض کیا گیا۔ "یا رسول اللہ کیا اس سے شبہ قدر مراد ہے؟" فرمایا: "نہیں (یہ فضیلت آخری رات کی ہے شبہ قدر کی فضیلتیں اس کے علاوہ ہیں) بات یہ ہے کہ عمل کرنے والے کا اجر اس وقت پورا دے دیا جاتا ہے جب کام پورا کر دیتا ہے اور آخری شب میں عمل پورا ہو جاتا ہے لہذا بخشش ہو جاتی ہے۔"

صدقہ فطر

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقہ فطر روزوں کو لغو اور گندمی باتوں سے پاک کرنے کے لیے مساکین کی روزی کے لیے ضروری تھا۔"

صدقہ فطر کی مقدار

صدقہ فطر کی مقدار پانچ سو درہم گندم ہے۔ اگر گندم دینا مشکل ہو تو پانچ سو درہم گندم کی قیمت دینا جائز ہے۔

شوال کے چھ روزے

غز کو تین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد چھ (مطل) روزے شوال (یعنی عید) کے صیئے میں رکھے تو (پورے سال کے روزے رکھنے کا ثواب ملے گا اگر ایسا ہی کیا کرے تو) گویا اس نے

میری بیماری (اعداہا پن) دور ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ وہی جواب دیا۔ اس نے تیسری دفعہ دعا کے لیے درخواست کی تو آپ نے فرمایا اچھی طرح وضو کرو اور دو رکعت نماز حاجت ادا کرو پھر یہ دعا پڑھو۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ يَا مُحَمَّدُ إِنِّي أَتَوَجَّهُ بِكَ إِلَيْكَ لِيُنْصَرِفَ عَنِّي كُلُّ شَيْءٍ يَكْشِفُ لِي عَنْ بَصَرِي شَيْئًا فَمِنْ قَوْلِي نَفْسِي

(عمل الیوم والملیلہ سنائی)

اور اگر کسی اور حاجت کے لیے دعا کرنا چاہے تو کھٹ لی تن پھری کی جگہ ان یقضی حاجتی ھذا فلانک اپنی مطلوبہ حاجت کا نام لے (اور پھر اپنی مادری زبان میں اللہ کو اپنی حاجت بھی بتا دے)

ترجمہ اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی رحمت کے واسطے سے اپنے رب کی طرف اپنی حاجت کے بارے میں متوجہ ہوتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ پوری ہو جائے میرے بارے میں آپ کی سفارش قبول کر اور میری بیماری (اعداہا پن) کو دور کر دے۔

قائدہ کے حضرت ابوامامہؓ نے کہا کہ اس ناچیز آدمی نے آپ کے حکم کے مطابق دو رکعت نماز ادا کی اور مذکورہ طریقے سے دعا کی اللہ تعالیٰ نے اس کی بیماری (اعداہا پن) کو دور فرمایا۔ اس میں ایک بات تو یہ ذکر ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کا طریقہ بتایا دوسری بات یہ ہے کہ اپنی شفاعت کا ذکر کر کے دعا کے لیے فرمایا۔ تیسری بات اس شخص کا علاج و دوا میری اور اخلاص بھی کامل تھا پھر اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور اعداہا پن جیسی بڑی بیماری دور ہو گئی۔

یعنی ہوں ہر اس مخلوق سے جو تو نے بنائی اور تیری مخالفت مانگنا مانگتی ہوں ان سب سے اور اپنے آگے رکھتا ارکھتی ہوں (اپنے لیے احوال بنانا ہوں) اس سورہ کو (جس کا ترجمہ یہ ہے)

”آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ ایک (ہی) ہے، اللہ بے نیاز ہے۔ اس کی اولاد نہیں اور نہ ہی وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔“

اپنے سامنے ہے، پہچنے سے، دائیں سے، بائیں سے، اوپر سے اور نیچے سے۔ امی، غلی، نیکی، ثمالی، فونی اور حق و ہر ایک کے بعد سورہ اخلاص مع بسم اللہ عمل پڑھ کر دعا مانگیں۔

حاجات کو پورا کرنے

کے لیے دعا کا ایک طریقہ

ہر لحوق تعالیٰ سے معافی مانگتے رہیں اور ہر مجرم بن کر اور ہر فرض نماز کے بعد صلی پڑھ کر تین بار درود شریف پڑھ کر صلیٰ علیٰ ایک بار پڑھیں۔
يَا مُبْتَوِّجُ يَالْقُدُّوسُ يَا قَلْبُوْدُ يَا قُدُّوْدُ
يَا مُعَزِّزُ يَا مُغْلِي يَا نَاصِرُ

پھر تین بار درود شریف پڑھ کر اپنی حاجت طلب کریں اور ایک وقت یا کچھ روزانہ پڑھ کر۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ
500 بار پڑھ کر بھی دعا کریں اور گناہ سے بہت بچیں کہ اس سے اثر اور بڑھ جاتا ہے۔

دعائے وسیلہ برائے حاجت براری

حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ ایک ناچیز شخص نے آکر نبی کریم ﷺ سے درخواست کی اے اللہ کے نبی ﷺ آپ میرے لیے دعا فرمائیں کہ میری بیماری (اعداہا پن) دور ہو جائے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ یہی بیماری بھتر ہے کہ تم اسی حالت میں رہو اور تم جنت میں جاؤ۔ اس نے پھر درخواست کی کہ آپ میرے لیے دعا فرمائیں کہ



شواہے ہومیوکلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستعد ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیوپیٹھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہر اندازے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انھیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتہ اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق ریکب سے مولیٰ دیکھا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی روچڑس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ کچھ تشخیص کی جائے اور دوا بھی تجویز ہو۔

کے تقریباً 80% ہال سفید ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ آپ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں کہ میرے بال کالے جائیں۔ میرا دوسرا مسئلہ لیکور یا ہے۔ یہ تقریباً 14 سال سے ہے۔ میرا پیٹ بڑھ گیا ہے۔ میں نے لیکور یا اور پیٹ کے لیے کافی دوا لینی ڈاکٹر سے بھی رابطہ کیا مگر دوائیوں سے وقتی طور پر اتفاق ہوتا ہے پھر بعد میں پہلے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی، غیر معیاری شہید، تیل اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے ساتھ ہوتی ہیں بالوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہمیں گنا ہے کہ آپ الگ کر علاج نہیں کرائیں وقتی اتفاق ہونے پر علاج۔ چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسا نہ کریں بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ علاج کریں ورنہ مسئلہ سمجھ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر ولیمار شواہے جرمنی کی مستعد جذیل ادویات

بال کالے ہو جائیں

ام ام۔ بکھر

میرا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میرے

نوٹس

برائے شواہے ہومیوکلینک

ستمبر 2014

اپنا مسئلہ اس نوٹس کے ساتھ روانہ کریں۔ نوٹس کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس میں بھیجیں اسی میںے کانوکی استعمال کریں۔

نام:

پتہ:



پہلے لیں۔ صبح ہمارے 5
قطرے آدھے کپ پانی میں
ڈال کر لیں ہر 3 گھنٹے بعد اس
سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی
اور دوا نہیں لیں۔

Ferrum ,Calc. flour-30

,Calc. phos-30 ,m e t . - 3 0

Pulsatilla-30 کے 7-7 قطرے آدھے کپ
پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

معدے کا مسئلہ

محمد اشفاق - کوٹ اودو

میرا مسئلہ معدے کا ہے اور یہ تقریباً 4 سال سے
چل رہا ہے۔ تقریباً اسباب کے دنوں ہوا تھا۔ میں نے اس کا
طعام کرایا ہے۔ کوئی ڈاکٹر کہتا ہے کہ گردے کا مسئلہ
ہے اور کوئی کہتا ہے کہ کھانا چیز کا مسئلہ ہے لیکن اس کا
کوئی مناسب علاج نہیں ہوا۔ اب ایک ڈاکٹر نے کہا
ہے کہ آپ کو معدے کا اسر ہے۔ انٹراساؤنڈ کر لیا تھا،
رپورٹ بھی کر رہا ہوں۔ برائے مہربانی میرا کوئی
اچھا سا علاج تجویز کریں۔ میں ڈاکٹروں سے ناامید
ہو چکا ہوں اور میں نے سوچا کہ ایک دفعہ آپ کو بھی خط
لکھوں۔ آپ وہ دوائی تجویز کریں جس کے ساتھ
ایکٹ نہ ہوں۔

جواب: محمد اشفاق آپ نے کہا تو بیان
کردی لیکن اس میں اپنا حال نہیں بتایا کہ آپ کو ہوتا
کیا ہے؟ لہذا اپنے حال کی تفصیل بیان کریں۔
انٹراساؤنڈ میں کوئی قابل ذکر بات نہیں کہ دوا آپ
کے حال کے مطابق تجویز کی جائے اور قارئین بھی اس
کو نوٹ کر لیں۔

استعمال کریں۔ Lycopodium-30
Calc. ,Pulsatilla-30,Borax-30
carb-30۔ ہر بوتل میں سے 7-7 قطرے
آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔ دو
ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

اندرونی خرابی

عاصمہ یوسف - فیصل آباد

مجھے ماہانہ ایام کے وقت اٹھیاں آنا شروع ہو
جاتی ہیں اور کچھ کھانا یا نہیں جاتا۔ یوں لگتا ہے کہ جان
نکل جائے گی۔ انگریزی دوائی کھانے سے ایام
میں بہتری آتی ہے۔ میری کمر کے نیچے حصے اور پیٹوں
پنڈلیوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ میرے سر کے بال بھی
گرتے ہیں۔ میرے جسم پر سرخ دانے نکل رہے ہیں
اور کبھی کبھی ہاتھ بھی کا پتے ہیں۔ ناف کے نیچے
حصہ پیٹ اور کولے پھیلتے جا رہے ہیں۔ رنگ بھی
غراب ہو گیا ہے۔ کبھی صاف لگتا ہے اور کبھی کالا۔
صرف چہرے اور ہاتھوں کا رنگ خوب ہوتا ہے۔ پانی
پینے سے مجھے اچھارا ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے نیچے
سیاہ پٹے بھی ہیں۔ چہرے پر بال نکل آتے ہیں جو
پہلے نہیں تھے۔

جواب: پانچ وقت نماز کی پابندی کریں۔ صبح
چہل قدمی کیا کریں۔ پانی کا استعمال کم از کم 12
گلاس روزانہ کریں۔ متوازن غذا دو دو، گوشت،
سبزیاں اور پھلوں کا استعمال بڑھائیں۔ ڈاکٹر ولیم
شوہرے جرنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک
استعمال کریں اور پھر اپنا حال تفصیل سے لکھیں۔
Sulphur-200 کی ایک خوراک سب سے



ویری کوئل اور

جوزوں کی آوازیں

محمد اسماعیل - خلیع جہلم

رہتے ہوئے کیسے رہنمائی کی جائے کہ وہ اس بے دراہ روی کا شکار نہ ہوں۔

محمد اسماعیل قرآن وحدیث کا مطالعہ کیجئے۔ نماز کی پابندی کیجئے۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیے اور پھر اپنی صحت کے لیے دعا کیجئے۔ ڈاکٹر ولیمار شوابہ جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر تمام حالت تحصیل سے لھیں۔
Staphisagria-30, Calc. phos-30
کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔

گردے کی پتھری

میرا عمران - خلیع مظفر گڑھ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عرصہ 8 سال سے گردے میں بار بار پتھری بن جاتی ہے۔ پہلی مرتبہ جب پتھری ہوئی تو ہوسو پوٹھک ڈاکٹر سے دوائی لی جس سے پتھری نکل گئی۔ سال کے بعد پھر بن گئی علاج کرایا پھر نکل گئی۔ پتھری تقریباً ہر سال ہو جاتی ہے۔ آخری مرتبہ جب پتھری ہوئی تو انٹرا سائڈ کرایا اس وقت تقریباً 19cm کی پتھری تھی دائیں گردے میں۔ اس وقت ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی علاج نہ کروانا صرف آپریشن ہوگا۔ آخر نکل ہو کر آپریشن کرایا۔ اب تقریباً دو سال ہو گئے ہیں آپریشن کو۔ اب دونوں گردوں میں درد اور کھنکھار رہتا ہے۔ پویشاب ٹیسٹ کرایا تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس میں کرسٹل نہیں آتے۔ بائیں گردے میں تقریباً پٹنے کے برابر پتھری ہے۔ برائے مہربانی کوئی اچھی سی دوائی تجویز کر دیں تاکہ آپریشن نہ کرانا پڑے۔

ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ ویری کوئل ہے اور یہ عارضہ 2007ء سے ہے۔ ایلو پیتھک ڈاکٹرز اس کا حل آپریشن بتاتے ہیں جبکہ میں آپریشن نہیں کرانا چاہتا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے بچپن سے ہی ٹھنکوں کے جوزوں میں درد رہا ہے۔ جب میں چلتا تھا تو ٹھک ٹھک کی آواز آتی تھی اور مجھے سکون مل جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اب مجھے درد تو نہیں ہوتا البتہ اٹھتے اور بیٹھتے وقت ٹھنکوں کے جوزوں سے ٹھک ٹھک کی آوازیں آتی ہیں جیسے جوز کی دونوں ہڈیاں آپس میں رگڑ رہی ہیں۔ میں پاک فوج میں جانے کا خواہش مند ہوں لیکن میرے دونوں کئے ویری کوئل اور جوزوں سے آواز آتا کہیں مجھے ان فٹ سے قرار دے دیں۔ ڈاکٹر صاحب جلد از جلد مجھے اس کا علاج بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ علاج کتنا عرصہ جاری رکھنا ہے۔

جواب: جب ہم بالغ ہوتے ہیں تو ہمارے جسم میں اور ہڈیات میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ والدین اور بڑے بزرگوں سے شرم و گھبراہٹ کے باعث ہم ان تبدیلیوں کا ذکر نہیں کرتے بلکہ اپنے ہم عمر لوگوں سے کرتے ہیں جن کو خود کچھ نہیں پتا ہوتا۔ نتیجتاً غلط معلومات پر گمراہ ہو جاتے ہیں اور غلط عادات میں پڑ کر اپنی زندگی اور صحت کو خراب کر دیتے ہیں۔ یہ ایک بہت عام مسئلہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک فرد کو اس جانب توجہ دینی سے سوچنا چاہیے کہ اپنے نوجوان بچوں اور بچیوں کی حدود کے اندر

ستھ، لٹی اور تازہ پھلوں کے جس مفید ہیں۔ ڈاکٹر ولیمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Ferrum, Calc. sulph-30 met-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔ جبکہ Alfalfa-30 کے 11 قطرے ہر کھانے کے بعد آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

عید کی بیماریاں

ایسے تو رمضان بھی کچھ لوگوں کے بیماریوں میں گزرتے ہیں غذائی بد اعتدالیوں کے باعث اور جب عید آتی ہے تو ایسے لوگوں کے صبر کا پتہ نہ لہر جھوٹا ہوتا ہے اور یہ ہر اس کھانے پینے کی چیز پر ٹوٹ پڑتے ہیں جو ان کی دسوس میں ہوتی ہے۔ گوکہ رمضان کا مہینہ مہینہ کھانے پینے میں گزارا ہوتا ہے۔ رمضان میں لوگوں کو عموماً دو فکروں میں دیکھا ہے۔ پہلی کہ صبر کی کیا کریں گے اور افطار میں کیا ہوگا؟ دوسری عید کی تیاری کیسے کریں اور اس کے لیے کیا کریں؟ انسانی رمضان کے مہینے کا جو مقصد ہے صبر برداشت اور نظم و ضبط یہ افطار کرنے اور عید کا چاند دیکھنے تک ہی ہوتا ہے اسی لیے تو ہر روزہ دار کو بڑا اصرار رہا ہوتا ہے کہ وہ بھوک پیاس برداشت کر رہا ہوتا ہے اسی لیے وہ کچھ اور برداشت نہیں کرتا چاہتا۔ بات ہم کر رہے تھے عید کی لیکن عید کا تعلق رمضان سے ہے۔ اسی وجہ سے بات رمضان پر آگئی۔ بہر حال اب ہم واپس عید کی کا ذکر کریں گے۔

عید کی ابتدا چاند رات سے ہو جاتی ہے۔ مری کی وجہ سے کولڈ اور ٹھس، کھلی، آنکھیں، فالوڈ اور گولڈ کنڈا وغیرہ کا استعمال بڑھ جائے گا۔ عید کی صبح شیر خور، کیک، مٹھائیاں، کچھریاں، وغیرہ کا استعمال ہوگا۔ ذرا غور کریں ان کھانے پینے کی چیزوں میں شوگر کتنی ہے؟ کولشروں کتنا ہے؟ ان چیزوں کو کھانے کے بعد آپ کتنا اور ڈش کی کام کر رہے ہیں؟ یا تھک کر لیٹ کر پی ڈی کے آگے یا عزیز رشتے داروں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ (یہاں میرے نو جوان اور بچے برگر، چیز، بریانی، فرائز وغیرہ کو بیان کر رہا تھا جن سے بہتر اندہ نہیں کہ وہ ان چیزوں کا استعمال کرتے ہیں)

پھر پھر، دل کے دورے، یورک ایسڈ کی زیادتی، شوگر کا بڑھنا، کولشروں کی زیادتی اس کی وجہ سے کھانے کا دل ہوتا، گھٹے کی خرابی، بد ہضمی (دانی و دسوس) وغیرہ، ہماری ان بد اعتدالیوں کے باعث عید کے موقع پر بہت بڑھ جاتی ہیں۔ اور عید کا دن ان بیماریوں کی وجہ سے ہسپتال میں گزرتا ہے۔

اس لیے عید کے دن اپنے آپ کو اور اپنے عزیز رشتے داروں کو صحت مند رکھیے۔ یاد رکھیے کہ صحت ہے تو صبر کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں لہذا خوشی کے اس موقع پر دوسروں کی خوشیوں کو خراب کرنے کا باعث نہ بنیں۔ صبر اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے اعتدال میں رہیں۔ یہ امن میں رکھتے ہوئے کر آنے والے دنوں میں بھی آپ ان چیزوں کو کھا اور پی سکتے ہیں۔

☆☆☆



Dr. Willmar Schwabe Germany

Available at All Medical & Homoeopathic Stores

شوابے سسٹم ریمیدیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی



آنا، پیٹھ پر بھی دانے ہیں جن کی وجہ سے زیادہ پیٹھنے سے جلن ہوتا شروع ہو جاتی ہے، معدے کا مسئلہ، بالوں کا گرنا،

سفید ہونا، دہلا پٹلا جسم بالکل بڑیاں ہیں گوشت بالکل بھی نہیں، نسوانی حسن بھی بالکل نہیں۔ خون کی کمی اور ٹیٹیم کی بہت کمی ہے۔ ہلڈ ٹیسٹ، الٹر ساکٹر، پیٹاب ٹیسٹ رپورٹس ابھارا ہی ہوں۔ کوئی کریم یا میڈیسن بتادیں۔ چہرے اور جسم کے لیے بھی دو تجویز کرسکیں۔ آپ کی بہت نوازش ہوگی آپ کی احسان مند ہوں گی۔ اگر ممکن ہو تو جواب جلد دے دیں کیونکہ دو ماہ بعد میری شادی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ نکاح صاف ہو جائے اور جسم بھی بھر جائے۔

جواب: اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات سے مانجس نہیں ہوتا چاہیے۔ اگر ہم صحیح تشخیص کر کے صحیح قسم کا علاج کریں (ہومیو پیتھک) تو کوئی وجہ نہیں کہ مرض سے نہایت نہ ملے۔ ہاں صحت کے اصولوں کی پابندی یقیناً حصول صحت کے لیے شرط ہے۔ متوازن غذا کا استعمال کریں۔ لال گوشت (بکرا، گائے) لہنا، پالک، سلا، کدو، چھوٹے، آم، چیری، قاب، آلو بخارا وغیرہ کا بھرپور استعمال کریں۔ صبح سویرے اٹھیں۔ نمازوں کی پابندی کریں۔ کوشش کریں کہ صبح کی نماز کے بعد کسی باغ میں چہل قدمی کریں۔ پانی کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں، کم از کم 2 گلاس روزانہ نہایت بہت کم پینے کے پیلے اور کھانے کے دو گھنٹے بعد پانی کا استعمال کریں۔ شربت اور کولڈ ڈرنکس بالکل استعمال نہ کریں ان سے بھی دانے نکلتے ہیں۔ البتہ

جواب: لگتا ہے کہ آپ بھی علاج بے کا حدی سے کر رہی ہیں، جیسی تو یہ بار بار میں رہی ہے۔ ٹیٹیم کی کوئی یا اس کے مرکبات کے استعمال سے بھی پتھری بننے کے چانسز بڑھتے ہیں۔ پیٹاب آنے پر اس کو روکنے سے بھی پتھری بنتی ہے۔ پانی کا کم استعمال کیا جائے تو بھی پتھری بنتی ہے۔ 19cm کی پتھری جیسا کہ آپ نے لکھا ہے بالکل 19mm تو ہو سکتی ہے۔ ٹیٹیم کی گولیاں استعمال نہ کریں۔ پانی کم از کم 15 گلاس روزانہ پئیں۔ پیٹاب جیسے ہی آنے ویسے ہی کریں روکنے کی عادت ترک کر دیں۔ کیلا، پالک، لہنا، دودھ کا استعمال فی الحال نہ کریں۔ وزن نہ اٹھائیں۔ البتہ چلتی پھرتی ضرور رہیں بلکہ سیر حیاں اترنے چڑھنے کی ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ومار شوابے جرمنی کی مشورہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کریں پھر کیفیت سے مطلع کریں۔
Calc. carb-30, Lycopodium-30
کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ہلکے
Berberis vulg-30 کے 1 قطرے ہلکے
گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔

کئی مسائل

م۔ ح۔ ضلع انک گاؤں لنگر

کافی عرصے سے پا کیزہ میں آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں۔ سوچا آج اپنا مسئلہ بلکہ مسائل آپ کو لکھوں۔ مہربانی فرما کر مجھے میرے مسئلے کا حل بتادیں۔ میں بہت پریشان ہوں اور اب تو شدید مانجی کا شکار ہو چکی ہوں۔ میرے موجودہ مسائل جن کا میں جلد حل چاہتی ہوں وہ ہیں چہرے کے دانے اور داغ دھبے، چہرے اور پیٹ پر بالوں کا